

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سہ ماہی

اکتوبر 2015

نگران اعلیٰ
معراج رحیمول



READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

قلم نگری

پاکستان کے نامور ہدایت کار نگار فرالی فطرت اور انوکھا نام

محسن الملک خلاب کے سخن خاص کا زندگی نامہ

پہلا اور خلاب: ہم خلاب میں کیا دیکھتے ہیں اور کیوں دیکھتے ہیں

نظام چہارت: ایک دور شہزادوں کے اور ہاں بیچاروں کی اولوں کے نامی

WWW.PAKSOCIETY.COM



24

شخصیت

محسن الملک

ڈاکٹر ساجد امجد

اردو ادب کے ایک
محسن کا زندگی نامہ

16

گفت و شنید

شہر خیال

مدیر اعلیٰ

آپ کی باتیں آپ کے خیال آپ
کے مشورے اور آپ کے سوال

15

سرگزشت

قلم کار

آوارہ

ایک صفحہ میں مکمل، مختصر، مختصر
ایک نادر روزگار کا تعارف

70

ظلم لکھی

عجیب شخص

انور فرہاد

پاکستانی نسلی صنعت
کے معروف ہدایت کار کا ذکر خاص

67

دلچسپ وجہیں

سنکی

حسن

تاریخ میں روپوش
معروف سنیوں کا تذکرہ

56

توفیق خاص

کراچی کراچی

عبداللہ احمد حسن

پرانے شہر کراچی
کی یادیں، سوچ سائیں

97

شکرات

چالاک چیتا

لے آورا جیوت

اس چیتے نے سب کو
گنئی کا ناچ نچ پارکھا تھا

93

معلومات

الو کھا گھر

ڈاکٹر عبدالرب بیہٹی

مکانوں کی تعمیر میں سہانسی
باتوں پر عمل کرنا ضروری ہے

85

غلط فیصلہ

کالا چھپرا

حسن رزاقی

کراچی کے ایک
متروک ہینسنگ کی تاریخ

139

اردو ادب

شاعرات

محمد ایاز راہی

ادب کی چست پرانی
شاعرات کا ذکر

119

تحریر خاص

اکتوبر کی شخصیات

صائمہ اقبال

اس ماہ سے حبشہ کی اہم
شخصیات کا ذکر خاص

105

نفسیات

نیند اور خواب

امین بہایانی

ہم خواب میں کیا
اور کیوں دیکھتے ہیں

ماہانہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔
تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کئے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح سے ذمہ دار نہ ہوگا۔

READING
Section

سفر امریکا

علیم شاہد

سیاحت مع سلوواک کا خزانہ
عطا کرنے کا وسیلہ ہے

نارتخ عالم

منظر امام

کرہ ارض پر ہونے والی
تبدیلیوں پر ایک نظر

سراب

کاشف زبیر

بلند حوصلوں اور بے مثل ولولوں
سے گندھی تہلکہ خیز داستان

نہلی سے بیانی

نظا کہ حالت

اسد اللہ

ہم جس گٹھے ہوئے ماحول میں
ساگر لے رہے ہیں اس کی ایک جھلک

دوسری سے بیانی

جرم کی کھتی

محمد عرفان رائے

ایک سبق آموز سچ بیانی جسے
آپ بھلا نہ پائیں گے

تیسری سے بیانی

مضبوط عورت

ظہیر مرزا

عورت خود کو بہادر ثابت
کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن

پانچویں سے بیانی

آخر کیوں

ڈاکٹر فراز افریدی

وہ دوسروں کا جرم اپنے سر
لے کر تھانے پہنچ گیا تھا

چھٹی سے بیانی

جان لیوا

امیمہ

اس کی حسرتوں نے پلورے
گھرانے کو تباہ کر دیا

چوٹھی سے بیانی

سب کچھ

طارق جمیل

ایک شخص مسلسل اس
کے تعاقب میں تھا

اٹھویں سے بیانی

تہی دامن

محمد سلیم اختر

اے بد صورت شخص کو سپاہ
حسانے کی خواہش تھی

نویں سے بیانی

زمیں کے لیے

ایس اے قاضی

وطن ہر شے سے عزیز تر
ہے ایک محب وطن کا احوال

ساتویں سے بیانی

انجام

شاہدہ ملک

ایک کم عقل عورت نے
کئی زندگیوں میں زہر گھول دیا

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور
تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر
آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

قارئین کرام!
السلام علیکم!

مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

آپریشن ضرب عضب نے وطن دشمنوں کی کمر توڑ دی ہے۔ قبائلی علاقوں میں ہماری جری فوج نے وطن دشمنوں کے تمام نیٹ ورک ختم کر دیے ہیں جس کا اعتراف عالمی رائے عامہ کی رپورٹس ہیں۔ گزشتہ دنوں یہ خبر گردش کرنے لگی تھی کہ دہشت گردی کے خلاف اتحادی سپورٹ فنڈ پاکستان کو اب نہیں ملے گا لیکن ضرب عضب کی کامیابی نے امریکا کو بھی فیصلے پر نظر ثانی کے لیے مجبور کر دیا اور ایک خصوصی نمائندے نے اعلان کیا کہ نئی صورت حال کے پیش نظر پاکستان کو اتحادی فنڈ کی ادائیگی جاری رہے گی۔ یہ کامیابی شمالی علاقوں سے وطن دشمنوں کے صفایا کی وجہ سے پاکستان کو ملی ہے۔ پاک فوج نے دہشت پسندوں سے ان علاقوں کو تقریباً خالی کر لیا ہے اس لیے ان کے وہ ہمدرد جو ادھر ادھر چھپے بیٹھے ہیں ان سے ہوشیار رہنے کی اب زیادہ ضرورت ہے گو کہ خفیہ ایجنسیاں، پولیس اور قانون نافذ کرنے والے دیگر ادارے پوری طرح بیدار ہیں۔ کامیابی سے مارے گئے چھاپے اور گرفتار دہشت پسند اس کا ثبوت ہیں لیکن عوام کی ذمے داری بھی اب بڑھ گئی ہے۔ اپنے ارد گرد ہمیں کڑی نظر رکھنی ہوگی۔ مشتبہ افراد اور سرگرمیوں کی اطلاعات پولیس اور قانون نافذ کرنے والے اداروں تک پہنچا کر اپنی ذمے داری ہمیں ادا کرنی ہوگی۔

شعبہ اشتہارات

نیشنل اشتہارات محمد نواز خان 0333-2256789
نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391
راہ محمد سعید 0323-2895528
نمائندہ اسلام آباد فراہ علی بخش 0300-4214400

قیمت فی پرچہ 60 روپے ♦ ذریعہ سالانہ 800 روپے

پبلشر پروپروپرائٹرز: عذرا رسول

مقام اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن

ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ

کراچی 75500

پرنٹرز: جمیل حسن

مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس

ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone: 35804200 Fax: 35802551

E-mail: jdpgroup@hotmail.com



معراج رسول

Downloaded from paksociety.com

اس کی پرورش پانی پت کے جس گھر میں ہو رہی تھی وہ گھر اس کے نانا خواجہ سجاد حسین مرحوم کا تھا۔ جنہیں اس قصبے میں ایک نمایاں مقام حاصل تھا۔ سجاد حسین محمڈن اینگلو اور نیشنل کالج علی گڑھ سے پڑھے ہوئے ان چار نو جوانوں میں سے تھے جنہوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے بی اے کی سند حاصل کی تھی۔ اس زمانے میں بی اے کی سند دولت و اقتدار کی چابی تھی۔ یونیورسٹی کے گورنر نے ان چاروں کو بلا کر کہا کہ گورنمنٹ سروس کے کسی بھی اعلیٰ عہدے کے لیے وہ درخواست دے دیں، انہیں وہ نوکری دے دی جائے گی۔ ایک نے سول سروس کو چنا اور دس سال میں کمشنر کے عہدے پر پہنچ گیا۔ دوسرے نے محکمہ پولیس کا انتخاب کیا اور انسپکٹر جنرل کے عہدے تک ترقی کی۔ تیسرا جوڑہ مشنری میں گیا اور سیشن جج بنا مگر سجاد حسین نے محکمہ تعلیم کو پسند کیا اور ڈپٹی ایجوکیشنل انسپکٹر سے انسپکٹر جنرل کے عہدے تک پہنچے تھے کہ نوکری کولات ماری۔ پینشن لے کر جاہلاد فروخت کی اور قصبے میں ایک اسکول قائم کر کے بیٹھے گئے۔ 1946ء میں سجاد حسین کا انتقال ہوا، انتقال سے چند منٹ قبل جب ہوش آتا تھا تو پہلا سوال یہی کیا تھا کہ کیا بچوں کے میٹرک کارڈز آگیا؟ تعلیم سے اس قدر محبت کرنے والے شخص کی زیر نگرانی تربیت پانے والے کو بھی علم سے اسی قدر رغبت ہونا ضروری ہے۔ پھر والد غلام السبطین بھی علم و ادب کی جانب راغب تھے مگر سجاد حسین اور غلام السبطین میں ایک بڑا فرق ہے۔ تھا کہ سجاد حسین کی سوچ قوم تک محدود تھی جب کہ غلام السبطین انسان دوستی اور جمہوریت پر یقین رکھتے تھے۔ اس دور میں زمینداری کا دور دورہ تھا۔ حسب نسب، شرافت، رذالت، اونچے خاندان، نیچے خاندان، سید، انصاری، شیخ، مغل، پٹھان کے امتیازات عروج پر تھے۔ شادی بیاہ میں فضول خرچیاں، توہم پرستی، تعویذ گنڈے پیری مریدی، عروس و قوالی، مجلس، ماتم کا خوب خوب چلنا تھا مگر غلام السبطین کے نزدیک یہ سب بے معنی تھے۔ وہ صرف انسانیت پر یقین رکھتے تھے۔ کڑی سادگی پسند تھے۔ غرور و نمائش سے حد درجہ نفرت کرتے تھے مگر آزادی ہند کے بھی حامی تھے۔ اس وقت مسلمانوں کی بڑی جماعتیں تھیں۔ مجلس احرار، مسلم کانفرنس، جمعیت العلماء ہند اور مسلم لیگ، باقی تینوں نے مسلم لیگ اور اس کے مطالبہ پاکستان کے خلاف مجاذبہ بنا رکھا تھا۔ غلام السبطین مسلم کانفرنس کے حامی تھے اس لیے مسلم لیگ کی سیاست کو پسند نہیں کر رہے تھے جب کہ ان کے صاحبزادے کا یہ عالم تھا کہ وہ مسلمانوں کی چاروں بڑی جماعتوں کو انسان دشمن قرار دے رہا تھا۔ یہی خیال اس کانگریس کے بارے میں بھی تھا۔ اس کی دلچسپی سیکولرزم میں تھی۔ وہ کیونسٹ نظام کا حامی تھا۔ یہ لگتا ہے کہ اس نے سب سے پہلے ہی سب کو چھوڑنا چاہا۔ چار یا پانچ برس کا رہا ہوگا۔ 1919ء کا سال تھا۔ جلیانوالہ باغ کا خون واقف رونما ہو چکا تھا اور انگریز پنجاب کے لوگوں پر رعب طاری کرنے کے لیے طرح طرح کی کوششیں کر رہے تھے۔ جی ٹی روڈ کے اطراف میں جتنے بھی قصبے تھے ان سب کے اسکولوں میں حکم جاری کیا گیا تھا کہ وہ سب بچوں کو چھوڑ دے اور قہار میں کھڑا کریں تاکہ انگریز فوج جو سڑک سے گزرے گی اس کو خوش آمدید کہیں۔ صبح سے سہ پہر تک ننھے ننھے بچے دھوپ میں کھڑے رہے۔ توہیں، بندوقیس، مشین گنیں اور بھالے لکواریں سنبھالے فوجی گزرے۔ حکومت کا خیال تھا کہ اسلحہ اور فوجیوں کی نمائش سے عوام مرعوب ہو جائیں گے مگر ان بچوں پر الٹا اثر ہوا۔ کئی دن تک غلام السبطین کا بیٹا لوگوں کو جمع کر کے ان ”لال منڈ والے بندوں“ کی نقل کرتا اور کہتا کہ ہم انہیں یہاں سے نکال باہر کریں گے۔ یہی نفرت وقت کے ساتھ بڑھتی رہی اور 1938ء میں وہ نو جوانوں کی بین الاقوامی تحریک کی کانفرنس میں امریکا پہنچ گیا۔ اس کانفرنس میں شرکت کے لیے 30-35 ملکوں سے نو جوان آئے تھے۔ جرمن جو ہٹلر کی گستاخوں سے چھپ کر آئے تھے۔ اطالوی، مسولینی کی خفیہ پولیس کو جل دے کر آئے تھے۔ برطانوی، پولش غرض ہر ملک سے نو جوان چھپ کر آئے تھے۔ خود یہ بھی متحدہ ہند کی حکومت کو جھوٹے خطوط دکھا کر امریکا آیا تھا۔ صرف اس لیے کہ اس کے اندر فاشزم کے خلاف جذبات بیدار ہو چکے تھے۔ اس کی تقریر نے تمام نو جوانوں میں اسے مقبول کر دیا۔ وہ لوگ جنہیں برطانوی تسلط سے ہند کی آزادی سے کوئی مطلب نہیں تھا وہ بھی اسے مبارک باد دینے لگے۔ یہ کانفرنس جنگ روکنے کے لیے منعقد ہو گئی تھی لیکن دیر میں ہوئی تھی اور سال بھی نہیں گزرا تھا کہ دوسری جنگ عظیم برپا ہو گئی۔ یہ واپس آ گیا۔ یہاں آ کر اس نے بمبئی کرائیکل نامی اخبار کو جوائن کر لیا۔ وقت گزرتا رہا۔ وہ جن خیالات کا حامل تھا ان خیالات کو شکست ہونے لگی تھی۔ برطانوی حکومت تو بساط سمیٹ رہی تھی مگر ہند میں تعصب کے عفریت نے سر اٹھالیا تھا۔ شمال مشرق اور شمال مغرب سے فسادات کی آمدھی اٹھنے لگی تھی۔ انسانی خون ازراں ہو گیا تھا۔ وہ بمبئی میں تھا اور اس کی ماں بہنیں پانی پت میں۔ جب مغربی پنجاب سے ہندو سکھ پانی پت پہنچے تو انہوں نے قیامت برپا کر دی۔ ہر گلی کو بے گھر مسلمانوں سے خالی کرانے کی مہم شروع ہو گئی۔ فسادات کے میں بائیس دن انہوں نے وہیں گزارے پھر دہلی سے فوجی ٹرک گیا اور ان لوگوں کو دہلی لایا گیا پھر اس نے ماں کو اپنے پاس بمبئی بلا لیا۔ وہ دن رات بمبئی میں امن کی میسنگز میں گزارتا کیوں کہ وہ قلم کار تھا اور قلم کار کبھی تعصب پسند نہیں ہوتا۔ کالم لکھتا، مضامین چھاپتا مگر جب انسانیت نے ہلکی سی انگڑائی لی اور کچھ امن و امان ہوا تو وہ صحافت کے ساتھ قلم میں بھی دلچسپی لینے لگا لیکن اس کی پہچان اول تا آخر قلم کار ہی رہی۔ اسے دنیا خواجہ احمد عباس کے نام سے جانتی ہے۔

شہر خیال



☆ شاہد جہانگیر شاہد پشاور سے رقمطراز ہیں۔ ”آج سرگزشت سے اپنے عشق کی داستان سناؤں گا۔ سرگزشت سے میری پہلی ملاقات عجیب حالات میں ہوئی۔ یہ 90ء کی دہائی کی بات ہے۔ میں ایک سرکاری اسپتال میں آفس انچارج تھا۔ اسپتال کے سامنے فٹ پاتھ کے قریب ایک رومی اخبار فروش کی دکان تھی۔ اکثر رومی میں پرانی کتابیں اور میگزینز بھی اس کے پاس آجاتے تھے جنہیں وہ فٹ پاتھ پر پھیلا دیتا تھا جسے وہاں سے گزرنے والے اکثر علم کے پیاسے خرید لیتے تھے۔ ڈیوٹی پر آتے جاتے میں چند لمبے دکاندار کے پاس رک کر سلام دعا کرتا اور کتابوں پر ایک اچھی سی نظر ڈالتا اور روڈ کراس کر کے اپنے اسپتال میں آجاتا۔ فٹ پاتھ پر بعض اوقات بڑی قیمتی اور نایاب کتب بھی مل جاتیں ہیں جنہیں میں خرید کر اور ضروری مرمت کروا کر اپنی ذاتی لائبریری کی زینت بنا لیتا۔ اچھا قلم، اچھی کتاب اور اچھی خوشبو ہمیشہ سے میری کمزوری رہی ہے۔ انہی دنوں ایک روز میں ڈیوٹی ختم کر کے گھر جا رہا تھا۔ حسب معمول دکاندار کے پاس رک کر ایک سائیک کی۔ چند لمبے رک کر پرانی کتابوں پر نظر ڈالی کہ اچانک ایک نعتیہ کلام پر مبنی بہت ضعیف کتاب پر نظر پڑی جس کی جلد اکثر چمکی تھی۔ میں نے احتراماً جھک کر کتاب اٹھالی۔ ابھی

میں اٹھنے لگا تھا کہ اسی کتاب کے نیچے ایک سرگزشت نظر آیا جو کہ آزادی نمبر تھا۔ سرگزشت کے نائیل پر پاکستان کے قومی پرچم اور بابائے قوم حضرت قائد اعظم کی تصاویر چھپی ہوئی تھیں۔ میں نے وہ پرچم بھی اٹھالیا۔ اس قسم کی ناقدری اور بے حرمتی دیکھ کر ہمیشہ میرا دل کڑھتا ہے۔ میں نے دونوں کی قیمت پوچھی تو کہنے لگا کہ ڈاکٹر صاحب آپ یونہی لے جائیں، میرے پاس تو یہ رومی میں آئے ہیں۔ (یاد رہے کہ ہمارے ہاں کمپاؤنڈ اور چپڑا اسی کو بھی اسپتال کی نسبت سے ڈاکٹر کہہ کر پکارا جاتا ہے اور میں تو ایک اہم عہدے پر متعین تھا۔) میرے بے حد اسرار پر کہنے لگا کہ چلیں آپ دس روپے دونوں کے دے دیں میں کتابیں لے کر گھر روانہ ہو گیا۔ ایک واقف دکاندار کو نعتیہ گلدستہ جلد تبدیل کرنے کے لیے دے دیا اور سرگزشت کا پرچہ لے کر گھر آ گیا۔ فرصت کے اوقات میں سرگزشت کا مطالعہ شروع کیا۔ ایک کے بعد ایک مضمون پڑھتا چلا گیا اور بے حد متاثر ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ کراچی سے شائع ہونے والا مشہور ”سب رنگ ڈائجسٹ“ بے انتہا عروج کے بعد زوال کی طرف گامزن ہو چکا تھا اور کئی کئی ماہ کے ناغے اور بعض اوقات تو سال میں صرف ایک بار شائع ہونے لگا تھا اور ایسے میں سرگزشت کی آمد ایک تازہ ہوا کا جھوٹا ثابت ہوئی۔ اگست کا پرچہ پڑھنے کے فوراً بعد میں نے تازہ شمارہ خریدا وہ بھی بڑا دلچسپ تھا۔ اب تو میں سرگزشت کے عشق میں مبتلا ہوتا چلا گیا لہذا پرانی کتابوں کے بازار کے واقف دکانداروں سے گزارش کی کہ اب تک کے جتنے بھی پرانے پرچے مل سکتے ہیں وہ میرے لیے رکھ لیں۔ اب روزانہ چھٹی کے بعد پرانے پرچوں کی تلاش میں کباڑی بازار جانے لگا۔ کبھی ایک کبھی دو پرچے ہاتھ لگ جاتے۔ سوائے پہلے پرچے کے اس وقت تک کے تمام پرچے آخر کار مجھے مل گئے۔ میری تلاش مکمل ہوئی اور تب سے اب تک ہر ماہ کا ایک بڑا ذخیرہ میرے پاس جمع ہو گیا۔ پھر میرے پاس جگہ نہ رہی اور صرف موجودہ سال کے پرچوں کے علاوہ تمام پرچے دوستوں میں بانٹ دیئے۔ اب بار بار کے بڑھے ہوئے انہی پرچوں کا مطالعہ کرتا ہوں یہاں تک کہ نیا پرچہ آجاتا ہے تو پھر اس میں مصروف ہو جاتا ہوں۔ یہ کبھی سرگزشت سے میرے عشق کی داستان۔ اس وقت ایک بار پھر اگست اور ستمبر 2015ء کے پرچے میرے سامنے پڑے ہوئے ہیں۔ دونوں پرچے بہت اچھے مضامین پر مشتمل ہیں۔ آج چھ ستمبر ہے جب میں یہ تبصرہ تحریر کر رہا ہوں۔ کئی دن سے ٹی وی کے مختلف چینلوں پر شہیدوں کے لواحقین اور عازمی آ کر اپنی یادداشتیں اپنے ہم وطنوں سے شیئر کرتے ہوئے خود بھی جذباتی ہو جاتے ہیں اور ناظرین کو بھی اپنے ساتھ 1965ء کے پاکستان میں لے جاتے ہیں۔ جب چشم فلک نے مختلف زبانوں اور فرقوں میں بٹی ہوئی عوام کو ایک قوم اور ایک آواز ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ ٹی وی نے تو اپنا حق ادا کر دیا لیکن سب ہی جانتے ہیں کہ تحریر کو تصویر پر ہمیشہ فوقیت حاصل رہی ہے۔ تصویر تو کچھ عرصہ بعد ذہن سے محو ہو جاتی ہے لیکن تحریر برسوں تک اور بعض اوقات صدیوں تک محفوظ رہتی ہے اور اپنے پڑھنے والوں کو رفتگان کی یاد اور کارناموں سے آگاہ کرتی رہتی ہے۔ اگست اور ستمبر 2015ء کے پرچوں میں مجھے شدت سے اپنے ان محسنوں کی کمی محسوس ہوتی رہی ہے جنہوں نے اپنا کل ہمارے آج پر قربان کر دیا تھا۔ اُمید ہے کہ آئندہ کسی شمارے

میں یہ کمی ضرور پوری کی جائے گی۔ اس ماہ ڈاکٹر ساجد امجد جناب احسن مارہروی کا زندگی نامہ لے کر آئے ہیں۔ بہت خوب ڈاکٹر صاحب۔ دیگر مضامین بھی بہت اچھے ہیں لیکن فرداً فرداً سب کا ذکر مشکل ہے کہ خط پہلے ہی بہت طویل ہو گیا ہے۔ اس ماہ کا توشہ خاص جناب زرہ حیدر آبادی کا مضمون ”شاعر کوئی اور ہے“ تھا۔ یہ ایک بے حد اہم اور معلوماتی مضمون ہے۔ انور فرہاد کا ”مولا جٹ“ بھی خوب تھا۔ بہت سی معلومات حاصل ہوئیں کس کس مضمون کا ذکر کیا جائے سب ہی تحریریں بہت اچھی تھیں۔ ”مظہر خیال“ منظر علی خان کو کرنی صدارت مبارک ہو۔ مجھی رخصت کا تبصرہ مزہ دے گیا۔ مجید احمد جانی، سدرہ بانو ناگوری، منشی محمد عزیز مئے، آفتاب احمد نصیر اشرفی، رانا محمد شاہد سب کے تبصرے جاندار تھے۔ مظہر احمد تبسم میں آپ کی دعاؤں اور محبتوں کے لیے مشکور ہوں۔ طاہرہ گلزار بھی اس ماہ غیر حاضر ہیں۔ برادر م وحید ریاست، بھٹی بھی گزشتہ کئی ماہ سے مسلسل غیر حاضر چلے آ رہے ہیں۔ ان سے گزارش ہے کہ اپنے بھرپور تبصرے کے ساتھ دوستوں کی محفل میں حاضر ہوں۔ اتنی طویل غیر حاضری اب چھینے لگی ہے۔ دوستوں سے گزارش ہے کہ ذاتیات کی بجائے درگزر سے کام لے کر سرگزشت میں چھپنے والے ادبی مواد پر تبصرہ کیا کریں۔ ہم سب سرگزشت کے رشتے سے ایک دوسرے کے عزیز ہیں۔“

☆ احمد خان تو حیدی کا اظہار یہ کراچی سے۔ ”شمارہ ستمبر 31 اگست کو کلمہ چوک راولپنڈی سے لے کر عازم کراچی ہوا۔ 28 گھنٹے کا سفر ہم نے سرگزشت میں ڈوب کر طے کیا۔ طویل ابو ختم ہونی لیکن محفل کے ساتھی ڈفلیاں نہ بچائیں۔ جب تک دم خم سے سرگزشت، سپنس، جاسوسی اور پاکیزہ کی دم چھوڑنے کا میرا ہرگز ارادہ نہیں برادر معراج رسول صاحب دین و دنیا کی تعلیم تجارت بن کر غریب کی بھٹی سے دور محلوں میں روپوش ہو گئی ہے۔ بچپن میں سرکاری اسکول میں دروازے بند کر کے ہمیں سرکاری دودھ پلایا جاتا تھا۔ اب یہ ہم اسٹیل مل والوں سے پوچھیں جسے کوئی چیز وقت پر نہیں ملتی۔ درسی کتب و سامان کے دوڑک حیدرآباد میں پکڑے گئے۔ ایک منی ہمارا ہیرا تھے عظیم ہیر و میزون لیزنی ٹی لگوٹ کے بارے میں ہم بالکل بے خبر تھے۔ بچی کو غیر مسلم کہ کر نکل جانے کا جملہ قلبی صدمے کا باعث بنا۔ اسلام پوری دنیا کا واحد مذہب ہے جو غیر مسلم کو پورا احترام دیتا ہے۔ (مگر ہم نہیں دیتے، کیا یہ کوتاہی کم ہے) ”شہر خیال“ میں تاک جھانک کی، منظر علی تاج سجائے نظر آئے۔ ہم نے بھی مبارک باد کے ساتھ جتنے لڈواٹھا سکتے تھے لے کر نکل آئے۔ برادر مجید احمد جانی اچھا تبصرہ کیا، ہم سب کے دل کی بات ہے کہ تعلیم کی آڑ میں لوٹ مار ہو رہی ہے۔ سسر سدرہ ناگوری تبصرہ طویل بیٹ ویری گڈ تھا۔ بت یومیرے گاؤں والی بھاگاں لڑاکی کی طرح دروازے کی اوٹ سے تاک جھانک کرتی آستین چڑھائے نظر آئی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ لیکچرار بی بی گڑیا طاہرہ گلزار، لڑائی پر روٹھ کر اعتکاف میں جا بیٹھی ہیں۔ اپنی محفل میں نوک، جھوک لازم ہے مگر سب ساتھی کسی کی کامیاب و ناکام ازدواجی زندگی میں دخل نہ دیں، سب کا ذاتی مسئلہ ہے۔ بھائی فلک شیر رحیم یار خان! مرد کسی ازدواجی زندگی کے بغیر نہیں رہ سکتا جیسا کہ بزرگوں نے برادری کو بیکار کھینے کے لیے تین ٹیکل ڈال کر ہمیں 20 ووٹ کا سربراہ بنا کر بلدیائی اسیرواروں کو ہماری خدمت کا موقع دیا۔ رانا شاہد، منشی عزیز مئے، مظہر تبسم، مجھی USA، ٹارلاڑکانہ، بشری افضل، آفتاب نصیر اشرفی کے اچھے تبصرے تھے۔ طویل کہانیاں میں احسن الکلام، سفر امریکا، شاعر کوئی اور ہے سرباب کا مطالعہ کرتے رہا کیونکہ پرچے کوچوں نے اسکول کے مضمون سمجھ کر قبضہ کر لیا ہے۔ ابن کبیر کی خدمت گارکاش یہ جذبہ پہلے ہوتا تو ہمارا بازو نہ کٹا۔ منی نہیں گیتا، اختر بلوچ نے اتنے عظیم خاندان کی مختصر تحریر دوبارہ تفصیل سے لکھیں۔ ستمبر کی شخصیات، عظیم قائد کو دیکھ کر خود بخود ہاتھ سیلوٹ پر چلا گیا۔ اف ہائے زندگی نے مہلت نہ دی۔ نکل کے دن روتا چھپ کے رات روتی ہے۔ بابا جان و بھگت سنگھ کے بارے میں پہلے پڑھا نہیں ہے۔ آدم خور پسند آئی، ہر شمارہ میں شکار کہانی لازمی دیں۔ سلٹی اعوان کی کیلاشی کہانی، ویری گڈ۔ انور فرہاد مولا جٹ کی یاد تازہ کرانے پر شکر یہ ایاز راہی سا ہیوال کی زرخیز منی سے ہم ٹرک بھر بھر گائے لا کر فارم بنا رہے ہیں۔ سچ بیانیاں، عجب دستور، معاشرہ کی سو فیصد تلخ حقیقت۔ 1970 میں میں خود چشم دید گواہ ہوں کہ ماں... ایک بیٹے کو دیکھی کھلانی اور دوسرے معذور بیٹے نے اپنی کمائی سے چار آنے کا ڈالڈالھی لایا تو ماں نے اسے جوتے سے مارا۔ والدین کا ناروا سلوک بچوں کو احساس کسٹری میں جٹا کر دیتا ہے۔ سعد یہ کو نیک آدمی سے شادی ضرور کر لینی چاہیے۔ ذمہ دار کون، اعلیٰ تعلیم یافتہ مگر غلط روش پر ایسے لگوں کو تبلیغی جماعت میں بیٹھنا چاہیے۔ انشاء اللہ ہر مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ست رنگی دنیا، کراچی اور ہر جگہ یہی حال ہے، ہمارے ساتھ کام کرنے والے باقاعدگی سے ماہنامہ بھتہ دے کر جان کی امان چاہتے ہیں۔ قسمت کے کھیل، گلناز اپنی ناگہبی میں برباد ہوئی۔ دوسروں کے لیے گڑھا کھودنے والے دانش جیسے لوگ خود گڑھے میں گرتے ہیں۔ روائیوں کے اسیر، بالغ ہونے پر شاہ زیب کو معذور سمجھ کر شادی نہ کرنے سے یہ نوبت آئی۔ ازدواجی تعلق شرعی اصل حل ہے۔ کاش فیصل نفسیاتی مریض تھا۔ شاہین کاظمی کی گلی نے دور جہالت کی یاد تازہ کر دی۔ سمانی، ٹوشین کافر جان سے ملنا غلط تھا۔ نتیجہ قتل و خودکشی۔ اقرار جرم، ایسے ہیرا پھیری والے بے ضمیر لوگوں کا انجام یہی ہوتا ہے۔ چونکہ سرگزشت، سچ بیانیوں کے باعث منفرد مقام رکھتا ہے اور ہر شمارہ خاص شمارہ ہوتا ہے۔“

☆ اعجاز حسین سٹھار، نور پور تھل سے لکھتے ہیں۔ ”ایک مدت بعد پرچا بروقت ملا۔ بھکر والے براہ راست رابطہ سے گھبرا رہے ہیں۔ قیصر خان سے بات ہو جائے، یہ ہماری خوش قسمتی ہوگی۔ یوسف سانول، بھٹی قریب رہتے ہوئے ملاقات نہ ہونا عجیب لگتا ہے۔ احمد خان تو حیدی، ہوائی سلام کا شکر یہ۔ ہم بھی موٹروے پر بورڈ نظر آنے پر سلام کو عادت بنائیں گے۔ منظر علی خان، واقعی آپ خان بلوچ ہیں۔ مبارک

باد قبول کیجئے۔ ”مٹی نہیں گیتا“ وطن ہمارا آزاد کشمیر کی زندہ مثال ہے۔ ”تمبر کی شخصیات“ خاصے کی چیز ہے اور معلومات کی پٹاری ہے۔ ”مولا جت“ میں نے 1981ء میں سرگودھا کے تاج سینما میں دیکھی تھی۔ اب فاطمہ جناح روڈ پر سینما کی جگہ لوہا اسٹیل کے سامان کا بہت بڑا اسٹور ہے۔ سچی بات ہے فلم دیکھ لینے کے بعد ایک مدت بعد اس کی مقبولیت کا علم ہوا اور ہم تب تک زمانے کی افراتفری میں کہانی بھی بھول چکے تھے۔ ساہیوال کی سیر بھی گزارا کر گئی۔ ”سراب“ پر جو دوست بلا جواز تنقید کر رہے ہیں اس پر افسوس ہے۔ کہانی میں تسلسل اور دلچسپی میں ذرا برابر کی نہیں آئی اور واقعات کی روانی ساون کے دریا کے بہاؤ جیسی ہے اور مصنف کی محنت قابل داد ہے۔ پہلی سچ بیانی، ”عجب دستور“ میں والدین کا رویہ نہ سمجھ آنے والا اور عجیب ہے۔ سوتلی اولاد سے ایسا سلوک دیکھا سنا ہو سکتا ہے یہاں تو ایسا لگتا ہے جیسے گزری نسلوں کا انتقام لیا جا رہا ہے۔ کہانی کا تانا بانا ایسے گورکھ دھندے پر ہے کہ قاری الجھ کر رہ گیا ہے۔ پڑھنے کے بعد دلچسپی، ہمدردی کی بجائے بیزاری سی محسوس ہوئی ہے۔ ”ذمہ دار کون“ میں وہ خود ہی ذمہ دار ہیں۔ یوں محرومیوں کا شکار طبقہ انتقام پر اتر آئے تو دنیا کے آدھے سے زیادہ انسان لقمہ اجل بن جائیں۔ جرم کے بعد ہر مجرم مختلف تاویلیں گھڑ کر خود کو بے گناہ اور مظلوم ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ”ست رنگی دنیا“ میں راشد نے انعامی رقم حاصل کرنے کے بدلے سکون کا سودا کر لیا تھا۔ ایک مشت دولت کو سنبھالنا عام انسان کے بس کی بات نہیں پھر کتنے مافیا ہیں جو شریف بے ضرر اور بے بس انسانوں کے تاک میں رہتے ہیں۔ ”قسمت کے کھیل“ میں عورت نے کسی کی زندگی میں کیا زہر گھولنا تھا بلکہ وہ خود تباہ و برباد ہو گئی۔ وہ نوجوان تھی، زندگی سے لطف اندوز ہونا تھا۔ کتنی خوشیاں، جولانیاں اور راحتیں اس کی تاک میں تھیں لیکن وہ دوسروں کے ہاتھوں کھیلنے کھیلنے سب کچھ حتیٰ کہ سانس تک ہار بیٹھی۔ ہر بندہ اپنے مزاج، سوچ اور عقل کے مطابق فیصلہ دے سکتا ہے کہ کون نقصان میں رہا۔ ”روایتوں کے اسیر“ میں کافی کچھ ظاہر نہیں کیا گیا۔ بڑی بڑی دیواریں کتنی بے بس عورتوں کی سسکیوں، آہوں اور نا انصافیوں کی گواہ ہیں اور یہ سب کچھ آج بھی ویسا ہی چل رہا ہے صرف کردار بدل رہے ہیں۔ ”کاش“ میں فیصل اور نورین کی عمر میں خاص فرق نہ تھا۔ مرد بھی تو اپنی شادی کے لیے کم عمر ترین لڑکی پسند کرتا ہے بس جذبے جوان رہنے چاہئیں اور محبت، غلوں اور وفا میں فرق نہ آنے پائے۔ ”طلاتی“ میں جذبات سے ہٹ کر اور حقیقت کو سامنے رکھ کر سوچا جائے تو ٹوشین کے اس قدم کو سراہا نہیں جاسکتا۔ فرقان مرچکا ہے۔ بدنامی جتنی حصے میں آئی تھی وہ آچکی ہے۔ آخر میں ایک شکوہ بھی پیدا ہو گیا ہے کہ معراج رسول نے اپنے انٹرویو سے محروم رکھا ہوا ہے۔ اب بھی ہمارے بچے کی شادی کے احوال کے لیے پاکیزہ کا انتخاب ہوا۔ میری طرف سے دلی مبارک باد کے ساتھ سرگزشت کے قارئین کا جرم بھی بتادیں بھلا اپنوں کے ساتھ کوئی یوں بے رخی بھی برتا ہے۔“

☆ سعید انور عباس شاہ کا خلوص نامہ دریا خان۔ سطر سے۔ ”تمبر کا شمار ہمیں 4 تمبر کو ملا، ایک تو شمارہ لٹ ملا دوسرا سب سے بڑی کوفت ہمیں اس وقت ہوئی جب ”عہد خیال“ کے کسی بھی حصے میں ہمارا نام شامل نہ تھا۔ حالانکہ خط تو ہم نے بروقت پوسٹ کر دیا تھا جو یقیناً ڈاکخانے والوں کی سمیٹ چڑھ گیا، دگا۔ اس ڈیوٹی فلنگ کے کسی بھی حصے کی ہم کیا مثال دیں یہ خود اپنی مثال آپ ہے۔ 3 تمبر کو ایک مرتبہ پھر محکمہ ڈاک کے ایک اعلیٰ افسر ریڈیو پاکستان کو انٹرویو دے رہے تھے اور اپنے محکمے کے اوصاف خوب بڑھا چڑھا کر بیان کر رہے تھے۔ وہ بار بار ایک ہی جملہ دہرا رہے تھے کہ ہمارا مستند عملہ یہ کرتا ہے وہ کرتا ہے، زیادہ سے زیادہ دو تین دن میں ڈاک بخیر و خوبی اپنی منزل تک پہنچا دیتا ہے جب کہ ہوتا اس کے برعکس ہے۔ ہم نے ایسے بچیاں بچے بھی دیکھے ہیں جو محکمہ ڈاک کی کوتاہی سے امتحان دینے سے بھی رہ جاتے ہیں کیوں کہ رول نمبر سلیپ یا تو ان کو وقت پر نہیں ملتی یا پھر پوسٹ مین صاحب ایسی بے حد ضروری چیز کو ناکارہ سمجھ کر ریج ایڈریس کی بجائے اپنی آسانی کی خاطر راستے میں پڑنے والی کسی دکان پر دے دیتے ہیں کہ کسی آتے جاتے کودے دینا، اب یہ دکاندار پر منحصر ہے کہ وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔ ”عہد خیال“ میں منظر علی خان بازی لے گئے بہت بہت مبارک ہو بھائی اس کے علاوہ مجید احمد جانی، بزرگ ہستی خالد محمود، سدرہ بانو ناگوری، فلک شیر، شمش محمد عزیز مئے، نعیم الحسن شاہ، محمد احمد رضا انصاری، ظہیر احمد تبسم، بشری افضل، رانا حبیب الرحمن، آفتاب احمد نصیر اشرفی، رانا محمد شاہد، شام احمد اور نجی رحمن کے شاندار خطوط پڑھ کر ہم مستفید ہوئے۔ ”عہد خیال“ کی معروف شخصیت رانا سجاد نے تو محفل میں شامل تھے اور ان کا نام بلیک لسٹ میں شامل تھا۔ بھئی کہاں ہیں آپ خدا خیر کرے۔ اس کے علاوہ شہر خیال کے چمکتے دکتے ستارے قیصر عباس خان، شاہد جہانگیر شاہد اور ہماری ہر دلچیز بہن طاہرہ گلزار بھی غیر حاضر تھیں۔ پچھلے خط میں وہ کچھ ناراض ناراض سی لگ رہی تھیں۔ کہیں انہوں نے ہم سب سے منہ موڑ تو نہیں لیا۔ خدا کرے ایسا نہ ہو۔ محمد سلیم قیصر بھی شامل محفل نہیں تھے۔ خدا ان کو سلامت رکھے اور ان کی مصیبتیں جلد دور فرمائے۔ بشری افضل آپ کے عزیزوں کی وفات پر ہم آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں خداوند کریم مرحومین کو جنت میں اعلیٰ ورجہ عطا فرمائے اور آپ سب کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔“

☆ عبد الجبار رومی انصاری کا خلوص نامہ لاہور سے۔ ”سرگزشت تمبر کا شمارہ 29 تاریخ کو مل گیا تھا۔ اس دفعہ سرورق پر تو خوب صورتی کا خمار چھایا ہوا تھا۔ چند دن پہلے تک جو گیتا کی خبر اخبار میں پڑھی تھی۔ حیرت ہوئی کہ اتنی جلدی گیتا کے متعلق معلومات سرگزشت کے صفحات پر بھی آگئیں۔ واڈمان گئے جی، یوں سب سے پہلے ”مٹی نہیں گیتا“ کو ہی پڑھنے بیٹھ گیا۔ گوئی گیتا بالکل بجز گئی بھائی کی مٹی ہی گئی۔ اللہ کرے وہ بھی جلد اپنے والدین سے ملے، ایڈمی فاؤنڈیشن کی گیتا کے لیے محبت اور اسے اپنا مذہبی ماحول دینا انسانی ہمدردی اور خدمت کی انتہا

ہے۔ اللہ انہیں اجر عظیم دے۔ ادارے میں بہت اچھی بات کہی گئی اگر حکومتی سطح پر سستی اور معیاری تعلیم کے لیے عملی اقدامات کیے جائیں تو لوگ مہلے اسکولوں کی طرف دیکھیں بھی نہیں۔ بہر حال تعلیم تو ضروری ہے۔ ہمارا ہیرو واقعی ہیرو تھا جنہوں نے مذہب سے بالاتر ہو کر پاکستان کی حفاظت کو اپنا مشن بنایا اور جان بھی قربان کر دی۔ میرون لیزلی کی سوچ بہت اعلیٰ تھی۔ ”عصر خیال“ میں خیال آرٹ کی صدارت منظر علی کو ملی بہت مبارک ہو۔ تجزیہ زبردست تھا اور خوشیوں کے لیے قربانی بھی دینی پڑتی ہے۔ مجید احمد جانی کی خیال آفرینی بھی اچھی تھی۔ سدرہ بانو ناگوری بھی وجود زن سے ہے کی حمایت میں بول پڑیں واقعی اس کے بغیر تو کائنات کے رنگ نامکمل ہیں اور منشی عزیز صاحب یہ خطا تو ہوتے ہی ہمارے پڑھنے کے لیے پھر غیر اخلاقی حرکت کیسے؟ آفتاب احمد نصیر نے بھی اچھا لکھا ہے۔ رانا محمد شاہد، اللہ آپ کی پریشانی دور کرے۔ ثار احمد جاسوسی نمیلی کا حصہ بنو تو انتظار بھی نہیں کرنا پڑے گا کیونکہ سرگزشت کے ختم ہوتے ہی جاسوسی مل جاتا ہے اور جب تک جاسوسی ختم ہوتا ہے تو سسٹمز آجاتا اور پھر سرگزشت کا دیدار ہو جاتا ہے۔ یوں پتا ہی نہیں چلتا اور مہینا گزر جاتا ہے۔ باقی دوستوں میں منشی رحمان، رانا حبیب الرحمن، ظہیر احمد تبسم، بشری افضل، محمد احمد رضا، نعیم احسن، فلک شیر، خالد محمود، سیف اللہ اور خرم علی راؤ نے بھی بہترین تبصرہ نگاری کی ہے۔ تبصرے کی شخصیات میں قائد اعظم، مولانا مودودی، اشفاق احمد، نوابزادہ نصر اللہ اور بابا گرونا تک کی زندگی کے بارے میں معلومات افزا تحریر زبردست تھی۔ پاکستان کی حسین وادی سے کیلاشی کہانی پہاڑی رنگ لیے بہترین تھی۔ قلم نگری سے ”مولا جٹ“ کا اشتہار دیکھ کر بے اختیار مسکراہٹ دوڑ گئی۔ مولا جٹ اور نوری نت کے کرداروں پر مشتمل یہ ایک لازوال قلم ہے۔ شکاریات میں آدم خور نے چونکا دیا۔ کہانی دلچسپ تھی۔ ”تاریخ عالم“ کا تیسرا حصہ بھی زبردست رہا۔ ایک ہی وقت میں دنیا کے مختلف خطوں میں کیا بود و باش رہی، پڑھ کے اچھا لگا۔ ارتقاء کا یہ سفر دلچسپی کا حامل ہے۔ سید علی احسن کی شاعری پر مشتمل تحریر احسن الکلام اثر انگیز تھی۔ ان کی علم دوستی نے ادبی دنیا میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ ساہیوال کا ذکر خیر پڑھ کر بہت خوشی ہوئی، اکثر اپنے آبائی شہر بہاولنگر جاتے ہوئے یہیں سے گزر کے جاتے ہیں اور کھنڈرات کے شہر ہڑپہ کا حال بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔ یہ سلسلہ بہت اچھا ہے جو پاکستان کے گوشے گوشے کی سیر کروائی جاتی ہے اور جس بہا معلومات بھی مل جاتی ہیں۔ (ہم ایسے مضامین دینا پسند کرتے ہیں بشرطیکہ آئے) ”سراب“ اپنے عجیب و غریب انداز سے آگے بڑھ رہی ہے۔ ”بیت بازی“ میں حنا شکار، محمد احمد رضا اور مجید احمد جانی کے اشعار ناپ پر تھے۔ بیت بازی کے دو بیچ اور بڑھادیں، پلیز۔“

☆ کے نجمی رحمن کا پڑھنا بڑا دلچسپ تبصرہ برٹ لیٹ (یو ایس اے) سے۔ (گو کہ یہ تبصرہ بہت لیٹ ملا ہے پھر بھی شامل کر لیتے ہیں) ”اگست کا شمارہ حسب معمول 18 اگست کو ملا۔ کتاب گھر والوں کا کہنا ہے کہ پاکستان سے Late آتا ہے۔ آپ کا ادارہ پڑھا صرف افطاری پر جانا وقت اور عبادت تراویح میں خلل نہیں ڈالتا بلکہ اتنا کھانا کھایا نہیں جاتا جتنا پھینک دیتے ہیں۔ بہت دکھ ہوا ہے ہم نے تو افطاریاں تقریباً بند کر دی ہیں۔ سیماب اکبر آبادی کا مختصر احوال پڑھا۔ سچ تو یہ ہے ”نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہوا۔ سو بار جب تحقیق کیا تب تک نہیں ہوا۔“ کلائیو اپنے حصے کا کام کر گیا آگے سزا جزا اس کے لیے تیار ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کا انداز بیان بہت ہی دلنشین ہے۔ آگے والے اہم شخصیات آیا بھٹی دل خوش ہو گیا کہ ہم بھی کچھ اہم ہو سکتے تھے اگر واقعی کچھ کر دکھاتے، آخر اشار LEO ہے۔ لفظ پاکستان کا خالق کوئی بھی ہو اچھا خیال اللہ کی طرف سے ہے۔ اللہ میرے پاک وطن کو چلا رہا ہے۔ 11 اگست کو سوٹ اور ٹائی پہن کے بیان دیا جا رہا ہے کہ یہ نئی نسل کو مغربی تہذیب سے دور رہنے کے لیے تربیت دینے کی ضرورت ہے۔ اس کو یہی نہیں پتا کہ نئی حضرت عیسیٰ کی صلیب کی نشانی کے طور پر مغرب میں پہنتے ہیں۔ ہمارے قائد اعظم نے پاکستان بننے ہی اپکن ٹوپی کو پاکستان کا لباس قرار دیا تھا۔ ”تاریخ عالم“ دلچسپ جا رہا ہے سب لباس کے لباس کا مقصد بدن کو ڈھانپنا ہے۔ مسلم عورت کے لیے خاص قرآن حکیم میں احکامات ہیں یہ جوئی وی پر انٹرویو لیتی ہیں ہر روز بیوٹی پارلر سے تیار ہو کر آتی ہیں دو پٹا کندھے کے ایک طرف دوسری طرف کھلے بال، فل میک اپ لگتا ہے اپنے میاں کے ساتھ خلوت میں بیٹھی ہیں۔ یہ پاک وطن کی نمائندہ ہیں ایک مسلم عورت کے روپ میں آئے تو زیادہ اچھی لگے۔ پراسرار کتب حیرت انگیز ہے۔ خاص کر یہ تحریریں، تصویریں۔ شاید افریقا کی قدیم قوموں میں کوئی یہ پراسرار تحریر جاننے والے ہوں۔ بڑے غلام علی خان واقعی اپنے فن میں یکتا تھے۔ زیڈ اے بخاری کو اگر کچھ دن کا اختیار ملا تھا تو انہیں خوشدلی سے یہ مسائل دیکھنے چاہیے تھے، موسیقی تو روح کی غذا ہے۔ برائی کچھ اور چیز ہے۔ طلعت محمود کی آواز بہت نرسوز ہے اس کی گائی ہوئی غزلیں ہر زمانے میں زندہ رہیں گی۔“

☆ محمد عمران جو نانی نے کراچی سے لکھا ہے۔ ”چھ سات ماہ کی غیر حاضری کے بعد تبصرے کے سرگزشت نے سرورق سے ہی دل موہ لیا۔ حالیہ اعتبار اور جنرل راجیل کے اقدامات کے بعد حالات بدل رہے ہیں امید ہے ہر شعبہ کی طرح تعلیم پر بھی مثبت اثرات مرتب ہوں گے۔ یک صفحہ سرگزشت نے لہو گرما دیا۔ کیسے کیسے جاننا اپنے لہو سے اس دھرتی کو سنبھالنے آئے ہیں تاکہ ہم سکون سے رہ سکیں۔ ڈاکٹر ساجد کی عمر میں برکت دے کہ آفتابی کے بعد سرگزشت کا مستقل سرمایہ ہیں۔ مولانا مارہروی کے حالات نے گرد و پیش سے بے خبر کر دیا۔ مشاہیر نے زندگی کی تمام تر مشکلات کے باوجود علم و ادب سے بے تو جہی نہ رہتی۔ نمونہ کلام کا انتخاب بھی شاعر تھا خاص کر وہ نظم دل کو لگی جس میں مولانا نے فرمائش پر حالات روز و شب نظم کے پیرائے میں باندھے۔ ابن کبیر کے خدمت گار پڑھنے کے لیے مضبوط دل کی ضرورت ہے۔ پل پل بڑھتی ہوئی عمر وی، خوف اور اس کے بعد چند فرشتہ صفت لوگوں کا مسیحا کی صورت ابھرنا انسانیت کی معراج ہیں، ایسے لوگ جو مٹی کا قرض اتار

رہے ہیں۔ ان کی خدما۔ کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ویسے بنگلہ دیش میں بھی مسلم اکثریت ہے اگر کمپنوں کے باسی خود وہاں کے وفادار ہو کر حقوق مانگیں، ضد چھوڑیں تو قومی دھارے میں شامل ہو کر مصلحت کے ساتھ قوت جمع کر سکتے ہیں۔ لیکن جن کی وجہ سے وہ کمپنوں میں محصور ہوئے کیا ان کا کوئی فرض نہیں؟ اختر بلوچ نے منی نہیں گیتا قدرے اختصار کے ساتھ لکھی۔ اوپر والا اس لڑکی کو ممبر سکون دے، اچھا راستہ نکالے پڑھ کر خوشی ہوئی کہ وہ محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ کچھ عرصہ قبل میری ایڈھی صاحب سے ملاقات ہوئی ان کی شخصیت کا اثر اور دفتر کا ماحول ہی کچھ اور ہے۔ صائمہ اقبال جو کہانی خوب صورتی سے بنتی ہیں مختصر شخصی خاکوں میں بھی کمال کر رہی ہیں۔ تمبر کی تحریر کو شمارے کا عطر اور معلومات کا جہان قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ انسان عجب مخلوق ہے کبھی درندے کو گولی مار کر آدم خور بناتا ہے اور کبھی خود آدم خور بن کر ساتھیوں کو کھاتا ہے۔ انجم ساحلی اچھا ماحول بناتے ہیں لیکن اس ماہ کے شکاری صاحب کچھ ست اور نا تجربہ کار سے لگے۔ تاریخ عالم میں منظر امام نے دلچسپی برقرار رکھتے ہوئے معلومات پہنچانے کی روایت باقی رکھی۔ فطری طور پر تذکرہ زیادہ پسند آیا۔ ویدانیت کے بارے میں مزید کچھ لکھیں تو نوازش ہوگی۔ آغاز سے انجام تک کیلاش کہانی نے اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ میں بھی اسی پہاڑی ماحول میں سانس لیتے ہوئے صبح کی خوشبو محسوس کر رہا تھا۔ ویل ڈن سلٹی اعوان۔ مولا جٹ اس جیسی دوسری کلاسک فلموں اور فنکاروں کا تذکرہ دلچسپی کا باعث ہے تاہم انور فرہاد اچھے قلم کار ہیں۔ عظیم صاحب کے طرز تحریر کے توجی ہم قائل ہو گئے۔ دلکش انداز ہے قاری کو ساتھ لے کر چل رہے ہیں۔ قمر علی عباسی کا رنگ جھلکتا ہے۔ کبھی الطاف شیخ کبھی آفاقی اور اب یہ صاحب۔ غرض یہ کہ سرگزشت میں میلہ لگا رہتا ہے۔ سراسر میری نالائقی ہے کہ ذرہ حیدر آبادی جیسے جید عالم ادب کا یہ پہلا تذکرہ پارہ میری نظر سے گزرا۔ (حالانکہ پہلے بھی ان کے مضامین چھپ چکے ہیں) شاعری کا شوق میرے دل میں بڑا پرانا ہے اور خاص کر ایسے مجموعہ پسند ہیں جن میں اس قسم کے کلاسک کو جمع کیا گیا ہے۔ یہ سلسلہ ادبی مضامین جاری رہے تو اگر انقدر سرمایہ ہوگا۔

☆ بشری افضل بہاولپور سے لکھتی ہیں۔ "30 اگست کو سرگزشت ملا ناٹیکل پردہ صنف نازک بہت پریشان ہے۔ یہ جنگل میں صنف مخالف طے جا رہے تھے۔ کارنر پر عظیم ہستی براجمان یہ تمام نظارے دیکھتے رہے۔ جنگل کی باتیں اور "ہمارا ہیرو" ہیرو کی عظمت کو سلام کیا۔ منظر علی خان کو "مہر خیال" میں کرسی صدارت پر براجمان پایا۔ حاجی بدرالدین کو خدا جنت الفردوس میں جگہ دے اور ان کے گھر والوں کو مہر عطا فرمائے۔ آمین۔ رانا حبیب الرحمن کے تبصرے نے ہنسنا ہنسا کر پیٹ میں تل ڈال دیے۔ بہت اچھا لکھا ہے۔ ہماری محفل کے ساتھیوں کی یہی خصوصیت ہے کہ روٹوں کو ہنسا دیتے ہیں۔ ہمارا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا تبصرہ پڑھ کر تازہ دم ہو گئے۔ "عجب دستور" بے چاری سعید کے ساتھ واقعی زیادتی ہوئی اس کے بیرون ملک نہ جانے کے فیصلے کو سراہا جانا چاہیے۔ دراصل بہن بھائی کی سعید سے ہی گھریا ہر کے سارے کام کرواتے۔ سعید نے بالکل درست اور صحیح فیصلہ کیا۔ "ذمہ دار کون" میں الف ف کو زیادہ میڈیا نے تباہ کیا تھا اگر ٹیک انسان جس نے بیٹی کی خاطر اپنا گھریا چھوڑا اور الف ف اکیلا رہ گیا تعلیم مکمل کر کے بھی اس کے شعور نے اسے نہ چھینچا۔ اگر کسی سے مشورہ کر لیتا تو کبھی ایسا قدم نہ اٹھاتا۔ میڈیا ہی اس کی تباہی کا ذمہ دار ہے۔ "ست رنگی دنیا" ارشد کا اگر انعام نکل آیا تو اس کو تو کرسی نہیں چھوڑنی چاہیے تھی۔ اس نے بہت غلط کیا مجھے بہت افسوس ہوا اتنی بڑی رقم بغیر پلاننگ کے ضائع کر دی جہاں سے چلا تھا وہیں پہنچ گیا۔ لوگوں کے لیے نصیحت کا پہلو نمایاں تھا۔ انکشافاتی پارے اچھے تھے۔"

☆ سدرہ بانو ناگوری کا اظہار یہ کراچی سے۔ "ادارہ بڑھا، بھارت کے سرکاری اسکولوں کا ذکر خیر تھا بھارت، ہمارا لاکھ دشمن سہی مگر اس کا یہ عمل قابل تعریف ہے۔ اسکول ہمارے ملک میں بھی ہیں۔ طلبہ بھی ہیں مگر تعلیم کا معیار بالکل بھی اچھا نہیں ہے۔ ایوان میں بیٹھے لوگوں کو اس سے کوئی غرض نہیں سوان سے کیا امید رکھتی۔ بڑے بڑے دعوے ضرور ہوتے ہیں مگر بات پھر وہیں پہ آجاتی ہے کہ دکھاتے رہتے ہیں سب روشنی کے خواب مگر چراغ بن کے اندھیروں میں چلنے والا کوئی نہیں۔ "مہر خیال" میں منظر علی خان پہلے نمبر پر نظر آئے خالد محمود کا تبصرہ شکایتوں سے بھرا بڑا تھا۔ نجی رحمان صاحبہ نے بڑی دور سے یاد کیا، بہت شکریہ۔ جی عزیز مئے کی طرح ہم بھی "سلور جوئی نمبر" کے منتظر ہیں دیکھتے ہیں کہ انتظار کی گھڑیاں کب ختم ہوتی ہیں۔ ظہیر احمد تبسم اور رانا حبیب نے ایک ہی بات لکھی کہ سدرہ بانو، طاہرہ گلزار سے لڑ رہی تھی تو بھائیوں پلیز تبصروں کو غور سے پڑھا کریں۔ میرا مقصد لڑائی نہیں تھا۔ طاہرہ آ پا بڑی ہیں، ہم سب کے لیے محترم ہیں ہاں کبھی اگر بڑے غلط نہیں کا شکار ہو جائیں تو چھوٹے ان کی رہنمائی کر دیا کرتے ہیں۔ امید ہے آپا سنا نہیں کریں گی۔ ڈاکٹر صاحب نے احسن مار ہروی کی شاعری سے سجا کر "احسن الکلام" کا زندگی نامہ لکھا۔ اور بہت خوب لکھا۔ "ابن کبیر" کی خدمت گار بھی خوب رہی۔ بنگلہ دیش جیسا ملک جہاں سہولتوں کا فقدان ہو جہاں بھوک اور غربت نے ڈیرے ڈال رکھے ہوں وہاں ایک امریکی اور خاص طور پر ایک مسلمان کا جذبہ ہمدردی قابل ستائش ہے۔ وہاں کے غریب لوگوں کے لیے وہ ایک ایسے چراغ کی مانند ہے جس کی روشنی نے ان کے گھروں میں اجالا بکھیر دیا ہے۔ تمبر کی شخصیات میں صائمہ اقبال شاید فاطمہ ثریا بجیا کا ذکر کرنا بھول گئیں ہیں۔ ان کی تاریخ پیدائش بھی تمبر کی ہے۔ 85 بہاریں دیکھ چکی ہیں اور آج کل کافی بیمار بھی ہیں خدا ان کو جلد صحت یاب کرے، آمین۔ سفر امریکا کا دوسرا حصہ بھی شاندار رہا۔ "منی نہیں گیتا" اس خبر کو اخبار میں پڑھ چکے ہیں مگر یہ انکشاف نیا ہے کہ بجز بھائی جان اس لڑکی پر بنائی گئی ہے۔ یہ فلم تو دولت اور شہرت کے لیے بنائی گئی ہے کیا ایسا بجز بھائی ہوگا جو بغیر دولت اور شہرت کے اس لڑکی کو اس کے اپنوں سے ملا سکے کیوں کہ یہاں تو اچھا نہیں بھی صرف فلموں تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ "مولا جٹ" کے پوسٹر ہم بھی ایک دو جگہوں پر دیکھ چکے ہیں لیکن انور فرہاد نے فلمی دنیا کی اس اہم شخصیت سے متعارف کروایا، اچھا لگا۔ "تاریخ عالم" کے حوالے سے منظر امام کی معلومات زبردست رہیں۔ "ساہیوال" کو خدا سلامت

رکھے۔ ”سراب“ کی سرایاں بھی جاری ہیں۔ ”عجب دستور“ اچھی نہیں لگی۔ سعد یہ صاحب کے اپنے بہن بھائیوں اور ماں باپ کے شکوؤں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آیا۔ The end بھی کچھ خاص نہیں ہوا وہ پہلے بھی تنہا تھی اور آخر میں بھی تنہا ہی لگی کے گلے بھی تھے۔ ”سلائی“ پڑھ کر آنکھیں نم ہو گئیں۔ نوٹسین کی حرکتوں نے اس کا ہنستا ہنستا گھرا جاڑ دیا اس کا جو انجام ہوا شاید ماں باپ کی عزتوں کو روندنے والی لڑکیوں کو مقدر میں یہی کچھ ملا کرتا ہے۔ آخری سچ بیانی میں مجرم نے ”اقرار جرم“ کر لیا مگر دولت اور پیسے کی ہوس میں ظفر بے چارہ مفت میں مارا گیا۔“

☆ محمد اشفاق، سرائے عالمگیر سے آئے ہیں۔ ”ستمبر 2015ء کا سرگزشت بلا۔ سب سے پہلے ”سراب“ کی قسط پڑھی۔ مجموعی طور پر کہانی شاندار ہے اور اگر 30، 40 قسطیں اور بھی ہو جائیں تو تب بھی کوئی بات نہیں ہے۔ پھر ”عصیر خیال“ میں داخل ہوئے۔ اگست کے شمارے میں کسی ایک وکیل کا خط شائع ہوا تھا جس کا خیال تھا کہ یہ خطوط ڈائجسٹ والے خود ہی گھڑ لیتے ہیں۔ محترم معراج رسول صاحب نے جن رسالوں کو اپنا خون دے کر پروان چڑھایا ہے ان کے بارے میں اس نے ایسا لکھا اور آپ نے شائع کر دیا۔ کیا بات ہے۔ پھر اس نے ”سراب“ کے بارے میں بھی لکھا تھا۔ کہانی کو مختصر کر دیا۔ جملہ اس نے بھی لکھا تھا اور اس ماہ خرم علی راؤ جو پرانے قاری ہونے کے دعویدار ہیں اس نے بھی ایسا ہی لکھا۔ میرا دعویٰ ہے کہ یہ خرم علی راؤ بالکل پرانا قاری نہیں ہے۔ 1985ء سے تو میں بھی سارے پرچے پڑھ رہا ہوں۔ میں نے تو اس کا خط کبھی نہیں پڑھا۔ ”بازی گر“ اچھی تحریر ہے۔ لیکن دیوتا، موت کے سوداگر، شکاری اور تاون جیسی کہانیاں کیا اس سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں۔ آئندہ خرم علی راؤ کی ای میل نہ ہی شامل کریں تو اچھا ہوگا (ہم ہر قاری کی رائے کا احترام کرتے ہیں۔ کیوں کہ ہر ایک کی سوچ جدا ہوتی ہے)۔ پھر سعدیہ کی سچ بیانی پڑھی۔ پچھلے ماہ فیصل کی کہانی پڑھی تھی جس کی ماں اور بہن بھائی نے اس کی زندگی تباہ کر دی تھی۔ اس ماہ سعدیہ کی سچ بیانی پڑھی۔ میری اپنی سچ بیانی بھی بالکل ایسی ہی ہے۔ میرے بھی ماں باپ اور بہن بھائیوں نے مجھے بالکل اسی طرح تباہ کرنا چاہا تھا۔ کل سے میں سوچ رہا تھا کہ مجھے سعدیہ کی مدد کرنی چاہیے۔ میں اپنا ہائل نمبر لکھ دیتا کہ وہ مجھ سے رابطہ کرے لیکن ایک بات کا ڈر لگتا ہے کہ جب آپ کسی عورت کی مدد کرتے ہیں تو جب اس کے حالات ٹھیک ہو جاتے ہیں تو اس کو پھر اپنے بہن بھائی یاد آ جاتے ہیں اور مدد کرنے والے کو دہر دینے سے باز نہیں آتی۔ پھر بھی میں سوچوں گا۔“

☆ فلک شیر شاہ گڑھ رحیم یار خان سے لکھتے ہیں۔ ”ماہ ستمبر کا سرگزشت پڑھ کر کچھ پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ ”مولا جٹ“ پڑھتے پڑھتے یوں لگا جیسے سینما میں بیٹھ کر فلم دیکھ رہے ہیں۔ سلطان راہی کی موت کا زخم پھر سے ہرا ہوا گیا۔ نالوں نے ایسے ہیرو کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا جو ہر فلم میں حق اور سچ کا ساتھ دیتا تھا۔ ماشاء اللہ اس دفعہ کافی معلوماتی لٹریچر پڑھنے کو ملا۔ احسن الکلام، ستمبر کی شخصیات، تاریخ عالم، کیلاشی کہانی، سفر امریکا اور ساہیوال۔ سب اچھے موضوع تھے۔ تحریروں میں ”عجب دستور“ اچھی تھی۔ بڑے بھائیوں کا بھی فرض بنتا ہے کہ چھوٹے بہن بھائیوں اور ماں باپ کا خیال رکھیں۔ ”ڈسٹار کون“ ایک سبق آموز تحریر، جس نے جس جھٹک کو بے نقاب کیا۔ ”ست رنگی“ بھی سبق ہے کہ حصول مندی میں برکت ہے اور شارٹ کٹ راستے سے جو دولت کمائی جائے تو برکت نہیں رہتی اور نہ ہی کار خیر میں لگائی جاسکتی ہے۔ ”قسمت کا کھیل“ اچھی سچ بیانی تھی۔ اللہ کی رضا پر قائم رہنا ہی زندگی کی کامیابی کی دلیل ہے۔ ”روایتوں کے اسیر“ ہلکی پھلکی اچھی تحریر تھی۔ کاوش تو اچھی کی گئی تھی۔ بس گزارہ کر گئی۔ ”کاش“ بھی پسند آئی۔ کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ ”گلی“ اور ”سلائی“ اچھے انداز میں لکھی گئیں۔ سلائی اور اقرار جرم دونوں سچ بیانیوں کا مرکزی خیال تو زبردست تھا مگر رائٹرز کچھ انارڈی انارڈی لگے۔ میری فیملی میں چاروں ڈائجسٹ بڑی مقبولیت کے حامل ہیں۔ پورا مہینا سکون سے پڑھتے پڑھتے گزر جاتا ہے۔ کپوڑنگ، پرنٹنگ کسی رسالے کی کامیابی کی ضمانت بھی جاتی ہے، جس کے لیے آپ کا ادارہ خراج تحسین کا مستحق ہے۔ آپ کو خصوصی مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ میری مسز اور بیٹی نے ذیشان کی شادی کی تصویروں میں سے آپ کی تصویر کو سب سے بیسٹ قرار دیا، پانچویں میں میری بیوی نے تمبر بھی لکھا ہے۔ پھر انسان کی خوب صورتی کا راز اس کی خوب سیرتی میں ہے۔ دو پنا عورت کی عزت ہے۔ ادارے کی سربراہ ہونے کی حیثیت سے آپ نے اسلامی روایت کو برقرار رکھا۔ معراج رسول صاحب اور ان کی فیملی کو ہم پہلے ہی عزت کی نگاہ سے دیکھتے آئے ہیں۔ اب اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ تعریف نہیں ہمارے دل کی آواز ہے جو آپ تک پہنچا رہے ہیں۔ مجھے کچھ کہانیاں وغیرہ لکھنے کا شوق ہے۔ ایک دفعہ آپ نے لکھا تھا کہ بس لکھتے رہیں اور بھیجے رہیں۔ انشاء اللہ کوشش جاری رکھوں گا۔ جب تک ہے جاں جب تک ہے جہاں۔ وہ کیا ہے کہ بقول شاعر ایک عرض تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے۔ کبھی تو بورڈ کو ہماری کوئی تحریر پسند آئی جائے گی۔ ”ہوا کے دوش پر“ کے بعد ”اندھی محبت“ بھی ہے۔ اسی امید کے ساتھ کہ شاید ہمارا نام بھی مصنفوں میں آجائے۔“

☆ منشی محمد عزیز مٹے نے لندن و ہاڑی سے لکھا ہے۔ ”ستمبر کا سرگزشت 29 اگست کو ہاتھ لگا۔ سرورق پر ایک حسینہ ادا اس اور گم سم سی نظر آ رہی تھی۔ دوسری طرف ایک صاحب اپنے کتے کے ہمراہ چال قدمی کرتے نظر آئے۔ ادارے تک پہنچے۔ آہ! غیر مسلموں نے ہماری ساری روایات اپنائی ہیں اور ہم اتنے بد نصیب اور بے حس ہو چکے ہیں کہ سب کچھ جاگتی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود بھی ان اچھی باتوں پر عمل پیرا ہونے کی ذرہ برابر کوشش نہیں کرتے۔ تعلیم آج کل ایک بزنس بن چکی ہے اور بس۔ یک سخی داستان میں ”ہمارا ہیرو“ کے اس ایک فقرے نے مجھ کو ڈالا کہ یہ ملک ہمارا بھی ہے ایک دن اس پر قربان ہو جاؤں گا۔ ”عصیر خیال“ کی صدارت منظر علی خان کے نام تھی۔ مبارک باد۔ خرم علی راؤ

"سراب" سے الہجہ لکتے ہیں۔ شکر یہ مجید احمد جانی کہ آپ نے یاد کیا۔ ساگرہ کی مبارک باد۔ اللہ آپ کے غم، خوشیوں میں بدل دے، آمین۔ خالد محمود کی کم از کم ایک تجویز صد فیصد قابل عمل ہے کہ ہمارے تاریخی ہیروز کے بارے میں نئی نسل کو آگاہ ہونا چاہیے۔ سدرہ بانو! آپ نے شاید ایسی ماں نہ دیکھی ہو جو کہ اپنے نفسانی تعلقات کی خاطر اپنے بچوں کا گلا دبا دیتی ہے لیکن ادھر ایسی ماں بھی موجود ہے۔ بس اللہ تعالیٰ مساف فرمائے۔ میرے خط نے پچھلے دو ماہ کی غیر حاضری کی ساری کسر نکال دی۔ بہت شکر یہ آپ کا۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی! آپ کی بیگم کی وفات پر تعزیت نامہ بھیجا تھا جو شائع نہ ہو سکا۔ اللہ تعالیٰ انہیں عریق رحمت کرے اور آپ کو صبر عطا فرمائے۔ دیا ریغیر سے محی رحمان صاحب کی آمد اچھی لگی۔ شاہد جہانگیر، اعجاز سٹار، وحید ریاست، بھٹی، احمد خان توحیدی، محمد سلیم قیصر، رضا محمد سجاد وغیرہ غیر حاضر تھے۔ مجید احمد جانی، سدرہ بانو ناگوری، آفتاب احمد نصیر اشرفی اور محی رحمان کے خطوط بھر پور تھے۔ "احسن الکلام" ڈاکٹر صاحب کا ایک اور شاہکار تھا لیکن صفحہ نمبر باون پر داغ کے مشہور شعر میں غائب غلطی تھی۔ باون صفحہ پر شعریوں ہے۔ اردو ہے جس کا نام، ہی جانتے ہیں داغ ہندوستان میں دھوم ہماری زبان کی ہے اور 149 صفحہ پر پہلے مصرع میں سے لفظ "کا" غائب تھا (اکثر حضرات ہماری کو ہمارے پڑھتے ہیں۔ 149 پر کس مصرع میں لفظ کا غائب ہے۔ دوبارہ چیک کیا مگر نظر نہیں آیا؟) دیگر کہانیوں کے بارے میں مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ کس کو ٹاپ پر رکھیں اور کس کو دوسرے نمبر پر رکھیں۔ بہر کیف محترم ابن کبیر کی خدمت گار اس ماہ کی بہترین تحریر تھی۔ ستوٹ ڈھا کا اور بہاریوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کے متعلق زیادہ سے زیادہ لکھا کریں۔ شاید کسی بے حس کے دل پر کوئی مثبت اثر ڈال دے۔ کاش ہمارے حکمران، بے چارے ان سچے پاکستانیوں کے بارے میں بھی کوئی اقدام اٹھائے۔ انوار اللہ خان کا جذبہ قابل تعریف ہے۔ "مٹی نہیں گیتا" کی مختصر داستان نے بہت شہرت کم کر دیا۔ نام نہاد جمہوریت پسند بھارت کے منہ پر لٹا نچھتی یہ تحریر۔ تمہیر کی شخصیات اس بار محترمہ صائمہ اقبال کے قلم سے۔ بہت ہی مزے دار اور بھر پور مضمون تھا۔ "آدم خور" کے لیے انجم فاروق سے معذرت کہ پڑھی نہیں۔ "تاریخ عالم" کی سیر بڑے مزے سے کرتے ہیں اور داد دیتے ہیں جناب منظر امام کی تحقیق کو۔ قلم نگاری میں اس مرتبہ مشہور زمانہ قلم مولا جٹ کا۔ "کلی" کی تذکرہ تھا۔ شاعر کوئی اور ہے میں محترم ذرہ حیدر آبادی نے بہت سے مشہور اشعار کے اصل شاعروں کے بارے میں بتایا۔ ساہیوال ہمارا ہمسایہ ضلع بریالڑا رہی نے مختصر سا بھر پور مضمون لکھا۔ خصوصاً ہڑپہ تہذیب کے بارے میں۔ جب دستور سرورق کی پہلی کہانی بہت اداس کر گئی۔ بہت ہی دلگہی کہانی ہے۔ سعدیہ کی انشائیں کوئی تخلص سا تھی ملا دے۔ "ذبتہ دار کون" میں الف مجھے تو نفسیاتی مریض لگ رہا تھا۔ "ست رنگی" دنیا میں راشد ایک کروڑ روپے کا انعام پا کر بھی تہی دست رہا۔ اسے بد نصیبی کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے۔ "قسمت کا کھیل" بھی ایک سبق آموز کہانی ہے۔ جس کا انجام اداس کر گیا۔ گلناز کی بد نصیبی کے مجرم اس کے اپنے رشتے دار بھی تھے۔ "تلائی" میں لوہین نے اپنی خطا کی تلافی صحیح معنوں میں کر دی۔ اقرار جرم جیسا کہ نام سے ظاہر ہے جرم دہرا کے موضوع پر تھی۔ جس کے آخر تک اصل قائل کا ہاتھ نہیں چلا۔ احمد نواز یقیناً جالاک مجرم تھا لیکن بالآخر پکڑا ہی گیا۔"

☆ رضا احمد خان نے دریا خان بھکر سے لکھا ہے۔ "ماہنامہ سرگزشت سے تعلق کافی پرانا ہے اور یہ میرے زیر مطالعہ رہتا ہے۔ قیصر خان صاحب نے یاد کیا تو نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے حاضر ہونا پڑا۔ دراصل والدہ محترمہ فوت ہو گئیں تو مجھے کسی چیز کا ہوش نہ رہا اور پورا سال شدید صدمے میں رہا۔ والدہ سے محرومی کا دکھ کیا ہوتا ہے۔ یہ ان کو پتا ہوتا ہے جو اس سانحے سے گزر چکے ہوں۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوا کہ میں چھاؤں میں بیٹھا تھا اور اچانک دھوپ میں آ گیا۔ خونی رشتوں نے رویے بدلے اور بہن بھائی اپنے نہ رہے تو پہلی دفعہ سمجھ آئی کہ کوئی کسی کا نہیں۔ میں اب اپنوں کے ہوتے ہوئے بھی باہر کے کھانے کھانے پر مجبور ہوں۔ منگنی ہوئی تھی۔ اپنوں کی سازشوں کی وجہ سے ٹوٹی تو اتنا دل برداشت ہوا کہ دوبارہ گھر نہ بسانے کی قسم کھالی۔ اب کوئی میرا پرسان حال نہیں۔ کچھ لوگ بد نصیبیاں اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ میں بھی ان بد نصیب افراد میں شامل ہوں۔ میری والدہ کے لیے ضرور دعا کریں کہ اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور مجھے سکون نصیب ہو۔"

☆ خرم علی راؤ کی تنقید۔ "مقابلوں کے لیے کوہن سبجے لگا تو سوچا کہ ایک خط بھی تحریر کر دیا جائے۔ چند دریافت طلب امور یہ ہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد کے مضمون میں اردو والے شعر میں ہے کہ "ہندوستان میں دھوم ہماری زبان کی ہے" جب کہ ذرہ صاحب کے تحقیقی مضمون میں جلی حروف میں ہے کہ "ساری جہاں میں دھوم....." میں نے بھی اسی طرح سنا اور پڑھا ہے جیسے کہ ذرہ صاحب والے مضمون میں ہے۔ درست آپ بتادیں (صحیح ہندوستان میں دھوم ہے)۔ "مٹی نہیں گیتا" نامی مضمون دوسری سطر میں لکھا ہے۔ "کھویا سے کھویا چھلتا" ہم نے تو کھوے سے کھوا چھلنا پڑھا اور لکھا ہے (درست کھوئے سے کھوا چھلتا ہے)۔"

☆ مجید احمد جانی کی ملتان سے آمد۔ "ہمارا ہیروز میرون لیزلی ملکوٹ ہے۔ ہماری تاریخ ایسے ہیروز سے بھری پڑی ہیں جنہوں نے اپنی بہادری جرأت سے پاکستان کا نام روشن کیا۔" "عظیم خیال" میں منظر علی خان صدارت کی کرسی پر براجمان تھے۔ خالد محمود گھوڑے شکایات کے انبار لگا رہے تھے۔ ارے بھائی ملتان کی سر زمین زرخیز ہے۔ مہمان نوازی، محبتوں میں یہ خطہ مشہور ہے اور آپ جلے کٹے بیٹھے ہیں۔ فلک شیر ملک وقت سے پہلے کوئی بھی نہیں جانتا۔ موت کا وقت مقرر ہوتا ہے۔ سدرہ بانو ناگوری، منشی محمد عزیز مئے، محمد احمد رضا انصاری، ظہیر احمد تبسم، آفتاب احمد نصیر، رانا محمد شاہد، مٹھارا احمد، محی رحمن کے تبصرے جاندار تھے۔ منشی محمد عزیز مئے، محمد احمد رضا انصاری، بشری افضل، رانا حبیب الرحمن،

مجی رحمن آپ نے بندہ ناچیز کو یاد رکھا، بہت شکریہ۔ طاہرہ گلزار، ایم سلیم قیصر غیر حاضر تھے۔ حاجی بدرالدین صاحب کو اللہ تعالیٰ جو ارحمت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ ”عجب دستور“ سرورق کی کہانی لکھ لکھ رلائی رہی۔ آخری فقرہ بہت زبردست تھا۔ ”ذمہ دار کون“ عورت کے قرب کا ستلاشی اپنے جرم کی سزا کاٹ رہا ہے۔ مجھے تو نفسیاتی مریض لگتا ہے۔ ”ست رنگی دنیا“ راشد کے ساتھ براہوا۔ کہتے ہیں دولت جو اپنے ہاتھ سے کمائی جائے وہی اچھی ہوتی ہے۔ ”روایتوں کے تم“ شاہ زیب معذور تھا لیکن درندگی کی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ قدرت نے اس کا انجام ٹھیک ہی لکھا۔ کالی کوٹھڑی میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا۔ شاہ زیب جیسے درندے ہر گلی محلے میں دمناتے پھرتے ہیں۔ دولت، ان کو پناہ دے رہی ہے۔ ”گلی“ کہانی کو جلد ختم کیا گیا ہے اگر تفصیلی پیش کیا جاتا تو چاشنی بڑھ جاتی۔ قسمت کا کھیل، سلائی، کاش، اقرار جرم زبردست رہیں۔ ”سراب“ پڑھی نہیں۔ ”ساہیوال“ کی سیر خوب رہی۔ اگر ہم ملتان کے حوالے سے تحریر بھیجیں تو شائع کریں گے؟ (ملتان پر قرۃ العین نے نب کی بہت عمدہ تحریر چھپ چکی ہے ”مولتان سے ملتان تک“۔) ”ستمبر کی شخصیات“ خوب رہی۔ ”مولا جٹ“ واقعی زبردست قلم تھی۔ سیم فضل کے ساتھ براہوا۔ فلسازوں، موسیقاروں کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ ”شاعر کوئی اور ہے“ کمال تحریر تھی۔ ”تاریخ عالم“ منظر امام، آدم خور، مٹی نہیں گیتا، خدمت گار شاعر رہی۔ ”کیلاش کہانی“ نے اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ احسن الکلام داغ دہلوی کے شاگرد کا زندگی نامہ پڑھ کر مزہ آیا۔ ”حقیقی میا“ آپ جتنی ای میل کر چکا ہوں۔ سندھیجے گا اور ہاں قارئین کی دل چسپی کے لیے مقابلے کا کالم شروع کر دیں۔“

☆ ناصر حسین رند کا اظہار یہ بہاد پور سے۔ ”اس دفعہ پوری قوم نے یوم دفاع بھر پور اور جوش و خروش سے منایا کیوں کہ اس دفعہ جنگ ستمبر 1965ء سے 2015ء کا 50 واں یعنی گولڈن جوبلی تھا۔ ڈیر مجید احمد جانی، عید کار ڈوالی روایت ختم ہونے پر ہم ٹھنڈی سائیس نے کر رہ گئے، کاش یہ روایت ہمیشہ زندہ رہتی۔ سدرہ بانو ناگوری ڈیر آپ نے بالکل بجا فرمایا۔ وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ۔ بشری افضل صلب والدہ رانا محمد سجاد کی نہیں بلکہ رانا محمد شاہد کی رخصت ہوئی ہیں، اللہ تعالیٰ ہر کسی کی ماں کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں عمر خضر عطا فرمائے۔ رانا محمد شاہد ہم سرگزشت کے علاوہ بھی دیگر پرچوں میں آپ کی تحریر دیکھا کرتے ہیں۔ مجی رحمن، آف یو ایس اے یاد رکھنے کا شکر یہ قیصر خان خوش رہو۔ تم سیم قیصر اللہ تعالیٰ آپ کا اچھا وقت جلد شروع ہو، آمین۔ خالد کبیر ڈیر سال میں ایک دفعہ آتے تھے۔ وہ بھی اب عجب ہو گئے ہو۔ سال میں ایک دفعہ تو حاضری لگوا لیا کرو پلیز۔ سکیل احمد عباسی پتو عاقل میں سیلاب آیا، اپنی خیریت سے آگاہ کرو۔ جاوید احمد سرکانی درانی کہاں گم ہو گئے ہو۔ ہمارے شہر خیال کے ساتھی محمد ایاز راہی ”ساہیوال“ نامی تحریر میں حاضر تھے لیکن تحریر ذرا مختصر سی تھی اگر آئندہ سے بڑی تہذیب پر ایک جامع تحریر شائع ہو جائے تو مزہ آجائے۔ سچی کہانیوں میں ”کاش“ پسند آئی۔ یہ عجیب غریب اور نفسیاتی قسم کی تحریر تھی۔ اس جیسی قلم بھول بھلیاں انڈیا کی قلم دیکھی تھی جو کانی سسٹمز اور خوب قلم تھی۔ آپ نے سچ بیانوں میں آخری کہانی عجیب و غریب پراسرار قسم کی کہانیوں کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اس کو جاری رکھیں۔“

☆ اصغر عباس کی میاں چٹوں سے آمد۔ ”آپ کی طرف سے مضامین کا مشاہرہ وصول ہو گیا ہے۔ یہ رقم پا کر میں بہت خوش ہوں۔ سرگزشت چونکہ کئی سالوں تک زیر مطالعہ رہا۔۔۔ اس لیے اس کے تمام لکھاریوں سے بھی مانوسیت ہو گئی۔ کچھ دن پہلے کے ایک اخبار میں جناب علی سفیان آفاقی کے انتقال کا پڑھا دل اداس ہو گیا۔ سرگزشت کی ”قلمی الف لیلہ“ ذہن میں گھومنے لگی اور پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ اللہ آفاقی صاحب کو جنت میں اعلیٰ مقام پر فائز کرے۔“

☆ انجم فاروق ساحلی کالاہور سے مکتوب۔ ”آدم خور“ شائع کرنے کا بے حد شکریہ۔ جن احباب نے ”لباس“ کو سراہا ان کا بے حد مشکور ہوں۔ اس مرتبہ سرگزشت کا ٹائٹل گہرے رنگوں میں رومانویت کے پُرکشف مناظر سے حیرن کانی پرکشش اور جاذب نظر تھا۔ اس ماہ سرگزشت کو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوتے دیکھا۔ مدیر سرگزشت محنت اور لگن سے جدت اور ندرت کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ احسن الکلام میں صفحہ نمبر 40 پر درج اشعار ضرب تھے۔ شاعر کوئی اور ہے۔ بہترین علمی و ادبی کاوش ہے۔ خدمت گار انسانی جذبات کی نگہ کش کا اچھا احوال ہے۔ ”ستمبر کی شخصیات“ میں قائد اعظم، سید مودودی، اشفاق احمد، نور جہاں، سجاد ظہیر، بابا گرونا تک، حسین شہید سہروردی نے توجہ حاصل کی۔ ”تاریخ عالم“ منظر امام صاحب کی بڑی زرخیز تحریر ہے۔ اسے بڑی محنت اور لگن سے قلم بند کیا گیا ہے۔ معلومات کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ صفحہ نمبر 104 پر تہذیب اور ثقافت کے مابین فرق کی گفتگو موجود ہے۔ اس سلسلے میں (Spengler) سپننگر کے الفاظ بڑے واضح ہیں۔ ”فلسفہ زندگی انسان کو ثقافت دیتا ہے اور کلچر جن محسوس و مرئی بیکروں میں جلوہ بھرا ہوتا ہے اسے تہذیب کہتے ہیں۔ (Decline of the West) بارو پو جی کم و بیش اس خیال کا اظہار کرتا ہے۔ جب وہ لکھتا ہے کہ تہذیب لاطینی زبان کا لفظ ہے جس کے اندر اجتماعی زندگی کا تصور موجود ہے۔ اس لیے تہذیب سے مراد وہ طریق کار ہے جس کا مظاہرہ انسانی معاشرے میں ہو۔ اس کے برعکس کلچر اس طریق عمل کا نام ہے جس کا تعلق انسان کی ذات اور اس کی داخلی دنیا سے ہے۔ سفا امریکا کا دوسرا حصہ خوب ہے۔ اب بیتیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔“

تاخیر سے موصول خطوط: اصغر علی تابش، ندرت فاطمہ (لاہور)، انیس جیوانی (کراچی)، عنایت حسین امجد (پشاور)، فرقان چنگیزی (کوئٹہ)، بہیم الدین (کوری)، رام لعل اللواری (سکھر)، ناہید احمد ملک (سرگودھا)، فیصل بٹ (سیالکوٹ)۔

محسن الملک

ڈاکٹر ساجد امجد

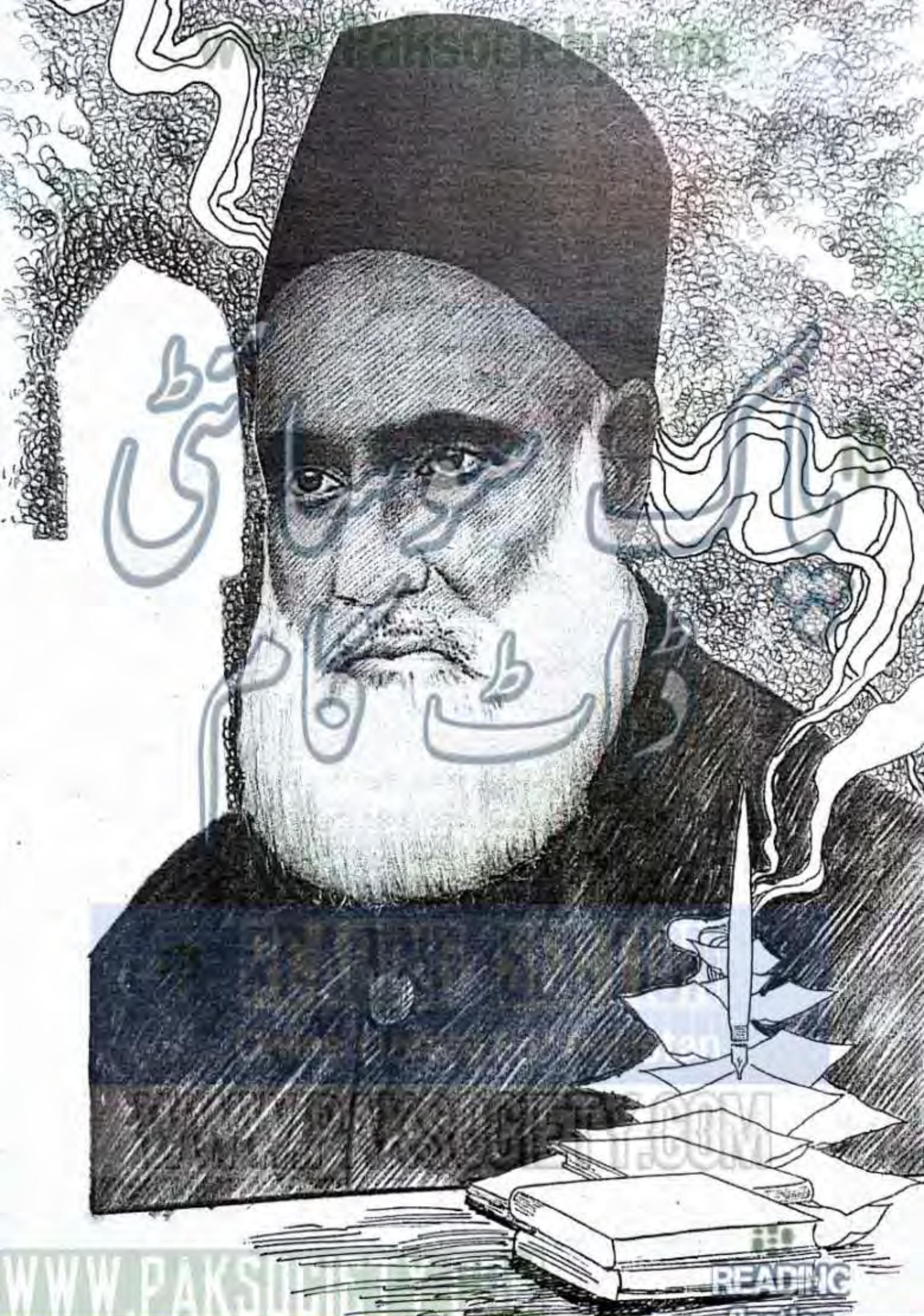
انگریزوں کی غلامی نے مسلمانانِ ہند کی سوچ کو بھی پابند سلاسل کر دیا تھا۔ وہ آج کو ہی سب کچھ سمجھنے لگے تھے، کل کی انہیں کوئی فکر نہ تھی۔ مسلمانوں کے مستقبل کی طرف بڑھتی سیلابی کو سرسید احمد خان نے محسوس کر لیا اور انہوں نے ”اقرا“ کے حکم کو برصغیر کے چپے چپے پر پھیلانے کا بیڑا اٹھایا۔ انہوں نے صاف لفظوں میں کہا، مسلمانوں کا سنہری مستقبل تبھی لوٹ سکتا ہے جب تعلیم عام ہو، اس لیے کہ زمانہ بدل چکا ہے۔ اب شمشیر و سناں نہیں قرطاس و قلم سے دنیا کو فتح کیا جاسکتا ہے۔ ان کی اس فکر کو عام کرنے میں ہر محاذ پر ساتھ دینے میں جس شخص نے اہم کردار ادا کیا، تن من دھن سے ساتھ دیا، اسی شخص کا زندگی نامہ۔ اس نے اپنا آج مسلمانانِ برصغیر کے کل کی خاطر قربان کر دیا تھا۔

متحدہ ہند میں تعلیم حاصل کرنے والے ایک خاموش سپاہی کی داستانِ حیات

دیکھو میں وقت سے پہلے بیدار بھی تو ہو گیا۔“
 ”بہت احسان ہے آپ کا۔“
 ”اپنے بیٹے کو نہیں دیکھو گے؟ یہی دیکھنے تو آیا ہوں۔“
 انہیں دیکھے بغیر ہی معلوم ہو گیا کہ بیٹا ہوا ہے اور جب دیکھا تو مزید خوشی ہوئی۔ ان کے خاندان میں جس طرح کے خوب صورت بچے پیدا ہوتے تھے یہ بھی ویسا ہی تھا۔
 ”آپ نے جو نام سوچا تھا وہی رکھیں گے یا اب کچھ اور سوچ لیا۔“
 ”سید مہدی علی سوچا تھا۔ میرے خیال میں یہی نام مناسب رہے گا۔“
 ”مولانا نے برکت دی تو میرا بچہ بڑی ترقی کرے گا۔ خاندان کا نام اس سے روشن ہو گا۔“ ماں نے کہا اور دو قطرے آنسوؤں کے آنکھوں سے نکل کر رخساروں پر آ گئے۔ یہ آنسو یقیناً خوشی کے تھے اور قبولیت کے بھی کہ یہی بچہ آگے چل کر ”محسن الملک“ کے لقب سے سرفراز ہوا۔

ابھی دن کی روشنی نے آنکھیں نہیں دکھائی تھیں۔
 نومولود نے اندھیرا ٹٹولا اور چراغ پر آنکھیں رکھ دیں۔
 قریب کھڑی عورتوں نے بچے کے بھرے بھرے جسم، چوڑی پیشانی، باریک ہونٹ اور نہایت کھلی رنگت کی طرف دیکھا۔
 کسی نے چراغ اٹھا کر قریب کر دیا۔ مبارک بادوں کے شور میں ہلکا ہلکا اجالا بیدار ہو کر آنگن میں ٹہلنے لگا۔ گھر میں چہل پہل ایسی تھی کہ میرضامن علی وقت سے پہلے ہی بیدار ہو گئے۔ اس چہل پہل کی وجہ ان کے علم سے باہر نہیں تھی۔ ان کی بیوی کی حالت رات گئے بگڑ گئی تھی لیکن وہ اپنی عادت سے مجبور تھے۔ نیند پر قابو نہیں پاسکتے تھے۔ محسن پارکر کے آنے والی آوازیں صاف بتا رہی تھیں کہ سب خیریت ہے۔ وہ یہ دیکھنے کے لیے گھر سے باہر نکلے کہ جس ذی نفس نے ان کے گھر میں پہلی سانس لی ہے وہ لڑکی ہے یا لڑکا۔ انہیں دیکھتے ہی عورتیں ادھر ادھر ہو گئیں اور وہ سیدھے بیوی کے کمرے میں پہنچ گئے۔

”آپ تو ایسے سوئے کہ پھر خبر ہی نہیں لی۔“
 ”تمہیں تو میری نیند کا حال معلوم ہی ہے لیکن یہ بھی تو



ہندوستان پر جب مسلمانوں کی حکومت ہوئی تو اسلامی حکومت کے استحکام اور تمدن کی ترویج کے لیے نامی سرداروں اور جانباز سپاہیوں کو جاگیریں عطا ہوئیں اور وہ مع اپنے قبائل کے وہیں آباد ہو گئے اور اس طور سے ان قصبات کی بنیاد پڑی جو خاص طور پر تمام شمالی ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں اور عرصہ دراز تک اسلامی شرافت اور اخوت کا ضامن سمجھے جاتے رہے۔ ان ہی قصبات میں سے ایک قصبہ ”اٹاواہ“ بھی تھا۔ یہاں ایک خاندان آباد تھا جو ”سادات بارہہ“ کی شاخ سمجھا جاتا تھا۔

ایک زمانہ تھا جب سادات بارہہ کا دور عروج تھا۔ سید عبداللہ خان اور سید حسین علی خان دونوں بھائی بادشاہ گر سمجھے جاتے تھے۔ حال یہ تھا کہ یہ دونوں بھائی جس کو چاہتے تھے پر بٹھا دیتے جس کو چاہتے اتار دیتے۔ مغل حکمرانوں کے پس پردہ یہی حکومت کر رہے تھے۔ پھر جب ان کا سورج غروب ہوا سید عبداللہ خان اور سید حسین علی خان قتل کر دیے گئے تو ان کے متعلقین ادھر ادھر پھیل گئے۔ کئی نسلیں گزر گئیں۔ ان نسلوں کو سرف یہ یاد رہ گیا کہ وہ کس خانوادے سے ہیں۔ ان کا شجرہ نسب کیا ہے۔ انہی میں وہ خاندان بھی تھا جس میں ابھی کل تازہ سید مہدی علی کا اضافہ ہوا تھا۔ یہ خاندان دنیوی جاہ و ثروت سے بہرہ اندوز تھا اور گم نامی کے ساتھ منازل ہستی طے کرنے میں مصروف تھا۔

سید مہدی علی کو باب (میرضامن علی) کی طرف سے توجہات ترکہ میں ملی تھی یعنی وہ پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن اس کے نانا مولوی محمود علی ایک مشہور عالم تھے اور اسی دولت علم کی بدولت ملازمت سرکار انگریزی میں صدر الصدوری اور دربار ٹونک میں وزارت کی کرسی پر پہنچے اور شاید یہ ان ہی کا اثر تھا کہ سید مہدی علی کی تعلیم و تربیت پر ابتداء ہی سے توجہ دی گئی۔

1837ء کے جس سال میں مہدی علی کی ولادت ہوئی مغلوں کی کمزوری عروج پر تھی۔ دہلی کے لال قلعے پر مغلوں کا پرچم لہرا ضرور رہا تھا لیکن عمل داری انگریزوں کی تھی۔ بادشاہ تو محض وظیفہ خور تھا۔ انگریزوں کا۔ انگریزوں نے ابھی اتنا تکلف ضرور کیا تھا کہ سرکاری زبان فارسی رہنے دی تھی۔ انگریزی تعلیم کی ضرورت سے اس زمانے میں کسی کے کان بھی آستانہ تھے۔ البتہ فارسی تعلیم دنیوی اور عربی تعلیم دینی ترقی کا زینہ سمجھی جاتی تھی لہذا جب مہدی علی پڑھنے کی

عمر کو پہنچا تو تحصیل فارسی و عربی میں مصروف ہو گیا۔ بہت سے بچے پڑھتے ہیں اور بہت سے خوب پڑھتے ہیں لیکن مہدی علی کی ذہانت تو قابل رشک تھی۔ حال یہ ہوا کہ چند برس نہیں گزرے تھے کہ اٹاواہ میں کوئی اسے پڑھانے والا نہیں رہا۔ وہ اٹاواہ میں موجود علما سے زیادہ عالم بن چکا تھا۔ اب اس کی تعلیم کے لیے کسی ایسے عالم کی ضرورت تھی جو اس سے زیادہ علم رکھتا ہو۔ بڑی مشکل سے ایک عالم مولوی عنایت حسین کا پتا لگایا گیا جو قصبہ مہموند میں رہتے تھے۔ سید مہدی علی کو ان کے سپرد کر دیا گیا۔ مولوی عنایت حسین کی تربیت سونے پر سہاگا ہو گئی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے مولوی سلامت اللہ کانپوری سے بھی تعلیم حاصل کی۔ ابتداء ہی سے اس کا ذہن تیز اور طبیعت شوخ تھی اس لیے ادب و شعر سے اس کو خاص مناسبت تھی اور زمانہ طالب علمی ہی میں اس کے حافظے میں برجستہ فارسی عربی اشعار کا ایک اچھا ذخیرہ جمع ہو گیا اور اولوالعزمی نے کتب بینی کی طرف مائل کیا۔ شوق تعلیم کا تقاضا تھا کہ ابھی یہ مسئلہ جاری رہے لیکن خانگی حالات کچھ اور تقاضا کر رہے تھے۔ گھر والوں کے مطابق یہی بہت تھا کہ اتنی تعلیم حاصل کر لی۔ بس اب کہیں نوکری کر لینی چاہیے۔ اسے بھی اُمید تھی کہ حصول تعلیم میں جتنی محنت کی ہے اساتذہ نے جن لفظوں میں حوصلہ افزائی کی ہے اس کے بعد تو اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ اس کا منتظر ہو گا۔ اس نے تنگ و دو شروع کر دی۔ بہت جلد اسے معلوم ہو گیا کہ کسی اعلیٰ ملازمت کے لیے قوی ذرائع اور بااثر سفارش کی ضرورت ہوتی ہے محض قابلیت کوئی نہیں دیکھتا۔

جب اٹاواہ کی سڑکوں پر گھومتے ہوئے بہت دنوں کی دھوپ سر سے گزر چکی تو کلکٹر کے دفتر کا ساٹبان میسر آ گیا۔ معلوم ہوا یہاں محرر کی جگہ خالی ہے۔ نحوہ محض دس روپے ماہانہ ہو گی۔ اسے اپنی قابلیت کے مقابلے میں یہ آمدنی کم معلوم ہوئی تھی لیکن آئندہ ترقی کی اُمید پر اس نے یہ ملازمت قبول کر لی۔

Downloaded from paksociety.com

وہ دہلی اور میرٹھ سے دور اٹاواہ میں بیٹھا تھا۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ ہواؤں کا رخ کس طرف ہے۔ آمدنی کیسا طوفان اٹھانے والی ہے۔ تبدیلی موسم کا کچھ احساس تھا تو ضرور مگر ایسا نہیں تھا۔

☆.....☆

سپاہ ہندوستان کو انگریزوں سے سنگین اور شدید اختلافات تھے۔ انہیں یقین تھا کہ انگریز انہی کے بل بوتے

پر حکومت کر رہے ہیں۔ پھر بھی انہیں خاطر میں نہیں لاتے۔ ان سپاہیوں کو اپنی ذلت تو گوارا تھی لیکن جب چربی والے کارتوس متعارف کرائے گئے تو انہیں یقین ہو گیا کہ انگریز انہیں بے دین بنانے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ ان کارتوسوں کو منہ بے چھیلنا پڑتا تھا اور ان کے متعلق یہ مشہور ہو گیا تھا کہ ان میں سورا اور گائے کی چربی استعمال کی گئی ہے۔

میرٹھ کے فوجی افسروں نے حکم دیا کہ ویسی سپاہی چربی والے کارتوس استعمال کریں۔ پچاس سپاہیوں نے یہ کارتوس استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کے خلاف فوجی قانون حرکت میں آ گیا۔ ان کا کورٹ مارشل ہوا۔ ان کی وردیاں اتار لی گئیں۔ پیروں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں۔ یہ فوجی گڑ گڑاتے رہے کہ انہیں اس طرح ذلیل و خوار نہ کیا جائے لیکن کوئی سننے والا نہیں تھا۔ انگریز فوجی افسر انہیں دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ انہیں اسی حالت میں جیل خانے لے جایا گیا۔ وہ بھی اس طرح کے بازاروں سے گزارا کیا۔ دیگر ہندوستانی سپاہی یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ وہ بے بس تھے لیکن غصہ ان کے چہرے سے عیاں تھا۔ سرکوشیوں میں باتیں کر رہے تھے کہ خدمت کا یہ صلہ ہے تو کل ہمارے ساتھ بھی نہیں ہو سکتا ہے۔

دو پہر نہیں گزری تھی کہ دیواروں پر اشتہار لگ گئے کہ انگریزوں سے لڑنے کے لیے لوگ تیار ہو جائیں۔

اگلے روز اتوار تھا۔ انگریز اپنے گرجا میں عبادت کی تیاریاں کر رہے تھے۔ شہر میں اور ارد گرد کے دیہات میں شور و شر کی علامات ظاہر ہو رہی تھیں۔ شہری مسلح ہو رہے تھے۔ آفتاب غروب ہونے کو تھا۔ پہلی جنگ کا بگل بجنے کو تھا کہ ہندوستان رجنٹ غصے سے بھری ہوئی باہر نکلی۔ جو انگریز افسر سامنے آیا مارا گیا۔ افسروں کے بنگلوں کو آگ لگا دی۔ ان کے بیوی بچوں کو قتل کر دیا۔ وہ نعرے لگا رہے تھے کہ دہلی چلو چنانچہ وہ گئے اور اپنے پیچھے اپنے افسروں کے گھروں کو خاک اور انگریزوں کی لاشوں کے سوا کچھ نہ چھوڑا۔

دہلی میں حسب دستور پکھریاں ہو رہی تھیں کہ باغیوں کی آمد کی خبر مشہور ہوئی۔ جتنی دیر میں انتظامات ہوئے ایک بلو شہر میں برپا ہو گیا۔ انگریزوں کو جن جن کو قتل کیا جا رہا تھا۔ چھاؤنی میں جتنی ویسی سپاہ تھی ایک نے بھی انگریزوں کی حمایت میں بندوق نہیں اٹھائی۔ قلعے کے عین نیچے کشن فریزر مارا گیا۔

جتنے بڑے انگریز افسران شہر میں تھے، قتل ہوئے یا فرار ہو گئے۔ سارے شہر پر باغیوں کا قبضہ تھا۔

اناوہ دور ضرور تھا لیکن ہندوستان کی زمین پر تھا۔ یہ خبریں یہاں پہنچیں تو زلزلہ آ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ زمین بھی انگریزوں کے قدموں سے خالی ہو گئی۔ سید مہدی علی کے قدیم سرپرست مسٹر ہیوم کلکٹر بھی غائب ہو گئے۔ دفتر بند ہو گیا۔ مہدی علی گھر بیٹھ گیا۔ ”لوجی، دس روپے ماہانہ کا آسرا تھا وہ بھی گیا۔ آئندہ کیا حالات ہوں گے خبر۔“

انگریزوں پر یہ بڑا سخت وقت تھا۔ زمین تنگ آسمان دور تھا۔ بڑے بڑے وفادار دوست بھی دشمن جان ہو گئے تھے۔ سید مہدی علی کے خاندان نے باوجود یہ کہ نواب فرخ آباد کے نائب ہوئے بغاوت کی آگ اناوہ میں بھی مشتعل کر دی مگر اپنی دھیمی چال پر قرار رکھی اور جادہ اطاعت سے انحراف نہ کیا۔

☆.....☆

سر سید احمد خان اس وقت اپنی اجڑتی ہوئی دلی سے دور بجنور میں صدر امین کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ بجنور ابھی تک بلوائیوں کی پہنچ سے دور تھا۔ قدر کی خبر سننے ہی انہیں دہلی میں اپنے گھر کا خیال آیا۔ کیا خبر دہلی میں اس کی ماں پر کیا گزر رہی ہوگی۔ پھر اس خیال سے دل کو تقویت بھی مل گئی کہ باغیوں کا اگر خطرہ ہوگا تو انگریزوں کو ہوگا ہندوستانیوں کو نہیں۔ انگریزوں کا خیال آتے ہی انہیں ان انگریزوں کا خیال آیا جو بجنور میں مقیم تھے۔ اگر شوریدگی بڑھی تو ان کی جانیں محفوظ نہیں رہیں گی۔ اس خیال کے آتے ہی انہوں نے ہتھیار باندھے اور مجسٹریٹ کی کوشی پر پہنچ گئے۔ انگریزوں پر اس وقت کیا گزر رہی ہے۔ اس کا اندازہ اسے اس وقت ہوا جب وہ مجسٹریٹ کی کوشی پر پہنچا۔ بجنور میں اس وقت بیس یورپین، عورتوں اور بچوں سمیت تھے اور یہ سب مجسٹریٹ کی کوشی میں جمع ہو گئے تھے۔ مارے خوف کے سب کا برا حال تھا۔ سب سے بری حالت مجسٹریٹ کی بیوی کی تھی۔

”مسٹر احمد! ہماری جانوں کو سخت خطرہ ہے۔ بلوائی لوگ ہم کو نہیں چھوڑے گا۔ ہم کو ادھر سے نکالو۔“

”میم صاحب، جب تک آپ کا یہ دوست زندہ ہے آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔“

”اوہ! تمہیںک یومائی فرینڈ۔ مگر اب ہوگا کیا آپ ان بلوائیوں کو کیسے روکیں گے۔“

”یہ آپ کے سوچنے کی بات نہیں۔ میں مجسٹریٹ صاحب کے ساتھ مل کر سب انتظام کر لوں گا۔“

سر سید احمد خان نے بجنور کی حفاظت کے لیے حکومتی کوششوں کے علاوہ اپنے طور پر بھی انتظام کیا۔ ڈپٹی مجسٹریٹ اور تحصیل دار دونوں مسلمان تھے۔ سر سید نے حفاظتی دستوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ڈپٹی مجسٹریٹ اپنے غول کو لے کر رات بھر گشت کرتے تھے اور خود تحصیل دار کے ساتھ مل کر جیل خانے اور خزانے کا گشت کرتے رہے۔

حالات پرسکون تھے لیکن ایک روز اچانک سراسیمگی پھیل گئی۔ ایک کمپنی تلگوں کی جو سہارن پور سے مراد آباد جا رہی تھی، بجنور پہنچی۔ خبر مشہور ہو گئی کہ اس کمپنی کی نیت ٹھیک نہیں بلکہ کچھ تلنگے مجسٹریٹ کی کوشی پر پہنچ بھی گئے ہیں۔ یہ خبر سنتے ہی سر سید مجسٹریٹ کی کوشی پر پہنچے۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا خبر غلط ہے ان کی جان میں جان آئی لیکن ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ اگر کسی دن واقعی ایسا ہو گیا تو کیا ہوگا۔ بجنور سے زیادہ مجسٹریٹ کی کوشی کی حفاظت کرنی چاہیے۔ انہوں نے اسی وقت کوشی کے سامنے شامیانہ لگایا اور شہر کے سربہ آوردہ مسلمانوں کے ساتھ کرسیاں ڈال کر بیٹھ گیا۔

ادھر ادھر سے شورشوں کی خبریں آرہی تھیں۔ خبر آئی کہ آزادی کے متوالوں نے مراد آباد کے جیل خانہ کو توڑ دیا اور قیدی ادھر ادھر پھیل گئے ہیں سیاسی قیدی تو حصول آزادی میں لگ گئے مگر جرائم پیشہ ڈاکے ڈالنے لگے۔ جس وقت یہ خبر آئی کہ سر سید اپنے ساتھیوں سمیت مجسٹریٹ کی کوشی پر تھے۔ تمام صاحبان نے اس اندیشے کا اظہار کیا کہ کہیں باغی یہاں کا خزانہ لوٹنے نہ آ پہنچیں۔ بالآخر یہ رائے قرار پائی کہ خزانے کو کنویں میں ڈال دیا جائے اور جب حالات پرسکون ہو جائیں تو نکال لیا جائے۔

اس وقت اس پر عمل بھی ہو گیا۔

حالات اتنے بگڑتے جا رہے تھے کہ اب لگتا تھا بجنور کو بھانا مشکل ہو جائے گا لہذا فیصلہ یہ ہوا کہ عورتوں کو اور بچوں کو یہاں سے نکال کر رڑکی پہنچا دینا چاہیے۔

عورتوں اور بچوں کو ہانسی پر سوار کرایا گیا اور سر سید اپنے ساتھ تحصیل دار کو لے کر نکلے اور کسی نہ کسی طرح میرٹھ تک پہنچ گئے لیکن اس حالت میں کہ بیروں میں چھالے پڑے ہوئے تھے۔ انہیں ہر جگہ انگریزوں کا مخبر سمجھا جا رہا تھا اس لیے بڑی مشکل سے جان بچا کر آئے تھے۔ حالت اتنی بری تھی کہ آتے ہی بیمار پڑ گئے اور ایسے کہ پانچ مہینے تک

میرٹھ سے کہیں اور جانے کے لائق نہ رہے۔

ان پانچ مہینوں میں دنیا ہی بدل گئی۔ آزادی کے متوالے پسپا ہوتے ہوتے ناکام ہو گئے تھے۔ فتح ٹکست میں بدل گئی تھی۔ انگریز دوبارہ دہلی میں داخل ہو چکے تھے اور اب دوسرے علاقوں کی شوریدگی کو دبانے کے لیے لڑائی کر رہے تھے۔

فتح مند انگریز فوج شہر میں داخل ہوئی۔ جو شخص راہ میں ملاقات کر دیا گیا۔ معززین شہر اپنی آبرو بچا کے گھروں میں پڑے رہے۔

سر سید نے ایک داتا دار ملازم کی حیثیت سے انگریزوں کی دوبارہ عمل داری کی خبر بڑی خوشی سے سنی لیکن یہ بھی سنا کہ جس وقت وہ اپنی جان خطرے میں ڈال کر انگریزوں کا دفاع کر رہے تھے۔ ان کی عورتوں کو بہ حفاظت بجنور سے نکال رہے تھے۔ دلی میں سرکاری فوج کے سپاہیوں نے ان کا گھر اور تمام اسباب لوٹ لیا۔

وہ دہلی پہنچے تو شہر کا پہچانا مشکل تھا۔ چھتیس گرجا تھیں، دیواریں بیٹھ گئی تھیں۔ وہ اس شہر خوشاں کو سکتے ہوئے اپنے گھر پہنچے۔ ان کی حویلی میں اب دیواروں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ کسی نے انہیں بتایا کہ ان کی ماں ایک ملازمہ کے ساتھ آٹھ دن ہو گئے جلو خانے کی ایک کونٹری میں بند ہیں۔ وہ دیوانہ وار کونٹری کی طرف بھاگے اور دروازہ پیٹ ڈالا۔ اندر تین عورتیں تھیں۔ ان کی والدہ، خالہ اور ملازمہ۔

”بیٹا تو یہاں کیوں آ گیا۔ ہم تو مر ہی رہے ہیں تو تو بچ جاتا۔“

”اماں بی! اب میں آ گیا ہوں آپ لوگوں کو کچھ نہیں ہوگا۔“

”کیسے کچھ نہیں ہوگا۔ یہاں کوئی کسی کو نہیں جانتا۔ میں نے بھی بہت کہا تھا میں سید احمد کی ماں ہوں لیکن انہوں نے ایک نہ سنی سب کچھ لوٹ کر لے گئے۔ ملازم پہلے ہی بھاگ گئے تھے۔“

”اس وقت کی بات اور تھی۔ میں ابھی قلعے سے آرہا ہوں۔ انگریزوں سے بات کر کے آیا ہوں۔“

وہ گھر سے نکلے کہ کسی سواری کا بندوبست ہو تو والدہ اور خالہ کو میرٹھ لے جائیں۔ جہاں انسان پیدل چلتے ہوئے ڈرتے ہوں۔ وہاں سواری کہاں۔ وہ ایک مرتبہ پھر قلعہ گئے۔ آخر حکام نے اجازت دی کہ شکر م (تیل گاڑی) جو سرکاری ڈاک میرٹھ لے جا رہی ہے وہ اس شکر م میں اپنی

جو انگریز افسران زندہ بچ گئے تھے انہوں نے اپنے اپنے عہدے سنبھال لیے۔ اٹاواہ کے کلکٹر مسٹر ہیوم بھی واپس آگئے۔ دفتر سنبھالتے ہی انہیں سید مہدی علی کی یاد آئی۔ فوراً ہرکارہ دوڑایا اور مہدی علی حاضر تھے۔ مسٹر ہیوم پہلے ہی تحقیق کر چکے تھے کہ اس نے یا اس کے خاندان نے بغاوت میں حصہ نہیں لیا ہے۔ انہوں نے خوش ہو کر اسے اپنا پیش کار بنا لیا اور صرف ڈیڑھ سال بعد ہی اسے سررشتہ داری پر ترقی دے دی گئی۔ یہ عہدہ اس وقت اہل عملے کی جان سمجھا جاتا تھا۔ لوگ اس عہدے کی آرزو لے کر لب گور پہنچ جاتے تھے اور وہ ابھی خیر سے جوان تھا۔

اس کی عادت تھی کہ پچھری کے اوقات کے بعد اور اکثر رات کو پچھری میں بیٹھ کر قانون یاد کیا کرتا تھا۔ ایک دن کلکٹر کا گزر رات کے وقت پچھری کے سامنے والی سڑک سے ہوا تو خلاف معمول پچھری میں روشنی دیکھ کر تعجب ہوا۔ کلکٹر اپنی سواری سے اتر اور جس کمرے سے روشنی آرہی تھی اس کے پیشوں سے اندر جھانکا۔ اسے پہچاننے میں ذرا دقت نہیں ہوئی۔ دیکھا کہ مہدی علی اندر بیٹھے کچھ پڑھ رہے ہیں۔ یہ تعجب اب بھی تھا کہ اس وقت کیا پڑھ رہے ہیں۔ دروازہ کھلوا کر اندر گئے۔ دیکھا کہ قانون یاد کر رہے ہیں۔ ”مسٹر مہدی، یہ تو آپ کے کام کی چیز نہیں پھر کیوں یاد کر رہے ہو۔“

”ایک تو اس لیے کہ رعایا کا فرض ہے کہ حکومتی قوانین سے واقف ہو دوسرے یہ کہ کیا خبر کب میری ترقی ہو جائے اور مجھے ان قوانین کی ضرورت پڑ جائے۔ بارش کے آثار ہوں تو ضروری تیاری کرنی پڑتی ہے۔“

”مسٹر مہدی، میں نے ایسا دور اندیش ہندوستانی آپ سے پہلے نہیں دیکھا۔ میں اعلیٰ حکام سے آپ کی سفارش کروں گا۔“

”میں آپ کا شکر گزار رہوں گا۔“

کلکٹر ہیوم نے اس کے شانے تھپ تھپائے اور وہاں سے رخصت ہو گئے۔ مہدی کو بھی اب بہت دیر ہو گئی تھی۔ اس نے بھی روشنی گل کی اور پچھری سے گھر چلا آیا۔ کچھ دن نہیں گزرے تھے کہ اسے سررشتہ داری سے تحصیل داری پر ترقی دے دی گئی۔ اس نے خود کو اس کا اہل ثابت کیا۔ عہدے پر فائز ہوتے ہی اس نے اٹاواہ کی ترقی کے لیے کام شروع کر دیے۔ اس نے بہت سی جدید سڑکیں اور سرکاری عمارتیں تعمیر کرائیں۔ شفا خانہ، ہائی اسکول،

مورتوں کو لے جاسکتے ہیں۔ وہ شکر مے لے کر گھر آئے۔ والدہ اور خالہ کو شکر مے میں بٹھایا اور میرٹھ کی طرف چل دیا۔

میرٹھ میں ان کے دوست منشی الطاف حسین تھے۔ انہوں نے ایک مکان خالی کر دیا جہاں انہوں نے دونوں خواتین کو اتارا۔

”آپ کے گھر والوں پر جو کچھ گزری اسے سن کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔“ منشی الطاف نے کہا۔

”مجھ پر تو کچھ بھی نہیں گزری۔ جو کچھ قوم پر گزری ہے مجھے تو اس پر رونا آتا ہے۔ کیسے کیسے نامی خاندان برباد ہو گئے۔“

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد سرسید نے پھر زبان کھولی۔ ”سوال تو یہ ہے کہ اب کیا ہوگا۔ مسلمان قوم جس طرح بے اعتبار ہوئی ہے اس اعتبار کو بحال کرنے میں ایک زمانہ لگ جائے گا۔ انگریز اب مسلمانوں کی بھلائی کا کیوں سوچیں گے۔ انہیں ملازمتوں پر کیوں رکھیں گے۔ ان کی تعلیم کا کیا ہوگا۔ کون ہوگا جو انگریزوں کو مسلمانوں کی وفاداری کا یقین دلائے گا۔“

اس رات وہ سونے کے لیے لیٹے تو خیال کی یہی چادر اوڑھ لی۔ مجھے مسلمانوں کی طرف سے انگریزوں کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے کام کرنا ہوگا۔ اپنی قوم کو جہالت سے دور کرنا ہوگا۔ انہیں آمادہ کرنا ہوگا کہ وہ جدید تعلیم حاصل کریں۔ انگریزوں کے ساتھ دشمنی کا نہیں مصالحت کا رشتہ رکھیں۔ انگریزوں کے ساتھ مل کر انگریزوں کی طرح ترقی کریں۔ مجھے اس کی ابتدا کرنی ہوگی۔ اس کے لیے میں ایک تحریک چلاؤں گا۔ اصلاحی تحریک، تبدیلی کی تحریک، ترقی کی تحریک۔

☆.....☆

جنگ حصول آزادی کی آندھی جس تیزی سے چلی تھی اسی تیزی سے تھم بھی گئی۔ اسی ہنگامے نے انگریزی اقتدار کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا۔ سلطنت مغلیہ کے جھلملاتے چراغ کو دفعتاً ایسا روشن کر دیا تھا کہ لگتا تھا اکبر اور تگ زیب کا زمانہ پھر لوٹ آئے گا لیکن خوش گمانوں کے یہ چراغ چند ماہ بعد ہی بجھ گئے۔ ہر جگہ انگریزوں کا تسلط دوبارہ قائم ہو گیا اور اس شان سے کہ دہلی کا لال قلعہ مغلیہ پرچم سے محروم ہو گیا اس کی جگہ حکومت برطانیہ کا پرچم لہرانے لگا۔ حالات ہر سکون ہوتے ہی دفاتر کا نظام بحال ہوا۔

تحصیل، منصفی اور کوتوالی کی شاندار عمارتوں کے علاوہ اپنے محسن مسٹر ہیوم کے نام پر ہیوم گنج کی تعمیر بھی کرائی۔ اب اٹاواہ ایک قصبے سے زیادہ خوش نما شہر نظر آ رہا تھا اور مہدی علی کی انتظامی صلاحیتوں کا منہ بولنا ثبوت تھا۔

دوسری طرف سرسید احمد خان بجنور سے ترقی پا کر صدر الصدوہ کے عہدے پر پہنچ گئے تھے ترقی پا کر مراد آباد آ گئے۔ وہ برادر اس کوشش میں تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کی طرف سے انگریزوں کا دل صاف کیا جائے لیکن کوئی صورت سمجھ میں نہ آتی تھی۔ وہ دل سے مانتے تھے کہ انگریزوں نے بغاوت کے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ ان کے نزدیک یہ ملکی بغاوت نہیں تھی بلکہ صرف سپاہیوں کی حکم عدولی تھی اور اس کے پیچھے بھی انگریز حکام کی بعض غلطیاں تھیں جو اتنی بڑھ گئیں کہ غصے میں ڈھل گئیں۔ بہت سوچ سمجھ کر انہوں نے قلم کو زبان کیا اور انگریزوں کی بدگمانیوں کے جواب سمجھنے بیٹھ گئے۔ انہوں نے نہایت تفصیل سے انگریزوں کی بدگمانیوں کے جواب لکھے اور وہ تمام الزام جو لوگوں کے خیال میں گورنمنٹ پر عائد ہوتے تھے۔ نہایت دلیری کے ساتھ تحریر کے حوالے کیے۔ اس رسالے کا نام انہوں نے ”اسباب بغاوت ہند“ رکھا اور نہایت خاموشی سے پانچ سو جلدیں چھپوا لیں۔ ان میں سے کچھ اپنے پاس رکھ کر باقی کا پارسل ولایت کروانہ کر دیا۔

یہ کتاب یا رسالہ گورنمنٹ آف انڈیا کو بھی بھیجا اور بعض انگریز حکام کے پاس بھی پہنچ گیا۔ مہدی علی نے یہ رسالہ اسباب بغاوت ہند مسٹر ہیوم کے پاس دیکھا اور ان سے پڑھنے کے لیے عاریتاً طلب کر لیا۔ وہ گھر پہنچے اور بستر پر لیٹ کر اس کی ورق گردانی میں مشغول ہو گئے۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے گئے ان کی آنکھیں کھلتی چلی گئیں۔ سرسید نے یہ مقدمہ ایسی دلیلوں سے لڑا تھا کہ وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ سادہ مگر دلنشین انداز ان کے لیے بالکل نیا تھا۔ اس وقت جیسی پر تکلف زبان استعمال کی جا رہی تھی یہ اسلوب اس سے بالکل مختلف تھا۔ رسالہ ختم ہوا تو وہ سرسید کے والد و شہدا ہو گئے۔ دل میں ایک تمنا پیدا ہوئی کہ کسی طرح اس شخص سے ملاقات کی جائے۔

انہوں نے یہ رسالہ مسٹر ہیوم کو داپس کیا تو اس کے مندرجات کا ذکر بھی نکل آیا۔ انہیں یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی تھی کہ مسٹر ہیوم سرسید کے دلائل سے متاثر نظر آ رہے تھے۔ وہ مسلمانوں کی طرف سے ان کے دل میں نرم گوشہ پیدا

ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

وہ بہت چاہتے تھے کہ سرسید احمد خان سے ملیں اور ان کی کاوشوں کی ان کے سامنے تعریف کریں لیکن ان کی دفتری مصروفیات نے انہیں موقع فراہم نہیں کیا البتہ انہوں نے اتنا کیا کہ سرسید کی تقلید مال اور فوجداری کے متعلق اردو میں نہایت اعلیٰ درجے کے چند رسائل تالیف کیے۔

وہ سرسید سے مل تو نہیں سکے لیکن ان کی سرگرمیوں پر برابر نظر رکھتے رہے۔ سرسید کا تبادلہ اب مراد آباد سے غازی پور ہو گیا۔ قوم کی بھلائی اب بھی ان کے پیش نظر تھی لیکن مسلسل تجربات نے نوعیت بدل دی تھی۔ اب انہیں پختہ یقین ہو گیا تھا کہ جب تک مسلمان وہ جدید علوم جو انگریز اپنے ساتھ لائے تھے حاصل نہیں کریں گے۔ اس وقت تک مسلمانوں کی بھلائی کی تمام تدبیریں فضول ہیں۔ مشکل یہ تھی کہ مسلمان انگریزی سے نا بلند تھے اور انگریزوں سے نفرت اتنی تھی کہ ان کی زبان سیکھنے کے روادار نہ تھے۔ اب جدید علوم کی اشاعت صرف ایک ہی صورت میں ممکن تھی کہ علمی کتابیں ایسی زبان میں ترجمہ کی جائیں جب علم کی رغبت بڑھے گی تو لوگ خود بخود انگریزی سیکھنے کی طرف مائل ہوں گے اور انگریزوں سے ربط و اتحاد بھی پیدا ہوگا۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے انہوں نے ایک سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی۔ ڈیوک آف آرگائل جو اس وقت وزیر ہند تھے۔ انہوں نے سوسائٹی کا پیٹرن بنا منظور کیا۔ ان کے علاوہ اور کئی انگریز حکام پیٹرن قرار پائے۔ بہت سے رئیس ہندو اور مسلمان اس کے ممبر بنے اور ترجمے کا آغاز ہو گیا۔

اس سوسائٹی کی شہرت مہدی علی تک بھی پہنچی۔ انہیں اور بہت سے لوگوں کی طرح اپنی زبان سے عشق تھا۔ ان کی تربیت فارسی اور عربی کے ماحول میں ہوئی تھی۔ انہوں نے گمان کیا کہ اسی طرح سرسید قوم کو انگریزی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ ان کے بارے میں بہت سی باتیں پہلے ہی سے مشہور تھیں مثلاً یہ کہ وہ انگریزوں کے مخبر ہیں یا یہ کہ وہ انگریزوں کے ساتھ کھانے کو جائز سمجھتے ہیں۔ ان کے دیگر عقائد کے بارے میں بھی طرح طرح کی باتیں مشہور ہو رہی تھیں۔

سرسید ابھی ترجمے کے مسائل سے نمٹ ہی رہے تھے کہ ان کا تبادلہ علی گڑھ ہو گیا۔ سائنٹیفک سوسائٹی کا کام ان کے بغیر چلنا ممکن نہ تھا اس لیے سوسائٹی کا تمام سامان اور اسٹاف بھی وہ علی گڑھ لے آئے۔

”افسوس کہ اسلام پر حملے ہو رہے ہیں اور مسلمانوں نے صرف سنا ہے۔“

”انگریزی داں، ہندوستان میں ہیں ہی کتنے جو اس کتاب کا اثر لیں گے۔“ کسی نے کہا۔

”آپ نے ٹھیک کہا لیکن ذرا یہ تو سوچئے اس کتاب کو پڑھنے کے بعد انگریزوں کے دلوں میں اسلام کی کیا وقعت رہ جائے گی۔“

اس بات کا کسی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ ہر شخص ایک دوسرے کا منہ تک رہا تھا۔

”آپ لوگ گواہ رہے گا۔“ سرسید کی بھاری بھرم آواز گونجی۔ ”میں اس کتاب کا جواب لکھنے کا ارادہ کر چکا ہوں۔“

لوگ سمجھ رہے تھے کہ بات آئی گئی ہوئی لیکن سرسید تو جس بات کا ارادہ کر لیتے تھے اسے پورا کر کے چھوڑتے تھے۔ انہوں نے اس دن کے بعد سے تیاریاں شروع کر دیں۔ ایک انگریزی خواں نوجوان کو ملازم رکھا جو اس کتاب کے ضروری حصے پڑھ کر سنانا تھا۔ ایک مولوی صاحب کو اس کام پر لگایا کہ وہ دور جاہلیت کے عربی شعرا کے کلام سے ایسے اشعار کا انتخاب کریں جن میں بل از اسلام کی فرسودہ رسموں کا ذکر کیا گیا ہے۔

جواب لکھنے کے لیے حوالے کی کتب کی ضرورت پڑی تو اسے معلوم ہوا جنگ آزادی میں وہ تمام نجی کتب خانے ضائع ہو چکے ہیں جہاں سے یہ کتابیں مل سکتی تھیں۔ اب ایک ہی راستہ تھا کہ ولایت کا سفر اختیار کیا جائے اور وہاں بیٹھ کر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھا جائے لیکن یہ ارادہ کتب کی تلاش سے بھی زیادہ دشوار تھا۔ ان کے پاس اتنا سرمایہ نہیں تھا کہ اس سفر کے مصارف برداشت کرتے یہ سفر اتنا آسان نہیں تھا کہ وہ اس کی دقتوں کو برداشت کرتے۔

وہ اپنی بے بسی پر ہاتھ ملتے رہے لیکن جلد ہی قدرت نے اس کا انتظام کر دیا۔ گورنمنٹ نے چند دوسرے طلبہ کے علاوہ ان کے بیٹے سید محمود کو تعلیم کی غرض سے یورپ بھیجنے کے لیے اسکا لرشپ جاری کیا۔ گورنمنٹ کی اس امداد نے سرسید کے ارادوں کو نئی زندگی بخش دی۔ انہوں نے بھی طے کر لیا کہ وہ بیٹے کے ساتھ ولایت جائیں گے۔ سفر کے اخراجات کے لیے انہوں نے اپنا کتب خانہ بیچا، کوشی کورہن رکھا کچھ قرض لیا اور رخصت کے لیے حکومت کو درخواست

انہی دنوں مہدی علی کا علی گڑھ جانا ہوا۔ وہ سرسید سے بھی ملے۔ دل میں غبار تو تھا ہی اس ملاقات میں انہوں نے مسلمانوں کی ترقی تعلیم کے بارے میں سرسید کے خیالات معلوم کیے اور ان کے ارادوں پر دھواں دھار بحث کی۔ سرسید کے بعض مذہبی عقائد بھی زیر بحث آئے۔

سرسید میں مخالف کو قائل کرنے کی زبردست قوت تھی۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ وہ مہدی علی کے ہر سوال کا جواب مدلل انداز میں دیتے رہے۔

مہدی علی کی تشفی تو ہو گئی لیکن یہ خیال دل میں پھر بھی تھا کہ اس ارادے میں سرسید کو ہرگز کامیابی نہیں ہو سکے گی لیکن جب اس سوسائٹی کے تحت چند کتابیں ترجمہ کرا کے شائع کی گئیں تو مہدی علی جیسے علم دوست کی آنکھیں کھل گئیں۔ انہوں نے ایسے شاندار خیالات کسی اور کتاب میں نہیں پڑھے تھے۔ انہیں اپنی جہالت کا شدت سے احساس ہوا۔ انہیں پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ سرسید جو کچھ کر رہے ہیں بہت مناسب ہے۔ اس میں قوم کی بھلائی اور ترقی پوشیدہ ہے۔ ایک اکیلا آدمی کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کا ہاتھ بٹانا چاہیے یہ خیال آتے ہی انہوں نے اپنی رائے سے رجوع کیا۔ سرسید کی رائے صحیح اور میرے خیالات غلط ہیں۔ جہاں تک ہو سکے گا میں سرسید کی مدد کروں گا۔ وہ ایک مرتبہ پھر سرسید سے ملے اور نتیجے میں سائنٹیفک سوسائٹی کا ممبر منتخب کر لیے گئے۔

مہدی علی نے سرسید کے مشن پر کام شروع کر دیا۔

☆.....☆

سائنٹیفک سوسائٹی کا سالانہ جلسہ تھا۔ سوسائٹی کے تمام ارکان علی گڑھ میں جمع تھے۔ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ اور مولانا حالی بھی آئے ہوئے تھے۔ سید احمد سے ان کی شناسائی نہیں تھی لیکن ان کے خیالات سے وہ متاثر ضرور ہونے لگے تھے۔ مہدی علی اب ترقی کرتے کرتے مرزا پور کے ڈپٹی کلکٹر بندوبست ہو گئے تھے۔ وہ ان اجلاسوں میں شرکت کرنے خاص طور پر علی گڑھ آئے ہوئے تھے۔

سوسائٹی کا آخری اجلاس ختم ہو چکا تھا۔ بہت سے لوگ سرسید کی کوشی پر جمع تھے۔ خوش گپیوں کا ماحول تھا کہ اچانک سرسید نے ماحول کو سنجیدہ بنا دیا۔ ”آپ حضرات کو معلوم ہے سرولیم میور کی کتاب ”لائف آف محمد“ چار جلدوں میں چھپ کر ہندوستان پہنچ چکی ہے۔“

”جی ہاں سنا تو ہم نے بھی ہے۔“

دے دی۔ یہ بتانا مناسب نہ تھا کہ وہ کس مقصد کے لیے انگلستان جانا چاہتے ہیں لہذا انہوں نے درخواست میں لکھا۔

”گورنمنٹ انگریزی کے مطالب کو استحکام بخشنے کے واسطے اس کے سوا کسی امر کی ضرورت نہیں ہے کہ اہل یورپ اور ہندوستان کے درمیان ربط ضبط کو ترقی دی جائے۔ پس اس مقصد کی تکمیل کے واسطے ہندوستانوں کو میری رائے میں یورپ کے سفر کی ترغیب دینی چاہیے تاکہ وہ مغربی ملکوں کی شائستگی کے عجیب و غریب نتیجوں اور اس کی ترقی کو بہ چشم خود مشاہدہ کر لیں۔ اسی خواہش پر میں یہ بات چاہتا ہوں کہ خود انگلستان جا کر اپنے ہم وطنوں کے لیے ایک نظیر قائم کروں۔“

انہوں نے اس دورے کی اصل غایت سے کسی کو آشنا نہ کیا۔ اس کے دوست بھی یہی سمجھ رہے تھے کہ ان کا یہ دورہ مطالعاتی دورہ ہے۔ صرف ایک سید مہدی علی تھے جسے انہوں نے اپنا رازدار بنایا۔

”میں صرف تمہیں اصل بات بتا رہا ہوں کہ میں انگلستان سرولیم میور کی کتاب کا جواب لکھنے کے لیے جا رہا ہوں۔ کسی کو اس کی ہوا نہیں لگنی چاہیے ورنہ اول تو حکومت مجھے جانے نہیں دے گی اور اگر چلا بھی گیا تو وہاں کے کتب خانے مجھ پر بند کر دیے جائیں گے۔ تم اس راز کو کسی پر ظاہر نہ کرنا۔ وہاں پہنچ کر مجھے جو ضرورت ہوگی میں تمہیں لکھوں گا۔ یہ ضرورت مالی بھی ہو سکتی ہے اور علمی بھی۔ میں کسی اور پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔“

”آپ نے مجھ پر بھروسہ کیا ہے تو میں اس پر پورا اتروں گا۔“

دونوں دوستوں نے ایک دوسرے کو خدا کے سپرد کیا۔ سرسید احمد خان ممبئی پہنچے ان کے دونوں بیٹے بھی ان کے ساتھ تھے۔ چند روز ممبئی کی سیر میں گزارے اور پھر بحری جہاز میں سوار ہو گئے۔

لندن پہنچتے ہی انہوں نے کام شروع کر دیا۔ سب سے پہلے حوالے کی کتب کی فراہمی کا مرحلہ تھا۔ انڈیا آفس کا کتب خانہ چھان مارا۔ برٹش میوزیم کی لائبریری سے بہت سی اطلاعات حاصل کیں۔ عربی کتابیں جو مصر، فرانس اور جرمنی سے شائع ہوئی تھیں، وہ منگوائیں کچھ کتابیں لندن کے بازاروں سے خریدیں۔ ایک آدمی ملازم رکھا جو انہیں لاطینی کتابوں کے ضروری حصے پڑھ کر سنا تا تھا اور وہ نوٹس

لیتے جاتے۔

وہ اس بات کی مکمل احتیاط رکھے ہوئے تھے کہ جب تک کتاب چھپ کر تیار نہ ہو جائے۔ ہندوستان میں اس تصنیف کی شہرت نہ ہونے پائے۔ وہ صرف مہدی علی کو رازدار بنا کر آئے تھے لہذا کتاب کے سلسلے میں پیش آنے والی ہر مشکل کے بارے میں انہی کو لکھتے تھے۔

”میں شب و روز تحریر کتاب سیر مصطفوی صلعم میں مصروف ہوں۔ سب کام چھوڑ دیا ہے۔ کرورد کرنے لگتی ہے۔ ادھر فکر ترتیب مضامین کتاب، ادھر فکر جواب اعتراضات۔ کسی شخص کے مددگار نہ ہونے کی صورت میں یہ کام اور بھی مشکل ہو گیا ہے۔“

”روپیا ہر روز صرف ہوتا جاتا ہے۔ کتبے کھدوائے ہیں، نقشہ جات جو استدلالات کتاب میں داخل ہوں گے بنوائے ہیں اس شخص کا بل آنے والا ہے جو انگریزی عبارت لکھتا ہے۔“

مہدی علی اس دوران تفاسیر و احادیث اور اکابر علماء کی تصنیفات سے ایسا مواد برابر بھیجتے رہے جو ”خطبات احمدیہ“ کی تالیف میں سرسید کے کام آ سکتا تھا۔

جیسے جیسے کتاب آگے بڑھتی گئی اخراجات کے جو اندازے انہوں نے لگائے تھے سب غلط ہوتے گئے۔ اندازے سے زیادہ خرچ ہونے کی توقع تھی۔ انہیں فکر ہونے لگی کہ لکھتا اور چھپوانا شروع کر دیا تو روپیا کہاں سے آئے گا۔

انہوں نے اب تک مہدی علی کو علمی کاموں کے لیے خطوط لکھے تھے کہ فلاں کتاب کا فلاں قصہ نقل کر کے بھجوادو لیکن اب مالی مدد کی ضرورت تھی۔ انہوں نے چندے کے لیے خط لکھا۔

”میری یہ رائے ہے کہ سو سو روپے احباب سے چندہ لیا جائے۔ تیس آدمی جمع ہونے چاہئیں تین ہزار سے کم خرچ نہیں ہوگا۔“

مہدی علی نے فوراً لبیک کہا۔ کچھ رقم اپنے پاس سے فراہم کی کچھ احباب سے جمع کی۔ کہیں سے کورا جواب ملا۔ بہر حال جو رقم جمع ہوئی وہ انہوں نے انگلستان روانہ کر دی۔ وہ اس طرح رقم کا بندوبست کرتے پھر رہے تھے جیسے وہ اپنے کسی مشن میں مصروف ہو۔

احباب سے جو رقم جمع ہوئی وہ اونٹ کے منہ میں زیرے کی طرح تھی۔

انہوں نے گھبرا کر پھر خط لکھا۔
 ”میری درخواست ہے کہ کسی مہاجن سے میرے لیے ہزار روپے قرض لیجئے۔ سو دا رو روپیا میں ادا کروں گا۔
 میں نے دلی بھی خط لکھا ہے کہ میری کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ ظروف حسن تک فروخت کر کے ہزار روپے بھیج دو اگر ہزار روپے مہاجن سے ہزار روپے سے آئے اور پانچ چھ سو روپے چندے میں آگئے تو کتاب بخوبی چھپ جائے گی۔“

ان خیالات اور منصوبوں کو ساتھ لے کر وہ ہندوستان واپس آگئے۔ بمبئی پہنچے اور پھر بنارس پہنچ کر اپنے عہدے کا چارج لے لیا۔ وہ اتنی جلدی میں تھے کہ بنارس پہنچنے کے دو مہینے بعد ہی انہوں نے تہذیب الاخلاق پہلا پرچہ شائع کر دیا۔

سید احمد کے نزدیک جو باتیں مسلمانوں کی دنیاوی ترقی کی مانع تھیں اور زیادہ تر مذہبی خیالات پر مبنی تھیں اس لیے ان پرچوں میں ان مذہبی عقائد پر مضامین لکھے جانے لگے جن کی موجودگی کی وجہ سے سید احمد کے بقول مسلمان ترقی نہیں کر سکتے تھے۔

اس پرچے میں سرسید کے علاوہ مولوی چراغ علی اور سید مہدی علی بڑے سرگرم مضمون نگار تھے۔ سرسید کے مضامین زیادہ تر اخلاقی اور تمدنی ہوتے تھے جب کہ مولوی چراغ علی اور مہدی علی کے مضامین مذہبی ہوا کرتے تھے۔ مہدی علی جو کچھ لکھتے اس میں ایسی لطافت ہوتی کہ لوگ پڑھتے تھے اور سردھنتے تھے۔ سرسید پر جو لوگ نکتہ چینی کرتے تھے ان کے جواب وہ ایسی ظرافت اور فصاحت سے دیتے تھے کہ سرسید کے حریف دنگ رہ جاتے تھے اور ان سے جواب نہیں بن پڑتا تھا۔ تیسرے پرچے کے بعد ہی مخالفتوں کا وہ شور اٹھا کہ کان بڑی آواز سنا کی نہ دیتی تھی لیکن سید مہدی علی مخالفتوں سے گھبرائے بغیر مضامین لکھتے رہے اور اس بے باکی سے کہ خود سرسید بھی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔
 ”مولوی مہدی علی خان کا علم اس کی ذاتی خوبیاں اس کی پیاری پیاری باتیں اس کی سچی ایمانداری اس کی فصیح تقریر اس قابل ہیں کہ اگر ہماری قوم کے دل کی آنکھیں اندھی نہ ہوتیں تو اس کے نام پر فخر کیا کرتے۔“

مخالفتوں کی آندھی ابھی چل ہی رہی تھی کہ سرسید نے ہوا کے ایک جموٹے کا مزید اضافہ کر دیا۔ وہ ان دنوں بنارس میں تھے وہیں ایک کمیٹی ”خواستگار ان ترقی تعلیم مسلمانان“ قائم کی۔ اس کمیٹی کا کام یہ تھا۔ ”جہاں تک ہو سکے یہ کمیٹی

جب کتاب مکمل ہو گئی اور وہ دیباچہ بھی لکھ چکے تو اندازہ چھاپے کی لاگت کا کیا، اس کے ہوش جاتے رہے۔ چار ہزار کا خرچ آ رہا تھا جب کہ مہدی علی نے جو رقم بھیجی وہ سولہ سو تھی۔ اس نے یہ سوچے بغیر کہ ادا کہاں سے کرے گا لندن کی ایک بینک سے تین ہزار کا قرض لے لیا اور مہدی علی کو خط لکھ دیا۔

”اگر تمام روپیا خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے۔ قیامت میں یہ تو کہہ کر پکارا جاوے گا کہ یہ ہے فقیر مسکین جو اپنے دادا محمد صلعم کے نام پر فقیر ہو کر مرا۔“

”خطبات احمدیہ“ چھپ کر بازار میں آ گئی تھی اور کتب فروشوں کی دکانوں پر رکھی ہوئی تھیں۔ اس مصروفیت سے نمٹنے کے بعد انہوں نے یہاں کی تعلیمی حالت کا مشاہدہ کرنا شروع کیا۔ کیسب سرج کو خود جا کر دیکھا۔ تعلیم نسواں پر غور کیا اور تعلیم کے مختلف طریقوں میں سے جو طریقہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کے مناسب سمجھا اس کو نگاہ میں رکھا۔ انہوں نے غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ یورپ کی تمام ترقی یہاں کی تعلیمی ترقی کی وجہ سے ہے۔ ہندوستان کے مسلمان اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتے جب تک ان کی تعلیمی ترقی نہیں ہو جاتی اور جب تک انگریزی تعلیم وہ حاصل نہیں کر لیتے۔ اس نے نہ صرف طے کر لیا کہ وہ ہندوستان جا کر تعلیمی جدوجہد میں مصروف ہو جائیں گے بلکہ مہدی علی کو لکھ بھی دیا۔

”اگر مسلمانوں کی تربیت کے لیے جداگانہ مدرسہ قائم ہو جائے تو ایک زحمت ہمارے لیے ہے۔ کوئی رات نہیں جاتی کہ ایسے مدرسے کے تقرر کی باتیں اور تجویزیں یہاں نہیں ہوتیں مگر بغیر دس لاکھ روپے نقد ہوئے ممکن نہیں ہے۔“

اس علمی و تعلیمی سیر کے دوران میں ایک کتب خانے

مہدی علی نے ڈھارس بندھائی۔

”مجھے اُمید نہیں کہ کوئی نتیجہ نکلے گا۔“

ساری رات اسی ادھیڑ بن میں گزر گئی کہ کل کے جلے کا انجام کیا ہوگا۔

دوسرے دن سید احمد نے اپنی رپورٹ کمیٹی کے سامنے پیش کی۔ ”اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ مسلمان اپنی تعلیم کی فکر خود کریں۔“ اسی رپورٹ میں انہوں نے مجوزہ کالج کی اسکیم اور طریقہ تعلیم بھی بیان کیا۔

اس کمیٹی نے چندہ جمع کرنا شروع کر دیا۔ اس کے ایک رکن مہدی علی بھی تھے۔ انہوں نے مرزا پور میں جہاں وہ ڈپٹی کلکٹر تھے ایک جلسہ عام منعقد کیا۔ اس میں نہایت زبردست تقریر کی۔ اس وقت جب کہ سرسید کو کافر، ملحد، نیچری اور جانے کیا کچھ کہا جا رہا تھا ان کے حق میں تقریر کرنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ انگریزی تعلیم کے فروغ کے لیے چندے کی اپیل کرنا بھی بڑی ہمت کی بات تھی۔ انہوں نے نہ صرف تقریر کی بلکہ ایسی زور دار تقریر کی کہ اسی جلسے میں ایک معقول رقم مہیا ہو گئی۔

گورنمنٹ نے بھی سرسید کی اس کوشش کو سراہا اور وعدہ کیا کہ اگر کمیٹی کی کوششوں سے مجوزہ کالج قائم ہو گیا تو حکومت اس مدرسے کی پوری مدد کرے گی۔

انگریز حکومت نے خطیر رقومات چندے میں دیں تو سید احمد کی ڈھارس بندھی۔

مہدی علی مرزا پور میں ڈپٹی کلکٹری کے دن کاٹ رہے تھے کہ حیدرآباد دکن کے وزیراعظم سرسالار جنگ کو اپنی ریاست کے مالی معاملات سنوارنے کے لیے کسی قابل اور ایماندار شخص کی ضرورت پیش آئی۔ ریاست میں کوئی ایسا فرد نظر نہ آتا تھا۔ انہوں نے سرسید سے مشورہ کیا۔ عرصے تک خط کتابت چلتی رہی بالآخر سرسید نے مہدی علی کا نام پیش کیا اور بہت کچھ تعریف کرنے کے بعد پُر زور سفارش کی جسے سرسالار جنگ نے منظور کر لیا۔

مہدی علی مرزا پور میں تھے کہ سرسید نے انہیں خوش خبری سنائی۔ ریاستوں کی ملازمت اور وہ بھی دکن جیسی امیر کبیر ریاست کی ملازمت اور پھر قدر دانی سے بلایا جا رہا تھا۔ انہوں نے فوراً رضامندی ظاہر کر دی لیکن وہ حکومت کے ملازم تھے۔ ریاستوں کا کچھ بھروسا نہیں کب نکال دیا جائے۔ اس نے تجویز پیش کی کہ اسے ڈپوٹیشن پر بلایا جائے یعنی وہ ملازم تو انگریز کار ہے لیکن اس کی خدمات سرسالار

اس بات کے دریافت کرنے میں کوشش کرے کہ سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں مسلمان طالب علم کس لیے کم پڑھتے ہیں۔ علوم قدیمہ اور علوم جدیدہ کیوں نہیں رواج پاتے اور جب یہ تمام مواقع ٹھیک ٹھیک دریافت ہو جائیں تو ان کے رفع کرنے کی تدابیر کرے۔

کمیٹی کا پہلا اجلاس بنارس میں منعقد ہوا۔ سید مہدی علی اس جلسے میں شرکت کے لیے بنارس گئے۔ انہوں نے اپنے تجربے کی روشنی میں کئی تجاویز کمیٹی کے سپرد کیں۔ ان تجاویز کی روشنی میں کمیٹی نے ایک اشتہار جاری کیا جس میں تمام مسلمانوں سے درخواست کی بلکہ دعوت دی کہ وہ اس مسئلے پر مضامین لکھیں۔ بہترین مضامین پر تین انعام پانچ سو، تین سو اور ڈیڑھ سو روپے دیے جائیں گے۔

مقررہ تاریخ تک اس اشتہار کے جواب میں 32 مضامین موصول ہوئے۔ ان میں ایک مضمون مہدی علی کا بھی تھا جو اصحاب مضامین کی جانچ پڑتال کے لیے مقرر کیے گئے تھے انہوں نے مہدی علی کے مضمون کو پہلے انعام کا مستحق قرار دیا لیکن مہدی علی کی خواہش سے اسے انعام کی فہرست سے خارج رکھا گیا۔

ان رسالوں کے موصول ہونے کے بعد ان خیالات کا جائزہ لیا گیا جو ان مضامین میں بیان ہوئے تھے اور یہ طے کیا گیا کہ ایک کالج قائم کیا جائے۔

اس کمیٹی کا جلسہ ہونے والا تھا جس میں کمیٹی کو اپنی رپورٹ پیش کرنی تھی۔ مہدی علی بھی آئے ہوئے تھے۔ صبح جلسہ ہونے والا تھا۔ سرسید نے ان کا پتنگ اپنے کمرے میں بچھوایا تھا۔ رات گیارہ بجے تک مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں پھر مہدی علی کی آنکھ لگ گئی۔ رات کے کوئی دو بجے ہوں گے کہ سسکیوں کی آواز سے ان کی آنکھ کھل گئی۔ کوئی رورہا تھا۔ انہوں نے سرسید کے پتنگ کی طرف دیکھا۔ پتنگ خالی تھا۔ وہ گھبرا کر کمرے سے باہر نکلے۔ دیکھا کہ سرسید ٹھپکتے جا رہے ہیں اور روتے جا رہے ہیں۔ مہدی علی بھی یہی سمجھے کہ خدا نخواستہ شاید کوئی افسوس ناک خبر آئی ہے؟

یہ سن کر وہ اور زیادہ رونے لگے۔ ”اس سے زیادہ افسوس ناک خبر اور کیا ہوگی کہ مسلمان روز بہ روز بگڑتے جا رہے ہیں اور مستقبل قریب میں ان کی بھلائی کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی ہے۔“

”خدا سب ٹھیک کر دے گا۔ کل جلسہ ہو تو رہا ہے۔“

جنگ مستعار لے لیں۔ سالار جنگ نے اس تجویز کو پسند نہیں کیا اور سرسید کو لکھ دیا۔

”ایک شخص دو آقاؤں کا ملازم نہیں ہو سکتا اگر مولوی مہدی علی کو ہماری گورنمنٹ پر اعتماد ہے تو مستعفی ہو کر آئیں۔“

اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ اگر وہ حیدرآباد جانا چاہتا ہے تو ڈپٹی کلکٹری سے استعفیٰ دے کر جائے۔ انہوں نے استعفیٰ دے دیا اور حیدرآباد چلے آئے۔ حیدرآباد میں وہ ”مجوزہ کارروائی“ کے عہدے پر فائز ہوا۔ یہ ایک جدید عہدہ تھا جو خاص اس کے لیے وضع کیا گیا تھا۔

انہوں نے اس خوبی سے کام سنبھالا کہ مقتدر حلقوں میں اپنے لیے مقام پیدا کر لیا اور صرف دو سال کے عرصے میں ان کو ”مستند مال گزاری“ بنا دیا گیا۔

اس وقت حیدرآباد کے باشندوں میں ان کے مطلوبہ معیار کا کوئی تعلیم یافتہ شخص ایسا نہیں تھا جسے وہ اپنی مدد کے لیے اپنے ساتھ ملا سکتے۔ وصول مال گزاری کے لیے انہیں بہت سے لوگوں کی ضرورت تھی جو ان کی نیابت میں پوری ریاست میں پھیل جائیں اور اراضی کی پیمائش وغیرہ کر کے ایسا نظام وضع کریں کہ رعایا کو بھی شکایت نہ ہو اور آمدنی پوری طرح خزانے میں منتقل ہو کر ریاست کی ترقی کا باعث بنے۔

سرسالار جنگ تحصیل مال گزاری کی مد میں بہت سی اصلاحات کر چکے تھے لیکن ان اصلاحات کے بعد بھی کوئی قابل انتظام نہ تھا۔ وصولی کرنے والوں اور زراعت پیشہ رعایا کے درمیان ہمیشہ کش مکش رہتی تھی۔ مہدی علی نے جب خوب اچھی طرح جائزہ لیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ کام اکیلے فرد کا نہیں۔ اس کے لیے بہت سے قابل مددگاروں کی ضرورت ہے۔ یہ وہ افراد ہوں جو مقامی نہ ہوں کیوں کہ جو افسران وصولی کے درمیان خورد برد کرتے ہیں وہ مقامی انتظامیہ سے مل جاتے ہیں۔ سب ایک دوسرے کی مدد کر رہے ہیں جس کی وجہ سے سرکاری خزانے کو بھاری نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔ انہوں نے سالار جنگ کی منظوری کے بعد مختلف مقامات سے بہت سے قابل انتخاب کو اپنے گرد جمع کر لیا۔ ان میں مولوی نذیر احمد بھی شامل تھے۔

ان افراد کی تقرری نے ایک بھونچال کھڑا کر دیا۔ ریاست کے اعلیٰ حلقوں نے اسے اپنی حق تلفی سمجھا کر ہمیں نوازنے کی بجائے باہر سے لوگ بلائے جا رہے تھے۔ شدید

تعصب اور فرقہ بندی نے نہایت خطرناک صورت حال پیدا کر دی۔ جن عہدیداروں کو منتخب کیا گیا تھا ان کے خلاف بعض بااثر افراد بلکہ جماعتوں کی طرف سے رعایا میں تعصب پیدا کیا جا رہا تھا۔ ان کے کاموں پر بے جا کٹہہ چینی ہونے لگی۔ مہدی علی تو گویا اس خرابی کی جڑ تھے۔ ان کے خلاف بے انتہا تعصب برتا جا رہا تھا۔ وہ افسردہ تھے کہ قوم کس حال کو پہنچ گئی ہے، جو ان کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرتا ہے لوگ اسی کے خلاف ہو جاتے ہیں۔

یہ آندھی اتنی شدید تھی کہ سالار جنگ کے قدم بھی لڑکھڑانے لگے۔ ان کے دل میں بھی خیال پیدا ہونے لگا کہ مہدی علی کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔

ریاست میں خوشامدیوں اور سازشیوں کی کمی نہیں تھی جو مہدی دشمنی میں ایک جگہ جمع ہو گئے تھے لیکن مہدی علی یہاں سے بھاگنے کی بجائے ایک جگہ ڈٹے ہوئے تھے۔ سرسید کی مثال ان کے سامنے تھی۔ پورا ہندوستان ان کا مخالف تھا لیکن وہ ڈٹے ہوئے تھے۔ جان لیوا مشکلات سامنے آئیں لیکن انہوں نے ہمت نہ ہاری۔ وہ بھی اس لشکر کا سپاہی تھے۔ ہار کیسے مانتے، انہوں نے سالار جنگ کو بھی حوصلہ دلایا اور کئی ملاقاتوں کے بعد انہیں اطمینان کرادیا کہ اگر استقلال سے کام ہو گا تو کامیابی یقینی ہے۔

آہستہ آہستہ وہ ان مشکلات پر غالب آ گئے۔ ان کی ان کاوشوں کی تعریف حیدرآباد کے ریزیڈنٹ نے بھی کی۔

”میں کامل ترین اعتماد رکھتا ہوں کہ آپ ہر ہائی نس نظام کی گورنمنٹ اور ان کے ملک کی رعایا کی اعلیٰ درجے کی جانثارانہ خدمات انجام دیں گے۔ ہندوستان سے جو افسر یہاں آئے ہیں ان کو جو وقتیں پیش آئی ہیں ان کا آپ نے اپنی دماغی قوت اور اصابت رائے سے استیصال کر دیا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ جب یہاں کی رعایا یہ سمجھ لے گی کہ ان کو ملک و رعایا کی بہبودی پیش نظر ہے اور یہ ایمانداری سے بے لاگ کام کرتے ہیں تو ان کی جاں فشانی کو قدر کی نگاہوں سے بھی دیکھے گی۔“

انگریزی عمل داری میں قاعدہ یہ تھا کہ انگریزوں کا ایک نمائندہ ہر ریاست میں ہوتا تھا جسے ریزیڈنٹ کہتے تھے۔ یہ ریاست کے کاموں کی نگرانی کرتا تھا اور رپورٹ حکومت کو بھیجتا تھا لہذا اسے ریاست میں خاص اہمیت حاصل ہوتی تھی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

مہدی علی نے اس خوبی سے کام سرانجام دے کے کہ حکومت انگلشیہ اس کی خدمات کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکی۔ اس کی بدولت نظام حیدرآباد کی بھی مقبولیت ہوئی اور خود مہدی علی کی کارکردگی کو بھی سراہا جانے لگا۔

وائسرائے لارڈ ڈفرن نے ریزیڈنٹ حیدرآباد کو لکھا۔ ”گورنر جنرل، اجلاس کونسل نے اس یادداشت کو دلچسپی سے ملاحظہ کیا اور مجھے اس خواہش کے ظاہر کر دینے کا ارشاد ہوا ہے کہ گورنر جنرل اس ترقی کی قدردانی کا اظہار کرتے ہیں جو ریونیو سروس میں حکومت نظام نے کی ہے اور جس سے مولوی سید مہدی علی کی کارگزاری پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔“

حیدرآباد کے ایک سابق ریزیڈنٹ اور موجودہ ایڈیشنٹ گورنر بنگال نے مہدی علی کے نام خط لکھا۔ ”اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ نے نہایت مفید کام شروع کیا اور اس کو نہایت کامیابی سے چلایا۔ بلاشبہ ایک کامیاب حکومت کے لیے یہ سنگ بنیاد ہے اور آپ کو یہ سن کر اطمینان ہوگا کہ اس لحاظ سے حیدرآباد صوبہ بنگال کے ان اضلاع سے جن میں دوامی بندوبست ہے بہتر ہے اور ہندوستان کے نہایت ترقی یافتہ اضلاع سے بہت زیادہ پیچھے نہیں ہے۔“

مہدی علی نے تھوڑے ہی عرصے میں اپنی محنت اور قابلیت سے محالفین کی زبانیں بند کر دیں۔ چمکتے ہوئے سورج سے انکار کون کر سکتا ہے۔ یہی حال اس کے کام کا تھا۔ اس نے آمدنی کو مستقل اور جائز محصولات قائم کر کے محفوظ کیا اور دوسری طرف رعایا کو حقوق دلوائے اور لگان و مال گزاری کی ایک معتدل شرح معین کی۔ لگان کی شرح اتنی منصفانہ رکھی کہ شکایت کے سب دروازے بند ہو گئے۔ مال گزاری کا تناوے فیصد حصہ وقت پر وصول ہونے لگا۔

اس نے یہ اصلاحات مال گزاری تک محدود نہیں رکھیں بلکہ اسے تہذیب و ثقافت تک پھیلا دیا۔ اس نے مولوی نذیر احمد کو دورہ کر کے معائنہ و قفارت کا حکم دیا۔ انہوں نے قفارت کا دورہ کیا اور قفارت کی حالت کے متعلق رپورٹیں پیش کیں۔

”کسی علاقے کا دفتر مرتب نہیں۔ دفتر بڑے نہیں لیکن ابتری اس قدر ہے کہ بیان نہیں ہو سکتی۔ ہر محکمہ میں عملہ کافی ہے لیکن ہر شخص کی بھی آرزو ہے کہ اور زیادہ ہوں۔“

ایک اور رپورٹ میں لکھا۔ ”اس ضلع کے دفاتر کی ابتری اس قدر ہے کہ اگر مختصر حالت میں لکھا جائے تو خود ایک دفتر ہو جائے۔ محافظ دفتر شاید ہی کوئی ہو جو مثل اور مقدمہ کے مفہوم کو سمجھتا ہو۔ انتہائی بدتمیزی سے چند کاغذات کو ہی لیا ہے اور اس کا نام مثل ہے اور ان کاغذات کی تعداد نہ تو مثل سے معلوم ہوتی ہے نہ دفتر سے۔“

جب یہ اور اس جیسی دوسری رپورٹیں موصول ہو چکیں تو مہدی علی ان رپورٹوں کی تصدیق کے لیے خود دوروں پر نکلے۔ انہوں نے ان دفاتر کی وہی حالت دیکھی جو ان رپورٹوں میں بیان ہوئی تھی۔ اب وہ ان خرابیوں کی اصلاح کی طرف مائل ہوئے۔ عہدے داروں کے مشاہرات میں اضافہ کرایا۔ ضرورت کے لحاظ سے عملے کا تعین کرایا۔ کاغذات کی باقاعدہ ترتیب کرائی گئی۔ ہر ضلع کے بستوں کے بعد اجدارنگ تجویز کیے۔ بعض دفاتر میں درویوں اور گدوں پر کچھ کام ہوتا تھا۔ اس نے میز، کرسی اور دوسرے فرنیچر سے اسے تبدیل کیا۔ عہدے داروں کو ان ذمہ داریوں کا احساس دلایا اور ایسا عملہ مقرر کیا جو ان دفاتر میں اچانک پہنچ کر دیکھتے تھے کہ دفتر کی حالت کیسی ہے اس سے یہ ہوا کہ لوگوں پر خوف طاری ہو گیا اور دفاتر میں عملہ پابندی سے پہنچنے لگا۔

تھوڑے ہی دن میں یہ نظام ایسا درست ہو گیا کہ ایک تقریب میں ریزیڈنٹ یہ کہنے پر مجبور ہو گیا۔ ”مجھے گلبرگ اور اورنگ آباد میں سرکاری دفاتر کا معائنہ کرنے کا موقع ملا ہے اس لیے نہایت خوشی سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ جس طریقے سے تہذیب و ترتیب دفتر ہوئی ہے وہ نہایت عمدہ اور قابل تعریف ہے۔ یہی اہم امور انتظامی ہیں جو باعث استحکام ریاست ہوتے ہیں اور جن پر کہ انتظام سلطنت کا دار و مدار ہے اور یہی ترقی کا دار و مدار ہے۔“

مہدی علی کی اصل قدر و قیمت اس وقت ظاہر ہوئی جب حیدرآباد قحط کا شکار ہوا۔ سالار جنگ کی نظر مہدی علی پر گئی اور انہوں نے قحط زدہ علاقوں کا انتظام مہدی علی کے سپرد کیا۔ اسے اس آفت سے نمٹنے کا تجربہ اس وقت بھی ہوا تھا جب وہ مرزا پور میں ڈپٹی کلکٹر تھا۔ لہذا وہ ان تدبیروں سے واقف تھا جو سرکار انگریزی میں قحط زدوں کی دیکھیری کے لیے کی جاتی ہیں۔

علی گڑھ میں ایک وسیع میدان تھا۔ کسی زمانے میں یہاں فوج پریڈ کیا کرتی تھی مگر اب وہاں چھاؤنی نہیں رہی تھی۔ سرسید نے مجوزہ کالج کے لیے اس زمین کو پسند کیا اور حکومت سے درخواست کی کہ یہ زمین کالج کے لیے دی جائے۔ یہ کام اتنی آسانی سے نہیں ہو گیا۔ حکومتی کارندوں نے قدم قدم پر روڑے اٹکانے شروع کیے۔ علی گڑھ کا کلکٹر اس کے بالکل حق میں نہیں تھا۔ دوسرے حکام کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔

یہ مخالفت اتنی شدید تھی کہ کمیٹی نے مایوس ہو کر زمین کا خیال ہی دل سے نکال دیا۔ مایوسی کے بادل تنے کھڑے تھے کہ نئے گورنر نے سرسید سے ملاقات کی اور دو شرائط پر زمین دینے کا وعدہ کر لیا۔

پہلی شرط یہ تھی کہ جو عمارت اس میں بنائی جائے اس کے بننے سے پہلے اس کا نقشہ گورنمنٹ کے ملاحظے کے لیے بھیجا جائے۔ دوسری شرط ذرا کڑی تھی اگر کوئی اتفاق پیش آجائے اور کالج بند کر دیا جائے تو جس قدر عمارت بنی ہوگی یہاں موجود ہوگی ان سب پر سرکار کا قبضہ ہو جائے گا۔

سرسید نے کمیٹی سے منظوری کے بعد دونوں شرطیں منظور کر لیں اور جواب میں قطعہ اراضی پر قبضے کی سند مل گئی۔ چٹیل زمین کے سینے پر عمارت کی تعمیر کا آغاز ایک ایسا خواب نظر آ رہا تھا جس کی کوئی تعبیر نہیں تھی جب کہ سرسید یہ چاہتے تھے کہ جلد سے جلد تعمیر کا کام شروع کر دیا جائے کہیں ایسا نہ ہو کہ گورنمنٹ کی نیت بدل جائے۔ سوال سرمائے کی فراہمی تھی۔ نقشہ ایسا بنایا تھا کہ مسلمانوں کے عروج کی کہانی سناتا تھا۔ اس کے لیے بڑی رقم کی ضرورت تھی اور حال یہ تھا کہ کوئی چندہ دینے کو تیار نہ تھا اول تو لوگ انگریزی تعلیم ہی سے نفرت کرتے تھے دوسرے تہذیب الاخلاق کے مضامین نے لوگوں کو شک میں ڈال دیا تھا۔ مولوی حضرات کفر کا فتویٰ دے ہی چکے تھے۔ وہ اپنے وعظوں میں تقریریں کر رہے تھے کہ سید احمد کو چندہ نہ دیا جائے۔ انہوں نے بھی طے کر لیا تھا کہ خواہ بھیک مانگنا پڑے۔ وہ کالج ضرور بنائیں گے۔ انہوں نے قوم کی خاطر واقعی بھیک مانگی۔ علی گڑھ میں نمائش لگی تو کتابوں کی دکان لگائی۔ والٹیر بن کر گلے میں جمبولی ڈالی، اسٹیج پر کھڑے ہو کر اپنی بے ہنگم آواز میں غزلیں گائیں۔ بجرے میں پہنچ گئے۔ طوائف اور سازندوں سے چندہ لیا۔ جس نے دعوت کرنی چاہی اس سے دعوت کے بدلے رقم طلب کی۔ کالج کا فنڈ

اس نے اپنے سابقہ تجربے کی روشنی میں کام شروع کر دیا۔ جو علاقے زیادہ سختی سے متاثر نہیں ہوئے تھے ان کو محفوظ رکھنے کی تدابیر کیں۔ قحط زدہ رقبوں میں فیاضی کے ساتھ امدادی کام جاری کیے۔ کنوؤں اور تالابوں وغیرہ کی درستی کا کام کیا گیا۔ محتاجوں اور مساکین کے لیے محتاج خانے قائم کیے۔ غلے کی درآمد برآمد پر بغیر کسی تجارتی دست اندازی کے بڑی توجہ رکھی اور چند ہی روز میں یٹینی بنا دیا کہ محض غذا نہ ملنے کی وجہ سے کوئی موت واقع نہ ہو۔ قحط زدہ علاقوں میں ضرورت سے بھی زیادہ غلہ پہنچا دیا گیا۔ حفظانِ صحت کی تدبیریں عمل میں لائی گئیں۔ اس کی کوششوں سے صرف چند مقامات پر ہیضہ اور چھک کی شکایت ہوئی لیکن ان امراض نے وبا کی شکل اختیار نہیں کی۔

چند ماہ کی مدت میں اس نے ایسا قابو پالیا کہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ قحط پڑا ہے۔

قحط و فح ہو جانے کے بعد انگریزی حلقوں میں اس کی قابلیت اور ایمانداری کے خوب چرچے ہوئے۔

”یہ صاحب (مہدی علی) جب کہ ڈپٹی کلکٹر تھے تب بھی قحط کے امدادی کاموں میں شریک تھے اور اس وجہ سے ان تدبیروں سے خوب واقف تھے جو سرکار انگریزی میں قحط زدوں کی دیکھیری کے لیے کی جاتی ہیں۔“
ممتاز اخبار نے بھی اس کے حسن انتظام کی داد دی۔

☆.....☆

اس کے محسن سرسید احمد خان کی مشکلات ناگفتہ بہ ہوتی جا رہی تھیں۔ ایک طرف وہ ریاست حیدرآباد کی ترقی و بہبود کے لیے کوشاں تھے۔ دوسری طرف سرسید اپنی جنگ لڑ رہے تھے۔ جس قوم کی بھلائی پیش نظر تھی اس کے بعض افراد ان کی جان کے درپے تھے۔ ان کے مشہور مخالف مولوی امداد علی علمائے وقت کو بھڑکانے میں مشغول تھے تاکہ ان کے خلاف فتویٰ لے سکیں اور بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ علمائے ہندو حرمین کے فتوؤں کے مطابق سید احمد کو کافر قرار دے دیا گیا۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے کمیٹی کے ایک جلسے میں مولوی سمیع اللہ نے تقریر کرتے ہوئے زور دے کر کہا کہ مدرسہ العلوم کی مخالفت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ اسے رفع کرنے کی صورت اس سے بہتر کوئی نہیں کہ ایک ماتحت مدرسہ بطور نمونہ علی گڑھ میں قائم کیا جائے تاکہ اس کا طریقہ تعلیم لوگوں پر ظاہر ہو اور معلوم ہو کہ اصول اسلام کے برخلاف نہیں۔

www.Paksociety.com

ہے۔ ان بزرگوں میں سے ایک جناب سید مہدی علی خان ہیں۔ انہوں نے اپنی ذات سے بے انتہا فیاضی اور اپنے قلم و قدم سے بے نظیر امداد اس مدرسے کی، کی ہے اس لیے ممبران کمیٹی نے یہ تجویز کی ہے کہ بطور اظہار شکر گزاری ایک عمارت جناب ممدوح کے نام سے موسوم کی جاوے اور اس عمارت کا نام مہدی منزل ہو۔

اس کے بعد بھی وہ جب تک حیدرآباد میں رہے وقتاً فوقتاً کالج کو امداد دیتے رہے اور ایسے لوگوں میں اپنا نام لکھوادیا جنہوں نے علی گڑھ کالج کے لیے قربانیاں دیں اور قوم کی بھلائی کے لیے اپنے دن رات صرف کیے۔

وہ ابھی حیدرآباد کی ملازمت سے دست کش نہیں ہوئے تھے کہ سرسالار جنگ کا انتقال ہو گیا۔ ریاستوں میں انتظام سلطنت کسی ایک فرد کے گرد گھومتا ہے۔ اس کے اٹھتے ہی نظام سلطنت الٹ پلٹ ہو جاتا ہے۔ مرنے والے کے ساتھ ہی اس کی تباہی و بربادی ہو جاتی ہے۔ وہ لوگ سامنے آجاتے ہیں جو بھی اس کے منظور نظر نہ تھے۔ وہ لوگ پس منظر میں چلے جاتے ہیں جو اس مرنے والے شخص سے وابستہ تھے۔

وہ سرسالار جنگ کے جنازے میں شریک تھے لیکن ان کا ذہن آئندہ کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے اب سالار جنگ نہیں رہے۔ لہذا سازشیں سامنے آکر رقص کریں گی۔ ذرا سی غفلت ہمیشہ کے لیے بدنامی کا باعث بن جائے گی۔ انہوں نے ارادہ کر لیا تھا کہ یہاں سے استعفیٰ دے کر علی گڑھ چلے جائیں گے اور اپنی صلاحیتیں علی گڑھ کالج کے انتظام میں خرچ کریں گے۔

وہ استعفیٰ دینے کا ارادہ کر چکے تھے۔ دو چار دوستوں سے اس کا تذکرہ بھی کر دیا تھا۔ ادھر لارڈ رین نے سر اسٹوارٹ ہیلی کو ضروری انتظامات کے لیے کلکتہ سے حیدرآباد بھیجا۔

سرسالار جنگ کے خاص لوگوں کے لیے یہ زمانہ نہایت نازک تھا۔ کچھلی رقابتیں از سر نو تازہ ہو گئی تھیں۔ اب سالار جنگ نہیں رہے تھے اور نواب آصف جاہ نابالغ تھے۔ مولوی مہدی علی اس نصاب کے خاص نشانہ تھے۔ سر اسٹوارٹ ہیلی نے حیدرآباد پہنچتے ہی دیکھا کہ ہر طرف بے اطمینانی پھیلی ہوئی ہے۔ ریاست کا ناخدا چل بسا تھا۔ کشتی ڈول رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی سنا کہ مہدی علی استعفیٰ دینے کا ارادہ کر چکے ہیں۔ اس خبر سے

بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک اجنبی مسافر انگریز ڈاک بنگلے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ سید احمد نے تعارف نہ ہوتے ہوئے اس سے چندے کی رقم طلب کی۔

”آپ کو اس کام کے لیے صرف اپنی قوم سے مانگنا چاہیے۔“

”بے شک! میری قوم کی ہستی ہے کہ غیروں کے سامنے ہاتھ پارتا پڑتا ہے مگر یاد رکھیے اگر یہ کالج انگریزوں کی اعانت کے بغیر بن گیا تو انگریزوں کے لیے کوئی ذلت کی بات اس سے زیادہ نہ ہوگی۔ وہ ہندوستان کی حکومت سے قائدہ اٹھاتے ہیں مگر ہندوستانوں کی بھلائی کے متعلق کاموں میں شریک نہیں ہوتے۔“ سرسید نے کہا اور وہ انگریز اتنا شرمندہ ہوا کہ اسی وقت چندہ دینے کو تیار ہو گیا۔ مہدی علی کو معلوم ہوا کہ تعمیر میں چندے کی وقت ہے۔ اسی وقت ایک ہزار نقد اپنے پاس سے چندہ بھیج دیا۔ پھر انہیں معلوم ہوا کہ سرسید قرض لے کر چندہ پورا کرنا چاہتے ہیں تو انہوں نے ذاتی ذمہ داری پر چھ ہزار کا قرض لیا اور سرسید کو روانہ کر دیا۔ حیدرآباد میں بلا اجازت قرض نہیں لے سکتے۔ انہوں نے سالار جنگ سے بات کی۔ انہیں باور کرایا کہ اگر سرسید قرض نہیں لوٹائیں گے تو وہ ادا کرے گا۔ سالار جنگ کو جب معلوم ہوا کہ قرض کالج کی تعمیر کے لیے بھیجا جائے گا تو انہوں نے منظوری دے دی۔

انہوں نے صرف امداد ہی نہیں کی بلکہ سالار جنگ کی توجہ اس طرف دلائی اور ریاست سے گرانٹ مقرر کرادی۔ یہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ سالار جنگ علی گڑھ آئے اور کالج کا معائنہ کرنے کے بعد اپنی جاگیر سے بھی سالانہ امداد منظور کی۔

مہدی علی اس سلسلے میں اتنی کاوشیں کر رہے تھے کہ سرسید ان کے احسان مند ہوتے جا رہے تھے۔ انہوں نے اظہار شکر گزاری کے لیے ایک عمارت مہدی منزل کے نام سے موسوم کی اور یہ نوٹ شائع کیا۔

کمیٹی نے اپنا فرض سمجھا کہ ان میں سے ان بزرگوں کی جنہوں نے اس (کالج) کے قیام میں بے انتہا ہمت صرف کی ہے اور اپنے مال سے اور اپنی سستی سے کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا۔ خاص طور سے شکر گزاری کی جاوے۔ بعض کی سستی اور فیاضی ایسی ہے جن کے شکر یہ کی دائمی یادگار کا قائم ہوتا۔ ہماری کمیٹی کو ذریعہ افتخار مقصود

انہوں نے ہر انگریز افسر تک اپنا مقدمہ پہنچایا۔ ان کی نیک نامی اور انتظامی صلاحیت کے سب ہی قائل تھے۔ لہذا وائسرائے نے دخل اندازی کی اور تمام اندیشے ہمیشہ کے لیے دور کر دیے وہ خود حیدرآباد آئے۔ اعلیٰ حضرت آصف جاہ کو آبائی سند پر متمکن کیا اور اسی دن میر لائق علی خان کو منصب وزارت پر فائز کر کے مختار الملک کا موروثی خطاب مع خطاب عماد السلطنت عطا کیا۔

حریفوں کو شکست ہو چکی تھی۔ تھوڑے دن کے لیے حالات پرسکون بھی ہو گئے تھے لیکن پس پردہ سازشیں جاری رہیں اور بالآخر ایک وقت وہ آیا جب مہدی علی کو حیدرآباد سے جانا پڑا۔

عنان وزارت ہاتھ میں لیتے ہی میر لائق علی نے مہدی علی کی وفاداری کو اس کی قابلیت کے ترازو میں تولی اور ایک جدید عہدہ محکمہ پولیٹیکل و فنانس وضع کر کے مہدی علی کو اس کا معتمد مقرر کیا۔ یہ عہدہ ایسا تھا کہ حکومت کی پوری طاقت اس کی ذات میں مجتمع ہو گئی۔ حکومت کے تمام صیغے اس کے زیر اثر آ گئے۔ ایسی طاقت اسے کبھی نہیں ملی تھی جیسی کہ اب ملی ہے۔

نظام حیدرآباد اعلیٰ حضرت آصف جاہ کی نظروں میں بھی مہدی علی کا اعتبار بہت بڑھ گیا اور ایک مرتبہ نوروز کی تقریب پر اسے شیر نواز جنگ بہادر کا خطاب مرحمت فرما کر اپنے اس اعتماد کا اظہار کیا۔

جب نواب حیدرآباد اسے اتنا چاہیں تو کس کی مجال کہ ان کی طرف میلی آنکھ سے دیکھے۔ انہوں نے خود بھی ایسی طبیعت پائی تھی کہ سازشوں کا شکار ہونے والے نہیں تھے لیکن میر لائق علی خان اپنی ناتجربہ کاری سے سازشیوں کے ہتھے چڑھ گئے۔ ان کے گرد کچھ ایسے لوگ جمع ہو گئے جن کے مشوروں سے ان سے ایسے افعال سرزد ہو گئے جو ان کی وزارت کی حدود سے باہر تھے۔ دوسرے گفتگوں میں انہوں نے اپنے اختیارات سے تجاوز کیا۔ سازشی افراد ان کے دل میں یہ ڈالتے رہے کہ ریزیڈنٹ ان کی پشت پر ہے لہذا انہیں اعلیٰ حضرت (آصف جاہ) کی طرف سے کوئی خدشہ نہیں ہونا چاہیے لیکن جب وقت آیا تو وہ اعلیٰ حضرت کے معسوب ہو گئے اور انہیں استعفیٰ دینا پڑا۔ میر لائق علی کا عہدہ وزارت صرف تین سال رہا۔

مہدی علی ایک مرتبہ پھر دھوپ میں کھڑے تھے۔ وہی حالات تھے کہ جب سالار جنگ کا انتقال ہوا تھا اور وہ

انہیں سخت دھچکا لگا کیوں کہ وہ ان کی خدمات سے ناواقف نہیں تھے جو مہدی علی انجام دے چکے تھے اور دے سکتے تھے انہوں نے ریزیڈنٹ کے ذریعے اسے کہلوا یا۔

”آپ حیدرآباد سے چلے جانے کا خیال ہرگز دل میں نہ لائیں۔ یہ بات بالکل نامناسب ہوگی۔ مجھے پورا یقین ہے کہ نواب مرحوم (سالار جنگ) کی وفات کے وقت سے آپ نے اب تک سیدھا اور صاف راستہ اختیار کر رکھا ہے جس کی غرض یہ تھی کہ نئے انتظام میں بامصلحت کارروائی ہو۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ اس ریاست کی سرسبزی کے لیے اپنی قابلیت صرف کرتے رہیں گے اور سر اسٹوارٹ کی صلیح پر کارروائی کرنے سے آپ صرف اپنی سرکاری کی خوشنودی حاصل نہ کریں گے بلکہ عوام کی نظروں میں بھی اس کی قدر ہوگی۔“

اس ہدایت کے بعد انہوں نے استعفیٰ دینے کا ارادہ ملتوی کر دیا لیکن اپنے دفاع کے لیے ضروری تھا کہ سالار جنگ کا جائین کوئی ایسا شخص ہو جو نہ صرف ان کی پالیسیوں کو جاری رکھے بلکہ خود مہدی علی کا دفاع کر سکے۔ اس کے لیے سالار جنگ کے فرزند میر لائق علی سے بہتر کون ہو سکتا تھا۔ معتمدین خاص اور ہوا خواہان سلطنت کی بھی خواہش تھی کہ میر لائق علی اپنے لائق باپ کے جانشین ہوں۔

حیدرآباد میں ایک مشہور خاندان تھا جس کے امراء امرائے پانگاہ کہلاتے تھے انہوں نے میر لائق علی کی مخالفت کی۔ یہ کشمکش بڑھتی ہی جا رہی تھی اور عہدہ خالی پڑا تھا۔ حالات بگڑتے جا رہے تھے اور اس وقت تو ناگفتہ بہ ہو گئے جب مسٹر جے جی کاڈری قائم مقام ریزیڈنٹ ہو کر آئے۔ یہ حضرات آتے ہی ان کوششوں میں مگن ہو گئے جہاں تک ممکن ہو۔ شمالی ہند کے قابل نوجوانوں کو جنہیں سر سالار جنگ نے انتخاب کیا تھا اور ظاہر ہے ان کے سرخیل مہدی علی تھا۔ ریزیڈنٹ کے مخالفانہ ارادوں کا براہ راست نشانہ مہدی علی تھے۔

اب حیدرآباد میں واضح طور پر دو گروپ بن گئے۔ ایک گروپ کی سربراہی مہدی علی کر رہا تھا جو میر لائق علی کے حق میں تھا اور ان کی تقرری کے لیے کوشش کر رہے تھے کیوں کہ یہ اس کی شرافت کا تقاضا تھا۔ سالار جنگ اس کے محسن تھے ان کے احسان کا بدلہ اور کسی طرح ادا نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ میر لائق علی کی مدارالمہامی کے لیے کوشش کرے۔ مہدی علی یہ مقدمہ بڑی شدت سے لڑ رہے تھے۔

ماہنامہ سرگزشت

READ
Sect

خود کو تنہا محسوس کر رہے تھے۔ میر لائق علی کے دور میں انہوں نے بقول اس کے حیدرآباد میں خدا کی پوری حکومت جیسے ان کے ہاتھ میں تھی۔ اب میر لائق علی خان کی جگہ نواب سر آسمان جاہ وزارت پر فائز کیے گئے۔ اب انہیں نہیں معلوم تھا کہ ان پر کتنا بھروسہ کیا جاتا ہے۔ وہ ایک مرتبہ پھر استعفیٰ دینے کا ارادہ کر چکے تھے کہ دو بار نوروز میں اعلیٰ حضرت آصف جاہ نے انہیں ”نواب محسن الدولہ محسن الملک“ کا خطاب مرحمت فرما کر اس کی قدردانی خدمات کا اظہار فرمایا۔

دہلی ریاستوں میں ”جسے پیا چاہے وہی سہاگن“ والا مقولہ چلتا ہے۔ سرکار جس سے خوش ہیں تمام عہدے دار بھی اس کی قدر منزلت کرتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت کی طرف سے انہیں خطاب عطا ہوا تو خود وہ بھی مطمئن ہوئے اور نئے آنے والے وزیر کی نظروں میں بھی ان کا اعتماد بحال ہو گیا۔

محسن الملک کا خطاب اس پر ایسا چسپاں ہوا کہ لوگ رفتہ رفتہ ان کا نام مہدی علی بھول گئے اور وہ محسن الملک ہو کر رہ گئے۔ انہیں لوگ اس خطاب سے اس طرح پکارتے تھے جیسے یہی ان کا نام ہو۔

وقت بدلتا ہے تو وقت کے پورے بدل جاتے ہیں۔ نواب سر آسمان جاہ عماد السلطنت نے اس کی قدر تو کی لیکن اس کے اقتدار میں کمی آگئی اور مولوی مشتاق حسین (وقار الملک) کو جو میر لائق علی خان کے زمانے میں صوبہ دار تھے۔ عروج حاصل ہوا۔

وہ عہدوں کے لالچ میں مبتلا نہیں تھے اس لیے انہوں نے اس تنزیلی کی پروا بھی نہیں کی۔ ان کے لیے یہی بہت تھا کہ نیا وزیر اعظم بھی ان کی خدمات کی قدر کرتا ہے۔

وہ ریاست کی ترقی و فلاح کے لیے کام کرتے رہے۔ اپنی انہی کوششوں کے دوران میں انہوں نے معدنیات کے ٹھیکے میں جو چالاکیاں ہوئی تھیں اور جس سے گورنمنٹ نظام کو بہت بڑا مالی نقصان پہنچا تھا اس کا پردہ چاک کیا۔ یہ معاملات جب پریس میں آئے تو لندن میں ہیجان برپا ہو گیا کیونکہ حصص کی خریداری میں حکومت برطانیہ بھی شامل تھی۔ لندن میں ایک تحقیقاتی کمیٹی بنی۔ اس کی بیرونی کے لیے گورنمنٹ نظام نے نواب محسن الملک (مہدی علی) کو بیرونی کے لیے منتخب کیا۔ بعض مشیر قانون اور مددگار ان کے ساتھ لندن روانہ ہوئے۔

جب تک وہ لندن میں قدم رکھتے اخبارات نے کالموں کے ڈھیر لگا دیے تھے جن سے اس غلط فہمی کا اندیشہ تھا کہ نظام گورنمنٹ، گورنمنٹ آف انڈیا اور ریزولوشن کے خلاف منشا کام کرتی ہے۔

مہدی علی نے لندن پہنچتے ہی مسٹر فریون سے ملاقات کی اور ان پر اپنی گورنمنٹ کے خیالات ظاہر کیے۔

”ہز ہائی نس، وزیر اور دیگر ارکان حکومت کی مقررہ پالیسی یہی ہے کہ کوئی کام ایسا نہ کیا جائے۔ جو ریزولوشن حیدرآباد، گورنمنٹ آف انڈیا اور آفس کے خلاف مرضی ہو اور یہ کہ ہمارے تمام کام حکومت بالا کے ایما کے مطابق ہوں۔“

اس نے اپنی اس پالیسی کو بڑے بڑے عمائدین کے سامنے بھی بیان کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔ اس کے بعد انہوں نے تحقیق کے لیے بتائی گئی کمیٹی کے سامنے خود کو شہادت کے لیے پیش کیا۔ اس نے اس خوب صورتی سے یہ مقدمہ لڑا اور ایسی خوب صورت دلیل دیں کہ وہ عہدے دار جو نظام حکومت کو نقصان پہنچانے والے تھے اور اس وقت لندن میں موجود تھے بلکہ خاص طور پر بلوائے گئے تھے۔ لاجواب ہو کر رہ گئے اور وہ غلط فہمیاں دور ہو گئیں جو ایک سازش کے تحت نظام گورنمنٹ کے خلاف پھیلائی گئی تھیں ان کی کوششوں سے وہ غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔ موجودہ ہوم سیکریٹری کو ہٹا دیا گیا۔

مہدی علی نے چند ہی روز میں لندن کے سرکاری حلقوں میں نہایت مقبولیت حاصل کر لی۔ مختلف لارڈ صاحبان نے انہیں اپنے گھر دعوت پر بلایا۔ یہ کسی بھی ہندوستانی کے لیے اس وقت قابل فخر تھا۔ وہ جہاں بھی گئے نہ صرف ریاست حیدرآباد کا مقدمہ لڑا بلکہ ایسے دلائل دیے اور ثبوت پیش کیے جو ہندوستان کی تمام ریاستوں کی صفائی پیش کرتے تھے۔ ان غلط فہمیوں کو دور کرتے تھے جو ان ریاستوں کے خلاف ولایت میں پھیلائی گئی تھیں۔

لندن میں ان کی قابلیت کے چرچے تھے لیکن ہندوستان میں ان کے خلاف ایک نیا محاذ کھلنے والا تھا جس کا احساس خود اسے بھی نہیں تھا۔ یہ تو ہندوستان پہنچ کر ہی معلوم ہونے والا تھا۔

وہ ساحل ہند سے سفر کر کے جب حیدرآباد پہنچے تو حیدرآباد کلب میں انہیں مدعو کیا گیا۔ ابھی تک سفر کی تھکان اتری نہیں تھی طبیعت بھی مضطرب تھی۔ ایک مختصر سی تقریر کے

میں ہم سب سرگرم ہیں۔ کیا عجب ہے کہ نواب صاحب کی وقاداری اور اطاعت اپنا نیک نتیجہ دکھائے اور شورش بند ہو جائے ورنہ بہت جلد بندہ بھی پہنچتا ہے اور علی گڑھ میں آکر ملتا ہے۔

وہ بدستور فنانشل سیکریٹری رہے اور ان کا تعلق مدارالمہام سے تھا۔

ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد امرا کی سازشوں نے ایک نیا جال پھینکا۔ ایک روز منصب دار غضنفر علی بیگ، محسن الملک کے پاس آئے اور انہیں یہ پیغام دیا کہ نواب سرور جنگ کو روپے کی ضرورت ہے۔ وہ چاہتے ہیں سر آسمان جاہ ان کی مالی امداد کریں۔

نواب سرور جنگ شطرنج کا ایک زیامہرہ تھے جو اب استعمال کیے جا رہے تھے۔ آغا مرزا نواب سرور جنگ اودھ کے باشندے تھے اور سر آسمان جاہ کے مخالف سمجھے جاتے تھے۔ ریزیدسی میں بھی ان کا اثر رسوخ تھا۔ اعلیٰ حضرت کی تعلیم کے لیے مقرر ہوئے تھے۔ اتالیقی کے بعد ریزیدسی کی سفارش پر معتمد پیشی کے ممتاز عہدے پر فائز کیے گئے۔

محسن الملک کو جب معلوم ہوا کہ سرور جنگ کو مالی امداد کی ضرورت ہے تو اس نے سر آسمان جاہ کو مشورہ دیا کہ یہ امداد کر دی جائے۔

”اگر کچھ مالی امداد دے دی جائے گی تو ان (سرور جنگ) کی بدگمانی دور ہو جائے گی اور اس بخشش سے کوئی حرج نہ ہوگا۔“

اس نے یہ مشورہ مصلحت وقت کے تحت دیا تھا۔ سرور جنگ اور سر آسمان جاہ کے درمیان بدگمانیاں چلی آرہی تھیں۔

محسن الملک نے یہی سوچا ہوگا کہ اس احسان کے بعد قربتیں بڑھیں گی جو ریاست کے لیے بھی اچھا ہوگا اور خود آسمان جاہ اور ان کے لیے بھی اچھا ہوگا۔

سر آسمان جاہ نے امداد کی مد میں ایک لاکھ روپے دینا منظور کر لیا۔ یہ روپیہ نواب سرور جنگ نے وصول بھی کر لیا لیکن اسے امداد نہیں رشوت کا رنگ دے کر اعلیٰ حضرت آصف جاہ کے علم میں لایا گیا۔

نواب فتح نواز جنگ ہوم سیکریٹری کو بھی موقع مل گیا۔ انہوں نے یہ واقعہ ریزیدسی تک پہنچا دیا۔

”سر آسمان جاہ امور مملکت نہیں چلا سکتے اس لیے لوگوں کو رشوت دے کر ان کا منہ بند کر رہے ہیں۔“ جب

بعد انہوں نے وہاں بیٹھنے سے معذرت کی اور گھر چلے آئے۔

ہوم سیکریٹری کا عہدہ خالی پڑا تھا۔ ایک انا رتھا اور سو بیمار تھے۔ رسہ کشی تو ہونی ہی تھی۔ یہ معاملہ بہ آسانی منٹ بھی سکتا تھا لیکن ریزیدسی کی مداخلت نے کھیل بگاڑ دیا۔ وہ فتح نواز جنگ (مہدی حسن) کے حق میں تھا جب کہ مدارالمہام سر آصف جاہ ریزیدسی کی ضد پوری کرنے کو تیار نہیں تھے۔ اس میں کہیں محسن الملک (مہدی علی خاں) کا نام نہیں تھا لیکن فتح نواز جنگ یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ محسن الملک کو بنا نا چاہتے ہیں۔ محسن الملک نے ان کے کان بھرے ہیں۔ وہ کھلے عام محسن الملک کے خلاف تقریریں کرنے لگے۔ محسن الملک کو بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔

اسی زمانے میں مسٹر ہاول ریزیدسی آئے۔ انہوں نے اس آگ کو مزید ہوا دی۔ وہ نواب محسن الملک (مہدی علی) کی حمایت میں فریقانہ حیثیت سے ٹریک ہو گئے اور فتح نواز جنگ کے ہوم سیکریٹری کے جانے کی سخت مخالفت کی۔ اپنی پوری قوت صرف کر دی۔ گورنمنٹ کے ارکان بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ بالآخر مسٹر ہاول حیدرآباد سے ہٹا دیے گئے اور ان کی جگہ نیا ریزیدسی آ گیا۔ اس نے غیر ضروری مداخلت سے گریز کیا۔ فتح نواز جنگ ہوم سیکریٹری ہو گئے اور ایک سکون سا ہو گیا۔

یہ سکون چھلنی میں پانی کی طرح رہا کہ پانی بہہ گیا اور چھلنی خالی رہ گئی۔ دو سال پہ مشکل گزرے تھے کہ سر چھلنی پلوڈن ریزیدسی پر آئے اور چند ہی دن میں سر آسمان جاہ کے خلاف ہو گئے۔ سازشوں کا بازار ایک مرتبہ پھر گرم ہو گیا۔ انہی سازشوں کا نتیجہ تھا کہ وقار الملک نے استعفیٰ دے دیا اور حیدرآباد سے روانہ ہو گئے۔

ان کے جاتے ہی سر آسمان جاہ کی نظروں میں مہدی علی (محسن الملک) کی وقعت بڑھ گئی۔ انہوں نے وقار الملک سے متعلقہ مہمات بھی مہدی علی کے حوالے کر دیں۔ مہدی علی بھی نہایت خلوص سے ان مہمات کو سر کرنے لگے اور ان غلط فہمیوں کو دور کرنے میں بھی مشغول رہا ہے جو سر آسمان جاہ اور ریزیدسی کے درمیان پیدا ہو گئی تھیں۔ ان کی کوششیں محض کوششیں رہیں اور تاریکی بڑھتی رہی۔ انہوں نے وقار الملک کو محط لکھا۔

کوشش بدستور جاری ہے اور حضرت اقدس و اعلیٰ کے احکام کی تعمیل اور مرضی مبارک کے مطابق کام کرنے

ریزیڈنٹ اعلیٰ حضرت سے ملا اور ان کے سامنے یہ معاملہ پیش کیا گیا تو انہوں نے نواب سرور جنگ کو طلب کیا اور ان سے وضاحت چاہی۔ انہوں نے جو بیان دیا اس میں اس عطیہ کی تحریک اور اسے قبول کرنے پر اصرار کا سارا الزام نواب سر آسمان جاہ اور محسن الملک پر رکھ دیا۔

”میں تو پہلے ہی آپ کے علم میں لا چکا تھا کہ سر آسمان جاہ نے مجھے ایک لاکھ روپے اصرار کر کے دیے ہیں۔ یہ شاید اس لیے تھے کہ میں اپنے فرائض سے غفلت برتوں اور جیسا وہ چاہتے ہیں ویسا کروں لیکن میں آپ ہی کا وفادار رہوں گا۔“

ریزیڈنٹ پہلے ہی ملا ہوا تھا۔ اس نے نواب سرور جنگ کے بیان کو سچ قرار دیا اور محسن الملک کی صفائی کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔

محسن الملک اس نتیجے سے ایسا مایوس ہوا کہ استعفیٰ پیش کر دیا۔ اعلیٰ حضرت نے استعفیٰ منظور کر لیا سازشیوں کا داؤ چل چکا تھا۔

گمان یہ تھا کہ مہدی علی جب حیدرآباد کو الوداع کہیں گے تو چونکہ وہ اعلیٰ حضرت کے معتوب ہیں اس لیے کوئی شخص انہیں خدا حافظ کہنے ریل تک نہ آئے گا۔ اب تک یہی ہوتا رہا تھا۔ اعلیٰ حضرت کے معتوب افراد چپکے سے ریل میں بیٹھ کر چلے جاتے تھے لیکن عوام میں ان کی مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ وہ روانہ ہو رہے ہیں تو شام ہی سے لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ وہ ہجوم ہوا کہ پلیٹ فارم بھر گیا۔ لوگ آہ و فغاں کر رہے تھے۔ انہیں الوداع کہنے والوں میں انگریز بھی تھے۔ انہوں نے ٹوپیاں اتار کر اس کے حق میں نعرے لگائے۔ کوئی ایسا نہ تھا جس کی آنکھوں میں آنسو نہ ہوں۔

ٹرین نے روانگی کی سیٹی دی اور روانہ ہوئی۔ پورا مجمع سکتے کی حالت میں ٹرین کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ پھر جب ذرا سکتہ ٹوٹا تو ایک دل جلا چلا اٹھا۔

”ایک سازش کے تحت خیر خواہ لوگوں کو الگ کرایا جا رہا ہے تاکہ آئندہ کوئی عقل مند یہاں رہے نہیں اور پھر جس کا جی چاہے وہ کرے۔“

اخبار آزاد نے دوسرے دن کے شمارے میں اس منظر کو یوں بیان کیا۔

”آپ کی روانگی سے دو روز پیشتر لوگ بہ کثرت آپ سے ملنے اور آپ کو الوداع کرنے ٹھیک ساڑھے سات

بجے ریلوے اسٹیشن پر جلوہ فرما ہوئے۔ مولوی صاحب کے آنے سے پہلے ایک جانب ہزار ہا آدمی انگریز، پارسی، لیڈیاں، ہندو، مسلمان جن میں اکثر سرکاری عہدیدار تھے۔ دوسری جانب ایک کثیر تعداد ان بیوہ عورتوں کی تھی جن کی وہ مدد کیا کرتے تھے، اپنے چھوٹے چھوٹے، یتیم بچوں کو لیے ہوئے مولوی صاحب کو الوداع کہنے آئی تھیں۔“

ہم نے کیا کسی نے بھی آج تک کسی عہدے دار کی روانگی پر اس طرح خاص و عام کو الوداعی تقریب میں شریک ہوتے نہیں دیکھا۔

مہدی علی نے ان بیوہ عورتوں کی آہ و زاری کو دیکھ کر پرائیویٹ سیکریٹری سے کہا۔

”سرکاری غلام کی جانب سے قدم بوسی کے بعد عرض کرتا کہ جب تک فدوی تھا ان غریب عورتوں کو جس طرح چاہا بنا ہا۔ اب میری آخری سفارش ہے جو میں ان عورتوں کے لیے کرتا ہوں۔ کہ ان بے کسوں کی پرورش کا سرکار کو خیال رہے۔“

☆.....☆

ایک شخص شام بہاری لال سرسید احمد کے دفتر میں ہیڈ کلرک تھا۔ کالج کے جتنے اخراجات ہوتے تھے سرسید کے ہاتھوں ہوتے تھے اور بہاری لال بہ حیثیت کلرک اس کا حساب کتاب رکھتا تھا۔ کالج کاروپا بینک بنگال میں تھا اور حسب ضرورت چیکوں کے ذریعے نکالا جاتا تھا۔ کچھ پرائیمری نوٹ بینک کی سپردگی میں تھے جن کا منافع تقریباً دو ہزار سالانہ بینک سے ہر سال وصول کیا جاتا تھا۔

شام لال کو کام کرتے ہوئے دس بارہ سال ہو گئے تھے۔ سرسید اس پر اعتماد کرنے لگے تھے لہذا اکثر بغیر پڑھے ہی چیک پر دستخط کر دیا کرتے تھے اور بہاری لال بینک سے پیسے نکلا لیتا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ سرسید اس پر اعتبار کرنے لگے ہیں تو اس کی نیت خراب ہوئی۔ جس قدر روپے چاہتا نکلا لیتا۔ اس کی ہمت مزید بڑھی۔ پھر اس نے جعلی دستخط بنانے شروع کر دیے۔ سرسید کو معلوم ہی نہ ہوتا اور پیسے بینک سے نکل جاتے یہاں تک کہ بینک میں جمع شدہ زر ضمانت بھی ختم ہو گئی۔ اس نے کالج کے ٹرسٹیوں کی طرف سے ایک مختار نامہ بنایا اور اس پر سات ٹرسٹیوں کے جعلی دستخط کر کے بینک کو بھیج دیا۔ اس مختار نامے کے ذریعے بینک کو اختیار دیا گیا تھا کہ کالج کو جس قدر روپے کی ضرورت ہو پرائیمری نوٹوں کی کفالت پر سووی روپیا قرض دیتا

دیکھا تو اس پر کسی چیک کا اندراج ہی نہیں تھا۔

کلرک نے تمام صورت حال ایک مرتبہ پھر سرسید کے سامنے رکھ دی اور انہیں مشورہ دیا کہ وہ اب بینک سے رابطہ کریں۔ سرسید نے بینک سے خط و کتابت کی تو ظاہر ہوا کہ غبن ہوا ہے۔ بہاری لال ایک لاکھ سے زیادہ کی رقم ہڑپ کر چکا تھا۔

سرسید کے لیے یہ صورت حال نہایت نازک تھی۔ صرف رقم ہی نہیں ڈوٹی تھی بلکہ اس کی عزت بھی داؤ پر لگ گئی تھی۔ کوئی یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ خود اس نے قوم کی امانت ہڑپ کر لی۔ انہوں نے ٹرسٹیوں سے مشورہ کرنے کے بعد اس واقعے کی اطلاع گورنمنٹ کو دی اور بہاری لال گرفتار کر لیا گیا لیکن مقدمہ چلنے سے پہلے ہی اس نے حوالات میں خودکشی کر لی۔

☆.....☆

محسن الملک مہدی علی خان حیدرآباد کی بھول بھلیوں سے نکلے تو سیدھا علی گڑھ پہنچے اور انہوں نے اپنی بقیہ زندگی کالج کی ترقی کے لیے وقف کر کے مستقل علی گڑھ میں رہنے کا عزم کر لیا۔

وہ بہت سے عزائم لے کر علی گڑھ آئے تھے لیکن بد قسمتی سے یہ سرسید کا آخری زمانہ تھا خصوصاً ایک لاکھ کے غبن کے بعد تو کالج کی کشتی ڈنڈا ڈول تھی۔ انتظامی معاملات دگرگوں تھے۔ تعمیر کا کام رک گیا تھا۔ چندے کی کوئی سبیل نہیں تھی۔ سرسید کو تو ایسی چپ لگی تھی کہ ساتھیوں کو ابھن ہوتی تھی۔

اس کالج کی بنیادوں میں مہدی علی کی محنت، پسینا اور روپیا دفن تھا۔ انہیں سرسید سے جو عقیدت رہی تھی اس کا بھی تقاضا یہ تھا کہ وہ کالج کی اصلاح کے لیے ہر طریقہ بروئے کار لائیں۔ یہ کام علی گڑھ میں رہ کر نہیں ہو سکتا تھا۔ انہوں نے ممبئی کا رخ کیا اور اسے اپنا محور عمل قرار دیا۔

اس وقت سب سے بڑی ضرورت یہ تھی کہ مخالفین کالج سے ربط ضبط کیا جائے اور انہیں کالج کی ترقی میں حصہ لینے پر آمادہ کیا جائے۔ اس وقت انہوں نے وہی کام کیا جو کبھی سرسید نے کیا تھا۔ ہر اس شخص سے ملاقات کی جس سے ذرا بھی توقع کی جاسکتی تھی۔ جسٹس بدرالدین طیب جی کا شمار علی گڑھ کے مخالفین میں ہوتا تھا۔ مہدی علی نے اپنی اعجاز بیانی سے انہیں ایسا رام کیا کہ عام مسلمانوں میں علی گڑھ کے ساتھ ہمدردی پیدا کرنے اور قومی تعلیم کی طرف

رہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور بہاری لال کالج کے نام پر قرض لے کر اپنی عیاشیوں پر خرچ کرتا رہا۔ ایک دن بہاری لال کی درخواست آئی کہ وہ بیمار ہے اسے رخصت دی جائے۔ پھر معلوم ہوا اس پر فالج کا حملہ ہوا ہے۔ نہ جانے کب تک ڈیوٹی پر نہ آسکے۔ کوئی مدت معین نہیں تھی کہ وہ کب آتا ہے۔ سرسید نے کچھ مدت کے لیے ایک عارضی کلرک کی تقرری کر لی۔ اس کلرک نے سیٹ پر بیٹھے ہی حساب کتاب کا جائزہ لیا۔ رجسٹر دیکھے۔ پرانی چیک بکس دیکھیں۔ اسے شک تو ہوا کہ کچھ گڑبڑ ہے لیکن نیا نیا آیا تھا پوری طرح بات کو سمجھ نہ سکا۔

اس سے پہلے یہ ہوتا تھا کہ بینک کی طرف سے تقاضے اور اکاؤنٹ کی صورت حال کے جو خطوط آتے تھے بہاری لال انہیں غائب کر دیتا تھا لیکن اس نئے کلرک نے ان خطوط کو پڑھا بھی، ان پر غور بھی کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ بینک اکاؤنٹ میں کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ وہ سرسید کی خدمت میں پہنچا اور تمام معاملہ گوش گزار کیا۔

”وہ تو بہت ایماندار آدمی تھا۔ دیکھنا بینک کو کوئی غلط نہیں ہوئی ہوگی۔“ سرسید نے کہا۔

”نہیں جناب بینک ایسی غلطی نہیں کر سکتا۔ ضرور کوئی جعل سازی ہوئی ہے کوئی آپ کے علم میں لائے بغیر پیسے نکلوا تا رہا ہے۔“

”یہ ہو سکتا ہے کہ آج شام بہاری لال کو کچھ دیر کے لیے بلوایا جائے۔ وہ بتائے گا کہ اصل معاملہ کیا ہے تم ابھی نئے ہو پوری بات سمجھ نہیں رہے ہو گے۔“

”گستاخی معاف! اسے بلانے کی غلطی نہ کیجیے گا۔ اگر وہی چور ہے تو ہوشیار ہو جائے گا۔ اسے تو یہ معلوم بھی نہ ہونا چاہیے کہ معاملہ کھل چکا ہے۔“

”پھر معاملہ کھلے گا کیسے۔“

”آپ فکر نہ کیجیے۔ میں حساب کتاب دیکھتا ہوں۔ ہو سکا تو بینک سے بھی رابطہ کروں گا۔ اگر پھر بھی کوئی بات ظاہر نہ ہوئی تو بے شک بہاری لال کو بلا لیجیے گا۔“

سرسید نے یہ کام اس پر چھوڑ دیا۔ نیا کلرک اب تمام معاملہ سمجھ چکا تھا۔ اس نے پچھلی چیک بکس دیکھیں۔ چیک بکوں کی کاؤنٹر فائلیں بغیر لکھی ہوئی تھیں۔ جتنے کا چیک کاٹا گیا تھا کاؤنٹر فائل پر وہ رقم درج نہیں تھی۔ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ چیک کتنی رقم کا جاری ہوا اور کس تاریخ کو۔ روزنامہ

خلاف کوئی کام کرے اور انہیں تکلیف پہنچائے لیکن یہ کالج کی بقا کا مسئلہ تھا لہذا وہ وقار الملک کی اسی رائے سے متفق ہو گئے کہ ٹرسٹیوں کے پاس ایک یادداشت بھیجی جائے کہ وہ کالج کی خبر لیں اور اسے یورپین اسٹاف کے ہاتھوں میں جانے سے بچائیں لیکن یہ یادداشت ٹرسٹیوں تک نہیں پہنچ سکی۔ سرسید کی علالت اور پھر انتقال نے اس یادداشت کو ٹال دیا۔

سرسید کے بیٹے جسٹس محمود کی ذہنی حالت کثرت شراب نوشی نے از حد خراب کر دی تھی۔ وہ باپ کے جانشین ضرور ہو گئے تھے لیکن کام کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ قوت فیصلہ بالکل ختم ہو چکی تھی۔ کالج کی حالت یہ تھی کہ اسٹاف ممبروں کی تنخواہیں، معماروں، باغبانوں، مزدوروں، کتب فروشوں کا روپا ادا کرنا تھا۔ ان قرضوں کی اتنی فہرست تھی کہ کبھی ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔ کالج میں ہر وقت قرض خواہوں کا ہجوم رہتا تھا۔ سیکڑوں غائب ناک خطوط آتے تھے۔

محسن الملک نے اس وقت سب سے پہلا کام یہی کیا کہ اپنی تمام توجہ کالج کی مالی مشکلات سے نکالنے کی طرف مبذول کر دی انہوں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر سرسید میموریل فنڈ کمیٹی قائم کی۔ صرف چھ ماہ میں اس نے بینک کا قرضہ ادا کر کے سود سے مخلصی حاصل کر لی۔

سید محمود کی حالت سیکریٹری شپ کے لیے ناقابل ہوتی جا رہی تھی۔ کچھ لوگوں نے ان کے کان بھی بھرے تھے کہ محسن الملک خود سیکریٹری بنا چاہتے ہیں اس لیے وہ کھلم کھلا محسن الملک کی مخالفت پر اتر آئے۔

ٹرسٹیوں کی عام رائے یہی تھی کہ چونکہ سید محمود کی ذہنی حالت اس قابل نہیں رہی کہ وہ سیکریٹری شپ کو تادیر چلا سکیں چنانچہ اجلاس ہوا اور کثرت رائے سے مہدی علی محسن الملک کو سیکریٹری منتخب کر لیا گیا اور سید محمود لائف پریزیڈنٹ کیے گئے۔

اس فیصلے کے بعد مہدی علی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور وہ کہہ رہا تھا۔

”اس وقت مجھے مر جانا چاہیے۔ افسوس! میں اپنی آنکھوں سے دیکھوں کہ تیس برس کی دوستی کے بعد سید محمود کا عہدہ مجھے ملے۔“

سید محمود اس سے پہلے ہی احتجاجاً کرے سے باہر نکل

متوجہ کرنے کے لیے ایک اخبار جاری کرنے پر تیار ہو گئے۔ انہوں نے اپنے ساتھ کچھ اور لوگوں کو بھی ملایا اور ان اصحاب نے مشترکہ سرمائے سے گجراتی اور انگریزی میں مائٹرا اور اردو میں مراۃ الاخبار جاری کر دیا اور عام انتظامات وغیرہ کے لیے ایک بورڈ بنا دیا لیکن کچھ عرصے کے بعد بورڈ نے اخبار بند کر دیا۔ مہدی علی نے پھر دریا دلی دکھائی اور اپنے پاس سے سرمایہ لگا کر دوسرا اخبار نصیر ممبئی کے نام سے جاری کر دیا۔

اس اخبار میں خود انہوں نے مضامین لکھے اور دوسروں سے لکھوائے۔ ان مضامین کا ایسا اثر ہوا کہ تھوڑے دنوں میں ہی علی گڑھ کے مقاصد لوگوں کے دلوں میں اچھی طرح راسخ ہو گئے۔ مختلف العقائد مسلمانوں کو کئی مہینوں، خوبے سلیمانی اور داؤدی بوہرے سب میں اس نے ایک قسم کی قوی زندگی پیدا کر دی۔

اس ہی کی کوششوں سے ہزہائی نہیں آغا خان کے دل میں ایسی لگن پیدا ہوئی جس نے ان سے علی گڑھ کی ترقی اور عظمت کے کام کرائے۔

وہ علی گڑھ کالج کی ترقی کے لیے کوشاں تھے۔ ممبئی سے نکلے اور ہندوستان کے دورے پر روانہ ہو گئے۔ میرٹھ، دہلی، مظفرنگر، سہارن پور، رام پور، مراد آباد وغیرہ کے دورے کیے۔ ہر جگہ جلسے منعقد کرائے، تقریریں کیں، اس کی مخالفتیں بھی ہوئیں، طعنے بھی دیے گئے۔ جو القابات سرسید کو دیے جاتے تھے انہی القابات سے انہیں بھی نوازا گیا۔ یہاں تک کہہ دیا گیا کہ ان کا لیکچر سننے کے لیے جانا سیدھا جہنم میں جانا ہے۔ لیکچر سننے والوں پر ان کی منکوحہ عورتیں حرام ہو جائیں گی۔

رام پور گئے تو نواب رام پور سے ملاقات کی۔ یہاں سے مراد آباد گئے۔

ان دوروں نے ان کی ثابت قدمی نے ایک عام بیداری پیدا کر دی۔

ان کی کوششیں بار آور ثابت ہو رہی تھیں۔ ادھر کالج میں سخت ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ سرسید پر شبہ کے صدے کا ایسا اثر ہوا تھا کہ طبیعت میں بے پناہ خصہ اور چڑچڑاہٹ پیدا ہو گیا تھا۔ کسی کی بات سننے کے روادار نہ تھے۔ وہ یورپین اسٹاف کے ہاتھوں میں کھیل رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ کالج آہستہ آہستہ انگریزوں کے ہاتھوں میں چلا جائے گا۔ محسن الملک یہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ سرسید کی مرضی کے

نکالنا تھا۔ سزائے کی کمی، ٹرستیوں کی عدم توجہی، اشاف کی خود سری یہ سب ایسے خطرات تھے جن سے یہ حیثیت سیکریٹری محسن الملک کو نبرد آزما ہونا تھا۔ ہوا مخالف تھی اور سفر ضروری تھا۔ ٹرستیوں سے امید نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ سیکریٹری کی مدد کریں۔

محسن الملک دن رات کام کر رہے تھے لیکن انہیں جادو نہیں آتا تھا کہ تمام کام ایک ساتھ حل کر دیں۔ اشاف خصوصاً انگریز اشاف ان کے لیے مصیبت بنا ہوا تھا جو تنخواہوں میں اضافے پر اصرار کر رہا تھا۔ اسے اس سے غرض نہیں تھی کہ کالج کی مالی حالت کیا ہے۔ طلبہ کے ساتھ بھی ان کا رویہ ناروا ہوتا جا رہا تھا جس سے طلبہ میں بے چینی بڑھ رہی تھی۔

وقت کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی سیاست بھی کروٹیں لے رہی تھی۔ ان حالات کا اثر کالج پر بھی پڑ رہا تھا۔ محسن الملک کو اس سے بھی نبرد آزما ہونا پڑ رہا تھا۔ جب سوہا متحدہ کی نگرانی سرانٹونی میگزینلڈ کے ہاتھ میں آئی اور انہوں نے سوہے کا چارج لیا تو مشکلات مزید بڑھ گئیں اور ایک لحاظ سے محسن الملک کو سیاست میں داخل ہونا پڑا۔

سرانٹونی میگزینلڈ کی حکومت نے 1900 (اپریل) کو سرکاری دفاتر میں دیوناگری حروف جاری کرنے کا ریزولوشن پاس کیا۔ ہندی رسم الخط سرکاری کاموں میں ضروری قرار دینے سے مسلمانوں میں سخت بے چینی پیدا کر دی۔ محسن الملک نے قومی نقطہ نظر سے اس کے خلاف احتجاج کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔

محسن الملک کی کوشش پر ایک مختصر جلسہ تعلیم یافتہ اصحاب کا منعقد ہوا۔ اس میں یہ طے کیا گیا کہ علی گڑھ اور دیگر اضلاع کے مسلمانوں کی ایک میٹنگ بلائی جائے اور اس میں گورنمنٹ کے اس ریزولوشن پر غور کیا جائے چنانچہ ایک جلسہ علی گڑھ کالج میں منعقد ہوا۔ اس جلسے میں محسن الملک نے نہایت زوردار تقریر کی۔ اس ریزولوشن کے معترض پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی اور مشورہ دیا کہ مسلمانوں سے صلاح مشورہ کر کے گورنمنٹ میں پیش کرنے کے لیے یادداشت تیار کی جائے۔ محسن الملک نے اس یادداشت کو تیار بھی کیا اور پیش بھی کیا اور یہ مقام لکھنؤ ایک جلسے کا انعقاد بھی قرار دیا۔

ابھی یہ جلسہ ہوا نہیں تھا کہ سر میگزینلڈ نے اس کانفرنس لے لیا۔ ان کی ناراضی کو دیکھتے ہوئے محسن الملک نے انہیں

گئے تھے۔ مہدی علی اپنی تقریر ختم کر کے جب باہر نکلے تو سید محمود برآمدے میں پہل رہے تھے اور یقیناً غصے میں بھی تھے۔ وہ پہلے ہی کہتے رہے تھے کہ محسن الملک سیکریٹری شپ کا عہدہ اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں۔ اب یہ بات سچ ہو گئی تھی چاہے اس میں محسن الملک کی کوششوں کا دخل تھا یا نہیں۔ محسن الملک مہدی علی نے سید محمود کو برآمدے میں دیکھ کر انہیں مخاطب کیا۔

”محمود سن! یہ وقت ایسا ہے کہ مجھے اور تجھ کو دونوں کو مرجانا چاہیے۔ میں ٹرستیوں کے کہنے کی کچھ پروا نہیں کرتا۔ اگر تو مجھے سیکریٹری مقرر کرے تو میں سیکریٹری ہوتا ہوں۔ میری اور تیری تیس برس کی دوستی ہے۔ تو نے اس عرصے میں مجھے بہت تکلیفیں دی ہیں لیکن اس پر بھی میں تیرے کہنے سے باہر نہیں ہوں۔ تیری جوتیاں اٹھانے کو موجود ہوں۔“

یہ سننا تھا کہ سید محمود بھی رونے لگے اور آگے بڑھ کر محسن الملک کو گلے سے لگا لیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

یہ ظاہر تو یوں لگتا تھا کہ سید محمود نے انہیں معاف کر دیا ہے لیکن ان کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ تھے۔ محسن الملک نے ان کی اطاعت و فرمانبرداری میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی حتی الامکان یہ بھی کوشش کی کہ سید محمود کے ساتھ مل کر کام کریں لیکن سید محمود کی حالت مزاج، کالج کے کاموں کو بے آسانی جلنے نہیں دے رہی تھی۔ محسن الملک ان کے جال میں بری طرح پھنس کر رہے گئے تھے۔ وہ سرسید کے بیٹے تھے اس لیے جاوے جاوے داخلت کو اپنا حق سمجھتے تھے۔ وہ جب نشے میں ہوتے تو کسی کی سننے کو تیار نہ ہوتے۔ ان کی اس حالت نے انگریز اشاف کو بھی ان سے بدظن کر دیا۔ کالج کے پرنسپل مسٹریک نے ٹرستیوں کو نوٹس دے دیا۔

”میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ ٹرستی یا تو محمود کو رکھیں گے یا مجھے۔“

مسٹریک کا انتقال ہو گیا اور ان کی جگہ مسٹرمارین آئے تو انہوں نے بھی صاف کہہ دیا جب تک مسٹر محمود کو معزول نہیں کیا جاتا وہ یہ عہدہ قبول نہیں کریں گے۔

سید محمود کو پریزیڈنٹ شپ سے ہٹا دیا گیا اور وزیر بنا دیے گئے۔ اس طرح سید محمود کی مداخلت عملاً ختم ہو گئی اور نواب محسن الملک کام کرنے کے لیے آزاد ہو گئے۔

یہ کام آسان نہیں تھا۔ جہاز ڈوب چکا تھا اسے باہر

عرصہ تک وہ اس مہتممی کو سلجھاتے رہے۔ مسئلہ یہ تھا کہ ٹرٹی گورنمنٹ کے خوف سے آزاد رائے دیتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ آغا خان کی تائید نے محسن الملک کو اور بھی کمزور کر دیا۔ انہوں نے دھمکی دے دی کہ اگر یہ اسکیم قبول نہ کی گئی تو وہ اپنی امداد بند کر دیں گے۔ محسن الملک نے اس دھمکی کی بھی برداشت نہیں کی بالآخر سر جیمس نے مداخلت کی۔ محسن الملک کی دیگیل کو سمجھا۔ گورنمنٹ کی پالیسی میں تبدیلی آگئی۔ ہزار ہہ نفس نفیس کالج میں تشریف لائے اور ان غلط فہمیوں کو دور کیا جو گورنمنٹ کی حمایت تعلیم عربی سے پیدا ہو رہی تھی۔

انہوں نے صاف کہہ دیا۔ ”انگریزی تعلیم کو کم کر کے عربی تعلیم قائم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔“ اس قضیے سے نمٹنے کے بعد ایک مرتبہ پھر محسن الملک کالج کی بہتری کے لیے اقدامات اٹھانے کی طرف راغب ہو گئے۔

کالج کے سابق طلبہ کی کالج کے ساتھ دلچسپی قائم رکھنے کے لیے اولڈ بوائز ایسوسی ایشن قائم کی۔ سابق طلبہ کو انتظامات کالج میں شریک کیا۔ یہ جماعت روز بروز مضبوط ہوتی گئی۔ سابق طلبہ بڑے بڑے عہدوں پر متمکن ہو چکے تھے۔ ان سے کالج کو بڑے مالی فوائد ہوئے۔

ڈاکٹر ضیاء الدین جو اس وقت لندن میں تعلیم پارہے تھے ان کے ذریعے ایک اور نیشنل علی گڑھ کالج ایسوسی ایشن قائم کرائی۔ اس کے تحت جلسے ہوتے تھے جن میں علی گڑھ کے مقاصد کی تبلیغ ہوتی تھی۔ ان جلسوں میں ہندوستان کے مینشن یافتہ انگریز اور ہندوستانی طلبہ اور وہ معزز اصحاب جو انگلستان میں مقیم تھے شرکت کرتے رہے۔

اس ایسوسی ایشن سے کالج کو کوئی مالی فائدہ نہیں پہنچا لیکن یہ فائدہ کچھ کم نہیں تھا بلکہ مالی فوائد سے زیادہ تھا کہ لندن میں علی گڑھ کالج کی تبلیغ ہوتی رہی۔

محسن الملک کا سب سے بڑا کارنامہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا دائرہ کار بڑھانا تھا۔ اس اجمن کا قیام اگرچہ سرسید کے ہاتھوں ہو چکا تھا لیکن سرسید نے اسے ممالک متحدہ و پنجاب تک محدود رکھا تھا۔ محسن الملک نے وقت کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی سرگرمیوں کو تمام ہندوستان کو محیط کر دیا۔ یہ اجلاس نہ صرف تعلیمی بیداری کا باعث بنے بلکہ مالی فوائد کا سبب بھی بنے۔

سرسید کی بڑی آرزو تھی کہ ایک اجلاس ممبئی میں بھی ہو لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ محسن الملک نے

لکھا کہ وہ نئی نال آکر وضاحت پیش کرنا چاہتے ہیں۔ میکڈانلڈ اتنے خفا تھے کہ انہیں حاضری کی اجازت بھی نہیں دی۔ وہ اس سے اتنے ناراض تھے کہ محسن الملک کا خطاب بھی انہیں گوارا نہیں تھا۔ انہوں نے بھرے جلسے میں کہا کہ حیدرآباد کی ملازمت ترک کرنے کی وجہ سے خطاب اب قابل تسلیم نہیں رہا۔

اس خطی کا نتیجہ نہ جانے کیا نکلتا کہ تائید غیبی کام آگئی۔ میکڈانلڈ رخصت ہوئے اور سر جیمس لاٹوش نے حکومت صوبہ متحدہ کا چارج لے لیا۔ یہ شخص سرسید کے مشن اور مسلمانوں کی تعلیم سے حقیقی دلچسپی رکھتا تھا۔ سر جیمس سے بڑی امیدیں تھیں۔ انہوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ یہ کالج گورنمنٹ کا کالج نہیں۔ اس کی خود مختاری بدستور اسی طرح رکھی جائے جیسی کہ سرسید کے زمانے میں تھی۔ میں اور میرے جانشین اس کی ترقی میں دل سے متوجہ رہے ہیں۔

ابھی کالج کی مشکلات ختم نہیں ہوئی تھیں کہ اس پر ایک اور حملہ ہو گیا۔ گورنمنٹ کی طرف سے ایک اسکیم پیش کی گئی جس کے تحت لوکل حکومتوں کو تعلیم کے لیے کچھ روپیا دیا۔ صوبہ متحدہ کی گورنمنٹ نے اسے بنارس ہندو کالج میں سنسکرت مجڈن کالج میں عربی تعلیم کے لیے اور الہ آباد میں سائنسی تعلیم کے لیے دیا جانا تجویز کر دیا۔ اس اسکیم نے مسلمان ماہرین تعلیم میں ایک ہیجان پیدا کر دیا۔ خیال یہ ہوا کہ اس وقت جو کوششیں کالج کے استحکام کے لیے ہو رہی ہیں ان میں رکاوٹ آئے گی۔ نیز مسلمانوں میں تفرقہ پڑ جائے گا۔

محسن الملک نے اس اسکیم کی مخالفت میں نہایت توانا آواز بلند کی۔ وہ عربی زبان کی تعلیم کے مخالف نہیں تھے اور نہ ہو سکتے تھے لیکن ان کے مطابق یہ وقت مناسب نہیں تھا۔ انہوں نے اس اسکیم کے خلاف ایک مدلل مضمون تحریر کیا۔ ”اس وقت مسلمانوں کی جو توجہ انگریزی تعلیم کی طرف ہو چلی ہے وہ پھر جائے گی اور ایسی حالت میں جب کہ اس وقت کالج کے پاس اتنا سرمایہ بھی نہیں ہے کہ اس کی آمدنی سے ایک صیغہ کا خرچ بھی چل سکے۔ عمارتیں غیر ملکی ہیں۔ کوئی اچھا کتب خانہ تک نہیں تو کیونکر ممکن ہے کہ عربی تعلیم کے لیے ایسا سرمایہ جمع کرنے کی کوشش بار آور ہو سکے جو اب تک انگریزی تعلیم کے لیے بھی میسر نہیں۔“

اس ایک مضمون تک محدود نہیں۔ وہ تواتر سے مضامین لکھتے رہے لیکن یہ اتنا اہم اور پیچیدہ مسئلہ تھا کہ

سمجھنے لگے ہیں کہ اپنے قدموں کی رونق بخشیں۔

مولوی مہدی علی خان محسن الملک جس وقت مستقل قیام کے لیے علی گڑھ آئے اور قومی تعلیم کا بوجھ اپنے کاندھوں پر رکھا یہ دراصل حیدرآباد کی پُر مشقت ملازمت کے بعد آرام لینے کا زمانہ تھا لیکن انہوں نے کالج اور قوم کی خاطر کام شروع کر دیا۔ طوفانی دورے کیے۔ مخالفوں کو موافق بنایا۔ اجلاس منعقد کیے، کالج کی مالی حالت کو بہتر بنایا اور اس کالج کو ایسا بنا دیا کہ بیرونی مہمانوں کو فخر کے ساتھ دکھاسکیں مگر کام ایسا ہی تھا جو وہ نہ کرتے تو شاید کوئی بھی نہ کر پاتا۔ انہوں نے کالج کو پورے رشتی بنانے کا خیال ہر مسلمان کے دل میں پیدا کر دیا۔

ان کی کوششوں ہی کا نتیجہ تھا کہ طلبہ کی تعداد اچانک بڑھ گئی۔ انہوں نے نہ صرف چندے کی اپیلیں کیں بلکہ جہاں بھی گئے وہاں کے رؤسا امراء اور عام لوگوں کو اپنی اولاد کو کالج میں داخل کرنے کی ترغیب بھی دی چنانچہ سابق راجا ناگپور، نوابان مرشدآباد، ڈھا کا، سورت، مشرول کے خاندانوں کے لڑکوں نے داخلے لیے۔ برما، کلکتہ، میسور، حیدرآباد، بنگلہ، سندھ اور بلوچستان کے طلبہ بھی داخل ہونے لگے اور یہ تعداد ہر سال بڑھتی ہی چلی گئی۔

پرنس آف ویلز کی آمد کی یادگار میں سائنس اسکول بھی قائم ہوا۔ سترتی علوم و فنون کی ترقی کے لیے اعلیٰ پیمانے پر عربی شاخ کا انتظام کیا گیا۔

کالج کی وہ عمارتیں جو سرسید کے زمانے میں ادھوری رہ گئی تھیں انہیں مکمل کرایا۔ بعض نئی عمارتیں بھی تعمیر کرائیں۔ علماء مشائخ علی گڑھ کالج کی طرف سے بے حد وحشت زدہ تھے جب کہ عوام بران کا بہت اثر تھا۔ اس طبقے کو ہم نوا بنانا بہت مشکل تھا۔ محسن الملک ان کی غلط فہمیاں دور کرنے میں برابر مشغول رہے۔ وہ اس کوشش میں پورے طور پر تو کامیاب نہیں ہوئے لیکن جو مخالفت پہلے تھی اس میں کمی آگئی بلکہ مولانا شاہ سلیمان پھلواری نے تو محسن الملک کے ہمراہ رنگون تک جا کر عملی ہمدردی کا بھی ثبوت دیا۔ دیگر علماء نے بھی ان کی مساعی کو قابل ذکر ٹھہرایا۔ جب تک سرسید زندہ رہے علماء ان سے بدظن ہی رہے۔ محسن الملک نے اس نفرت کو محبت میں تبدیل کیا۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی (لکھنؤ) نے بالکل بجا لکھا۔

”سرسید کی مذہبی فروگزاشت سے زیادہ ہمارے اکابر کو ان کی سیاست سے بے گامگی تھی۔ ان کے استقلال

ان کی یہ آرزو بھی پوری کر دکھائی۔ اس اجلاس میں مالی طور پر تو چنداں فائدہ نہیں ہوا لیکن ایسی بنیاد قائم ہو گئی جو آگے چل کر مالی فوائد کا سبب بنے۔ اس کے برعکس لکھنؤ میں ہونے والی کانفرنس میں عطیات کی بارش ہو گئی۔ ایک لاکھ سے زیادہ کا چندہ وصول ہوا۔ محسن الملک کی تقریریں ہر جگہ موثر و مفید ثابت ہوئیں۔ محسن الملک تعلیم نسواں کے زبردست حامی تھے۔ اب زمانہ بھی کہہ رہا تھا کہ عورتوں کو بھی پڑھنا لکھنا چاہیے۔ ہر چند کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اب بھی لڑکیوں کی تعلیم کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا محسن الملک نے علی گڑھ میں ایک زمانہ اسکول قائم کیا اور اس کے لیے محسن الملک کی توجہ دلانے پر فرمانروائے بھوپال نے بارہ سو روپے ماہوار کی گرانٹ عطا فرمائی۔

یوڑھے محسن الملک اتنا کام کر رہے تھے کہ سرسید کی جوانی یاد آجاتی تھی۔ اب انہوں نے کالج کو اس معیاری درجے تک پہنچا دیا تھا کہ مہمانوں کی آمد پر خفت اٹھانی نہ پڑے۔ وہ فخر سے کہہ سکیں کہ جو سرمایہ انہوں نے بذریعہ چندہ اکٹھا کیا یا ان حضرات نے دیا وہ اپنی زبان سے اپنے ہونے کا اقرار کر رہا ہے۔ یہ بھی سرسید کی روایت تھی جسے محسن الملک نے زندہ کیا۔ لارڈ کرزن اور نواب صاحبان رام پور اور مہاراجا اندور کالج میں تشریف لائے۔

سرتیس لائٹس کی آمد کالج کا ایک یادگار واقعہ تھا۔ کالج کی آراستگی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ان کے ہاتھوں نظام میوزیم اور آسمانی منزل کا افتتاح کرایا گیا۔ ایڈریس پیش کیا گیا۔ اس کے بعد عربی کی اعلیٰ تعلیم کے لیے چندوں اور وظیفوں کا اعلان ہوا۔ اسٹریچی ہال تالیوں سے گونجتا رہا۔

وہ دن بھی محسن الملک کی محنت کی اجرت کا دن تھا جب پرنس آف ویلز ولی عہد سلطنت برطانیہ مع پرنسز آف ویمز کالج کے معائنے کے لیے آئے۔ اس موقع پر ہزار اہل ہائی نیس کی منظوری سے ایک سائنس اسکول حضور مدوح کے نام سے موسوم ہو کر قائم ہوا۔ اس اسکول کے لیے ممبئی کے مشہور فیاض تاجر سر آدم جی بھائی نے ایک لاکھ اور ہز ہائی نیس آغا خان اور راجا صاحب محمود آباد نے 35,35 ہزار چندہ دیا۔

ان حضرات کی آمد بتا رہی تھی کہ انہوں نے محسن الملک کی کاوشوں کو تسلیم کر لیا ہے اور اس کالج کو اس قابل

معمولی ترقی کی کس قدر باعث ہوئی ہے۔“

☆.....☆.....☆

طلبہ اور یورپین اسٹاف کے درمیان تعلقات کشیدہ چلے آ رہے تھے۔ انگریز پروفیسر اپنے ہم منصبوں تک کو اہمیت نہیں دیتے تھے تو طلبہ کس گنتی میں۔ ٹرینیوں اور ہندوستانی اسٹاف نے بہت کوشش کی کہ یہ تعلقات بگاڑ کی طرف نہ جائیں لیکن یہ کشیدگی بڑھتی ہی چلی گئی۔ طلبہ کے پاس انگریز پروفیسروں کے خلاف شکایتوں کے انبار لگ گئے۔ طلبہ نے نہایت صائب اور مؤدبانہ طریقہ استعمال کیا۔ اپنی شکایت پر مبنی درخواست لکھی اور ایک طالب علم سید مصطفیٰ حسین کے ذریعے پرنسپل تک پہنچا دی۔ پرنسپل نے اس درخواست پر غور کرنے کی بجائے اسے بے عزت کر کے دفتر سے نکال دیا۔

طلبہ اس واقعے کو بھی کڑوے گھونٹ کی طرح پی

سول ایجنٹ برائے یو۔ اے۔ ای



وِیلکمز بک شاپ

سپیس، سرگزشت، یاکینز، جاسوسی

بی او بکس: 27869 کراچہ، دہلی

فون: 04-3961016 فیکس: 04-3961015

موبائل: 052-9695984

ای میل: welbooks@emirates.net.ae

طبع کے باعث جو خود رانی تھی اس کا تدارک ناممکن تھا اس وجہ سے اکثر مواقع پر تنفر ہو جاتا تھا۔ اس کے دفاع میں نواب سید مہدی علی خان صاحب کے ایسے صلح جو اور متاثر مزاج شخص کی ضرورت تھی اور خدا کی حکمت نے انہیں انتخاب کیا تھا۔“

نواب محسن الملک جب کالج ہی کی کسی خدمت کے صلے میں میرٹھ پہنچے تو انہیں مدرسہ مظاہر الاسلام (سہارن پور) کی طرف سے جلسہ تقسیم انعام میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ یہ بھی ایک کرامت ہی تھی کہ انہیں ایک اسلامی مدرسے میں مدعو کیا جا رہا تھا جب کہ وہ سرسید کی نیابت کر رہے تھے جن سے علماء کے تعلقات کبھی خوشگوار نہ رہے اور یہ تاثر عام تھا کہ علماء علی گڑھ کالج اور انگریزی تعلیم کے خلاف ہیں۔

محسن الملک نے اس دعوت کو بڑی خوشی سے قبول کیا اور سہارن پور تشریف لے گئے۔ جلسے میں علمائے دیوبند بھی موجود تھے۔ محسن الملک کا نہایت شاندار استقبال کیا گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ انہیں جلسے کا صدر بنایا گیا۔ علمائے دیوبند کی موجودگی میں یہ اعزاز کم نہ تھا کیونکہ وہ مسلکی اعتبار سے بھی الگ تھے پھر بھی انہیں جو تہنیت نامہ پیش کیا گیا اس میں ان کے تعریفی کلمات کے ساتھ ساتھ اس تاثر کی بھی تردید کی گئی کہ ارباب مدارس اسلامیہ انگریزی تعلیم کو برا سمجھتے ہیں۔

یہ وہ کامیابیاں تھیں جو وہ حاصل کرتے جا رہے تھے اور جن کا براہ راست فائدہ کالج اور سرسید مشن کو پہنچ رہا تھا۔ ان کی پذیرائی صرف مجبان اسلام ہی میں نہیں ہو رہی تھی بلکہ انگریزی گورنمنٹ بھی ان کی معترف ہوئی اور ان کی خدمات اور ملکی کاموں کی قدردانی کے اعتراف میں انہیں 1906ء میں ”قیصرہ ہند“ کے طلائی تمغے سے نوازا گیا۔ یہ ان کے متوازن مزاج کا ثبوت ہے کہ ہر طبقہ خیال تک ان کی رسائی تھی۔

ہر آنر سرجیس بذات خود علی گڑھ آئے اور اپنے ہاتھوں سے یہ تمغہ انہیں پہنایا۔

”یہ عزت صرف ان لوگوں کو ملتی ہے جو اپنے ہم عصر لوگوں کی بے لوث خدمت کرتے ہیں اور نہایت خلوص کے ساتھ ہندوستان کی فلاح کے لیے اپنے کو وقف کر دیتے ہیں۔ سرسید کی وفات کے بعد سے میں نے مولوی سید مہدی علی خان کے کارناموں کو بہ غور دیکھا ہے اور مجھ کو معلوم ہے کہ ان کی جانفشانی، خوش بیانی اور صائب رائے کالج کی غیر

انگلش اسٹاف اپنی من مانی کرتا رہا۔ اپنی شرائط منواتا رہا۔ طلبہ کی برہمی کالج کے اس خراب نظم و نسق کا نتیجہ تھی جو برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ پرنسپل کی ناعاقبت اندیشی نے اس آگ کو بالکل ہی بے قابو کر دیا۔

علی گڑھ میں سالانہ نمائش لگا کرتی تھی۔ اس وقت طلبہ کی کوئی اور تفریح تو تھی نہیں۔ سال بھر اس نمائش کا انتظار کیا کرتے تھے اور جب نمائش لگتی تھی تو خاص طور پر جتنے اقامتی طلبہ ہوتے تھے جمع ہو کر نمائش کا رخ کیا کرتے تھے۔ ان طلبہ کے دم سے نمائش میں خوب رونق ہوا کرتی تھی۔

فروری 1907ء کی نمائش تھی۔ طلبہ کا ایک گروہ مختلف اشالوں کو دیکھتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک طالب علم راجا غلام حسین اور پولیس کے ایک سپاہی کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ کچھ لوگ بیچ میں پڑے اور جھگڑا ختم ہو گیا۔ کسی نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ جھگڑا ابھی ختم نہیں ہوا۔

اس سپاہی کا غصہ اسکی رفع نہیں ہوا تھا۔ اس نے اس جھگڑے کی اطلاع اپنے افسروں کو دی اور طالب علم کا نام بھی بتایا۔ دوسرے دن سپرینٹنڈنٹ پولیس کالج میں آیا اور پرنسپل سے ملاقات کی۔ پرنسپل کو چاہیے تو یہ تھا کہ اپنے طالب علم کا دفاع کرتا یا کم از کم اتنا تو کرتا کہ غلام حسین کو بلا کر احوال معلوم کرتا۔ کچھ اور لڑکوں کو گواہی کے لیے طلب کرتا لیکن اس نے بغیر کسی چھان بین کے غلام حسین کو کالج سے نکال دیا۔ طلبہ غلام حسین کو بے قصور سمجھتے تھے۔ انہوں نے ایک وفد ترتیب دیا۔ اس وفد نے پرنسپل سے ملاقات کی اور اصرار کیا کہ وہ غلام حسین کو نہیں بلکہ اس سپاہی کو سزا دلوائیں جس نے جھگڑے میں پہل کی تھی اور بھری نمائش میں غلام حسین کو زد و کوب کیا تھا۔ پرنسپل نے اس درخواست کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ وہ اس وقت دانش مندی کا مظاہرہ کر سکتا تھا، ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے ان سے کچھ وعدے کر لیتا لیکن اس نے ان طلبہ کی تذلیل کی۔

غصے میں بھرے ہوئے طلبہ نے اسٹرائیک کر دی۔ محسن الملک اتفاق سے علی گڑھ ہی میں تھے۔ انہوں نے جو سنا تو چند ٹرسٹیوں کو لے کر طلبہ یونین کے سیکریٹری کے پاس گئے اور اس سے مذاکرات کیے۔

”کیا تم یہ نہیں دیکھتے کہ میں بذات خود تمہارے پاس چل کر آیا ہوں۔ پھر تم میری بات نہیں مانو گے؟“

”ہم آپ کی بہت عزت کرتے ہیں لیکن ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ انگریز پروفیسر اس کالج کو اپنی جاگیر سمجھیں۔“

کچھ دن بعد ایجوکیشنل کونفرنس کی سینٹرا سٹینڈنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں طالب علم مصطفیٰ حسین بھی شریک تھا۔ پرنسپل کی نظر اس پر پڑی تو عین جلسے میں اس طالب علم کو لتاڑا۔

Downloaded from paksociety.com

”میں یا مصطفیٰ حسین دونوں میں سے کوئی ایک میننگ سے چلا جائے۔“

جلسہ گاہ میں سناٹا پھیل گیا۔ پھر سب نے دیکھا کہ مصطفیٰ حسین اپنی جگہ سے اٹھا اور جلسہ گاہ سے نکل گیا۔ یہ طلبہ کی سخت بے عزتی تھی جب کہ مصطفیٰ حسین کا کوئی جرم بھی نہیں تھا۔

انگریز پرنسپل نے صرف یہی نہیں کیا بلکہ مصطفیٰ حسین کو کالج اور بورڈنگ سے بھی خارج کر دیا۔

کسی نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ ہندوستانی پروفیسر چپ سادھے بیٹھے رہے اور کچھ دیر کے بعد جلسے کا دوبارہ آغاز کر دیا گیا۔

اس واقعے نے طلبہ کو سخت مشتعل کر دیا تھا لیکن محسن الملک کے سمجھانے بھجانے پر طلبہ نے کوئی قدم اٹھانے سے گریز کیا۔ البتہ انہیں یہ یقین ہو گیا کہ اسٹاف اور ٹرسٹیوں میں سے کسی کو ان کے ساتھ ہمدردی نہیں۔ بے اعتمادی کا یہ زہر ان کی رگوں میں اترتا چلا گیا۔ طلبہ خاموش ہو گئے تھے لیکن جھنجلائے ہوئے تھے۔

طلبہ اور اسٹاف کی یہ رسہ کشی علی گڑھ سے باہر بھی نکلی اخبارات میں ایسے مضامین شائع ہوئے جو طلبہ کے حق میں اور انگریز پرنسپل کے خلاف تھے۔ اس سے پرنسپل کے دل میں مزید بدگمانیاں پیدا ہوئیں۔ اس کے خیال میں یہ مضامین باقاعدہ منصوبے کے تحت لکھوائے جا رہے ہیں۔

دوسری جانب طلبہ کو حوصلہ مل رہا تھا کہ وہ حق پر ہیں اور ان کے ساتھ نا انصافی کی جا رہی ہے۔ بددلی تھی کہ روز بہ روز بڑھتی جا رہی تھی اور کوئی ان پر قابو پانے والا نہیں تھا۔

سرسید کے آخری دنوں میں جو حالات رونما ہوئے تھے اس سے ٹرسٹیوں کا اثر انگلش اسٹاف کے دلوں سے زائل ہو گیا تھا جو اب تک بحال نہ ہو سکا تھا۔ محسن الملک نے جب کام سنبھالا تو وہ بھی کالج کی بیٹھتی ہوئی دیوار اٹھانے میں مشغول رہے۔ انہیں اتنی امید بھی نہیں تھی کہ اگر کوئی وقت پڑا تو ٹرسٹیوں کی جماعت ان کی مدد کرے گی لہذا وہ کالج اور قوم کے بہترین مفاد میں چشم پوشی کرتے رہے اور

مملکت State

ایک کثیرالتعداد انسانی آبادی جو کسی خاص خطہ زمین کے اندر مستقل طور پر سکونت پذیر ہو نیز بیرونی اقتدار سے آزاد ایک باقاعدہ منظم حکومت کے تحت ہو اور قریباً قریباً سب باشندے اس کا حکم مانتے ہوں۔ آبادی، خطہ، زمین، حکومت اور خود مختاری یہ چار چیزیں مملکت کے لیے لازمی شرط ہیں۔ ان میں سے ایک کی عدم موجودگی سے بھی مملکت معرض وجود میں نہیں آسکتی۔

مرسلہ: نادر مرزا۔ راولپنڈی

یہاں کے فیصلے ٹرسٹیوں کو کرنے دیجیے یا آپ کیجیے یہ انگریز پرنسپل کون ہوتا ہے۔ اول تو یہی غلط ہے کہ حکومت پرنسپل شپ کے لیے اپنا نمائندہ بھیجتی ہے۔“

”میرے بچوں تمہیں نہیں معلوم کہ ہم کس حکمت کے ساتھ اس اداے کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ ہندوستان پر ان کی حکومت ہے۔ ہم کب تک ان سے ٹکریں گے۔“

”یہ کالج ہمارے ہم وطنوں کے چندے سے چلتا ہے۔ چندہ جمع کرنے آپ جاتے ہیں یہاں کا انگریز اشاف نہیں جاتا۔ ہم ان کا نہیں آپ کا حکم مانیں گے۔“

”تو پھر میرا حکم مان لو۔ یہ اسٹرائیک ختم کر دو۔ میرے لیے یہ سوہان روح ہے کہ میں جن بچوں کے لیے صحبت مہیا کر رہا ہوں وہ ناخوش ہوں اور اسٹرائیک پر اتر آئیں۔ باہر کتنی بدنامی ہوگی کہ مہدی علی جس ادارے کے لیے ہماری جیبیں خالی کر رہا ہے کالج کا نظم و نسق بھی ٹھیک نہیں کر سکتا۔“

”اسٹرائیک ختم کر دینے سے کیا ہوگا۔ کیا انگریز پرنسپل کلاسوں میں اور کلاسوں سے باہر ہماری تذلیل کرنے سے رک جائیں گے؟ نہیں بلکہ وہ تو اور شیر ہو جائیں گے اب تو ہمارا ایک ہی مطالبہ ہے انگریز اشاف کو نکال باہر کرو۔ ہم اس وقت تک کلاسوں میں نہیں جائیں گے۔ ہماری اسٹرائیک میں مزید شدت آجائے گی۔“

”تم سب کیوں میری جان کے دشمن بن گئے ہو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں ان معاملات کو ٹرسٹیوں کے سامنے اٹھاؤں گا اور یورپین اشاف کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو کم کروں گا۔“

”اس وقت ہمارا ایک ہی مطالبہ ہے کہ غلام حسین کی سزا معاف کی جائے۔“

”اس وقت مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ تم لوگ غلام حسین کی سزا مان لو اور اپنی طرف سے بلا شرط معذرت کر لو۔ اب کسی کو سزا نہیں دی جائے گی۔“

ان کی اس یقین دہانی پر طلبہ نے اسٹرائیک ختم کر دی۔ ایک معذرت نامہ لکھ کر پرنسپل کی خدمت میں پیش بھی کر دیا۔

ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ پرنسپل نے چھ اور طلبہ کو کالج چھوڑنے کا حکم دے دیا۔ اس نئے حکم نامے کے جاری ہوتے ہی پانی سر سے اوتچا ہو گیا۔ طلبہ نے محسن الملک کو ان کا وعدہ یاد دلایا۔

”آپ نے وعدہ کیا تھا کہ اب کسی طالب علم کو سزا نہیں دی جائے گی۔“

محسن الملک نے اپنی بے بسی ظاہر کی اور طلبہ نے کالج بند کر دیا۔

اس کالج کے لیے ستر ٹرسٹیوں کی ایک بااثر جماعت موجود تھی۔ اس جماعت میں جس طبقے کا بڑا عنصر تھا اس وقت اس سے یہ امید ہی نہیں ہو سکتی تھی کہ انگلش اشاف کے خلاف اگر کوئی کارروائی کرنی پڑے گی تو وہ سیکریٹری کا ساتھ دے گی۔ اگر محسن الملک کوئی قدم اٹھاتے بھی تو ٹرسٹیز دو حصوں میں تقسیم ہو جاتے جو کالج کے لیے مزید نقصان دہ ہوتا اسی لیے وہ بے بس ہو گئے لیکن کالج نے جو وقار حاصل کیا تھا وہ اس شورش کے ہاتھوں خاک میں ملتا ہوا دیکھ کر ان کا دل بیٹھ گیا۔

اشاف کو اب بھی اس شورش میں اپنی غلطی نظر نہیں آرہی تھی بلکہ ان کے نزدیک کوئی ایسی بات تھی ہی نہیں جس کی شکایت طلبہ کو کرنی چاہیے تھی۔ جب مرض کا احساس ہی نہ ہو تو علاج کیا ہو۔ وہ تو اس اسٹرائیک کو سیاست کا شاخسانہ سمجھ رہے تھے۔ کم از کم حکومت کو انہوں نے یہی باور کرایا۔

چند کانگریسی اخبار یونین میں آتے ہیں۔ ان کے پڑھنے سے طلبہ کے قلوب اثر پذیر ہوتے ہیں اور اس کے ثبوت میں کانگریس لیڈروں کی وہ مالی امداد کی پیش کش ہے جو انہوں نے اسٹرائیک قائم رکھنے کے لیے طلبہ کو دی ہے یہ

اس کی منظوری پر بے حد اصرار کیا۔

یہ خبر مشہور ہوتے ہی صدا خطوط انہیں موصول ہوئے جن میں استدعا کی گئی تھی کہ وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں قومی اخبارات نے بھی اصرار کیا کہ وہ اپنا استعفیٰ واپس لے لیں۔

صرف مسلمانوں میں نہیں بلکہ اور بہت سے لوگوں میں نواب محسن الملک کے علی گڑھ کالج کے سیکریٹری شپ سے عنقریب مستعفی ہو جانے کی خبر بڑے افسوس کے ساتھ سنی جائے گی۔ نواب محسن الملک نے علی گڑھ کے لیے سخت کوششیں نہایت صداقت اور بے غرضی کے ساتھ کی ہیں۔ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی ان کی سچی گرم جوشی کا نتیجہ ہے۔ ایک مدت دراز تک کام کرنے کے بعد جب زمانہ آرام کا تھا تو انہوں نے علی گڑھ کالج کا کام اپنے ذمہ لیا۔ ہمیں اُمید ہے کہ نواب صاحب قبلہ ایک دفعہ پھر اس رائے پر نظر ثانی فرمائیں گے اور بد نصیب مسلمانوں کی کشتی کو طوفان خیر سمندر کے رحم پر چھوڑ کر علیحدہ نہیں ہوں گے۔ (ٹائمز آف انڈیا)۔

اس موقع پر اولڈ بوائز کا جلسہ بھی ہوا۔ اس میں نئے اور پرانے طلبہ، اسٹاف اور ٹریشیوں کی طرف سے بڑی جوش تفریریں ہوئیں۔ ان تقریروں کا خلاصہ یہ تھا کہ گزشتہ باتوں کو فراموش کیا جائے، رواداری اور اعتماد کی فضا کو برقرار رکھا جائے۔ طلبہ اور اسٹاف کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم کیے جائیں۔

تمام شرکاء نے ان تجاویز پر عہد و پیمانہ کیے اور اجلاس ختم ہوا۔

محسن الملک کو استعفیٰ واپس لینا پڑا لیکن ان کے دل پر جو سخت چوٹ لگی تھی اس نے انہیں سنبھلنے نہیں دیا۔ ایسی مشکلات ان کے لیے نئی نہیں تھیں لیکن اب بڑھاپا تھا۔ اعصاب اس قابل نہیں رہے تھے کہ تکالیف برداشت کرتے۔ وہ بیمار ہو گئے۔ چونکہ بمبئی کی آب و ہوا انہیں راس آگئی تھی اور یہاں طبیعت بحال ہو جاتی تھی لہذا وہ بمبئی چلے گئے۔ بخار نے یہاں بھی ساتھ نہیں چھوڑا۔ دکھ ایسا تھا کہ تم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ دوستوں کے خطوط یہاں بھی پہنچ رہے تھے لیکن اس میں تاب تحریر نہیں تھی۔ وہ مایوسی کی اس منزل پر تھے جہاں انسان کو کوئی اپنا ہمدرد نظر نہیں آتا ان کے ساتھ جو سلوک ہوا تھا وہ سب کو اس کا ذمہ دار ٹھہرا رہے تھے۔ کوئی ایسا نہیں تھا جس کے سامنے وہ اپنا دکھ بیان

کالج کے نظم و نسق کا معاملہ نہیں بلکہ ایک سیاسی معاملہ ہے۔ کالج کے طلبہ کو سیاست سے دور رہنا چاہیے۔

یہ ایک ناشائستہ الزام تھا جو طلبہ پر لگایا جا رہا تھا۔ علی گڑھ کالج کے اکابرین نے طلبہ کو ہمیشہ سیاست سے دور رکھا تھا۔ محسن الملک خود بھی جب حیدرآباد سے ریٹائر ہو کر آئے تو یہ آسانی سیاست کا راستہ اختیار کر سکتے تھے لیکن انہوں نے قومی اصلاح اور تعلیمی خدمات کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ اگر چند سیاسی آرٹیکل لکھے بھی تو اردو ہندی تنازع پر تھے۔ یہی ان کی سیاست تھی۔

طلبہ نے اپنے اوپر لگنے والے الزام کی بھرپور مخالفت کی اور ایک مفصل ٹیلی گرام کے ذریعے گورنمنٹ کو باور کرایا۔ محسن الملک کے خیالات ابتدا ہی سے کانگریس کے بارے میں اچھے نہیں تھے۔ ان طلبہ نے ان کا حوالہ بھی دیا تھا کہ ہم محسن الملک کے تربیت یافتہ ہیں اسی لیے کانگریسی لیڈروں کے دام میں کیسے آسکتے ہیں۔ یہ محض الزام ہے جو ہم پر تھوپا جا رہا ہے۔

ان طلبہ نے محسن الملک سے بھی ملاقات کی اور انہیں یقین دلایا کہ ان کے سیاسی عزائم نہیں۔ یہ انگریزی اسٹاف کی سیاست کا شاخسانہ ہے کہ ہم پر یہ الزام لگایا جا رہا ہے تاکہ ان کی کوتاہیاں دبی رہیں۔

اس شورش کی تحقیقات کے لیے ایک کمیشن قائم ہوا اور اس نے شکایات اور اسباب شورش کی تحقیقات کر کے یہ فیصلہ سنا دیا کہ اس شورش کا تعلق قطعی سیاسی نہیں۔ اس کمیشن نے ایسی تجاویز بھی دیں جن پر عمل کر کے طلبہ اور اسٹاف میں ہم آہنگی پیدا کی جاسکتی تھی۔

یہ کمیشن رخصت ہوا تو لیفٹیننٹ گورنر سر جان ہیوٹ کالج کا معائنہ کرنے کے لیے آئے۔ گورنر نے ایک مرتبہ پھر اس خیال کی تردید کی کہ یہ کوئی سیاسی واقعہ تھا۔ انہوں نے ٹریشیوں کو بھی ہدایت کی کہ وہ اس واقعے کے اسباب کو ختم کرنے کے لیے جرأت سے کام لیں اور یہ اُمید ظاہر کی۔ ”برائی سے بھلائی جلوہ گر ہوگی اور موجودہ پریشانی سے نکل کر کالج اس خوش حالی سے جو اسے اب تک نصیب رہی نسبتاً زیادہ خوش حالی کے دور میں جنم لے گا۔“

گورنر کی آمد دل خوش کن تھی۔ گورنر نے حوصلہ افزائی بھی کی تھی اور ہمدردی بھی لیکن محسن الملک ان حالات سے اور ٹریشی حضرات کے رویے سے ایسے دل برداشتہ ہوئے تھے کہ انہوں نے ٹریشیوں کے سامنے استعفیٰ پیش کر دیا اور

دماغی سخت مطلق نہ کریں۔ اگر ایسا نہ کریں گے تو اندیشہ ہے کہ ہاتھوں کا ریشہ جو اس وقت موجود ہے ترقی پکڑ جائے گا اور لکھنے پڑھنے کے کام سے بالکل معذور کر دے گا۔

کچھ دنوں بعد ڈاکٹروں کی ہدایت پر عمل کرنے کی وجہ سے کچھ افاقہ تو ہو گیا لیکن ڈاکٹروں کا اب یہی مشورہ تھا کہ وہ کسی پہاڑی مقام پر جا کر کچھ دن آرام فرمائیں۔ انہوں نے شملہ جانے کا ارادہ کر لیا۔ ستمبر 1907ء کے آخری ہفتے میں علی گڑھ آئے تاکہ یہاں سے شملہ جا سکیں۔

وہ اس عمر میں بھی ہمیشہ تروتازہ رہا کرتے تھے۔ کالج کے کاموں میں جوانوں کی طرح مشغول رہتے تھے لیکن اس مرتبہ ان کا چہرہ اداس تھا۔ نقاہت کے آثار نمایاں تھے۔

مولانا وحید الدین سلیم ان سے ملنے کے لیے آئے تو ان کی حالت دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ بڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ زیادہ باتیں ماضی قریب کے واقعے یعنی طلبہ کی اسٹرائیک کے بارے میں ہوتی رہیں۔ محسن الملک اس واقعے سے سخت رنجیدہ تھے۔

مولوی وحید الدین سلیم نے ان سے پوچھا۔ ”اب تو تمام معاملات بخیر و خوبی منٹ گئے۔ کیا اب بھی آپ کو کوئی شکایت ہے؟“

محسن الملک نے عجیب حسرت بھری آواز میں جواب دیا۔ ”مولانا! بظاہر کوئی شکایت نہیں مگر میں نہیں جانتا وہ کیا چیز ہے جو میرے اندر سے نکل گئی ہے۔ میرا دل بیٹھ گیا ہے اور اب کسی کام میں اور کسی بات میں لطف نہیں آتا۔“

مولانا وحید الدین نے انہیں تسلی دی۔ ”آپ شملہ تشریف لے جا رہے ہیں۔ خدا کی ذات سے امید ہے کہ شملہ کی آب و ہوا آپ کو اس آئے گی اور اب کوئی شکایت باقی نہیں رہے گی۔“

”ہاں میں بھی یقین کرتا ہوں کہ شملہ پہنچ کر میری تمام شکایتوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔“ محسن الملک نے کچھ دیر تامل کرنے کے بعد جواب دیا۔

وہ شملہ گئے۔ دو ہفتے تک تو حالت رو بہ اصلاح رہی لیکن پھر مرض نے زور باندھا۔ گردن، چہرہ، آنکھوں اور پیشانی پر ورم ہو گیا۔ یہ ورم اتنا شدید تھا کہ ورم کے بوجھ سے آنکھیں بند ہو گئیں۔ پورچین ڈاکٹروں نے دو مرتبہ عمل جراحی کیا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ورم بڑھتا گیا اور دماغ تک اس کا اثر جا پہنچا۔ ڈاکٹر کے مطابق ان کا

کرتے۔ کرتے بھی تو کیوں کرتے۔ وہ دوستوں کے خطوط الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے کہ ان کی نظر مولوی عبداللہ جان کے خط پر پڑی۔ مولوی صاحب کو وہ اپنا ہمدرد سمجھتے تھے۔ انہیں دکھ ہوا کہ اب تک ان کے خط کا جواب کیوں نہیں دیا۔ بہت دن بعد انہوں نے قلم اٹھایا اور مولوی عبداللہ جان (ٹرسٹی) کو خط لکھنے بیٹھ گئے۔

”عنایت نامہ پہنچا۔ میری طبیعت کا کیا حال پوچھتے ہو۔ آپ سب صاحب میری جان کے دشمن ہو کہ جو آپ نجات نہیں دیتے۔ آپ صاحبان سمجھ لیں کہ میرا رنج اور غم میری بیماری اب نہ جاوے گی جب تک میں کالج کا سیکریٹری رہوں گا۔ بہت گالیاں کھائیں بہت آفات ہے مگر اب نہ گالیاں کھانے کی طاقت ہے نہ اپنے معزز ٹرسٹیوں کی طرف سے باضابطہ ذلیل ہونے کی ہمت ہے اور نہ کالج کو جنگ و جدل کا اکھاڑا بنانا منظور ہے ورنہ میں بھی سینے میں دل اور منہ میں زبان اور ہاتھ میں قلم رکھتا ہوں۔ جب چاپ گالیاں سننا اور اپنے آپ کو باضابطہ اور اعلانیہ ذلیل ہونا گوارا نہیں کر سکتا۔“

میں اس وقت ایک خاص وجہ سے مجبور ہو گیا۔ ورنہ اب میں ایک دن کے لیے بھی سیکریٹری رہنا منظور نہ کرتا اور اس کا مجھے رنج ہے اور رنج پوچھو تو یہی میری بیماری ہے اور میں بیماری کا شکر گزار ہوں کہ اس نے اس زمانے میں میری بڑی مدد کی اور گالیوں کے اکھاڑے میں آنے سے روکا۔ خدا میری بیماری کو میری مدد کے لیے قائم رکھے تاکہ سامنے گالیاں کھانے سے بچتا رہوں۔

وہ جب بھی بسببی آتے تھے ان کی صحت بحال ہو جاتی تھی لیکن اس مرتبہ حالت جوں کی توں تھی۔ بخار میں کمی ضرور آگئی تھی لیکن جسم گھلتا جا رہا تھا، کمزوری بے پناہ ہو گئی تھی۔ ڈاکٹروں نے کئی معائنوں کے بعد اپنی رائے کا اظہار کر دیا۔

”دماغ کی حالت ایسی ہے کہ دو مہینے تک کوئی کام نہیں کرنا ہے۔ دل کی حرکت کمزور ہے۔ پھیپڑوں میں خون کا دورہ سست ہے۔ نبض کی رفتار اچھی طرح نہیں معلوم ہوتی۔ ان وجوہ سے ضروری ہے کہ ہفتے عشرے تک بستر سے علیحدہ نہ ہوں۔ اس کے بعد امتحان کیا جائے گا اور بستر سے جدا ہونے کی اجازت اس شرط کے ساتھ دی جائے گی کہ دو مہینے تک کسی پہاڑ پر رہیں اور جسمانی اور خاص طور پر

ہیں ان کے سامنے اس ریزولوشن کی کوئی حقیقت نہیں۔ ہماری بد قسمتی ہوگی اگر انہیں کسی اور جگہ دفن کیا جائے۔ وہ قوم کی امانت تھے اور ان کو دفن کیے جانے کی نسبت رائے دینے کا حق قوم کو ہے۔ اگر ان کے عزیزوں کو اس بات میں کچھ اختلاف ہو تو اس کی وجہ محض ان کے جذبات ہوں گے مگر یقین ہے کہ وہ بھی اس تجویز کو پسند کریں گے اور ہماری اس تحریک کی قدر کریں گے۔“

رات کے دو بج رہے تھے کہ کلکتہ میل ٹرین علی گڑھ اسٹیشن پہنچی۔ معززین شہر، ٹرسٹی حضرات اور طلبہ کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ ٹرین نے جیسے ہی پلیٹ فارم کے قدم پکڑے لوگ دیوانہ وار ٹرین کی طرف دوڑے کہ ڈبے میں جا کر مرحوم کا آخری دیدار کر لیں کیوں کہ عام لوگوں کو ابھی معلوم نہیں تھا کہ کہاں دفن کیا جائے گا۔

انجمن شبانہ المسلمین شملہ کے ارکان، سید سردار علی کی سربراہی میں میت کے ہمراہ تھے کہ ٹرسٹی حضرات نے ان سے اپنی قرارداد کا ذکر کیا اور میت علی گڑھ اسٹیشن پر اتارنی چاہی۔ وصیت درمیان میں آگئی۔ سید سردار علی میت کو حوالے کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ محسن الملک کے عزیز واقارب جو اس وقت وہاں موجود تھے وہ بھی میت کو اٹاوا لے جانے پر بھند تھے۔ اچھا خاصا تنازع اٹھ کھڑا ہوا۔

کسی قدر حجت کے بعد تابوت کی گاڑی علی گڑھ اسٹیشن پر اتار لی گئی۔ اعزہ اب بھی اسرار کر رہے تھے کہ میت کو اٹاوا میں دفن کیا جائے۔

دن نکل آیا تھا اور ابھی کچھ طے نہیں ہو پایا تھا۔ نواب وقار الملک کو بھی اطلاع کر دی گئی۔ وہ بھی پہنچنے والے تھے۔ اسی اثناء میں نواب مرحوم کی بیگم کا تار موصول ہوا۔ اس میں لکھا تھا کہ وصیت کی تحقیقات کی جائے۔ اگر وصیت ثابت نہ ہو تو میت علی گڑھ میں دفن کر دی جائے۔

دن کے کوئی دس بجے ہوں گے کہ نواب وقار الملک اسٹیشن پہنچے۔ انہیں بیگم محسن الملک کا تار دکھایا گیا۔ انہوں نے ٹرسٹیوں کی موجودگی میں وصیت کی تحقیق شروع کی۔ شملہ سے میت کے ساتھ آنے والوں سے طویل بات چیت کی اور جب وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ وصیت کی کوئی حقیقت نہیں تو تابوت گاڑی سے اتار کر ایک پلنگ پر رکھا گیا اور اس پر ایک سفید دو شالہ ڈال کر جنازہ کالج میں لایا گیا۔ نماز جمعہ کے بعد نماز جنازہ ادا

خون زہریلا ہو گیا ہے۔ نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری تھی مرنے سے ایک دن قبل انہوں نے دوستوں اور ملازموں کو جمع کیا۔

”مجھے اب زندگی کا اعتبار نہیں۔ آپ سب صاحب گواہ رہیں کہ میں صدق دل سے کلمہ اسلام پڑھتا رہا ہوں۔ میں نے جو کچھ قومی خدمات کی ہیں وہ نیک نیتی کے ساتھ ہیں۔ اگر ان کاموں میں کوئی غلطی ہوئی تو میں بے قصور ہوں کیوں کہ میری نیت ہر حال میں نیک تھی اور خدا میری نیکی کا شاہد ہے۔“

یہ ان کے آخری الفاظ تھے جو انہوں نے کسی سے کہے۔

16 ویں اکتوبر 1907ء کو شام چھ بجے ان کی روح عالم بالا کی طرف پرواز کر گئی۔

اس حادثے جانکاہ کی خبر راتوں رات پورے ہندوستان کو پہنچا دی گئی۔ دائرے ہند کو بھی اس کی اطلاع پہنچا دی گئی۔

صبح ہوتے ہی بہت سے لوگ اس کوشی کے سامنے جمع ہو گئے جہاں ان کا قیام تھا۔ جنازہ اٹھایا گیا۔ اگرچہ نماز جنازہ جامع مسجد میں ہونی تھی مگر ریل کا وقت قریب تھا اس لیے ایک وسیع میدان میں نماز پڑھائی گئی۔ کالج کے قائم مقام سیکریٹری کو اطلاع کر دی گئی کہ محسن الملک کی وصیت کے مطابق ان کی تدفین اٹاوا میں ہوگی لہذا لاش اٹاوا لے جائے گی۔

یہ اطلاع ملتے ہی ٹرسٹیوں نے فوراً ایک اجلاس کیا اور اس وصیت پر بحث کی گئی کہ ان کی میت اٹاوا میں دفن کی جائے؟ اور مختصر سی بحث کے بعد یہ قرارداد پاس کی کہ ان کو کالج میں سرسید کے پہلو میں دفن کیا جائے نہ کہ اٹاوا میں۔

”نواب محسن الملک کے جو بے شمار احسانات ہیں ان کے اعتراف کا بھی ایک طریقہ ہے۔ سرسید کے پہلو میں دفن کیے جانے کا حق ان کے سوا کسی کو نہیں۔“

”اگر مرحوم نے کوئی وصیت اٹاوا میں دفن کیے جانے سے متعلق کی ہے تو اس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ خان بہادر، زین العابدین کے دفن کے جانے کے بعد یہ ریزولوشن پاس کر دیا گیا تھا کہ آئندہ کوئی شخص کالج میں دفن نہ کیا جائے۔ اس ریزولوشن کا علم نواب صاحب کو تھا اس لیے یہ وصیت کر دی ہوگی لیکن نواب مرحوم کی جو خدمات کالج کے لیے

ہوئی۔ طلبہ۔ ٹرینیان اور شہر کے لوگوں نے مرحوم کا آخری دیدار کیا اور میت کو سرسید مرحوم اور زین العابدین کی قبروں کے درمیان دفن کر دیا گیا۔

تیرے احسان تری یاد بھلانا دل سے خون انصاف ہے احسان فراموشی ہے محسن الملک کوئی گم نام آدمی تو تھے نہیں۔ انتقال کی خبر عام ہوتے ہی مسلمانوں میں صف ماتم بچھ گئی۔ مدارس بند کر دیے گئے۔ مساجد میں قرآن خوانی ہوئی۔ جگہ جگہ جلسے ہوئے۔ تعزیتی خطوط کا تانتا بندھ گیا۔ وائسرائے کی جانب سے بھی تعزیتی پیغام موصول ہوا۔

حکومت ہند کے تمام اعلیٰ عہدے داران نے تعزیتی پیغامات ارسال کیے۔ ان سب میں نواب صاحب کی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا گیا تھا۔

نواب صاحب کی یاد میں منعقد ہونے والے جلسوں میں یہ قرار و اوس پیش کیا جا رہا تھا کہ ان کی خدمات اور احسانات کی شکر گزاری یہ ہے کہ ان کی ایک ایسی شاہکار یادگار قائم کی جائے جو زمانے کی ضرورت کے مناسب اور سارے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے مفید ہو۔

یہ صدائیں ہر طرف سے بلند ہوئیں تو کالج کے ٹرینی حضرات نے ایک جلسہ منعقد کر کے اس پر غور کیا اور بحث و مباحث کے بعد ”یادگار“ کی قرارداد منظور کر لی گئی اور یہ قرار پایا گیا کہ یادگار ایسی ہو جس سے ایک طرف مڈن یونیورسٹی کا مقصد پورا ہوتا ہو اور دوسری طرف کالج کی کوئی اہم ضرورت پوری ہوتی ہو۔

ممبران نے تجویز کیا۔
”ایک لاکھ روپے کے سرمائے سے ایک بورڈنگ ہاؤس بنایا جائے اور اس کی آمدنی سے کالج میں علوم جدیدہ کی چند پروفیسر شپ قائم ہوں۔“
بعد میں ایک لاکھ کی رقم کم معلوم ہوئی اور اسے تین لاکھ تک بڑھا دیا گیا۔ فنڈ جمع کرنے کے لیے کمیٹی قائم ہوئی اور ہر ضلع میں اس کی شاخیں قائم ہوئیں۔

نواب وقار الملک کی جانب سے یہ اپیل شائع ہوئی۔
”یہ طے کیا گیا ہے کہ تین لاکھ روپے کے چندے سے مرحوم کی یادگار قائم کی جائے۔ اس رقم کی آمدنی سے کالج میں پروفیسر شپ قائم کی جائے گی۔ یہ روپے کالج میں بورڈنگ ہاؤس میں لگایا جائے گا جو کہ نواب صاحب

مرحوم کے نام سے نامزد کیا جائے گا۔ اس غرض سے ایک کمیٹی قائم ہو گئی ہے جس کا نام محسن الملک میموریل فنڈ کمیٹی ہے۔“

جو صاحب اس فنڈ میں کم سے کم ایک ہزار روپے دیں گے ان کا نام نامی کنندہ کر کے بورڈنگ ہاؤس کے ایک کمرے پر لگایا جائے گا۔

مسٹر آرچولڈ پرنسپل علی گڑھ کالج اس کمیٹی کے خزانچی ہیں اور روپیا بینک آف بنگال آگرہ میں جمع کرایا جائے گا۔

چندے کی تحریک ابھی شروع نہیں ہوئی تھی کہ قحط رونما ہو گیا۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ ابھی چندہ نہ کھولا جائے کیوں کہ لوگ ابھی اس حالت میں نہیں ہوں گے کہ چندہ دے سکیں۔

قحط کی حالت میں تحفیف ہوتے ہی چندے کی تحریک ہوئی۔ کچھ چندہ جمع بھی ہوا لیکن اس کے بعد ہی یونیورسٹی فنڈ جمع کرنے کی تحریک شروع ہو گئی اور کام کرنے والوں کی تمام توجہ اسے کامیاب بنانے پر مبذول ہو گئی۔

محسن الملک میموریل فنڈ کا کام رک گیا۔

ابھی تک جو عطیات جمع ہوئے تھے اتنے ضرورت تھے کہ ایک عمدہ قسم کی عمارت بنانے کے لیے کافی ہوتے لیکن ہوا کچھ بھی نہیں اگر ہوا تو یہ کہ منٹو سرکل کا ایک بلاک محسن الملک کے نام سے منسوب کیا جانا تجویز ہوا اور یہ بھی صرف تجویز ہی رہی۔ محسن الملک کا کتبہ نظر نہیں آیا۔

حیدرآباد میں ان کے کثیر التعداد دوست اور مداح موجود تھے۔ نہایت جوش کے ساتھ محسن الملک اسکا لرشپ کمیٹی قائم ہوئی۔ کچھ چندہ فراہم بھی ہوا لیکن اتنا نہیں تھا کہ اسکا لرشپ جاری ہوتی۔

یہ معاملہ بھی سرد ہو گیا۔

ہوا تو یہ کہ نواب صاحب کے انتقال کے چار ماہ بعد ان کی بیگم کا بھی انتقال ہو گیا۔ اولاد کوئی بھی نہیں کہ ان کی یادگار کہلانی بس وہ کام یادگار رہ گئے جو انہوں نے اپنی زندگی میں کالج کے لیے کیے تھے۔

ماخوذ

از: حیات محسن
مرتبہ: مولوی محمد امین زبیری
سرسید نمبر، نگار

کراچی کراچی

عبداللہ احمد حسن

شہر کراچی سے تاریخی ورثہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ جب کہ تاریخی ورثے کی حفاظت پر مہذب معاشرے میں فرض ہے مگر ہم ان نوادر جیسی عمارتوں کو کھنڈر میں تبدیل ہوتے خاموشی سے دیکھ رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ کچھ دنوں بعد اس شہر میں تاریخی عمارتیں گنتی کی رہ جائیں گی۔ کئی دہائی قبل کے کراچی کو سامنے لانے کے لیے ایک قابل سائنس تحریر۔

کراچی کی ایک مختصر اور دلچسپ لفظی تصویر

سے مسقط عمان اور علیچی ریاستوں کے ساتھ تجارت شروع ہوئی جس کے بعد اس بستی نے ایک چھوٹے سے شہر کا روپ دھارنا شروع کیا، 1795ء میں خان قلات نے منوڑا میں ایک چھوٹا سا قلعہ بنا کر سندھ کے حکمران کے حوالے کر دیا۔ اس علاقہ کی تجارتی اہمیت کو دیکھتے ہوئے انگریزوں نے 1839ء میں سرچارلس نیپئر کی کمان میں حملہ کیا اور شہر پر قبضہ کر لیا، بعد ازاں 1846ء میں کراچی کو برٹش انڈیا میں ایک ڈسٹرکٹ کی حیثیت دے دی گئی، اس وقت آبادی تقریباً نو ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ اسی سال کراچی میں ہیضہ کی وبا پھیل گئی جس سے نمٹنے کے لیے حکومت نے ایک کنزرویٹو بورڈ بنا دیا جسے بعد ازاں 1852ء میں میونسپل کمیشن میں بدل دیا گیا پھر 1853ء میں ترقی دے کر میونسپل کمیٹی میں تبدیل کر دیا گیا۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں ہانگی سپاہیوں نے کراچی

ہمارے ایک دوست جن کا نام زبیر ہے قریب دس سال قبل وہ اچانک کباڑی بن گئے، جی نہیں آپ غلط سمجھے وہ جو تار پرائیڈ پر بانٹلی کی آوازیں لگانے والے کباڑی نہیں بلکہ ان کو اچانک تاریخ سے دلچسپی ہو گئی اور وہ بھی کراچی کی تاریخ سے، سوانہوں نے کمر کس لی اور نیٹ پر تحقیق شروع کی پھر موٹر سائیکل پر اور اس کے بعد پیدل گھومے اور بہت سی عمارتوں اور جگہوں کا پتہ لگایا۔ اس بار ہم کراچی گئے تو ان کے ساتھ ایک اتوار کا دن گزارا اور کچھ جگہیں دیکھیں، تو سوچا کہ ان معلومات کو سرگزشت کے حوالے کر دیا جائے شاید قارئین میں سے کوئی یہ سب دیکھنا چاہے۔

کراچی تین سو سال قبل تک ایک چھوٹی سی بستی تھی جسے کلاچی کہا جاتا تھا (بعض لوگوں کو اس روایت پر اعتراض ہے) جہاں ماہی گیر رہتے تھے، جن کی نسلیں کھڈہ لیاری میں آباد ہیں۔ سترھویں صدی کے آخر میں یہاں

پرائی کتابوں کا بازار

ہمارا پروگرام یہ بنا تھا کہ صبح گیارہ بجے تک نکل جائیں



گئے مگر زبیر کو کچھ تاخیر ہو گئی تو ہم نے زبیر کو فون پر مطلع کیا کہ ہم صدر جا رہے ہیں وہ تیار ہو کر وہیں آ جائیں، سو ہم صدر میں ریگل چوک کے قریب لگنے والے پرائی کتابوں کے سٹڈے بازار میں پہنچ گئے۔ کافی دن سے ہمارا ارادہ یہاں آنے کا تھا مگر موقع نہیں مل رہا تھا، آج آئے تو واقعی احساس ہوا کہ یہ جگہ صرف ایک بار نہیں بار بار آنے کے قابل ہے۔ وہاں گھوم پھر کر سب اسٹالز دیکھے کچھ خریداری بھی کی اتنے میں زبیر کی کال آ گئی۔ ہم ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھے انہوں نے پوچھا کہ کہاں سے شروع کیا جائے تو ہم نے کہا صدر کے کسی پرانے ریستوراں میں لے چلو جائے پٹیس سے شکم پری کر کے نکلتے ہیں۔

کیفے مبارک

وہ ہمیں انگلر یا اسپتال کے سامنے واقع کیفے مبارک میں لے گئے، یہ ایک پرانا ایرانی ریستوراں ہے جو اب کسی بوہری صاحب کے پاس ہے۔ انہوں نے اس کا بڑا خیال رکھا ہے، ہر چیز نئی معلوم ہوتی ہے۔ دیواروں پر چلو مرغ و چلو کباب وغیرہ کے بورڈ اسی طرح لگے ہوئے تھے جیسے کسی زمانے میں ہم دیکھتے تھے۔ وہاں داخل ہوتے ہی ہمارے سامنے لڑکپن کا دور گھومنے لگا، وہی میز کرسیاں۔ ویسا ہی کاؤنٹر، فضا میں رچی یادوں کی خوشبو، اس وقت ہمارے احساسات کیا تھے ان کو بیان کرنے کے لیے ہمارے پاس

پر قبضہ کر لیا مگر جلد ہی یہ تحریک ناکام ہو گئی اور شہر کا قبضہ ایک بار پھر انگریزوں نے حاصل کر لیا۔ 1878ء میں شہر کو ریل کے ذریعہ باقی ملک سے جوڑ دیا گیا۔ مشہور تاریخی عمارات فریئر ہال اور ایمپریس مارکیٹ بنائی گئیں۔ اسی شہر میں 1876ء میں قائد اعظم پیدا ہوئے جن کی قیادت میں 1947ء میں مسلمانوں نے پاکستان حاصل کیا۔ 1847ء میں کراچی سمیت سندھ کو بمبئی میونسپل کے تابع کر دیا گیا اس وقت تک آبادی بڑھ کر ایک لاکھ پانچ ہزار تک پہنچ گئی تھی جن میں مسلمان، ہندو، پارسی، یہودی، ایرانی، لبنانی اور ان کے علاوہ گوا کے عیسائی تاجر بھی شامل تھے۔ 1900ء میں شاہراہوں پر بڑھتے ہجوم کے پیش نظر ہندوستان کا پہلا ٹراموے کا نظام یہاں متعارف کرایا گیا، ابتدا میں ٹرام کو گھوڑے کھینچتے تھے مگر بعد ازاں میکانیکی گھوڑے یعنی انجن نے ان کی جگہ لے لی۔ 1933ء میں کراچی میونسپل ایکٹ تشکیل دیا گیا اور اسی سال کراچی میونسپل کارپوریشن بنا دیا گیا اس میں سٹاون کونسلر منتخب کئے گئے جن کا تعلق مختلف مذہبی برادریوں سے تھا۔ جناب جمشید نسرwanji جو پارسی برادری سے تعلق رکھتے تھے پہلے میئر منتخب ہوئے جو اس سے پہلے کراچی کے پرانے نظام کے تحت بیس سال تک صدر کے عہدے پر فائز رہے تھے۔ ان کی کئی یادگاریں آج بھی اس شہر میں بکھری ہوئی ہیں۔ ان کو ماڈرن کراچی کا باپ بھی کہا جاتا ہے کیونکہ ان کے دور میں کراچی نے کافی ترقی کی تھی۔ یہ ایک صاف ستھرا شہر تھا جہاں بڑی سڑکیں چوڑے فٹ پاتھ (جو اب ناپید ہیں) خوبصورت عمارتیں اور سب سے بڑی چیز شہریوں کے لیے بنیادی سہولیات تھیں جو بد قسمتی سے اب عنقا ہیں۔ یہاں مختلف اقوام اور مذاہب کے لوگ باہم اتفاق سے رہتے تھے، غرض یہ صحیح معنوں میں ایک کاسموپولٹن شہر تھا۔ 1936ء میں کراچی کو سندھ کے دارالحکومت کی حیثیت دے دی گئی۔ پاکستان بننے کے بعد کراچی کو ملک کا پہلا دارالحکومت بننے کا شرف حاصل ہوا جسے بعد میں اسلام آباد منتقل کر دیا گیا مگر کراچی آج بھی ملک کا سب سے بڑا اور اہم شہر ہے اس کی آبادی ایک اندازے کے مطابق دو کروڑ تک پہنچ چکی ہے۔ یہ کراچی کا ایک مختصر تعارف تھا

رہے ہوں گے اب چند کو چھوڑ کر باقی دھول
ہوشی میں اٹے پڑے تھے۔ برسوں سے ان کی
نہ مرمت ہوئی ہے نہ رنگ و روغن کیا گیا
ہے۔ ہر سو ایک حسرت بھری خاموشی گونج
رہی تھی۔ جب پاکستان بنا تو کراچی میں
پارسیوں کی خاصی آبادی تھی۔ ان کے بڑے
کاروبار تھے اور وہ سیاست میں بھی حصہ لیتے
تھے جیسے جمشید نسرwanجی، جہانگیر کوٹھاری وغیرہ
تھے۔ آج کراچی میں پارسی بہت کم رہ گئے
ہیں۔ ان میں بھی بڑے کاروباری غالباً
صرف بہرام ڈھنشو جی آداری ہیں۔ نئی نسل
تقریباً پاکستان سے جا چکی ہے، کچھ بوڑھے
رہ گئے ہیں جو آہستہ آہستہ ختم ہو رہے ہیں، اب ان کی تعداد
صرف چند ہزار ہی رہ گئی ہے، ایک اندازے کے مطابق
2030ء کے بعد شاید پاکستان میں کوئی پارسی نہیں ملے گا۔



الفاظ نہیں ہیں۔ متنی یادیں، کتنے چہرے، گویا ایک فلم سی
دماغ میں چلنے لگی۔ خیر و شر کو بلایا تو پتا چلا بیٹس نہیں ہیں، زبیر
نے کہا "یوں کریں، اب ایک بچنے والا ہے تو کھانا ہی کھا لیتے
ہیں۔ ہم نے بھی سوچا ٹھیک ہے اور آرڈر دے دیا۔

ویر نے سلیقے سے کھانا چنا اور جب
ہم نے پہلا لقمہ منہ میں ڈالا تو ایک بار پھر
ذہن نے ماضی کی طرف چھلانگ لگائی۔
اس زمانے میں کھائے ہوئے کھانے کا
ذائقہ یاد آیا، اس وقت جو لقمہ منہ میں تھا
اس میں وہی مزہ تھا۔ ہم نے خاصی رغبت
سے کھانا کھایا پھر زبیر نے ایک چائے
منگوائی وہی کیتلی اس کے ساتھ چینی ایک
الگ پیالی میں اور وہ چھلنی جو کپ پر رکھنی
تھی۔ ساتھ ہی ایک خالی کپ کیونکہ اس
ایک چائے کے سیٹ میں دو کپ چائے

ہوتی ہے۔ چائے کا گھونٹ لیا تو ایک بار پھر ماضی سامنے آ
کھڑا ہوا۔ ہمیں لگا جیسے ابھی ہم چند دوست فلم دیکھنے آئے ہیں
اور انتظار کا وقت ایرانی چائے پی کر گزار رہے ہیں۔ غرض یہ
تجربہ اتنا شاندار رہا کہ کیا بتائیں ہم زبیر کے ممنون ہیں جن کی
وجہ سے ہم نے حال میں رہتے ہوئے ماضی کا چکر لگایا۔

پارسی کالونی

اب گاڑی کا رخ کترک پارسی کالونی کی طرف تھا جو
سو لجر بازار جمشید کوآرٹرز میں واقع ہے۔ وہاں پہنچتے ہی یوں
لگا گویا ہم کراچی میں نہیں ہیں، ہر سو خاموشی اور سکون تھا، نہ
ٹریفک نہ لوگوں کا ہجوم، وہاں بڑے بڑے بنگلے تھے مگر اپنی
حالت پر نوحہ کناں کیونکہ ان بنگلوں پر جو یقیناً کبھی شاندار



اسی جگہ ایک پارک بھی تھا مگر اس کا دروازہ مقفل تھا ہم نے
سلاخوں سے دیکھا تو ایک چھوٹا مگر خوبصورت پارک نظر آیا،
یقیناً یہاں شام کو بزرگ جمع ہو کر ہوا خوری کرتے ہوں گے
اور باتوں میں وقت گزارتے ہوں گے۔ یہاں ایک آنکھوں
کا اسپتال بھی نظر آیا بورڈ پر ڈاکٹر ایس ڈی انگلرسر یا آئی
اسپتال لکھا تھا۔ مگر بورڈ کی حالت خاصی بری تھی۔ رنگ اڑ چکا
تھا اور رنگ آلود تھا، جبکہ ایک چھوٹا بورڈ قدرے بہتر حالت
میں تھا۔ صدر میں واقع انگلرسر یا اسپتال بھی ایک تاریخی
عمارت ہے جسے ڈاکٹر برجر انگلرسر یا اور گل بانو نے بنوایا تھا۔

جانوروں کی سبیل

اب ہمارا رخ سو لجر بازار ہی میں واقع ایک جگہ کی



طرف تھا جس کا اب صرف بورڈ رہ گیا ہے اصل چیز تجاوزات کا شکار ہو چکی ہے۔ پہلے کراچی میں گھوڑا گاڑیاں اور تانگے چلتے تھے مگر اب یہ سواریاں ناپید ہوتی جا رہی ہیں، پرانے کراچی میں کئی جگہ مخیر حضرات نے چھوٹے چھوٹے حوض بنائے ہوئے تھے جو ہم وقت صاف پانی سے بھرے رہتے تھے، جہاں سے پیاسے جانور پانی پیتے تھے۔ آج کے لوگوں کو عجیب لگ رہا ہو گا مگر ایک زمانے میں

اندر کی طرف واقع ہے، اس کی وجہ سے اس علاقہ کو گرو مندر کہا جاتا تھا اور آج تک یہی کہلاتا ہے۔ یہ ایک چھوٹا چار دیواری میں گھرا ہوا مندر ہے۔ اس مندر پر لگی تختی کے مطابق آنجنمانی سیٹھ شواجی بھائی سار کی یاد میں ان کے بیٹے سونی ہیر جی بھائی نے مندر کی چار دیواری اور نائل وغیرہ کا خرچہ دیا تھا۔ وہاں چیلیں دیکھ کر ہم نے دروازے پر لگی گھنٹی بجائی مگر آج کراچی کے جو حالات ہیں ان میں ہر شخص دوسرے سے خوفزدہ ہے، شاید اسی وجہ سے کسی نے نہ دروازہ کھولا نہ جواب دیا۔

ایسا بھی تھا، آج یہاں انسان کو بھی کوئی سہولت نہیں ملتی بیچارے جانور تو کسی گنتی میں ہی نہیں ہیں۔ جی تو ذکر ہو رہا تھا سو بھر بازار میں واقع جانوروں کی سبیل کا جہاں صرف بورڈ رہ گیا ہے جو بتاتا ہے کہ جناب فرامرزی ای پانٹھا کی نے یہ حوض بنوایا تھا۔ ذرا سوازنہ کیجئے اس وقت کے کراچی کا آج کے کراچی سے۔ اب وہاں کوئی حوض نہیں ہے اس کی جگہ دکان بنی ہوئی ہے۔

گرو مندر کا مندر

ہمارا اگلا شاپ تھا گرو مندر، ہم ہمیشہ یہ نام سنتے تھے مگر اس کی وجہ تسمیہ کیا ہے آج پتا چلا، یہ ایک مندر ہے جو ذرا

مندر کے شیر بنگلے پر

اب زیر نے کہا ایک خاص چیز دکھاتا ہوں، ہم نے کہا چلو۔ ہم طارق روڈ کے علاقے میں پہنچے، زیر نے ایک طرف اشارہ کیا دیکھا تو ایک بڑا سا بنگلا تھا جس میں گیٹ کے اوپر دو شیر بنے ہوئے تھے مگر کچھ عجیب سے لگ رہے تھے، ہمیں سمجھ نہیں آیا تو زیر نے بتایا بنگلا نیا ہے مگر شیر بہت پرانے ہیں، میٹھادر کے علاقہ میں ایک جگہ گنوگلی کے نام سے مشہور ہے وہاں ایک پرانا مندر ہے یہ شیر اصل میں اسی مندر میں لگے ہوئے تھے مگر ایک صاحب نے وہاں سے اکھاڑ کر اپنے بنگلے پر لگا لیے اب شاید وہ خود بنگلا بیچ کر وہاں سے جا چکے ہیں مگر شیر آج بھی وہیں لگے ہوئے ہیں۔ اب ہماری الجھن دور ہوئی دراصل یہ شیر اس عمارت کا حصہ نہیں لگ رہے تھے ان کی قدامت ظاہر ہو رہی تھی اسی لیے ہمیں کچھ عجیب لگ رہا تھا۔



صدر

اب ہم صدر میں ہیں، سامنے سینٹ پیٹرک چرچ کی عمارت ہے مگر داخلے کی اُمید نہیں، اس جگہ 1845ء میں غالباً سندھ کا پہلا چرچ بنایا گیا تھا اور اسے سینٹ پیٹرک کا نام دیا گیا تھا بعد ازاں یہاں موجودہ بڑا چرچ بنا دیا گیا مگر

وقت یہ مارکیٹ دور سے واضح نظر آتی تھی۔ یہی وہ مقام تھا جہاں 1857ء میں بغاوت کرنے والے سپاہیوں کو بڑی بے رحمی کے ساتھ موت کی سزائیں دی گئی تھیں، تاکہ دوسرے عبرت پکڑیں، ان کو سرعام توپ کے گولوں سے اڑایا گیا تھا تاکہ کوئی اور بغاوت کا سوچ بھی نہ سکے۔ اس کی بنیاد بمبئی کے گورنر جیمس فرگوسن نے 1884ء میں رکھی تھی، اسی نے میری ویدرناور جسے اب صرف ناور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے کی بنیاد بھی رکھی تھی۔ اس کا ڈیزائن جیمس



اسٹرکچرن نے بنایا تھا اور بنیاد ایک انگریزی فرم اے جے الفیلڈ نے بنائی جبکہ عمارت کی تعمیر ایک مقامی فرم محمود نوان اینڈ دولوہیجیو نے کی۔ اس میں قریب دو سو اتنی دکانوں اور اسٹالز کی گنجائش رکھی گئی تھی اور قریب ہی ایک تفریحی پارک بھی بنایا گیا تھا، یوں سمجھیں یہ اس دور کا ایک شاپنگ مال تھا جہاں خریدار کو اپنی ضرورت کی تقریباً ہر چیز مل جاتی تھی، اور صرف یہی نہیں انگریزوں نے ایسی سات مارکیٹیں یا مالز کراچی میں مختلف مقامات پر بنائی تھیں۔

گلبائی میٹرنیٹی ہوم

ایمپرس مارکیٹ کی لائن میں صدر کی طرف بڑھیں تو کچھ آگے ایک پرانی عمارت آپ کو نظر آتی ہے، یہ گلبائی نسر وانجی مہتا پارسی میٹرنیٹی ہوم ہے جو جناب جمشید نسر وانجی



چھوٹا چرچ بھی کام کرتا رہا یہاں تک کہ 1885ء میں آنے والے ایک طوفان نے چھوٹے چرچ کو تباہ کر دیا۔ اب ہم نے کئی اشار کا رخ کیا یہاں گوا سے آنے والے لوگ رہتے ہیں۔ یہ مذہباً عیسائی ہیں۔ کئی اشار پران کا گون یونین ہال ہے۔ یہ عمارت 1888ء میں تیار ہوئی تھی، اس عمارت کی لوکیشن ایسی ہے کہ ایک پتلی سی عمارت نے روڈ کو دو حصوں میں بانٹا ہوا ہے ایک جانب طبی آلات کی دکانیں ہیں دوسری جانب اسلحہ فروشوں کی گویا اس عمارت نے زندگی اور موت کے درمیان حد فاصل قائم کی ہوئی ہے۔ اس عمارت کے سامنے جہاں اسلحہ فروش ہیں اسی جانب وہ جگہ بھی ہے جہاں پارسی اپنے مردے کو تیار کرتے ہیں، جیسا کہ آپ جانتے ہوں گے کہ پارسی نہ مردے کو دفن کرتے ہیں نہ جلاتے ہیں بلکہ وہ اس کو چیل کوؤں اور گدھ وغیرہ کی خوراک بننے کے لیے مخصوص مقام پر رکھ دیتے ہیں مگر اس سے پہلے جو مردے کی تیاری کا مرحلہ ہوتا ہے وہ یہاں انجام پاتا ہے۔

کچھ آگے آئیں تو دائیں ہاتھ پر ایک بورڈ نظر آئے گا یہ پارسیوں کی عبادت گاہ یعنی آتش کدہ ہے، بورڈ پر لکھا ہے 'انج جے بہرانا پارسی دارمہر' یہاں غیر پارسی کا داخلہ سختی سے منع ہے۔ یہ عمارت 1948ء میں تعمیر ہوئی۔

ایمپرس مارکیٹ

یہ صدر کا مشہور ترین اور مہم جو مقام ہے۔ یہ مارکیٹ انگریز دور میں 1884ء سے 1889ء کے دوران تعمیر ہوئی اس کا نام ملکہ وکٹوریہ ایمپریس آف انڈیا کے لقب پر رکھا گیا۔ اس کی تعمیر کے لیے خوب سوچ سمجھ کر یہ جگہ چنی گئی تھی جہاں کوئی تعمیرات نہیں تھیں اس

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

بچتے ہیں برنس روڈ پر جو غالباً کراچی کی پہلی فوڈ اسٹریٹ ہے، یہاں لسی پی کرتا زہ دم ہو کر پھر اپنے تاریخ کے سفر پر نکل گئے۔

خالقینا ہال

یہ ایم اے جناح روڈ پر واقع غلام حسین خالقینا ہال اینڈ لائبریری ہے۔ اس کا خوبصورت طرز تعمیر آپ کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے۔ اس کی تعمیر 1906ء میں ہوئی تھی، کل لاگت تینتیس ہزار روپے تھی جس میں سے اٹھارہ ہزار غلام حسین خالقینا نے دیے جبکہ باقی رقم بلد یہ کراچی نے دی۔



اس کی تعمیر ادبی سرگرمیوں کے لیے ہوئی تھی مگر اس عمارت کو خاص شہرت تب ملی جب مولوی شوکت علی اور مولوی محمد علی جوہر پر خلافت موومنٹ میں حصہ لینے کے الزام میں مقدمہ چلا، انگریزوں نے اس عمارت کو کورٹ بنا کر دونوں بھائیوں پر مشہور مقدمہ بغاوت چلایا تھا۔

آرام باغ

یہاں سکھوں کا ایک گردوارہ ہے، یہ گردوارہ اب بند ہے اس لیے ہم صرف باہر سے ہی دیکھ سکے۔ آگے روڈ پر ایک پرانی خستہ حال مگر خوبصورت عمارت نظر آئی جس کی تفصیل نامعلوم ہے۔

ہائی کورٹ

یہ بھی ایک خوبصورت پرانی عمارت ہے۔ اس کی تعمیر 1923ء میں شروع ہوئی اور 1929ء میں مکمل ہوئی، اس پر کل لاگت 3975248 روپے آئی۔ بعد میں پاکستان حکومت نے اس میں توسیع کی مگر اصل عمارت کو یونہی رکھا

نے تعمیر کروایا تھا، احاطہ میں فوارہ کے پاس لگی ایک کتاب نما سختی پر لکھا ہے جمشید نسر وانجی نے اپنے والد رستم نسر وانجی مہتا کی یاد میں 1920ء میں بنوایا۔ میٹریٹی ہوم کا سنگ بنیاد 1917ء میں رکھا گیا اور 1919ء میں اس کا افتتاح سزجے ایل ریونے کیا۔ یہاں خان بہادر نسر وانجی مہتا کی یادگار بھی بنائی گئی ہے۔ احاطہ میں گھومتے ہوئے ہم عمارت کے عقب میں بچتے تو دیکھا وہاں دو چھوٹی عمارتیں بنی ہوئی ہیں اور وہاں لوگ رہائش پذیر ہیں، ان سے بات کی تو ان کا بیان تھا کہ یہ عمارتیں اسپتال کے اسٹاف کے لیے بنائی گئی تھیں جو بعد میں ان کو مستقل رہائش کے لیے دے دی گئیں اور یہ لوگ ان ہی کی اولاد میں سے ہیں۔

رتن تلاؤ۔ اردو بازار۔ برنس روڈ

یہاں اب بھی بہت سی انگریز دور کی عمارات ہیں ایک عمارت جو اندر کے روڈ پر ہے اس پر ہندوستان کے جھنڈے بنے ہوئے ہیں اور ہندی زبان میں سوراج بھون لکھا ہوا ہے۔ اردو بازار میں ایک عمارت ہے جس کی گیلریوں کی جالی پر گاندھی کی تصویریں بنی ہوئی ہیں، اور بھی کافی پرانی عمارتیں یہاں موجود ہیں مگر پر ہندو نام لگے ہیں کسی پر دیوی دیوتاؤں کی مورٹیاں بنی ہوئی ہیں۔

اوپر یہ کیا وہ اکیلا کھڑا ہے اداس در ماندہ خستہ حال، جی ہاں یہ ایک لیٹر بکس ہے جسے دیکھنے کو آگے نہیں ترس گئی ہیں آج برسوں بعد یہاں نظر آیا تو اس حال میں کہ اپنی حالت پر ماتم کناں تھا، ایک زمانہ تھا جب اس کی بڑی اہمیت تھی مگر آج سائینس کی ترقی نے اسے اس حال کو پہنچا دیا ہے کہ



اب کوئی اس سے رجوع نہیں کرتا نہ کوئی خط ڈالتا ہے نہ ڈاکیا خط نکالنے آتا ہے۔ وہ زمانے بھی تھے جب لوگ خط آنے کا انتظار کرتے تھے۔ ڈاکیا اپنی سائیکل پر مخصوص تھنٹی بجا کر اپنی آمد کا اعلان کرتا تھا مگر وقت وقت کی بات ہے اب تو، جی ہاں اب یہ ای میل اور ایس ایم ایس کا دور ہے۔ اب ہم

اور اس سے متصل نئی عمارتیں بنوائیں۔

آزادی کے بعد پاکستان روئل آرمی کے سربراہ بنے تھے۔

اسی لیے اس کو فلیگ اسٹاف ہاؤس کے نام سے موسوم کیا گیا۔ یہ مکان قائد اعظم کی ملکیت میں 1943ء میں آیا جب اسے کراچی کے ایک سابق میئر سے ایک لاکھ پندرہ ہزار روپے میں خریدا گیا۔ ستمبر 1947ء میں قائد اعظم کا سامان ۱۰ اور نگزیب روڈ دہلی سے یہاں منتقل کیا گیا۔ قائد اعظم نے اس کو گورنر جنرل ہاؤس کے طور پر

فری میسنز لاج

ہم پی آئی اے کے دفتر کے سامنے وائی ایم سی اے گراؤنڈ کی لائن میں واقع اس عمارت میں پہنچے جس پر محکمہ جنگلی حیات کا بورڈ آویزاں ہے۔ اندر پہنچ کر ہماری نظر ایک تختی پر پڑی جس پر دجال کا نشان بنا ہوا تھا، یہ عمارت



استعمال کیا۔ 31 ستمبر 1948ء کو قائد اعظم کی رحلت کے بعد محترمہ فاطمہ جناح یہاں منتقل ہو گئیں اور اس کو خاندانی رہائش کی حیثیت دے دی گئی۔ فاطمہ جناح یہاں 1964ء تک رہائش پذیر رہیں پھر وہ موہٹا ہیلس یا قصر فاطمہ منتقل ہو گئیں، تاہم قائد کی بہن محترمہ شیریں بائی اپنی وفات تک یہاں رہیں۔ ان کے بعد یہ مکان قائد اعظم ٹرسٹ نے سنبھال لیا۔ 1985ء میں یہ مکان

حکومت پاکستان نے ٹرسٹ سے خرید لیا اور اس کو قائد اعظم ہاؤس کا نام دے کر بطور میوزیم عوام کے لیے 25 نومبر 1993ء کو کھول دیا گیا۔ ہم یہاں چار بجے پہنچے تو ہمیں بتایا گیا کہ میوزیم کا وقت چار بجے ختم ہو جاتا ہے۔ خیر یہ پہلے بھی دیکھا ہوا ہے اس لیے ہم آگے بڑھ گئے۔

1914ء میں فری میسنز ٹرسٹ نے بنائی تھی اور انہوں نے اس کو جاودگمر کا نام دیا تھا۔ اس عمارت کو فری میسنز نے کئی برس اپنے اجتماعات کے لیے استعمال کیا، اس وقت مقامی لوگوں کو کچھ پتا نہیں تھا کہ یہاں کیا سرگرمیاں ہو رہی ہیں، بالآخر 1972ء میں پاکستان میں فری میسنز پر پابندی عائد کر دی گئی اور یہ عمارت حکومت نے اپنے قبضہ میں لے لی جسے بعد ازاں محکمہ جنگلی حیات کو دے دیا گیا۔ یہاں اب بھی کئی جگہ تختیوں دیواروں اور لکڑی پر فری میسنز کا مخصوص نشان کندہ ہے اور اس عمارت کے بارے میں لکھا ہے۔

جوناکڑہ ہاؤس اور

نواب صاحب سے ملاقات

کچھ آگے بڑھے تو دفعتاً زیر نے ایک سبز رنگ کے گیٹ کے سامنے بریک لگا دیا جس پر مخصوص نشان بنا ہوا تھا (بعد میں پتا چلا کہ یہ ریاست جوناکڑہ کا شاہی نشان ہے) اور ہم سے کہا پتا ہے یہ کون سی جگہ ہے، ہم نے لاعلمی ظاہر کی تو انہوں نے بتایا کہ یہ نواب آف جوناکڑہ کی رہائش گاہ ہے۔

ہم نے اس بارے میں سنا ہوا تھا اور کھوڑا بہت جوناکڑہ کے بارے میں پڑھا ہوا بھی تھا، ہم نے زیر سے پوچھا، کیا نواب صاحب سے ملاقات ممکن ہے۔ وہ بولے کچھ کہہ نہیں سکتے تو ہم نے گیٹ پر موجود گارڈ سے بات کی، ہم نے استفسار کیا، کیا نواب صاحب تشریف



قائد اعظم ہاؤس میوزیم

یہ اسٹاف فلیگ ہاؤس کے نام سے بھی مشہور ہے۔ یہ میوزیم میٹروپول ہونل کے عقب میں ہے۔ یہ مکان انیسویں صدی کے آخر میں بنایا گیا تھا اور اس کی ملکیت

1922ء تک رام چندر چھی لوہانا کے پاس تھی۔ 1940ء سے برٹش انڈین آرمی نے اسے کرائے پر لے کر اپنے سینئر آفیسرز کو رہائش کے لیے دے دیا۔ جن میں جنرل ڈگلس ڈی گریسی بھی شامل تھے جو



رکتے ہیں۔ گارڈ نے اثبات میں جواب دیا تو ہم نے اپنا تعارف کروایا کہ ہم بیرون ملک سے آئے ہیں اور نواب صاحب سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ گارڈ نے نو بڑا وہ صاحب سے رابطہ کر کے ہم سے بات کروائی ہم نے اپنے بارے میں بتایا اور صاف کہہ دیا کہ ہم ملنا چاہتے ہیں مگر ہم چونکہ اچانک بغیر کسی پیشگی پروگرام کے آئے ہیں اس لیے باضابطہ طور پر وقت نہیں لیا ہوا تو اگر ملاقات ممکن ہو تو ہمارے لیے باعث صد افتخار ہوگی، انہوں نے اپنا اطمینان کر کے ہمیں آنے کی اجازت دی۔ ہمیں اندر ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا۔ کچھ دیر بعد نواب محمد جہانگیر خانگی صاحب تشریف لے آئے۔ ہم نے حیرت سے دیکھا کہ ہمارے سامنے جو شخصیت تھی وہ سادگی اور وقار کی تصویر تھی، جس میں غرور و تکبر کا نام و نشان تک نہ تھا، پھر ان کا انداز گفتگو، ذرا ہی سی دیر میں یوں محسوس ہو رہا تھا گویا ہم انہیں برسوں سے جانتے ہوں۔ کچھ ذاتی گفتگو ہوئی کچھ جو ناگڑھ اسٹیٹ کے بارے میں ہوئی چونکہ وہ گفتگو آؤٹ آف ریکارڈ ہے اس لیے ہم یہاں تحریر نہ کرتے ہوئے آپ کو جو ناگڑھ کے بارے میں مختصر آتاتے ہیں۔

یہ ریاست کاٹھیاواڑ میں بحیرہ عرب کے کنارے پور بندر اور امریلی کے درمیان واقع ہے، یہ ریاست مغلوں کے زمانے میں نواب صاحب کے اجداد کو دی گئی تھی جب مغل سلطنت کمزور ہو گئی تو بہت سی اور ریاستوں کی طرح جو ناگڑھ نے بھی آزادی کا اعلان کر دیا اور اٹھارویں صدی سے ایک آزاد ریاست کے طور پر رہی۔ یہ ایک خوشحال ریاست تھی جس کے خزانے بھرے ہوئے تھے، اس کا رقبہ 3336 مربع میل تھا، یہ زرخیز زمین تھی، اس ریاست میں جو راجی میل سمندری ساحل شامل تھا جس میں خوبصورت

اور چمکدار سنہری ریت پر مشتمل بیچ بھی تھے۔ یہاں سولہ پورٹس تھیں اور 999 شہر، گاؤں اور قصبے تھے۔ دارالحکومت جو ناگڑھ نامی شہر ہے جو گرنار اور داٹھرنامی پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر واقع ہے، یہاں خوبصورت ودلچسپ عمارتیں اور مہاراج اشوک نے جو نقوش کالے گرینائٹ پر کھدوائے تھے وہ بھی ہیں، گرنار کی پہاڑیوں کے دامن میں گرنامی وسیع جنگل ہے جو 494 مربع میل پر مشتمل ہے جہاں جو ناگڑھ کی مشہور جنگلی حیات پائی جاتی ہے جن میں ایشیائی ببر شیر بھی شامل ہیں۔ یہاں پارکس کا اوسط تیس سے پینتیس اچے سالانہ ہے۔ ہندوستان کی تقسیم کا اعلان ہونے کے بعد اس وقت کے نواب مہابت خانگی صاحب جو موجودہ نواب صاحب کے دادا تھے پاکستان تشریف لائے مقصد تھا کہ جو ناگڑھ کا الحاق پاکستان سے کر دیا جائے، اس سلسلے میں نواب صاحب اور قائد اعظم کے درمیان پندرہ ستمبر 1947ء کو معاہدہ ہو گیا کہ جو ناگڑھ اب پاکستان کا حصہ ہے مگر نہرو نے کشمیر کی طرح جو ناگڑھ پر بھی زبردستی قبضہ کر لیا، ہندوستانی فوج 9 نومبر 1947ء کو جو ناگڑھ میں داخل ہو گئی۔ اس وقت وہاں کے دیوان یعنی وزیر اعظم سر شاہنواز بھٹو تھے جو ذوالفقار علی بھٹو کے والد اور بینظیر بھٹو کے دادا تھے۔ تب سے اقوام متحدہ میں یہ کیس موجود ہے مگر کشمیر کی طرح یہ مسئلہ بھی ہنوز التواء کا شکار ہے۔

نواب صاحب نے اپنے صاحبزادے سے ملوایا جن کا نام نوابزادہ علی مختار خانگی ہے۔ ایک خوبصورت اور ناقابل فراموش ملاقات کی خوشگوار یادوں کے ساتھ ہم نے نواب صاحب سے رخصت مانگی اور وہاں سے نکل آئے۔

موہٹا پیلس

اب ہم اولڈ کلفٹن پر واقع موہٹا پیلس کے سامنے تھے۔ وقت تنگ تھا مگر ہمیں ٹکٹ مل گئے۔ یہ محل نما بنگلہ راجھستان کے مشہور تاجر شورتن موہٹا نے 1927ء میں برصغیر کے



آنجنہانی سچیت سٹکھ جی کی آواز گونجنے لگی، یہ دولت بھی لے لو
یہ شہرت بھی لے لو، بھلے چھین لو مجھ سے میری جوانی، مگر مجھ کو
لوٹا دو بچپن کا ساون، وہ کاغذ کی کشتی وہ بارش کا پانی۔

پہلے مسلمان آرکیٹکٹ آغا احمد حسین کے تیار کردہ ڈیزائن پر
بنوایا تھا، آغا احمد حسین کا تعلق ہے پور سے تھا وہ میونسپل
کارپوریشن میں چیف سرویئر تھے انہوں نے بے پور کے فن

تعمیر کے زیر اثر اسے اینگلو مغلیہ انداز
میں بنایا۔ آزادی کے بعد حکومت
پاکستان نے اس میں وزارت خارجہ
کا دفتر قائم کر دیا، جب اسلام آباد
دارالحکومت بن گیا اور دفاتر وہاں
منتقل ہو گئے تو یہ عمارت محترمہ فاطمہ
جناب کور ہائش کے لیے دے دی
گئی۔ وہ یہاں اپنی وفات
1967ء تک رہیں ان کے بعد یہ
جائیداد ان کی بہن شیریں جناح کول
گئی تاہم ان کے انتقال کے بعد یہ
متنازعہ جائیداد کی حیثیت اختیار کر گئی



شہری رتنیسور مہادیو مندر

ہم اب کلکشن پر ہیں، یہاں یہ قدیم مندر ہے جو قریب
۱۵۰ سال پرانا ہے اور آج بھی یہاں پوجا ہوتی ہے۔ ہم
نے اندر جانے کا پوچھا تو جواب ملا کہ ابھی پوجا ہو رہی ہے
اگر آپ اندر جانا چاہتے ہیں تو منگل کی صبح کو آجائیں ویسے
اجازت نہیں ہے۔ بحر یہ ٹاؤن کے موجودہ کام کی وجہ سے یہ
مندر اور جہانگیر کوٹھاری پریڈ وغیرہ کو خطرہ پیدا ہو گیا تھا
کیونکہ تاریخی آثار سے ایک مخصوص فاصلہ چھوڑ کر کام کیا جا
سکتا ہے تاکہ ان آثار کو نقصان نہ پہنچے مگر یہ پاکستان ہے۔
جب اس مندر میں کریک پڑنے کی شکایات آئیں جس پر
میڈیا اور سول سوسائٹی نے فوری ایکشن لیا اور سندھ ہائی
کورٹ نے آرڈر جاری کیا اور نہ شاید یہاں کچھ نہ بچتا۔

پلے لینڈ، فن لینڈ اور ماہی خانہ

ہر طرف ملک ریاض کی پھیلائی ہوئی مٹی اڑ رہی
ہے۔ سامنے دیکھا تو پتا چلا کہ اب یہاں پلے لینڈ نامی کوئی
چیز نہیں ہے۔ اس پر جو دکھ ہم نے محسوس کیا وہ بیان سے باہر
ہے۔ ہماری طرح جن لوگوں کی بچپن کی یادیں پلے لینڈ سے
جڑی ہوں گی وہی اس دکھ کو محسوس کر سکتے ہیں ہم اپنے بچپن
میں یہاں آیا کرتے تھے جب کچھ بڑے ہوئے تو بہن
بھائیوں کو لانا شروع کیا، بڑی یادیں وابستہ ہیں یہاں سے

اور لاوارث عمارات کے زمرے میں آئی۔ 1995ء میں
اسے سندھ حکومت کی مدد سے حکومت پاکستان نے باقاعدہ
خرید کر ایک خود مختار بورڈ آف ٹرسٹیز کے حوالے کر دیا تاکہ
اسے پاکستانی ورثہ کا میوزیم بنایا جاسکے۔ 15 ستمبر 1995ء
کو تالپور حکمرانوں کے نوادرات سے اس کا افتتاح کیا گیا۔
تب سے اب تک یہاں مختلف نمائشوں کا اہتمام کیا جاتا رہا
ہے۔ کہتے ہیں جب مستقل نوادرات مل جائیں گے تو اسے
بھی مستقل میوزیم کی حیثیت دے دی جائے گی، ہمارے
خیال سے تو یہ ایک لطیفہ ہی ہے اس خیال است محال است و
جنوں است کیونکہ پاکستان چوک پر واقع نیشنل میوزیم کی
تباہی کو دیکھتے ہوئے کیا امید کی جاسکتی ہے۔

موہٹا پیلس کے عقبی حصہ میں چند بت رکھے ہیں جو
انگریزوں کے دور میں سڑکوں پر آویزاں رہے ہوں گے ان
میں ملکہ وکٹوریہ کا بت بھی شامل ہے۔ ارے یہ کیا ہے اچانک
ہماری نظروں کے سامنے ہمارا بچپن گھومنے لگا، یہ ہم نے کیا
دیکھ لیا..... جی وہاں دو شیروں کے دھاتی مجسمے رکھے ہوئے
تھے اور ان مجسموں سے ہمارا بچپن جڑا ہوا تھا۔ یہ مجسمے چڑیا گھر
میں لگے ہوئے تھے اور ہم نے انہیں وہیں دیکھا تھا اور نہ
صرف دیکھا تھا بلکہ متعدد بار ان پر سوار ہوئے تھے ہم نے
ان پر چڑھ کر تصویریں بنوائی تھیں اب یہ یہاں رکھے ہیں،
آج کیفے مبارک نے ہمیں لڑکپن کی سیر کروائی تھی مگر ان
شیروں نے تو ہمیں بچپن میں پہنچا دیا۔ ہمارے کانوں میں

انہوں نے تین لاکھ روپے خرچ کر کے یہ یادگار بنا کر کراچی کے شہریوں کو عطیہ کر دی۔ اس کی تعمیر 1919ء میں شروع ہوئی اور 1920ء میں پایڈ تکمیل کو پہنچی۔ افتتاح لیڈی لوئڈ نے خود اپنے ہاتھ سے کیا۔ اب اس میں توسیع کر دی گئی ہے اور میڑھیاں کافی دور تک جاتی ہیں۔



جمشید نسر وانجی بلڈنگ

کراچی کھارادر میں بانکڑا ہول کے سامنے یہ بلڈنگ ایک سو سال سے کھڑی تھی، مالکان نے

اس کو 1991ء میں فروخت کرنے کا فیصلہ کر لیا کہ خریدنے والا اس کو توڑ کر یہاں کوئی بڑی شاندار بلڈنگ یا مال کھڑا کر دے گا۔ انہی دنوں انڈسٹریل اسکول آف آرٹس اینڈ آرکیٹیکچر والوں کو اپنے پلاٹ واقع کلنٹن پر کیسپس بنانے کا خیال آیا، وہ کوئی ایسا ڈیزائن چاہتے تھے جو آرکیٹیکچر کا شاہکار ہو۔ چند ہی دنوں بعد انڈسٹریل کے بانیوں میں سے ایک شاہد عبداللہ نے خوشی سے اعلان کیا کہ مجھے ایک خوبصورت پرانی عمارت مل گئی ہے جو کھارادر میں ہے اور برائے فروخت ہے، ہم اس کو ضائع ہونے سے بچائیں گے اور اپنے پلاٹ پر منتقل کریں گے۔ یہ پتھروں سے بنی ہوئی تین منزلہ عمارت ہے جو دو بلاکس پر منتقل ہے۔

اس کی تعمیر 1903ء میں جمشید کے والد نسر وانجی رستم جی مہتانے کروائی تھی، انہوں نے اسے اپنی کمپنی کے آفیسر اور گوداموں کے طور پر استعمال کیا بعد ازاں جمشید نسر وانجی نے 1919ء میں اس کا دوسرا بلاک بنوایا جو آری سی سے بنوایا گیا۔

اور آج..... آج یہاں صرف مشینوں کی گھز گھاہٹ ہے اور چاروں طرف اڑتی ہوئی مٹی ہے، پلے لینڈ کی جگہ ایک خالی قطعہ زمین ہے۔ کاش اس لینڈ مارک کو یوں تباہ نہ کیا جاتا جس سے کئی لوگوں کی جذباتی وابستگی ہے۔ مگر شاید آج جذبات کچھ نہیں صرف پیسا ہی سب کچھ ہے۔

یہاں فن لینڈ ہوا کرتا تھا جسے کچھ فاصلے پر لے جایا گیا ہے۔ اور یہ ماہی خانہ ہے جی ہمارا مطلب ہے ایکوریم۔ بھئی یہ ایکوریم تو بہت بعد میں ہوا ہے ہم تو بچپن میں ماہی خانہ دیکھنے جاتے تھے اور اس شوق میں اتنی بہت سی میڑھیاں چڑھتے تھے۔ ان میڑھیوں پر ہر وقت لوگوں کا تھمکنا لگا رہتا تھا یہاں ہم نے ایک نوجوان کو پھول بیچتے دیکھا تھا اب تو وہ بزرگ ہو چکا ہو گا مگر یہ برسوں پرانی بات ہے وہ پھول بیچتا تھا اور لوگوں کی فرمائش پر بھی الاپ اور بھی گانے سناتا تھا بہت ہی اچھی آواز کا مالک تھا اور سریلان بھی تھا۔ اب نہ جانے کہاں ہوگا۔

جھانگیر کوٹھاری پریڈ

پہلے ان میڑھیوں کی تعداد اتنی نہیں تھی یہ کراچی



گورنمنٹ نے اضافہ کیا ہے۔ اس کی تاریخ کچھ یوں ہے کہ بمبئی کے گورنر سر جورج لوئڈ کی بیگم لیڈی لوئڈ پیر کو یہ جگہ پسند آئی تھی اور اس نے یہاں گھاٹ اور پریڈ بنانے کے لیے جناب جھانگیر کوٹھاری سے کہا۔ جھانگیر کوٹھاری چیمبر آف کامرس کے ممبر بھی تھے



جب اس عمارت کو خریدنے کا فیصلہ ہو گیا تو اگلا سوال آیا کہ کیا اس کی منتقلی ممکن ہے؟ اس سلسلے میں مختلف آراء آئیں کسی نے ماہرین کو بلانے کا کہا کسی نے یونیسکو سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا الغرض آخر میں فیصلہ ہوا کہ ہمیں خود انحصاری سے کام لینا ہے۔ کام شروع ہوا پہلے اس کی ڈرائیونگ بنائی گئیں نقشے تیار ہوئے بیٹھار تصویریں اتاری گئیں۔ پھر تین بڑی کمپنیوں سے رابطہ کیا گیا کہ اس کو محفوظ طریقہ سے توڑ کر منتقل کرنا ہے اور وقت بھی بچانا ہے۔ قرعہ فال حاجی محمد شاہ اکرم بلوچ کے نام نکلا صرف اس لیے نہیں کہ انہوں نے کم پیسے لگائے تھے بلکہ اس لیے کہ انہوں نے سب کچھ دیکھ کر اور سوچ سمجھ کر ایک حکمت عملی بنائی تھی۔ اس پورے عمل کے لیے تین مہینے مختص کیے گئے، مگر جائداد منتقلی

پتھروں میں سے صرف پچاس پتھر ٹوٹے یا خراب ہوئے جنہیں تبدیل کر دیا گیا۔ روزانہ جتنے پتھر یا لکڑی کے ٹکڑے اکھاڑے جاتے تھے انہیں احتیاط سے ٹرکوں میں بھر کر کلفٹن پہنچایا جاتا تھا جہاں انہیں دوبارہ نقشہ کے مطابق جوڑا جاتا تھا، اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اس ٹیم کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ کم ہے کہ جنہوں نے اتنی بڑی ذمہ داری اٹھائی اور اسے بخوبی پایہ تکمیل کو پہنچایا۔ آج یہ عمارت کلفٹن میں شان سے سر اٹھائے کھڑی ہے اس میں اسٹوڈیوز کے علاوہ نمائشی ہال اور آرٹ گیلری بھی ہے۔

آج کا سفر تمام ہوا۔ قارئین سے التماس ہے کہ ماضی کو کچرا سمجھ کر نہ پھینک دیں ان جگہوں کی اہمیت سمجھیں اور ان کا وزٹ ضرور کریں۔

Downloaded from

pakociety.com

وغیرہ کے عمل میں تین سال گزر گئے تھے۔ اس دوران انڈس اسکول کا کیسپس تعمیر ہو چکا تھا جس میں نسر وانجی بلڈنگ کے لیے خاص جگہ مختص کر دی گئی تھی۔ بالآخر اپریل 1995ء میں کام شروع کیا گیا۔ ایک ایک پتھر ایک ایک لکڑی کے ٹکڑے پر نمبر ڈالے گئے اور سب چیزوں کو محفوظ طریقہ سے نکال کر منتقلی کا عمل شروع ہوا۔ یہ کام دنیا میں کوئی پہلی بار نہیں ہوا اس سے پہلے بھی عمارتیں منتقل کی گئی ہیں خاص طور پر مصر میں ایک ہرم کی عمارت کو اپنی جگہ سے جہاں پانی آ گیا تھا ایک دوسری بلند و محفوظ جگہ منتقل کیا جا چکا ہے۔ یہ سارا عمل ہائی کوالیفائیڈ ماہرین کی زیر نگرانی ان مزدوروں نے کیا جنہیں خاص تربیتی عمل سے گزارا گیا تھا مگر یہاں خاص بات یہ تھی کہ یہ کام ان پڑھ مزدوروں نے اور نا تجربہ کار ٹیم نے مل کر ایسے کیا کہ 26000

پاگل پن کی لاتعداد اقسام ہیں۔ انہی میں سے ایک قسم کو سنک کہا جاتا ہے۔ اس مرض میں مبتلا افراد نہ صرف اپنا بلکہ اپنے ارد گرد کے لوگوں کی زندگی بھی حرام کر دیتے ہیں اور اگر وہ سنسکی کسی بڑے عہدے پر فائز ہوں تو سمجھ سکتے ہیں کہ اس کا اثر معاشرے پر کیا پڑتا ہے۔ ایسے ہی کچھ مشہور و معروف سنسکیوں کا تذکرہ۔

حسن

سنک میں مبتلا افراد کا ذکر خاص

ہوں گے۔
آئیں ایسے کچھ حکمرانوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ کس مزاج کے ہوتے تھے۔
بازنطین حکمران جسٹس، یہ شخص 565 سے 576 تک حکومت کرتا رہا تھا۔ اس نے بہت شان و شوکت اور دبدبے کے ساتھ حکومت کی لیکن آخری عمر میں سنسکی ہوتا چلا گیا تھا اور اس کی سنک کا یہ عالم تھا کہ اچھا بھلا صحت مند ہونے کے باوجود وہیل چیئر پر گھوما کرتا۔
اس کا خیال تھا کہ وہ اتنا پاکیزہ اور مقدس ہے کہ اگر اس نے پاؤں زمین پر رکھے تو ناپاک ہو جائے گا۔ لہذا اس نے وہیل چیئر پر بیٹھنا شروع کر دیا۔

پاگل پن، خبطی یا سنسکی ہونا ایک عام سی بات ہے۔ آپ نے اپنے ارد گرد ایسے بے شمار لوگوں کو دیکھا ہوگا جن کی عادتیں عجیب ہوتی ہیں۔ جن کی حرکتیں عجیب ہوتی ہیں جو کبھی کبھی اپنے اور دوسرے لوگوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہو جاتے ہیں۔ پھر ایسے لوگوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ انہیں وہی شفا خانے میں رکھ دیا جاتا ہے۔
یہ تو عام لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے اور اگر ایسے لوگ کسی ملک کے حکمران یا بادشاہ ہوں تو پھر کیا صورت حال ہوتی ہو گی۔
کون ان کو روکنے والا ہوگا، چاہے وہ کچھ بھی کرتے پھریں۔ وہ تو زمین والوں کے لیے خدا کا عذاب بن جاتے



READING
Section

جائے گا اس لیے اس نے ساری زندگی نہانے سے گریز کیا۔
کون اندازہ کر سکتا ہے اس کے جسم سے اٹھنے والی
بدبوؤں کو اہل دربار کس طرح برداشت کرتے ہوں گے، یہ
وہی جائیں۔

روس کا بادشاہ انبا، کو ایک شوق تھا اس نے اپنے دربار
میں سنجیدہ لوگوں سے زیادہ مسخرے بھر رکھے تھے۔ جن کا فرض
منہسی ہی یہی تھا کہ بادشاہ سلامت کو ہنساتے رہیں۔ اس لیے
اس کے دربار میں کام تو کم ہوتا تھا لیکن لطفی زیادہ سنائے جاتے
تھے۔ ہر قسم کے لطفی۔

پورا دربار ہر وقت ہنستا ہی رہتا تھا۔
اس کے بالکل برعکس سویڈن کے بادشاہ ایرک کو ہنسنے
ہنسانے سے سخت نفرت تھی۔

ہنسی تو دور کی بات ہے اس کے دربار میں کسی کو مسکرانے
کی بھی اجازت نہیں تھی۔ اگر کوئی ہنستا ہوا پایا جاتا تو اسے سخت
سزا دی جاتی۔ اس کا خیال تھا کہ اسے زہر دے کر مارا جائے گا۔
کھانے پینے کی ہر چیز کو چیک کر کے اس کے سامنے رکھا
جاتا تھا لیکن اس احتیاط کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس کی موت زہر
ہی سے ہوئی تھی۔

خطبہ پن کی اس دور میں خواتین بھی کسی سے کم نہیں
تھیں۔ مثال کے طور پر جویرا کے پرنسز الیکزینڈرا اس کو وہم
تھا کہ وہ بچپن میں شیشے کا ایک گلاس نگل گئی تھی۔ اس لیے وہ
اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے میں انتہائی احتیاط کیا کرتی کہ کہیں وہ
گلاس اندر ہی ٹوٹ نہ جائے۔

اس عورت کو صفائی کا اتنا خیاب تھا کہ سب لوگ عاجز آ گئے
تھے۔ اس نے زندگی بھر سفید لباس پہنا۔ اس کا خیال تھا کہ شیشے
والی عورتوں کو سفید لباس پہننا چاہیے۔

آسٹریا کا بادشاہ فرڈی نینڈ اتنا جنونی تھا کہ اس نے کبھی
کچھ بول کر نہیں دیا۔ حالانکہ وہ گونگا ہرگز نہیں تھا لیکن اسے
بولنے کا شوق ہی نہیں تھا۔

اس نے پوری زندگی میں شاید دو چار ہی جملے بولے
ہوں گے۔ اس کا کہنا تھا کہ بولنا آنے کا مطلب یہ نہیں کہ بولو
بھی۔

خاموشی سب سے بہتر ہوتی ہے۔ انسان کو خاموش رہنا
چاہیے۔ اپنے سارے احکامات اشاروں سے دیا کرتا۔

اب چین کے ایک بادشاہ ژین رے کا حال سن لیں۔
موصوف کا شوق بچوں والا تھا۔ وہ محل کے وسیع و عریض باغ میں
رات کے وقت آنکھ پھولی کھیلا کرتے تھے اور یہ حکم تھا کہ ان کے

اس کے بستر تک اسے وہیل چیئر پر لایا جاتا اور اسے
اتار کر بستر پر لٹا دیا جاتا۔ ایک بار لوگوں کا یہ خیال ہوا کہ شاید وہ
مفلوج ہو گیا ہے۔ اس نے اس خیال کو غلط ثابت کرنے کے
لیے کئی میل پیدل چل کر دکھایا۔ اس کے بعد پھر وہیل چیئر پر
بیٹھ گیا۔

اس سنک کا کوئی جواب ہو سکتا ہے؟

اب ایک اور صاحب کو لیں۔

یہ تھے سلطنت عثمانیہ کے مشہور حکمران ابراہیم صاحب،
ان کو موٹاپے کا شوق تھا۔ خود ہی اس کوشش میں رہتے کہ زیادہ
سے زیادہ موٹے ہو جائیں اور اپنے ارد گرد بھی موٹوں ہی کو
دیکھنا پسند فرماتے تھے۔

موٹے لوگوں پر ان کی عنایات بہت خاص ہوا کرتیں۔
وہ ایسے لوگوں کو دربار میں اچھے عہدے دے دیا کرتے۔

موصوف کے حرم سرا میں بیویوں کے علاوہ 280
داشتائیں بھی تھیں اور سب کی سب بے تحاشا موٹی (ذرا اپنی
چشم تصور سے یہ دیکھیں کہ جب 280 موٹی موٹی عورتیں ہر
طرف گھوم رہی ہوں گی تو کیسا گول مٹول منظر ہوتا ہوگا)۔

لیکن شوق پھر شوق ہے۔ اتنا ہی نہیں۔ اب ذرا آگے کا
بھی سنیں۔ ان کو یہ خیاب بھی تھا کہ تعداد 280 ہی رہے۔ اب
اتفاق سے کوئی موٹی خاتون حرم سرا سے باہر دکھائی دے گئی اور
وہ انہیں پسند آ گئی تو وہ اسے اٹھوا کر حرم سرا میں لے آئے اور کسی
ایک پرانی والی کو نہر یا تالاب میں ڈبو کر مروا دیتے۔ تعداد 280
ہی رہتی۔

کہتے ہیں کہ انہوں نے اس طرح سینکڑوں عورتوں کو
مروا بھی دیا تھا۔

فرانس کا کنگ چارلس، اس شخص پر دو قسم کی سنک سوار
تھی۔ ایک سنک تو یہ تھی کہ اسے خون بہانے کا بے حد شوق تھا۔
وہ اپنے وفادار سرداروں کی وفاداری کا امتحان اس طرح لیا کرتا
کہ ان کی گردنیں اڑا دینے کا حکم جاری کرتا اور لازم تھا کہ وہ
بے چارے سردار مرتے وقت اس کی تعریف کرتے ہوئے
مریں۔ اگر کوئی ایسا نہیں کرتا تو اس کے خاندان کو مار دیا جاتا۔

اس لیے مرنے والے سرداروں کو یہ تو معلوم تھا کہ وہ مر
رہے ہیں اور اگر انہوں نے بادشاہ کی تعریف نہیں کی تو ان کا
خاندان بھی مارا جائے گا۔ اس لیے وہ بے چارے بادشاہ کی
شان میں قصیدے پڑھتے ہوئے مرتے تھے۔

چارلس کو ایک اور وہم بھی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ قدرت
نے اسے ایک ایسے شیشے سے بنایا ہے جو پانی لگنے سے تڑخ

کا خیال تھا کہ وہ عورت کو دیکھتے ہی زندہ ہو کر اس سے فلرٹ کرنے لگے گا۔ ہے کوئی جواب اس پاگل پن کا۔

برائنڈن برگ کی ماریا ایلونورا۔ اس ملکہ کو بیٹے کا شوق تھا لیکن بد قسمتی سے اس کے یہاں بیٹی پیدا ہو گئی۔ بس اس کی پیدائش کے بعد ہی اس کا پاگل پن شروع ہو گیا۔ وہ اپنی پیدا ہونے والی بیٹی کی دشمن بن گئی۔

اس نے کئی بار اس بیٹی کو مار دینے کی کوشش کی کبھی پانی میں پھینک کر، کبھی منہ پر تکیہ رکھ کر لیکن اس بیٹی کی خوش قسمتی یہ تھی کہ اس ملکہ کے شوہر کو بیٹی سے بہت محبت تھی۔ وہ ہر وقت ملکہ کی نگرانی کرتا رہتا۔ اور درجنوں بار اس نے اپنی بیٹی کی جان بچائی۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب زندگی کے کیسے پہلو ہیں۔ انسان کی فطرت کیسی ہوتی ہے اور انسان ہی کی فطرت میں اتنا تضاد کیوں ہوتا ہے۔

آپ نے اس ملکہ کے بارے میں جان لیا جسے اپنی بیٹی سے شدید نفرت تھی۔

اب روس کے نیوزور کا حال سنیں۔ اس بادشاہ کو اپنی بیٹی سے بے انتہا محبت تھی۔ جب دو سال کی عمر میں اس کی بیٹی کا انتقال ہوا تو اس نے قسم کھائی کہ وہ پورے ملک کے ہر گرجا گھر میں جا کر اس کے لیے دعا کرے گا۔

اور اس نے ایسا ہی کیا۔ وہ پورے ملک کا دورہ کر کے ہر گرجا گھر میں جا کر دعا میں کیا کرتا۔ بڑی مشکلوں سے اسے سمجھا سمجھا کر اس قابل کیا گیا تا کہ وہ دربار و کاروبار سلطنت کی طرف توجہ دے۔

اسپین کا ایک بادشاہ تھا کارلوس۔ اس کا شوق بہت کھانا پینا تھا۔ یعنی وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتا رہتا تھا۔ اس شخص کو کبھی فارغ نہیں دیکھا گیا۔

اس کے دربار میں غیر ملکی سفیر آتے تو وہ ان کے سامنے بھی اپنے پسندیدہ مشغلے میں مصروف رہتا تھا۔ یہ تو چند کا احوال تھا۔ ان کے علاوہ اور نہ جانے کتنے ہوں گے۔

پاگل پن یا خبطی ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ اس دنیا میں کروڑوں اس مزاج کے ہوں گے۔ لیکن ان کا نوٹس نہیں لیا جاتا۔

پرابلم وہاں ہوتی ہے جہاں حکمران اور بادشاہ حضرات پاگل پن یا سسکی پن کے مریض بن جائیں۔ اس وقت تاریخ ان کا نوٹس ضرور لیتی ہے۔ ان کے پاگل پن کو محفوظ کر لیا جاتا ہے۔

سارے وزراء اس کھیل میں ان کے ساتھ ہوں۔ لہذا پوری کاہینہ رات کے وقت آنکھ پجھولی میں مصروف ہوتی۔

وزیر خارجہ کسی درخت کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں تو وزیر دفاع کسی فوارے کے نیچے دبکے ہوئے ہیں۔

اندازہ لگائیں کہ کیسی صورت حال ہوتی ہوگی۔ اب مصر کے آخری بادشاہ شاہ فاروق کی طرف آجائیں۔ ان کے شوق سب سے نرالے تھے۔

ایک بار مذاق میں چرچل کی گھڑی چوری کر لی تھی۔ اس پر جو لے دے ہوئی وہ ایک الگ کہانی ہے۔

ایک بار خواب دیکھا کہ وہ جنگل میں جا رہے ہیں اور کچھ شیروں نے ان پر حملہ کر دیا ہے۔ دوسری صبح بیدار ہو کر انہوں نے اپنے وزیروں کو اپنا خواب سنایا اور یہ فرمائش کی کہ انہیں چڑیا گھر جانا ہے۔ بادشاہ کی خواہش تھی، کیسے پوری نہیں ہوتی۔ پورا قافلہ چڑیا گھر پہنچ گیا۔ وہاں جاتے ہی انہوں نے چڑیا گھر کے سارے شیروں کو گولی مار دی۔

کون اندازہ کر سکتا ہے ان کے زور بازو کا۔

پروشیا کے بادشاہ فریڈرک کا جنون بھی کسی سے کم نہیں تھا۔ اسے لٹے سیدھے تجربات کرنے کا بہت شوق تھا۔

ایک بار اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ اگر بہت لمبے آدمی کی شادی کسی چھوٹے قد کی عورت سے کرادی جائے تو اولاد کیسی ہوگی۔

بس اس خبط کے سوار ہوتے ہی اس نے پکڑ پکڑ کر لمبے آدمیوں کی شادیاں چھوٹی قد کی عورتوں سے کرا دیں۔

خدا جانے اولاد کیسی ہوئی ہوگی۔ بہر حال یہ اس کا ایک دلچسپ مشغلہ تھا۔

چین ہی کا ایک بادشاہ خاکن شی۔ اسے یہ خوف تھا کہ رات کے وقت قتل کر دیا جائے گا۔ اس لیے ساری زندگی کسی ایک بستر یا ایک کمرے میں نہیں سویا۔

بھی ایک جگہ تو کبھی دوسری جگہ، کباب سبج ہیں ہم کروٹیں ہر سو بدلتے ہیں۔ جو جل اٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں۔

اسپین کی ملکہ جوانا کا یہ خیال تھا کہ اس کا شوہر دنیا کا سب سے بے وفا شخص ہے۔ اس لیے اس نے ساری زندگی کسی عورت کو اپنے شوہر کے قریب نہیں آنے دیا۔

چلیں یہاں تک تو ایک عام سی بات ہو سکتی ہے لیکن کمال اس وقت ہوا جب شوہر کی موت واقع ہو گئی۔ اس نے لاش کے قریب بھی کسی عورت کو آنے کی اجازت نہیں دی۔ اس



ڈاٹ ایک عجیب شخص

انور فرہال

پاکستان کی فلمی صنعت محدود وسائل میں بھی کمال دکھاتی تھی۔ معمولی اخراجات میں اعلیٰ معیار کی فلمیں بنانا پاکستان کا خاصا تھا کیوں کہ ہمارے ہاں "ٹیلنٹ" کی کبھی کمی نہ رہی ہے۔ اس بار ہم ایک ایسے ہی ٹیلنٹڈ شخص کا تذکرہ کر رہے ہیں جس نے ہر مرحلے پر کمال دکھایا۔ اس نے فلمی صنعت کے سورمائیوں کے اندازوں کو ہر گام پر غلط ٹھہرایا۔

فلمی دنیا کی ایک نامور شخصیت کا تذکرہ خاص

ان دنوں میں ایک فلمی ہفت روزہ نگار میں تھا۔ کاپی پریس جا چکی تھی۔ میں آئندہ شمارے کے لیے مضامین منتخب کر رہا تھا کہ میرے دوست خانزادہ آگئے۔ فلمی تبصرے میں وہ ایک مقام رکھتے تھے۔ ہم دونوں فلمی دنیا کے زوال پر باتیں کرنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ ایک سازش کے تحت فلمی صنعت کو تباہ کیا جا رہا ہے۔ ہمارے ہاں ٹیلنٹ کی کمی نہیں اور چین چین کر ٹیلنٹ پرسن کو پریشان کیا جا رہا ہے۔ لچے لفنگے اسٹوڈیو میں گھستے جا رہے ہیں جس کی وجہ سے

عزت دار اپنا دامن بچانے کے لیے فلمی صنعت سے دوری رکھنے لگے ہیں۔ اس بحث میں اسلم ڈار کا بھی ذکر آیا تھا۔ اس واقعے کے کچھ عرصے بعد میں۔ اس ہفت روزہ سے ایک دوسرے ہفت روزہ چلا گیا تو خانزادہ سے بھی ملاقات ختم ہو کر رہ گئی۔ آج اتنے عرصے بعد اس سے ملاقات ہوئی اس کے ہاتھ میں ایک فلمی اخبار تھا جس کی سرخی بتا رہی تھی کہ اسلم ڈار کا انتقال ہو گیا۔ میں نے اخبار لے کر دیکھا پھر کہا یہ تو پرانا ہے۔

”ہاں پرانا ہے مگر اس لیے ساتھ لیے گھوم رہا ہوں کہ اس میں فلسفہ و ہدایت کا راسلم ڈار کے انتقال کی خبر ہے۔“

”ارے بھئی! یہ تو پرانی خبر ہے۔“ میں نے کہا۔

”مرحوم ایک اچھے فلم میکر تھے۔ ان کی فلمیں ہمیشہ ان کی یاد دلاتی رہیں گی۔“ ان پر ایک مضمون لکھا ہے۔

”جی ہاں، اچھے لوگ اپنے اچھے کام کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ مرنے کے بعد بھی نہیں مرتے۔ ہم قلم کاروں کا فرض ہے کہ قارئین کو یاد دلاتے رہیں۔“

”میں نے ان کی کوئی فلم نہیں دیکھی ہے۔ مگر ان کی فلم ”پیشرا اور دل لگی“ کے بارے میں سنا ہے کہ بڑی اچھی فلمیں تھیں۔“ خانزادہ نے کہا۔

”ہاں وہ اس زمانے کے فلم ساز و ہدایت کار تھے جب لوگ فلم والوں کو گناہ گار تصور کرتے تھے۔ ان کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں کچھ بتائیں۔“

میں خیالوں کی دنیا میں کھو گیا بھی خانزادہ نے کہا۔

”کیا ہوا۔ کیا سہنے لگے؟“

”سوچ رہا ہوں کہاں سے شروع کروں؟“

”سوچنے کی کیا بات ہے۔ وہ جو کسی نے کہا ہے میں ابتدا سے کہتا ہوں، تاناہنا سٹو۔ تو بس شروع ہو جائیں۔“

اور میں شروع ہو گیا۔ ”اسلم ڈار خالص لاہوری تھے۔ انہوں نے اسی شہر میں جنم لیا۔ قیام پاکستان کے وقت وہ آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے۔“

”گویا وہ اپنے پیارے پاکستان سے عمر میں کوئی دس بارہ برس بڑے ہوں گے؟“

”ہاں ان کی عمر کچھ ایسی ہی ہوگی۔ 1950ء میں انہوں نے میٹرک پاس کر لیا تو ان کے جی میں آیا کیوں نہ فلم لائن جو ان کی جائے۔“

”ایسا انہوں نے کیوں سوچا؟ اس کی کوئی وجہ تو ہو گی؟“ خانزادہ پھر پوچھ بیٹھے۔

”ہاں بھئی! بغیر وجہ کے کوئی بات نہیں ہوتی۔“ میں نے انہیں سمجھایا۔ ”ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ لاہور کی لٹی پٹی فلم انڈسٹری نئے سرے سے بنائی اور سنواری جا رہی تھی اور دوسری وجہ ان کے والد محترم ایس ایم ڈار (محمد شفیع ڈار) تھے۔ وہ بھی فلم انڈسٹری کی طرف مائل تھے۔ انہوں نے 1951ء میں بطور اسٹنٹ کیمرامن فلمی دنیا میں قدم رکھ دیا تھا۔ نوجوان اسلم ڈار نے باپ کو فلم انڈسٹری کا حصہ بننے دیکھا تو انہوں نے اپنی خواہش کا اظہار ان سے کر دیا۔ بڑے ڈار نے چھوٹے ڈار کو بھی عکاسی کے شعبے ہی سے فلمی کیریئر شروع کروایا۔ ان دنوں جعفر شاہ بخاری معروف عکاس تھے۔“ ایس ایم ڈار نے بخاری صاحب سے کہا۔

”میرا بیٹا بھی فلم لائن اختیار کرنا چاہتا ہے۔ میری درخواست ہے کہ آپ اسے اپنی شاگردی میں فلم فوٹو گرافی کی تربیت دیں۔“

”ٹھیک ہے اسے میرے پاس بھیج دیجیے گا۔“

”اس طرح اسلم ڈار، جعفر شاہ بخاری کے اسٹنٹ بن کر ان سے عکاسی کی تربیت حاصل کرنے لگے۔“ شاہ جی نے نوجوان شاگرد سے کہا۔

”میاں صاحبزادے! اگر تم کچھ سیکھنا چاہتے ہو، کچھ بننا چاہتے ہو، فلم انڈسٹری میں اپنا کوئی مقام بنانا چاہتے ہو تو تم محض میٹرک پاس ہو کر کچھ نہیں کر سکتے۔ اس لائن میں بڑھے لکھے لوگ ہی ترقی کرتے ہیں۔“ اسلم ڈار واقعی کچھ کرنا چاہتے تھے کچھ نام پیدا کرنا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے استاد کی بات گرہ سے باندھ لی اور حسرت موہانی نے جس طرح جیل میں چکی کی مشقت کے ساتھ مشق سخن جاری رکھی تھی، اسی طرح اسلم ڈار نے بھی اسٹنٹ کیمرامن کی تھکا دینے والی مشقت کے ساتھ ساتھ مزید پڑھنے لکھنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔“

میں ذرا رکا تو خانزادہ بول پڑے۔ ”وہ دور بڑا اچھا تھا۔ نوجوان بڑوں کے کہے کو ہوا میں نہیں اڑاتے تھے۔ انہیں لاکھوں کا بول سمجھ کر ان پر عمل کرتے تھے اور کامیاب ہوتے تھے۔“ پھر مجھے مخاطب کر کے کہا۔ ”اب اپنی بات آگے بڑھائیں۔“

اسلم ڈار بڑی محنت، لگن اور دل جمعی کے ساتھ اسٹنٹ کیمرامن کے طور پر کام کرتے رہے۔ جعفر شاہ بخاری کی بہترین تربیت نے انہیں جلد ہی بااعتماد کیمرامن بنا دیا۔ کئی سال کی مشقت کے بعد استاد نے ان کی کارکردگی

ہوئی تھی۔ اسلم ڈار کی پہلی فلم ہونے کے باوجود یہ ایک کامیاب فلم ثابت ہوئی۔ اس فلم کی ہیروئن رانی اور ہیرو نصر اللہ بٹ تھے جو مسٹر پاکستان کا ٹائٹل رکھنے والے باڈی بلڈر تھے۔ دارا کی کامیابی نے انہیں جو حوصلہ دیا اس کی وجہ سے وہ سخی لئیرا، آخری چٹان، مسٹر 303، مجرم کون، دل گلی، وعدہ، سیاہ انارٹی، بڑے میاں دیوانے، بشیرا، عشق نچائے گلی گلی، گوگا، زبیدہ، بابل صدقے تیرے، انوکھا راج، پھول، ہم تمہارے ہیں، قدرت و انتقام، زرق خان، پہلی نظر جیسی کامیاب اور یادگار فلمیں بنانے کے قابل ہوئے۔ 1957ء میں اسلم ڈار نے بطور عکاس اپنی فلمی زندگی کی جو ابتدا کی تھی 1998ء میں بطور ہدایت کار اپنی آخری فلم ”ڈولی سجا کے رکھنا“ سے اس کا اختتام کیا۔

”تو کیا انہوں نے ”ڈولی سجا کے رکھنا“ کے بعد کسی اور فلم کی ڈولی نہیں سجائی؟“
”نہیں۔“
”اس کی کوئی وجہ؟“

”سب سے اہم بات جو سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ منفرد سوچ اور دماغ کے فلم میکر تھے۔ وہ اپنی نئی فلم میں ایک Variation دیا کرتے تھے۔ یعنی ان کی ہر فلم اگلی سے یکسر جدا ہوتی تھی۔ جب کہ ڈسٹری بیوٹرز اور سینما والے جانتے تھے کہ وہ بس ایک ہی طرح کی فلم بنائیں۔ ان کی پہلی فلم ”دارا“ سپر ہٹ ہوئی تو تقسیم کاروں نے انہیں مجبور کیا کہ وہ ایسی ہی ایکشن فلم بنائیں۔ اگرچہ انہوں نے ایک رومانی فلم کی پلاننگ کر رکھی تھی۔ مگر جو لوگ فلم خریدتے اور چلاتے تھے انہوں نے انہیں یہ فلم بنانے نہیں دی۔ مجبوراً انہیں ”سخی لئیرا“ بنانی پڑی۔ یہ بھی ایکشن فلم تھی مگر ”دارا“ کا تسلسل نہیں تھی۔ اس کا تقسیم اور موضوع مختلف تھا۔ ان لوگوں کی جانب سے ان پر یہ دباؤ اور پریشر بہت دنوں تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ مجبوراً انہیں خود اپنا ڈسٹری بیوٹن دفتر کھولنا پڑا۔ اس دوران چند فلمیں انہوں نے اپنی مرضی سے بنائیں مگر اس کے بعد بھی فلم ٹریڈ کے لوگوں نے ان کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ لہذا دل برداشت ہو کر انہوں نے فلم بنانا ہی چھوڑ دیا۔ لیکن فلم انڈسٹری اور فلم والوں سے پیار محبت کا رشتہ برقرار رکھا۔ وہ فلم انڈسٹری کی ہر دلعزیز شخصیت تھے۔ وہ تاحیات فلم ڈائریکٹر ایسوسی ایشن کے صدر رہے۔ مرتے دم تک فلم انڈسٹری کی بحالی کے لیے سرگرم رہے۔ 22 دسمبر 2014ء کو انہوں نے ہدایت کار داؤد

کے حوالے سے کہا۔
”اب تم مکمل عکاس بن گئے ہو اور آزادانہ طور پر فوٹو گرافی کر سکتے ہو۔“

”تو اسلم ڈار ان ڈی پنڈنٹ عکاس بن گئے۔“
”ہاں جس طرح تعلیم مکمل کرنے کے بعد لوگ ملازمت کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں اسلم ڈار بھی عکاسی کی تربیت مکمل کرنے کے بعد بطور عکاس کام کرنے لگے۔ اس لحاظ سے ان کی پہلی فلم ”نوراں“ تھی جس کے ہدایت کار ایم اے خان تھے۔ یہ فلم 1957ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ بطور عکاس ان کی کارکردگی بہت اچھی تھی اس لیے دوسرے فلم ساز و ہدایت کار اس ہونہار عکاس کی خدمات حاصل کرنے لگے۔ ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری فلم ریلیز ہوتی گئی۔ اس طرح اسلم ڈار کی بطور عکاس قابل ذکر فلموں میں سردار، سلطنت، چھو منتر، ڈولی، تاجے ناگن، بابجے بین، شہباز، سن آف علی بابا، تاج اور تلوار، سمیرا، پھوٹی امی، خیبر پاس، رقاہ، کوٹکا، البیلا، لالہ رخ اور مجھے جینے دو شامل ہیں۔“

”آپ نے بتایا تھا۔“ خانزادہ میرے خاموش ہوتے ہی بول پڑا۔ ”بڑے ڈار یعنی شفیع محمد ڈار نے بھی اسٹنٹ کیمرامین کی حیثیت سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا۔ کیا انہوں نے کوئی ترقی نہیں کی؟ بیٹا باپ سے آگے نکل گیا۔ باپ وہیں کھڑا رہا؟“

”ارے نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ بڑے ڈار چھوٹے ڈار سے پہلے اپنی تربیت مکمل کر کے پہلے فل فلیج عکاس بنے پھر ہدایت کاری شروع کر دی اور اپنی عکاسی کی طرح اس فیلڈ میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ایس ایم ڈار کی بطور ہدایت کار دلا بھٹی، سردار اور سلطنت جیسی کامیاب فلمیں ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔“

”گو یا اسلم ڈار نے اپنے والد کی فلم سردار اور سلطنت کی بھی عکاسی کی۔“

”ہاں سید صاحب! جب دوسرے ان کے بیٹے کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا رہے تھے تو وہ کیوں اس سے محروم رہتے۔ بات مرحوم اسلم ڈار کے حوالے سے ہو رہی ہے تو یہ بتانا ضروری ہے کہ انہوں نے بھی عکاسی کو اپنی آخری منزل نہیں سمجھا۔ انہوں نے بھی باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنی دوسری انگلز کا آغاز ہدایت کاری سے کر دیا۔ ان کی بطور ہدایت کار پہلی فلم ”دادا“ تھی جو 1968ء میں نمائش پذیر

فلم ”دارا“ کی کامیابی کے بعد ایک مکمل رومانوی فلم بنانا چاہتے تھے مگر فلم ٹریڈ کے لوگوں نے انہیں یہ فلم بنانے نہیں دی۔ یہ فلم ”دل لگی“ تھی۔ اسلم ڈار منفرد سوچ کے مالک تھے اور منفرد اور اچھوتے موضوعات کی فلمیں بنانے کے قائل تھے۔ انہوں نے اپنی پہلی فلم ”دارا“ بنانے کے دوران ہی اپنی دوسری فلم کی پلاننگ شروع کر دی تھی اور فیصلہ کر لیا تھا کہ ان کی دوسری فلم مکمل رومانوی اور سوشل ہوگی اور اس کا نام وہ دل لگی رکھیں گے۔ ”دارا“ سپر ہٹ ثابت ہو چکی تو انہوں نے اپنے فلم ساز میاں مشتاق سے کہا۔ ”میں نے دوسری فلم کی منصوبہ بندی کر لی ہے۔ یہ معاشرتی موضوع پر ایک رومانٹک فلم ہوگی۔ میں نے اس کا ٹائٹل ”دل لگی“ سوچا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟“

میاں صاحب نے کہا۔ ”ٹھیک ہے یہی فلم بنائیے۔“ اپنے فلم ساز کی طرف سے رضامندی ملنے کے بعد اسلم ڈار نے ”دل لگی“ کے لیے کام کرنا شروع کر دیا۔ عام طور پر سب سے پہلے گانوں کی تیاری کا کام شروع ہوتا ہے۔ اسلم ڈار ایک دن اپنے موسیقار رفیق علی کے ساتھ گانوں کے سلسلے میں اہم صلاح و مشورہ کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ شاعر مشیر کاظمی بھی موجود تھے۔ کیوں کہ ان ہی کو سارے گیت لکھنے تھے۔ ابھی ان کی بات چیت جاری ہی تھی کہ ان کے دفتر میں پنجاب سرکٹ کے معروف تقسیم کار نسیم باپولر تشریف لائے۔ ان کے ساتھ کراچی کے ایشیا فلمز کے مشیر علی رمزی بھی تھے جنہوں نے کراچی میں دارا ریلیز کی تھی۔ سلام دعا کے بعد انہوں نے پوچھا۔ ”آگے آپ کا کیا پروگرام ہے؟“

اسلم ڈار بولے۔ ”میں اپنی اگلی فلم ”دل لگی“ کی تیاری کر رہا ہوں۔“

”یہ دل لگی کیا ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”یہ ایک رومانٹک فلم ہے۔“ اسلم ڈار نے بتایا۔

”ابھی میں نے اس فلم کے لیے ایک مکھڑا پسند کیا ہے۔ بڑا خوب صورت میوزک ہے۔ آپ سنیں گے تو ایک دم پھڑک اٹھیں گے۔“

آنے والے مہمان ایک دم پھڑک اٹھے۔ ”ہمیں کسی دل لگی دل لگی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ تم اگر ”دارا“ جیسی کوئی ایکشن فلم بناؤ گے تو ہم اسے خرید لیں گے۔ ورنہ چائے پلاؤ ہم چلتے ہیں۔“

بے چارے اسلم ڈار نے انہیں تائل کرنے کی بڑی

بٹ سے بڑے خوشگوار انداز میں فون پر بات کی تھی اور کہا تھا میں 24 دسمبر کی شام کو ایور نیو اسٹوڈیو ضرور آؤں گا مگر وہ 24 دسمبر 2014ء کو حسب وعدہ ایور نیو اسٹوڈیو نہیں پہنچے۔ ایسا دل کا دورہ پڑا کہ اپنے مالک حقیقی کے پاس جا پہنچے۔

میں یہاں تک کہہ کر خاموش ہوا تو خانزادہ نے کچھ نہیں کہا۔ اچھے لوگ اپنی زندگی میں بھی سب کو متاثر کرتے ہیں اور مرنے کے بعد دنیا سے گزرنے کے بعد بھی۔ ذرا دیر بعد میں ہی بولا۔ ”اسلم ڈار نے اپنی فنی زندگی کے بیشتر ایام ایور نیو اسٹوڈیو میں گزارے تھے اور اسی اسٹوڈیو میں اپنی کئی خوب صورت فلمیں بنائی تھیں۔ 28 دسمبر کو اسی نگار خانے میں مرحوم کے فلمی احباب قرآن خوانی اور فاتحہ خوانی کے لیے جمع تھے اور ان کی روح کو ایصالِ ثواب پہنچا رہے تھے۔“

میں ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر تک کمرے کی فضا اداس اور سوگوار رہی۔ پھر خانزادہ کی آواز نے خاموشی کا ظلم توڑا۔ ”اسلم ڈار ایک فلم والے تھے مگر اچھے انسان تھے۔ یہ ان کی اچھائی ہی تھی کہ آج اس وقت ہم ان کے گزر جانے کے ذکر پر اداس ہو گئے۔ وہ ایک پڑھے لکھے، تربیت یافتہ فلم میکر تھے۔ انہوں نے اچھی، کامیاب اور دلچسپ فلمیں بنا کر جہاں پاکستانی فلمی صنعت و تجارت کو فائدہ پہنچایا، تقویت بخشی وہاں عوام کو بھی صاف ستھری اور معیاری تفریح فراہم کی۔“ اتنا کہہ کر وہ ذرارہ کے پھر بولے۔ ”ابھی اسلم ڈار کے بارے میں جو باتیں بتائی گئیں ان سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ فلم والوں میں بھی اچھے لوگ ہوتے ہیں اور اچھی اور ایسی فلمیں بھی بنائی جاتی ہیں جو تفریحی مقاصد پوری کرنے کے علاوہ ملک اور معاشرہ کی تعمیر و ترقی میں بھی مثبت کردار ادا کرتی ہیں۔“

”جی ہاں فلمیں ابلاغ کا سب سے موثر ذریعہ ہیں۔ اچھے پڑھے لکھے اور باشعور فلم والے اپنی فلموں کے ذریعے بھی عوام الناس کو اچھائی کی طرف راغب کرتے ہیں اور برائی سے دور رہنے کی ترغیب دیتے ہیں۔“

”آج کی اس نشست میں چونکہ ہم مرحوم اسلم ڈار کے حوالے سے باتیں کر رہے ہیں۔“ میں نے مزید کہا۔

”اس لیے میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک اچھے ہدایت کار اور فلم ساز کو کن دشواریوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان کے راستے میں کیا کیا رکاوٹیں آتی ہیں۔“ میں ذرارہ کا پھر خانزادہ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ”اسلم ڈار اپنی ایکشن

کوشش کی کہ یہ ایک اچھا سبیکٹ ہے اور یہ بھی بہت کامیاب ہوگی مگر ڈسٹری بیوٹرز اپنی بات پر اڑے رہے۔ چائے پی اور چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد یہ لوگ ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے۔ اسلم ڈار کو اس موقع پر یہ سوچنا پڑا کہ وہ مالی طور پر اتنے مستحکم نہیں کہ اپنی پسند کے موضوع پر فلم بنائیں۔ ڈسٹری بیوٹرز ان کی ضرورت تھے۔ اس مسئلے پر ان کے فلم ساز میاں مشتاق نے بھی ان کو مشورہ دیا کہ ہمارے لیے یہی بہتر ہے کہ ہم اسی پٹرن کی فلم بنائیں جیسی تقسیم کار چاہتے ہیں۔ لہذا اس ”دل لگی“ کا پروگرام ملتوی کر دیں اور اسلم ڈار کو ایسا ہی کرنا پڑا۔ انہوں نے ایکشن سے بھرپور ایک فلم ”آخری چٹان“ شروع کی۔ اس فلم میں بھی نصر اللہ بٹ کو ہیرو اور رانی کو ہیروئن کے لیے منتخب کیا۔ جب کہ سلطان راہی کو پہلی بار سائیڈ ہیرو کے طور پر پیش کیا۔ دیگر کرداروں کے لیے ترانہ، ایم ڈی شیخ، گل زمان، ساقی، حامد حسن اور سلمی ممتاز کو کاسٹ کیا۔ یہ ایک کاسٹیوم ایکشن فلم تھی۔ اس فلم کی ابتدا ہی ہوئی تھی کہ نسیم پاپولر اور شیر علی رمزی ہنستے مسکراتے ان کے دفتر آئے اور پنجاب اور کراچی سرکٹ کے لیے ”آخری چٹان“ کا سودا کر لیا۔ قصہ مختصر یہ کہ اس کی تقسیم کاری کا مرحلہ بڑی آسانی سے طے ہو گیا۔ فلم مکمل ہوئی تو سنیما گھروں کی وصولیابی کے لیے ڈسٹری بیوٹرز کو کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس کی نمائش ہوئی تو یہ فلم دارا سے زیادہ کامیاب ثابت ہوئی۔

”آخری چٹان“ کی نمائش کے بعد اسلم ڈار نے اپنی پسند کی فلم ”دل لگی“ کی پلاننگ دوبارہ شروع کر دی۔ ایک بار پھر ڈسٹری بیوٹرز آئے اور انہوں نے کہا۔

”ڈار صاحب! آپ نے پھر وہی کچھ کرنا شروع کر دیا جس سے ہم نے منع کیا تھا۔ آپ ایکشن کے ڈائریکٹر ہیں۔ اس لیے ایکشن فلم ہی بنائیں۔“

اس طرح اسلم ڈار کو ایک بار پھر ”دل لگی“ کو سیٹ کی زینت بنانے کا موقع نہیں ملا اور انہوں نے ایک نئی ایکشن فلم ”سختی لئیرا“ شروع کر دی۔ سختی لئیرا میں بھی لیڈنگ رول نصر اللہ بٹ اور رانی نے کیا۔ ادیب کو ایک اہم رول میں پیش کیا گیا جب کہ سلطان راہی کو ایک بزرگ مجاہد کے کردار کے لیے کاسٹ کیا گیا۔

یہاں تک کہہ کر میں ڈار کا پھر خانزادہ کی طرف دیکھ کر مسکرا کر بولا۔ ”اس موقع پر یہ بات دلچسپی کا سبب ہوگی کہ ایک کردار بزرگ مجاہد کے بیٹے کا بھی تھا جس کے لیے

ڈار صاحب نے ایک اداکار سے بات کی تو اس نے بہت زیادہ معاوضہ مانگا۔ ڈار صاحب نے کہا۔ ”یار! یہ ایک مختصر سا کیریئر ہے۔ لہذا پیسوں میں بھی کچھ کمی کرو۔“

”نہیں ڈار صاحب! پیسوں میں کوئی کمی نہیں ہو سکتی۔ ایکٹنگ بہت مشکل کام ہے۔ ہر ایک کے بس کی بات نہیں کہ اداکاری کرے۔ اس لیے کردار چھوٹا ہو یا بڑا میں اپنے معاوضے میں کوئی کمی نہیں کر سکتا۔“

”اور میں تمہیں تمہارا طلب کیا ہوا معاوضہ نہیں دے سکتا۔“

یونٹ کے لوگوں نے سمجھا کہ ڈار صاحب اب کسی اور سے اس کردار کے لیے بات کریں گے مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اسلم ڈار نے اعلان کر دیا۔ ”اب یہ کیریئر میں خود کروں گا۔“

سارے لوگ چونک پڑے کہ ڈار صاحب نے یہ کیا فیصلہ کر لیا۔ اگلے روز اس رول کی مناسبت سے انہوں نے لباس زیب تن کیا اور میک اپ کروایا۔ اس کے بعد سیٹ پر جا کر شاٹ دیا۔ جب وہ شاٹ دے رہے تھے تو سیٹ پر وہ اداکار بھی موجود تھا جس نے یہ کردار کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ دیگر لوگوں کی طرح اسے بھی یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ فلم کے ڈائریکٹر نے اتنی کامیاب اداکاری کی۔ شاٹ مکمل ہونے کے بعد وہ ان کے پاس آیا اور ان کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر بولا۔ ”گرو جی! آپ تو بہت بڑے ایکٹر ہیں۔“

”مجھے ایکٹنگ کا کوئی شوق نہیں۔“ اسلم ڈار نے اسے جواب دیا۔ ”میں تو ایکٹر میکر ہوں اور اس بات پر فخر محسوس کرتا ہوں۔ تمہارے انکار پر مجھے ایکٹنگ پر آمادہ ہونا پڑا۔ یاد رکھو کہ ہر بڑے ہدایت کار میں ایک بہت بڑا ایکٹر چھپا ہوتا ہے۔ ورنہ وہ بڑا ڈائریکٹر کیسے بن سکتا ہے۔“ اس کے بعد وہ اپنی فلموں میں ضرورتاً چھوٹے موٹے کردار ادا کرتے رہے۔“

”وائسی! یہ تو بڑا دلچسپ اور یادگار واقعہ تھا۔ ایک اداکار کے انکار پر ہدایت کار اداکار بن کر اداکاری کرنے پر تیار ہو گیا۔“ خانزادہ نے کہا۔

”اسلم ڈار نے غلط نہیں کہا تھا کہ ڈائریکٹر تو ایکٹر میکر ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس وجہ کا ایک واقعہ متحدہ ہندوستان میں نامور ہدایت کار محبوب خان کے ساتھ پیش آیا تھا۔ جب کامیڈین یعقوب نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ فلمیں میری وجہ سے کامیاب ہوتی ہیں۔ محبوب صاحب

ہیرو کا سٹ کیا تھا۔ غالباً اس سوچ کے ساتھ کہ اس کی بین الاقوامی شہرت کی وجہ سے اس فلم پر اچھا اثر پڑے گا۔ مگر نتیجہ اس کے برخلاف ہوا۔ یہ فلم ضیاء الدین کے موڈ مزاج کی نہیں تھی۔ بری طرح فلاپ ہو گئی۔

اس کے بعد ڈار صاحب کے ذہن میں ایک بڑا زبردست سبجیکٹ آیا۔ یہ ”بشیرا“ کا سبجیکٹ تھا۔ ڈار صاحب اس پارٹی کے پاس گئے جس نے ان کی فلم مجرم کون پر ڈبوس کی تھی اور اس پارٹی سے کہا۔ میں نے اپنی آنے والی فلم کا جو خاکہ تیار کیا ہے، وہ ایک بڑی فلم ثابت ہوگی۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ فلم بھی آپ ہی پر ڈبوس کریں تاکہ اس کی کامیابی سے پہلی فلم کی ناکامی کا بھی ازالہ ہو جائے مگر دودھ کا جلا چھاج بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ پارٹی نے صاف انکار کر دیا۔

”ہمیں صاحب! ہمیں آپ سے کوئی فلم نہیں بنوانی۔“

مگر اسلام ڈار کو تو بہر حال یہ فلم بنانی تھی ان کا کام ہی یہی تھا۔ ان کے ایک دوست اور محلے دار قمر بٹ تھے جو ان سے اکثر کہتے تھے کہ میرے ساتھ مل کر فلم بناؤں مگر ڈار صاحب یہ کہہ کر نال جاتے تھے کہ بٹ صاحب! فلم کا کام بڑا رکھی ہے۔ اس لیے میں نہیں چاہتا اگر فلم تو قعات پر پوری نہ اتری تو ہماری آپ کی دوستی اور محلے داری میں دراڑ پڑ جائے گی۔ ”بشیرا“ کے لیے جب انہیں فنانس کی ضرورت پڑی تو تمام سابقہ باتیں بھلا کر قمر بٹ کے پاس پہنچ گئے۔

”یار بٹ صاحب! ایک بڑی زبردست فلم کی پلاننگ کی ہے۔ جس کی کامیابی صد فی صد یقینی ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں یہ فلم تمہاری شراکت داری میں بناؤں تاکہ میرے ساتھ تمہیں بھی کمانے کا موقع ملے۔“

قمر بٹ بخوشی راضی ہو گئے کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ ڈار ایک اصول پسند آدمی ہے اور مجھے کسی عنوان سے کبھی دھوکا نہیں دے گا۔ بٹ سے وہ پارٹنرشپ ایگریمنٹ کے بعد ”بشیرا“ کا کام شروع کر دیا گیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ بشیرا اسلام ڈار کی پہلی پنجابی فلم تھی۔ اس فلم کا ٹائٹل رول سلطان راہی کو دیا گیا۔ سلطان راہی ”دارا“ کے بعد بننے والی ان کی ہر فلم میں چھوٹے موٹے کرداروں میں شامل ہوتا تھا۔ ڈار صاحب اس کی محنت، لگن، جدوجہد اور تعاون سے بہت متاثر تھے اور انہوں نے اس سے کہہ رکھا تھا کہ اگر اللہ نے کبھی موقع دیا تو تمہیں کسی بڑے کردار میں بھی پیش کروں

یہ بات تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے۔ انہوں نے یعقوب کو اپنے پونٹ سے علیحدہ کر کے ایک بس کنڈیکٹر کو اپنی فلم میں چانس دیا جو ایک بڑا اداکار بن کر ابھرا۔ یہ شیخ مختار تھا۔ خیر بات ”دل لگی“ کے حوالے سے ہو رہی تھی۔ ”نئی لیرا“ کے بعد اسلام ڈار صاحب نے ایک بار پھر ”دل لگی“ بنانے کی کوشش کی۔ لیکن اس بار بھی وہی ہوا جو اس سے پہلے ہو چکا تھا۔ لہذا ”دل لگی“ پھر پینڈنگ میں چلی گئی اور اس کی جگہ ”مسٹر 303“ کے پروجیکٹ پر انہیں کام کرنا پڑا۔ واضح رہے کہ جس دور میں ”مسٹر 303“ بن رہی تھی اس دور میں پاکستان میں فیلڈ مارشل ایوب خان برسر اقتدار تھے۔ اسی دور میں حکومت نے 303 آفیسرز مختلف محکموں سے نکال دیئے تھے۔ اب یہ محض اتفاق تھا کہ ڈار صاحب کی فلم کا نام بھی ”مسٹر 303“ تھا۔ اس زمانے میں فلمیں اسلام آباد میں سنسر ہوتی تھیں۔ فلم مکمل کرنے کے بعد جب اسلام ڈار یہ فلم سنسر کرانے اسلام آباد گئے تو اس وقت کے سنسر بورڈ کے چیئرمین نے فلم دیکھنے کے بعد کہا۔ ”کیوں نہ اس فلم کو پینڈ کر دیا جائے؟“

”اگر واقعی اس فلم میں کوئی قابل اعتراض بات ہے تو اسے پینڈ کر دیں۔“

چیئرمین صاحب بولے۔ ”ہم نے آپ کی فلم فل بینچ کوریفر کر دی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے انہوں نے ڈار صاحب کو فلم سے کاٹے ہوئے حصے دیئے جو اتنے زیادہ تھے کہ وہ فلم لگائی ہی نہ جائے۔ جن اعتراضات کو بنیاد بنا کر کاٹ چھانٹ کی گئی وہ بڑے مستحکمہ خیز تھے۔ مثلاً یہ کہ اگر کسی آدمی کو گولی لگتی ہے، وہ چاہے کوشے پر کھڑا ہے یا اپنے گھر میں بیٹھا ہو۔ وہ گولی لگنے کا ایکشن دے مگر زمین پر نہ گرے۔ اس کے بعد فلم فل بینچ میں گئی تو انہوں نے بھی اپنی رپورٹ میں وہی باتیں لکھیں جو پہلی رپورٹ میں لکھی گئی تھیں اور کہا گیا اگر ان باتوں کو فلم سے خارج کر دیں تو فلم ریلیز ہو سکتی ہے ورنہ پینڈ۔“

”مسٹر 303“ کو فل بورڈ نے بھی مسترد کر دیا تو اسلام ڈار نے فل بورڈ کو ہائی کورٹ میں چیلنج کر دیا۔ یہ کیس گیارہ ماہ تک چلتا رہا۔ اس کے بعد نمائش کا مرحلہ آیا تو اس وقت بھی یہ فلم اپنی اصلی حالت میں نہیں تھی۔ بری طرح فلاپ ہو گئی۔ جو ہونا ہی تھا۔ اس فلم کے بعد اسلام ڈار نے ایک فلم ”مجرم کون“ بنائی۔ یہ فلم انہوں نے کسی اور پارٹی کے لیے بنائی تھی۔ ضیاء الدین کو انہوں نے اس فلم میں بطور

گا۔ ایسا اللہ نے انہیں موقع دیا تھا۔ سلطان راجی ان کی فلم میں نا کھیل رول کر رہا تھا۔
 فلم انڈسٹری بھی بڑی عجیب و غریب لوگوں کی دنیا ہے۔ کسی چھوٹے اداکار کو ایک کسی بڑے کردار میں کام کرتے دیکھ کر کچھ لوگ ہانسنے لگے۔ کسی نے کہا۔
 ”ڈار صاحب! آپ کیا کر رہے ہیں۔ اتنے چھوٹے اداکار سے اتنا بڑا کردار کروا رہے ہیں۔ اس طرح تو فلم دو کوئی کی ہو کر رہ جائے گی۔“

کوئی بولا۔ ”یہ رول تو صرف ساون صاحب ہی کر سکتے ہیں۔ آپ انہیں کاسٹ کریں۔“
 اداکار ساون ان دنوں اپنے عروج پر تھے۔ کچھ لوگوں نے یہ افواہ اڑا دی کہ ڈار صاحب ساون صاحب کے پاس گئے تھے۔ ان سے معاملہ طے نہ ہو سکا اس لیے انہوں نے سلطان راجی کو لیا۔ اگرچہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ سلطان راجی ”بشیرا“ کے لیے پہلی اور آخری چوائس تھے۔ جس پر اسلم ڈار قائم رہے۔ سلطان راجی نے ہی جان لگا کر محنت کی اور اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ فلم مکمل ہوئی تو ڈار صاحب سوچنے لگے۔ جس طرح ہماری پہلی فلمیں بنی ہیں۔ فلم بھی اسی طرح آسانی سے یک جا بنے گی مگر آسانی سے کیا کوششیں بسیار کے باوجود نہیں بنی۔ انہوں نے اپنے پرانے ڈسٹری بیوٹریا پور سے شکایت کی۔
 ”میری نئی فلم ”بشیرا“ مکمل ہو چکی ہے۔ اس کے بارے میں بھی کچھ سوچیں۔ کچھ کریں۔“

”کیا سوچیں۔ کیا کریں کہ تم نے کام ہی ایسا کیا ہے کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔“
 ”میں نے کون سا ایسا قلم لکھا کہ وہ دیا ہے؟“
 ”اول تو تم نے پنجابی فلم بنا کر ٹیلی کی ہے۔ دوسرے ایک سٹے لڑکے کو بشیرا بنا دیا۔“
 ”اور اس قسم کے رعیتوں کا راجیوں مایوس کرتا رہا۔ اس طرح ان کی پریشانی روز بروز بدھتی گئی۔ وہ سب سے بھی کہتے تھے۔ فلم بہت اچھی ہے۔ بہت کامیاب ہوئی۔ بہت کمانے کی۔“
 ایک دن نیم پاپور نے ان سے کہا۔ ”اگر آپ کو اپنی فلم پر اتنا ہی بھروسہ ہے تو اسے خود ہی لے لیں کیوں نہیں کرتے؟“
 اپنا دفتر بنا کر اپنی فلم خود ہی لے لیں کریں۔“
 ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد ڈار صاحب نے ایسا ہی کیا۔ ایک دفتر کرائے پر حاصل کر کے اس میں اپنا

ملہنا مسرگزیشت

تقسیم کا رادار قائم کر لیا۔ دفتر کھول کر بیٹھ گئے کہ سنیما والے ان کے پاس آئیں گے۔ سنیما والے ایڈوائس رقم ادا کر کے فلم ایک کروا لیا کرتے تھے۔ ان کے دفتر میں جب کوئی سنیما والا نہیں آیا تو ان لوگوں نے خود ایڈوائس رقم سنیما والوں کا دورہ کیا اور مالکان سے کہا آپ ہماری فلم ”بشیرا“ لگا سنیما ہم آپ سے پیشگی رقم بھی نہیں لیں گے۔ اس کے باوجود کسی سنیما والے نے ”بشیرا“ ایک نہیں کروائی۔

ایسی مایوس کن صورت حال دیکھ کر ڈار صاحب کے پارٹنر قمر نے بہت مایوس ہوئے۔ انہوں نے کہا۔ ”میں یہ پارٹنر شپ ختم کرتا ہوں۔ جب بھی تمہاری فلم ریلیز ہو میرا لگا یا ہوا پچھتا جائے گا۔“
 اسلم ڈار نے انہیں کچھ یا مگر وہ نہ مانے۔ وہ بے جا رہے کسی کیا کرتے۔ کہاں تک پریشانیوں کا مقابلہ کرتے۔ اس لیے پارٹنر شپ ختم کرنے پر مجبور ہو گئے مگر کچھ دنوں کے بعد اپنے ایک دوست اور پارٹنر شیخ صدیق کے سبھانے پر ڈار صاحب سے شراکت داری کا رشتہ دوبارہ استوار کر لیا۔

جب ایلو وائس رقم نہ لینے کی شرط پر بھی کسی سنیما والے نے ”بشیرا“ کی رائٹس سے انکار کر دیا تو ڈار صاحب ایک ایسے سنیما گھر پہنچ گئے جو صرف پرانی فلمیں چلاتا تھا۔ یہ صورت سنیما تھا جو ایسا سنیما کے نام سے آج بھی موجود ہے۔ فلم کے پرڈیوسر اور ڈائریکٹر نے صورت سنیما والوں سے کہا۔
 ”میرا نام اسلم ڈار ہے۔ آپ میرے نام سے واقف ہوں گے۔ میں نے دارا، آخری چٹان اور نئی لیرا جیسی کامیاب فلمیں بنائی ہیں۔“

”جی ہاں، اس حوالے سے ہم آپ کو پہچانتے ہیں۔“
 ڈار صاحب خوش ہوئے اور بولے۔ ”میں نے ایک نئی فلم بنائی ہے۔ ”بشیرا“، یہ بھی سابقہ فلموں کی طرح اثناء اللہ کامیاب ہوگی۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ ہم آپ اپنے سنیما میں دکھائیں۔“
 پرانی فلمیں چلانے والوں کو نئی فلم مل رہی تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنی کاروباری ذہنیت کا ثبوت دیا۔ ”آپ کہتے ہیں تو ہم آپ کی فلم دکھادیں گے مگر آپ کو پیشگی رقم نہیں دے سکیں گے۔“
 ڈوبتے ڈوبتے سنیما والوں نے کہا کہ سہارا بھی مل جائے تو ای کو قیمت کھتا ہے۔ اس طرح اسلم ڈار نے یہ شرط بھی منظور کر لی۔ صورت سنیما والے یہ سوچ رہے تھے کہ پرانی فلم کے

اکتوبر 2015ء



سمجھا جاتا رہا۔

اسلم ڈار کی دلی خواہش تھی کہ وہ رومانس سے بھرپور فلم بنائیں۔ مگر یکے بعد دیگرے انہیں ”دل لگی“ کی بجائے دوسری فلمیں بنانا پڑیں۔ کیوں بنانا پڑیں۔ اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ اب جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اس پوزیشن میں کر دیا تھا کہ وہ خود اپنی فلم پروڈیوس کر سکیں تو انہیں ”دل لگی“ کے پروجیکٹ کو عملی جامہ پہنانے کا خیال آیا۔ اب انہیں اس فلم سے روکنے اور منع کرنے والے کسی شخص کا خوف دامن گیر نہیں تھا لیکن شاید قدرت اس معاملے میں مہربان نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے ”دل لگی“ کا پروگرام ایک بار پھر التوا کا شکار ہو گیا۔ وجہ کیا تھی؟ وجہ یہ تھی کہ انہی دنوں ہمارا وطن عزیز دو لخت ہو گیا۔ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔ یہ ہماری تاریخ کا بدترین واقعہ تھا۔ لاکھوں مجانب وطن کو اس سانحے کا جو صدمہ پہنچا اسلم ڈار بھی اس صدمے سے دوچار ہوئے اور ان کا دل و دماغ اس قدر متاثر ہوا کہ انہوں نے خود ”دل لگی“ کا پروگرام ملتوی کر دیا اور اس کی جگہ ”رزق خان“ کے نام سے ایک فلم شروع کر دی۔ یہ فلم دراصل اسلم ڈار کے جذبات اور دکھوں کا اظہار تھی۔ وہ دکھ جو انہیں مشرقی پاکستان کے سانحے کے بعد ملا تھا۔ انہوں نے ”رزق خان“ میں جتنے بھی گیریکٹرینٹ کیے تھے وہ سارے اس دور کے حکمرانوں سے مشابہت رکھتے تھے۔ اگرچہ ان کے نام مختلف رکھے گئے تھے۔ ڈار صاحب نے اس فلم کے ذریعے اپنے ملی اور قومی جذبات کا اظہار بھرپور انداز میں کیا تھا۔ لوگوں نے ان کے جذبات کو سراہتے ہوئے اس فلم کو بہت پسند کیا اور باکس آفس پر بھی یہ بڑی کامیاب فلم ثابت ہوئی۔ اسلم ڈار خود بھی اس فلم کو اپنے لیے قابل افتخار سمجھتے ہیں۔ اس فلم میں بھی سلطان راہی کو انہوں نے بطور ہیرو پیش کیا تھا۔

”رزق خان“ کی تکمیل، نمائش اور کامیابی کے بعد ایک بار پھر ”دل لگی“ سے دل لگانے کا خیال آیا تو ڈار صاحب نے بڑے عزم و ارادے کے ساتھ کہا۔ اب یہ فلم میں خود بناؤں گا۔ ”دارا“ سے ”رزق خان“ کے پہلے تک ہر فلم کے بعد میں نے اس فلم کو بنانے کی کوشش کی مگر نہ اس کے لیے فنائے نہ تقسیم کاروں نے اس کی خریداری میں دلچسپی کا اظہار کیا بلکہ مجھے مجبور کیا کہ میں ایکشن فلم بناؤں لیکن اب نہ مجھے کسی فنائے کی ضرورت ہے نہ کسی تقسیم کار کی۔

”دل لگی“ بنانے کا خیال جب پہلی بار ڈار صاحب کو آیا تھا تو انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وحید مراد کو بطور ہیرو

مقابلے میں تو یہ نئی فلم بہتر بزینس کرے گی۔ ایک دو ہفتے چل جائے گی تو ہمیں کچھ نہ کچھ فائدہ ہو ہی جائے گا اور ان بے وقوفوں کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔

شاید وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ یہ انازی اور نا سمجھ لوگ ہیں یا پھر ان کی فلم میں کوئی جان نہیں لیکن جب ”بشیرا“ صنوبر جیسے خستہ حال سینما گھر میں ریلیز ہوئی تو اس کی قسمت ہی بدل گئی۔ ہر شوق، ٹکٹ کے حصول کے لیے دنیا فساد، ایڈوانس بکنگ، دو دو چار چار دن پہلے کے ٹکٹ حاصل کرنا بھی دشوار ہو گیا۔

شہر میں کوئی فلم ایسی چلے اور اس کی خبر دوسرے سینما والوں کو نہ ہو، ناممکن ہے۔ فلم انڈسٹری میں بھی کھلبلی مچ گئی۔ اسلم ڈار کی نئی فلم بھی ہٹ ہو گئی۔ ایسی فلم جس کے بارے میں کسی کو بھی اُمید نہیں تھی کہ اسے کوئی شوق سے دیکھے گا۔ پسند کرے گا۔ اس کا کھڑکی توڑ بزینس ہو رہا تھا۔ فلم والوں نے مبارک سلامت کے پیغامات بھیجنے شروع کر دیے۔ دوسری طرف سینما والوں کا تانتا بندھ گیا ان کے دفتر میں۔ سب ہاتھوں میں ایڈوانس رقم لے کر درخواست گزار تھے کہ ہمیں بھی اپنی فلم ریلیز کرنے کا موقع دیں۔

نسیم پاپولر اور دوسرے تقسیم کار جنہوں نے یہ کہہ کر اسلم ڈار کو دلی صدمہ پہنچایا تھا کہ تم اردو فلموں کے ہدایت کار ہو، تم نے پنجابی فلم کیوں بنائی اور فلم کا ٹائٹل رول ایک نئے لڑکے سے کیوں کروایا؟ آج کب افسوس مل رہے تھے کہ اپنی غلط سوچ کی وجہ سے انہوں نے اس فلم کے حقوق حاصل نہیں کیے۔ ورنہ اس فلم کی وجہ سے وہ لاکھوں کما لیتے۔ قدرت کے بھید کوئی نہیں جانتا۔ اللہ رب العزت اسلم ڈار کو آزمائش میں ڈال کر اسے زیادہ سے زیادہ نوازنا چاہتا تھا۔ اس لیے مخالفین کے شور پر اس نے اپنا تقسیم کار ادارہ بھی قائم کر لیا۔ ”بشیرا“ کی بلاک بسٹرز کامیابی کے بعد یہ تقسیم کار ادارہ مستحکم ہو گیا۔ فلم کی ساری آمدنی اسلم ڈار کو حاصل ہوئی۔ اور وہ اس قابل ہو گئے کہ اپنی فلم خود پروڈیوس کر سکیں۔

اس فلم کی لازوال کامیابی نے جہاں اسلم ڈار کی بنیادیں مستحکم کر دیں وہیں سلطان راہی کے بارے میں فلم انڈسٹری میں جو منفی سوچ تھی اور اسے نیا سمجھ کر کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا اس تاثر کو بھی مسترد کر دیا۔ ”بشیرا“ کی نقیدہ مثال کامیابی کے بعد اسے ایک کامیاب اداکار تسلیم کر لیا گیا بلکہ انہی موت سے پہلے تک فلموں کی کامیابی کی ضمانت

قصہ کوتاہ، جب ڈار صاحب ندیم کے گھرا گیری منٹ کرنے گئے اور ان سے کہا۔ ”آپ کو یاد ہوگا جب آپ سوات میں اقبال شہزاد کی فلم ”بازی“ کے گانے پکچرائز کروا رہے تھے ان دنوں میں آپ سے ملا تھا اور کہا تھا کہ میں اپنی ایک فلم ”دل لگی“ میں آپ کو ہیرو لینا چاہتا ہوں۔“

”جی ہاں، یاد ہے مگر اس بات کو تو خاصا عرصہ گزر گیا۔“
Downloaded from paksociety.com
”اور میں آپ کے پاس نہیں آیا۔ آپ یہی کہنا چاہتے ہیں نا؟“
”جی ہاں۔“

”آپ کے پاس اتنے دنوں تک نہ آنے کی وجہ یہ تھی کہ میری وہ فلم ”دل لگی“ کسی نہ کسی وجہ سے التوا کا شکار ہوتی رہی۔ اب اس لیے آیا ہوں کہ اب وہ فلم میں نے شروع کر دی ہے اور آپ سے اس فلم کے لیے ا گیری منٹ کرنے آیا ہوں۔ میری شرط صرف یہ ہے کہ میں تین مہینے میں فلم مکمل کرنا چاہتا ہوں۔ آپ بتائیے، آپ تین مہینے تک مجھے وقت دے سکتے ہیں اور اگر دیں گے تو کیا معاوضہ لیں گے؟“

ندیم بیک جو ایک سلیٹی ہوئی سوچ اور فکر کے انسان ہیں۔ انہوں نے یقیناً یہ سوچا ہوگا وہ شخص جو اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اپنی کمنٹ پر برقرار ہے جب کہ اسے یہ بھی معلوم ہوگا کہ آج میری وہ پوزیشن نہیں جو ”بازی“ کے زمانے میں تھی۔ اس کے باوجود اس کا میرے پاس آنا اس بات کی دلیل ہو سکتی ہے کہ وہ معمولی اعصاب اور صلاحیتوں کا بندہ نہیں۔

ندیم نے نہ صرف ”دل لگی“ میں کام کرنے کی رضامندی ظاہر کر دی بلکہ تین مہینے تک مسلسل ٹائم دینے کی بات بھی مان لی اور جب معاوضے کا مرحلہ آیا تو وہ رقم مانگی جو ان کے اس وقت کے مقابلے میں بہت کم تھی۔

سات سال تک التوا کا شکار رہنے والی فلم ”دل لگی“ سیٹ کی زینت بن گئی۔ ڈار صاحب نے ندیم سے ہر مہینہ پندرہ پندرہ دن لے کر ان کا کام وقت پر مکمل کر لیا۔ فلم وقت پر تیار ہو گئی۔ وہ اپنے دفتر میں بیٹھ کر ڈسٹری بیوٹرز اور سینما مالکان کا انتظار کرنے لگے مگر ”بشیرا“ کی طرح اس بار بھی انہیں مایوس ہی ہونا پڑا۔ ڈسٹری بیوٹرز یہ سوچ کر ان کے پاس نہیں آئے کہ اسلم ڈار ایکشن فلمیں بناتا ہے۔ اس رومانی فلم میں اس نے کیا تیر مارا ہوگا۔ تب ڈار صاحب نے

کاسٹ کرپس گے لیکن جب وہ اپنی فلم ”آخری چٹان“ بنا رہے تھے انہی دنوں ندیم کی پہلی فلم ”چکوری“ ریلیز ہوئی جسے دیکھ کر اسلم ڈار نے ہیرو کے سلسلے میں اپنا ارادہ بدل دیا اور وحید مراد کی جگہ ندیم کو ”دل لگی“ کا ہیرو بنانے کا عزم کر لیا۔ ”آخری چٹان“ کے گانوں کی عکس بندی کے لیے جن دنوں ڈار صاحب سوات میں موجود تھے انہی دنوں ندیم اقبال شہزاد کی فلم ”بازی“ کی شوٹنگ سوات میں کر رہے تھے۔ ڈار صاحب ان کے ہوٹل پہنچ گئے اور ان سے کہا۔

”میں فلم ڈائریکٹر اسلم ڈار ہوں۔ میں ایک فلم ”دل لگی“ کے نام سے بنانا چاہتا ہوں جس میں آپ کو ہیرو لینا چاہتا ہوں۔“

ندیم نے اپنے طور پر لوگوں سے ڈار صاحب کے بارے میں جاننے کی کوشش کی کہ یہ کیسے ہدایت کار ہیں مگر اس کے آگے معاملہ نہیں پہنچا۔ کیوں کہ ”دل لگی“ مسلسل سات سال تک التوا کا شکار ہوتی رہی پھر جب ”دل لگی“ شروع ہونے کا وقت آیا۔ اس وقت تک ندیم کی 9 فلمیں فلاپ ہو چکی تھیں۔ ”دل لگی“ شروع کرنے پر جن لوگوں نے انہیں مبارک باد دی جب انہوں نے پوچھا۔ آپ کی اس رومانوی فلم کا رومانوی جوڑا کون ہوگا؟ تو ڈار صاحب بولے۔

”شبنم اور ندیم۔“
”یہ آپ کیا غضب کر رہے ہیں۔“ انہوں نے چھوٹے ہی کہا۔ ”شبنم کی حد تک تو ٹھیک ہے مگر ندیم آپ کو پتا ہے اس کی مسلسل نو فلمیں فلاپ ہو چکی ہیں۔ ایک پٹے ہوئے ہیرو کو لے کر آپ اپنی فلم کا ستیاناس نہیں کریں گے؟“

یہی بات دیگر فلموں والوں نے بھی ان سے کہی جب انہیں معلوم ہوا کہ ندیم کو وہ ہیرو لینا چاہتے ہیں مگر ان کے پائے استقلال میں جنبش پیدا نہ ہوئی۔ وہ اپنے ارادے میں اڑے رہے۔ شاید وہ اس بات کے قائل تھے کہ فلم کسی ایک شخص کی وجہ سے کامیاب ہوتی ہے نہ ناکام۔ انہیں منع کرنے والوں میں جفادری قسم کے ڈسٹری بیوٹرز بھی تھے اور سینما مالکان بھی مگر اب اسلم ڈار کو کسی کے مشورے کی ضرورت تھی نہ رہنمائی کی۔ وہ عزم و ارادے کے بڑے کے تھے جس کا ایک ثبوت یہ فلم بھی تھی کہ سات سال تک مختلف وجوہ کی بنا پر قنصل کا شکار ہونے کے باوجود اس کے بنانے کے ارادے سے وہ دستبردار نہیں ہوئے تھے۔

کار نے اس پرتس کھا کر اس کی فلم ریلیز کی تو اس کا مذاق اڑانے والوں کے ہوش اڑ گئے۔ آج بھی ڈسٹری بیوٹرز اور سینما مالکان فلم میکرز کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے۔ اپنے دیس میں بنی فلموں سے زیادہ اہمیت غیر ملکی فلموں کو دیتے ہیں۔ اول تو ملکی فلموں کو سینما گھر دستیاب نہیں ہوتے ہیں تو دوسرے تیسرے ہفتے اچھی خاصی چلتی ہوئی فلم کو اتار کر نئی غیر ملکی فلم لگا دیتے ہیں۔“

”فلم بنانا اسلم ڈار کا پیشہ تھا۔ ان کا بزنس اور کاروبار تھا اور اب تو ان کے راستے کی بہت سی رکاوٹیں بھی ختم ہو گئی تھیں۔ ان کا اپنا ڈسٹری بیوشن کا دفتر بھی تھا اور اس دفتر کے سہارے بشیرا، رزق خان اور دل گئی سے بہت اچھی کمائی بھی کر چکے تھے۔ پھر بھلا فلمیں کیوں نہ بناتے؟ ان کے بارے میں غالباً پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ وہ دوسروں سے ذرا ہٹ کر تھے۔ ان کی سوچ اور فکر دوسرے فلم میکرز سے مختلف تھی۔ وہ مختلف، منفرد اور اچھوتے خیالات کی حامل فلمیں بنانے کے قائل تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی ہر فلم پہلی فلموں سے مختلف ہو۔ جب تک وہ بے بس تھے۔ ڈسٹری بیوٹرز اور سینما مالکان کے دباؤ پر ایکشن فلمیں بناتے رہے۔ چونکہ ان کی پہلی فلم ”دارا“ ایکشن فلم تھی جو ہٹ ہوئی اس لیے تقسیم کاروں نے یہ سمجھ لیا کہ وہ ایکشن فلمیں ہی بنا سکتے ہیں۔ اس مجبوری کے دور میں بھی انہوں نے جو ایکشن فلمیں بنائیں ان میں بھی یکسانیت نہیں آنے دی۔ ہر فلم کی کہانی مختلف موضوع اور تقسیم کے لحاظ سے بھی ایک دوسرے سے کوئی مشابہت نہیں رکھتی تھی لیکن اب جب وہ آزاد تھے اور اپنی پسند کی فلمیں بنا سکتے تھے تو فلمیں کیوں نہ بناتے۔ ”دل گئی“ کے بعد انہوں نے باہل صدقے تیرے، پہلی نظر، بڑے میاں دیوانے، وعدہ، زبیدہ، انوکھا راج، قدرت و انتقام، عشق نچائے گلی گلی، گوگا، پھول، ہم تمہارے ہیں، سیاں اناڑی وغیرہ بنائیں۔“

”جی ہاں یاد ہے۔“

”سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے حالات میں جب وہ ہر طرح سے آزاد تھے۔ سرمایہ کاری سے لے کر ڈسٹری بیوشن تک خود کرتے تھے اور فلم بنانا ان کا پیشہ بھی تھا۔ پھر انہوں نے 1998ء میں فلمیں بنانا کیوں ترک کر دیں؟“ خانزادہ نے سوال کیا۔

”ڈار صاحب نے جب اپنی پسند کی فلمیں بنانا شروع کیں تو اپنے بیٹے کو ڈسٹری بیوشن آفس میں بٹھا دیا اور

سوچا۔ چلو ہم خود ہی اس کی نمائش کا بندوبست بھی کر لیتے ہیں تو سینما والوں نے ان کے آگے گھاس نہیں ڈالی۔ دستور کے مطابق جو پیشگی رقم ادا کرتے تھے۔ اس سے انکار کر دیا۔ ایک سینما والے سے بڑی مشکل سے ان کا معاملہ طے ہوا مگر اس نے بھی ایڈوانس میں دی ہوئی رقم واپس لے لی کہ فلم فلاپ ہوگی تو اس کی رقم بھی ڈوب جائے گی۔ اسلم ڈار اور ان کے پارٹنر قمر بٹ کو اس موقع پر جو ذہنی اذیت برداشت کرنا پڑی وہ ناقابل فراموش ہے مگر وہ جو کہتے ہیں کہ ناخدا جس کا نہ ہو، اس کا خدا ہوتا ہے۔ ان کی مشکل بھی اللہ نے آسان کی۔ اس آزمائش کے وقت بھی انہوں نے اللہ ہی سے مدد مانگی۔ کسی نہ کسی طرح ”دل گئی“ سینما گھروں میں لگی اور ایسی لگی کہ پھر اترنے کا نام نہیں لیا۔ کامیابی کے لحاظ سے اس نے اردو فلموں کے اس وقت تک کے سارے ریکارڈ توڑ دیے۔ یہ وہ فلم تھی جس نے پاکستان کے ہر ایشین پر پندرہ پندرہ بار چلنے کا ریکارڈ قائم کیا بلکہ بعض ایشین ایسے بھی ہیں جہاں اس سے بھی زیادہ چلی۔ اس فلم نے بلائیسٹم جو بیلی کا جھومرا اپنے ماتھے پر سجایا اور وہ ندیم جس کی نو فلمیں فلاپ ہو چکی ہیں ایک بار پھر اس کی ساکھ بحال ہو گئی اور وہ کامیاب اداکاروں کی صف اول میں شامل ہو گیا۔

”دل گئی“ ایک اچھے سیکٹ پر ایک اچھی بلکہ بہت اچھی فلم تھی۔ جس کی پلاننگ ایک اچھے ڈائریکٹر نے کی تھی اور اسے کامل یقین تھا کہ شائقین فلم اسے بہت پسند کریں گے مگر وہ لوگ جن کے ہاتھوں میں فلم ٹریڈ کی لگام ہوتی ہے وہ انہی فلم میکرز کا ساتھ دیتے ہیں جو ان کی پسند کی فلمیں بنا کر انہیں دیتے ہیں۔ اچھی فلمیں بنانے والوں کو بھی بسا اوقات اپنی پسند کے برخلاف دوسروں کے موڈ مزاج کی فلمیں بنانی پڑتی ہیں۔ جو فلم میکرز فلم ٹریڈ کے جغادریوں کے کہنے پر نہیں چلتے انہیں سزا دیتے ہیں وہ کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ ”بشیرا“ اور ”دل گئی“ باکس آفس کے لحاظ سے بہت بڑی فلمیں تھیں لیکن چونکہ ڈسٹری بیوٹرز کی پسند کو پیش نظر رکھ کر نہیں بنائی گئی تھیں۔ اس لیے انہوں نے ان کے ساتھ سوتیلی ماں سے بھی بدتر سلوک کیا۔

”فلم ٹریڈ سے تعلق رکھنے والوں کا یہ رویہ کل کی طرح آج بھی برقرار ہے۔ رنگیلا نے جب اپنی پہلی فلم ”دیا اور طوفان“ بنائی تھی تو اس کی حوصلہ افزائی کرنے کی بجائے اس کی ہر طرح حوصلہ شکنی کی گئی مگر جب ایک جھوٹے سے تقسیم

میرے مرنے کے بعد وہاں فلمیں بناتے رہنا۔“
”آپ کے بعد کیوں؟ آپ کی موجودگی میں کیوں نہیں؟“

”اگر ایسی بات ہے تو یہی سہی۔“
اس کے بعد اسلم ڈار نے ایک فلم ”ڈولی سجا کے رکھنا“ شروع کی جس کا پروڈیوسر بیٹے کو بنایا اور فلم کے متعلق تمام معاملات کی ذمہ داری بیٹے کو سونپ دی تاکہ اسے بخوبی اس بات کا علم ہو کہ کن کن مرحلوں سے فلم بنانے کے لیے گزرنا پڑتا ہے۔

ڈار صاحب کے کام کرنے کا ایک اصول تھا۔ وہ اپنی فلم کے لیے آرٹسٹوں سے شیڈول طے کر کے تاریخیں دے دیتے تھے اور پھر پوری کوشش کرتے تھے کہ شیڈول کے مطابق کام ہو جائے تاکہ وقت کے مطابق فلم مکمل ہو جائے۔ ایسا ہی شیڈول ”ڈولی سجا کے رکھنا“ کے لیے بھی تیار کیا گیا مگر اس بار بد قسمتی سے کچھ ایکٹروں کی وجہ سے ان کا شیڈول متاثر ہوا اور وہ فلم جو تین مہینے میں مکمل ہو جانی چاہیے تھی اسے دس ماہ لگ گئے۔ جیسے جیسے فلم لیٹ ہوتی گئی ان کا بیٹا دل برداشتہ ہوتا گیا۔ آخر کار اس نے کہہ دیا۔ ”پاپا! یہ میرے بس کا کام نہیں۔ یہ آپ ہی کا حوصلہ ہے کہ آپ اس لائن سے وابستہ ہیں اور ان لوگوں کے ساتھ کام کر رہے ہیں مگر میں ہرگز ان لوگوں کے ساتھ کام نہیں کر سکتا۔“
”ڈولی سجا کے رکھنا“ مکمل ہونے کے بعد بڑی بے دلی کے ساتھ ان کے بیٹے نے اسے ریلیز کیا تو یہ فلم ناکام ہو گئی۔

پھر یوں ہوا کہ ایک دن ان کے بیٹے نے ڈسٹری بیوشن آفس کی چابی بھی ان کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ”اب یہ کام بھی میں نہیں کروں گا۔ آپ نے مجھ سے کہا تھا نا۔ میرے مرنے کے بعد فلم نہیں بنانا۔ میں آپ کی زندگی میں ہی اس کام سے توبہ کرتا ہوں۔“

16 سال تک ڈسٹری بیوشن آفس میں بطور ڈسٹری بیوٹر کام کرنے کے بعد فلم پروڈیوس کرنے کے چکر میں بیٹا اس قدر دل برداشتہ ہوا کہ تقسیم کاری کے کام سے بھی متنفر ہو گیا۔ باپ کے ہاتھ میں دفتر کی چابیاں دے کر رہ گیا تو پھر کبھی اس کی طرف رخ نہیں کیا۔ باپ کو اس کا جو صدمہ ہونا چاہیے تھا وہ ہوا۔ ان کی تیسری پشت فلم انڈسٹری اور ٹریڈ میں قدم نہ جما سکی۔ اس بات کا انہیں بڑا دکھ ہوا۔

ڈار صاحب کی ذمہ داریاں اب بڑھ گئی تھیں۔ اب

کہا۔ ”اب یہ دفتر تمہارا ہے۔ ڈسٹری بیوشن کا سارا کام تم کرو گے۔“ تقسیم کاری کی ساری ذمہ داری بیٹے کو سونپ کر وہ اپنے موڈ مزاج کی فلمیں بنانے لگے۔ ہر فلم دوسرے سے بالکل مختلف نئے سبکیٹ اور نئے معاشرتی مسائل کے پس منظر میں کبھی سنجیدہ کبھی کامیڈی، کبھی اردو کبھی پنجابی زبان میں۔

ایک دن ان کے بیٹے نے ان سے کہا۔ ”پاپا! آپ یہ کیسی فلمیں بناتے ہیں؟ آپ ویسی ہی فلمیں بنائیں جیسی لوگوں کی ڈیمانڈ ہے۔“

بیٹے کی زبانی یہ باتیں سن کر ڈار صاحب یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ان کا بیٹا بھی دوسرے ڈسٹری بیوٹرز کی طرح مارکیٹ کے رنگ میں رنگ گیا ہے۔ ”میرے بیٹے کے سوچنے کا انداز مجھ سے مختلف ہو گیا ہے۔“ اس خیال نے ان کے دل و دماغ کو دھچکا لگایا۔ ”میں تو یہ سمجھتا تھا کہ میرا بیٹا میرے بعد میرے مشن کو جاری رکھے گا۔ میری طرح منفرد اور اچھوتے موضوع کی فلمیں بنائے گا مگر وہ تو مجھ ہی کو ایسی فلمیں بنانے سے روک رہا ہے۔“

انہوں نے بیٹے سے کہا۔ ”میرے مرنے کے بعد تم فلمیں نہ بنانا۔“

”کیوں پاپا! آپ نے یہ بات کیوں کی؟“
”اس لیے کہ تم ایک ڈسٹری بیوٹر ہو۔ تمہارا موڈ مزاج ڈسٹری بیوٹروں ہی جیسا ہو گیا ہے۔ تم پروڈیوسر نہیں اس لیے پروڈیوسروں جیسی تمہاری سوچ اور فکر نہیں۔“
”مگر پاپا! میں تو سوچ رہا تھا جس طرح آپ نے اپنے پاپا کی طرح فلم ڈائریکشن کو اپنایا اسی طرح میں بھی.....“

”نہیں..... تمہارے لیے یہ سب کچھ بہت مشکل ہو گا۔ تم اسٹوڈیوز کے ماحول سے واقف نہیں۔ تم یہ نہیں جانتے کہ پروڈیوسرز کو فلم بناتے وقت کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔“

”نہیں پاپا! میں تو فلم بناؤں گا۔ اتنا عرصہ فلم ٹریڈ میں گزارنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مجھے اپنے باپ دادا کی طرح فلم ہی بنانا چاہیے۔“

بیٹے کی زبانی یہ باتیں سن کر ڈار صاحب کی مایوسی کچھ کم ہوئی انہوں نے کہا۔ ”اگر ایسی بات ہے تو اس ڈسٹری بیوشن آفس سے اٹھو اور اس جنگل میں چلو جس کا نام اسٹوڈیو ہے۔ تاکہ تمہیں وہاں کے لوگوں کی نفسیات کا علم ہو اور تم

قلمی صنعت کو ایک نئی جہت دی تھی۔ ایسی تخلیقی صلاحیتوں سے بالامال ہدایت کارہ کو مفاد پرست لوگوں نے گجر برانڈ فلمیں بنانے پر مجبور کر دیا۔“

مگر اسلم ڈار کا مسئلہ سنگیتا سے قدرے مختلف تھا۔ اسلم ڈار سنگیتا کی طرح مجبور نہیں تھے۔ اسلم ڈار کے راستے میں شروع میں مفاد پرستوں نے ضرور رکاوٹیں کھڑی کی تھیں مگر جب وہ با اختیار ہو گئے، خود مختار ہو گئے، اس وقت انہوں نے خود اپنے نئے آنے والے دنوں کو آسان بنانے کی کوئی تدبیر نہیں کی۔ ان کا بیٹا ان کا ساتھ دے سکتا تھا۔ ان کا ہاتھ بنا سکتا تھا۔ ان کے مشن کی تکمیل کر سکتا تھا۔ ان کی تیسری پشت کو بھی فلم انڈسٹری میں باپ دادا کی طرح زندہ رکھ سکتا تھا مگر اس کے لیے اسلم ڈار کو جو کرنا چاہیے تھا وہ انہوں نے نہیں کیا۔ وہ اپنی نئی فلموں کے لیے تو بہت اچھی پلاننگ کرتے تھے مگر انہوں نے اپنے مستقبل کے لیے کوئی اچھی منصوبہ بندی نہیں کی۔ اگر وہ سولہ برس تک اپنے بیٹے کو ڈسٹری بیوشن آفس میں بٹھائے رکھنے کی بجائے فلم پروڈکشن میں اسے اپنے ساتھ رکھتے، اسٹوڈیوز کے ماحول، آرٹسٹوں سے غمٹنے، فلم سازی کے نرم گرم حالات سے نبرد آزما ہونے

انہیں فلم سازی کے ساتھ ساتھ ڈسٹری بیوشن کا کام بھی کرنا پڑا تو ان کے لیے مشکلات پیش آنے لگیں۔ بڑھتی ہوئی عمر کا تقاضا تھا کہ اب ان کا ہاتھ بنانے والا ان کا ساتھ دینے والا کوئی ہو مگر ساتھ دینے والا ہی جب ساتھ چھوڑ گیا تو وہ آہستہ آہستہ ہمت ہار بیٹھے۔ کچھ دنوں تک تو وہ نئی فلموں کی پلاننگ کرتے رہے پھر یہ خیال بھی دل سے نکال دیا لیکن فلم انڈسٹری سے اپنا ناتا نہیں توڑا۔ اس کی بہبود اور بھلائی کے لیے کام کرنے کو ہی اپنا مقصد حیات بنا لیا۔

”بات دراصل یہ ہے کہ جس طرح ہمارے ملک میں زیادہ تر لوگ قومی مفادات سے زیادہ ذاتی فائدے کے لیے کام کرتے ہیں اسی طرح ہماری قلمی دنیا میں بھی انڈسٹری اور ٹریڈ کی جڑیں مضبوط کرنے کی بجائے زیادہ تر فلم والے ذاتی مفادات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اس مقصد کے لیے ان لوگوں کو بھی اپنے راستے پر چلنے کے لیے مجبور کرتے ہیں جو اچھی فلمیں بنا کر اپنی فلم انڈسٹری اور ملک و قوم کا نام روشن کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے سنگیتا کے بارے میں تو سنا ہو گا کہ ”سوسائٹی گرل“ اور ”مٹھی بھر چاول“ جیسی فلمیں بنا کر اس نے پاکستانی

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

ماہ اکتوبر کی بدلتی رسمیں
جاسوسی کے شمارے کی نگاہیں

انسانوں کے ہاتھوں انسانوں کا ہولناک قتل عام سپنس سے بھرپور شاہکار **امجد رئیس** کا انصاف

شریف آدمی کو بد معاش بننے پر مجبور کر دینے والے قانون شکن عناصر کی یکجائی جسے جہنم لینے والا ہولناک سلسلہ **طاہر جاوید مغل** کے قلم سے چلچلاتی دھوپ میں بے آسرا تنہا مسافر کی آبلہ پائی....

عبدالرب بھٹی کی طبع آزمائی

سرورق کی کہانیاں

ہمارے معاشرے کے وہ کردار جو بلند ہونے کے باوجود پسپائی کا درجہ رکھتے تھے..... **منظر امام** کی کیٹلی تحریر

آج نہیں تو کل ہر شخص کا حساب بے باق ہونا ہے..... **کاشف زبیر** کی اس حوالے سے یادگار تحریر

ایبولا

انگاریے

آوارہ گرد

بڑا کام

یوم حساب

آپ کے تھرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کھائیں



زبان میں ہوا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد ایس ایم ڈار صاحب نے پہلے پرچہ کے ساتھ ایک اور پرچہ "فلم کلچر ریل" کے نام سے نکالا۔ یہ پندرہ روزہ پرچہ تھا۔ ان پرچوں کے لیے وہ ہندوستان کے تمام فلمی مراکز کلکتہ، بمبئی اور مدراس آیا جایا کرتے تھے۔ وہاں کی فلموں کی خبریں اور فیچرز شائع کرتے اور ان کے اشتہار بھی لے کر آتے۔ تھوڑے ہی عرصے میں دونوں پرچے پورے متحدہ ہندوستان میں مقبول ہو گئے تھے۔ واضح رہے کہ ان دنوں لاہور بھی ایک فلمی مرکز تھا اور یہاں بننے والی اردو اور پنجابی فلمیں پورے ہندوستان میں دیکھی جاتی تھیں۔ پھر ایک وقت آیا جب لاہور فلم انڈسٹری سے تعلق رکھنے والے بہت سے فلم والے بمبئی اور کلکتہ چلے گئے۔ جن میں فلم ساز و ہدایت کار اے آر کاردار اور نذیر صاحب بھی تھے۔ جنہوں نے بمبئی جا کر بڑا نام کمایا۔ اے آر کاردار سے ایس ایم ڈار صاحب کی بڑی دوستی تھی۔ انہوں نے بمبئی جا کر جب اپنی صلاحیتوں سے ایک اعلیٰ مقام حاصل کر لیا تو اپنے صحافی دوست شفیع محمد ڈار کو بمبئی آنے کی دعوت دی اور کہا کہ آپ یہاں آ کر میرے اسٹوڈیو اور میرے کاروبار کے نظم و نسق کو سنبھال لیں۔ ڈار صاحب اپنے دوست کے بلائے پر بمبئی چلے گئے اور لاہور سے شائع ہونے والے اپنے دونوں فلمی پرچے اپنے بھائی ایم ڈی ڈار کو سونپ گئے۔ ان کے یہ بھائی چونکہ ان جریدوں کے سلسلے میں پہلے سے ان کے ساتھ تھے اس لیے انہیں اس بات کا یقین تھا کہ وہ دونوں پرچے سنبھال لیں گے۔

ایس ایم ڈار صاحب پڑھے لکھے اور سمجھ دار آدمی تھے۔ جلد ہی کاردار اسٹوڈیو کا کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دینے لگے۔ کاردار صاحب بھی ان کے کام سے بہت خوش تھے اور چاہتے تھے کہ ان کی فیملی کو بھی بمبئی بلوائیں مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ تقسیم ہند کا مرحلہ آیا تو ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے اور ڈار صاحب کو اپنی فیملی بمبئی لانے کی بجائے خود لاہور واپس لوٹ آنا پڑا۔

اس دوران لاہور میں بھی بڑا خون خرابہ ہوا اور املاک کو نقصان پہنچا۔ لاہور کے اسٹوڈیوز بھی تباہی و بربادی سے بچ نہ سکے۔ جب کچھ عرصہ بعد حالات آہستہ آہستہ نارمل ہوئے تو فلم والوں نے دوبارہ فلم سازی شروع کی۔ ایس ایم ڈار صاحب نے جو کاردار

کی تربیت دیتے تو اس سولہ سال کی مدت میں وہ ان کی طرح ایک طاقت ور اور توانا اعصاب کا فلم میکر ثابت ہوتا۔ انہوں نے اپنے آبائی پیشے سے بیٹے کو وابستہ کرنے کی بجائے اسے ڈسٹری بیوشن آفس میں بٹھا کر اسے عضوئے معطل بنا دیا۔ اس دوران اس میں ایک ڈسٹری بیوٹر کی خوبی تو پیدا ہو گئی اور وہ دوسرے تقسیم کاروں کی طرح ان کی فلموں کو تنقید تبصرے کا نشانہ تو بنانے لگا لیکن اس قابل نہیں رہا کہ کوئی اور کام کر سکے۔ ایسے حالات میں اسے پروڈیوسر بنانا اور ایک پوری فلم کی ذمہ داریاں اس پر ڈالنا اسلم ڈار کی زبردست بھول تھی۔ ایسی زبردست غلطی کا خمیازہ انہیں یہ بھگتنا پڑا کہ اس نے فلم سازی سے ہمیشہ کے لیے توبہ کر لی اور ڈسٹری بیوشن کی ذمہ داری سے بھی دستبردار ہو گیا۔ ڈار صاحب نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے۔

ڈار صاحب نے تقسیم کاروں کے سلوک سے مجبور ہو کر اپنی فلموں کی خود تقسیم کاری کا فیصلہ کیا۔ یہاں تک تو وہ قابل معافی ہیں مگر اپنی اولاد کو اپنے آبائی پیشے کی تربیت دینے کی بجائے ڈسٹری بیوشن آفس میں دفن کر دینا، ان کا ناقابل معافی جرم تھا جس کی انہیں سزا ملی۔

"ابھی کئی بار اسلم ڈار کی تیسری پشت کا ذکر ہوا ہے۔" خانزادہ بولے۔ "ان کی پہلی پشت یعنی اسلم ڈار کے والد محترم کے بارے میں بھی کچھ بتائیے۔"

"شاید آپ بھول گئے۔ ان کے بارے میں ابتداء میں بتا چکا ہوں۔"

"جی نہیں، میں بھولا نہیں، ایس ایم ڈار صاحب کے بارے میں آپ نے بتایا ہے مگر بہت مختصر کے ساتھ میں چاہتا ہوں کہ ذرا تفصیل کے ساتھ بتائیں۔ آخر انہوں نے ایک فلمی گھرانے کی بنیاد رکھی تھی تو ان کے متعلق ٹھیک ٹھاک معلومات تو حاصل ہونا چاہیے نا۔"

"محمد شفیع ڈار کا خاندان ڈیڑھ سو سال سے بھی کچھ زیادہ عرصے سے لاہور میں آباد تھا۔ انہوں نے جب بی اے پاس کر لیا تو انہیں فلموں سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ انہوں نے اس شوق کے تحت ایک فلمی پرچہ نکالا۔ یہ ایک ہفت روزہ تھا جو انگریزی زبان میں نکالا گیا تھا اور اس کا نام تھا "سووی فلش"۔ اس کا دفتر انہوں نے 8 نمبر میکلوڈ روڈ میں قائم کیا تھا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ پنجاب کے حوالے سے یہ پہلا فلمی جریدہ تھا جس کا اجرا انگریزی

اسٹوڈیو میں فلم سازی کے ہر شعبے کو بہت قریب سے دیکھ چکے تھے یہ فیصلہ کیا کہ انہیں بھی فلم انڈسٹری سے وابستہ ہو کر اپنی نئی آنکھ کا آغاز کرنا چاہیے۔ لہذا عملی طور پر اس کی ابتداء انہوں نے فلمی فوٹو گرافی سے کی۔ باضابطہ اس کی تربیت حاصل کی۔ پھر تربیت مکمل ہونے کے بعد مکمل عکاس کی حیثیت سے متعدد فلموں کی عکاسی کی مگر یہ ان کی آخری منزل نہیں تھی۔ انہوں نے اللہ کا نام لے کر ہدایت کاری شروع کر دی اور اپنی ذہانت، محنت اور لگن کی وجہ سے کئی کامیاب اور یادگار فلمیں بنائیں۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ ان کی ایک فلم ”سردار“ کے پروڈیوسر و زمانہ جنگ کے مالک و مدیر میر ظلیل الرحمن اور ماہنامہ ”رومان“ کے غنی دہلوی تھے۔ یہ فلم سلور اسکرین کے بیس پر بنی تھی اور ایک کاسٹیوم اور ایکشن فلم تھی جس میں اس وقت کے نامور فنکاروں صبیحہ، ستوش، الیاس کشمیری، نیر سلطانہ، شیخ اقبال، نذر، آشا بوسلے، ایم اسماعیل اور غلام محمد نے کام کیا تھا جب کہ اس کے فوٹو گرافر اسلم ڈار تھے۔ یہ اسلم ڈار کی آزاد عکاس کے طور پر ابتدائی دور کی فلم تھی۔ باپ نے یعنی ایس ایم ڈار نے بیٹے اسلم ڈار کو اس شرط پر اس کی فوٹو گرافی کرنے کی اجازت دی تھی کہ اگر پہلے دن تم نے صحیح شوٹنگ کر لی تو تم سے پوری فلم شوٹ کروائی جائے گی ورنہ تہہ باری جگہ ہم کسی اور سے عکاسی کروائیں گے۔ اس زمانے میں ہوتا یہ تھا کہ جو شوٹنگ آج کی گئی ہے اس کی پرنٹ نکال کر دوسرے روز کی شوٹنگ سے نکل دیکھا جاتا تھا۔ اسلم ڈار اپنے پہلے دن کی شوٹنگ میں کامیاب قرار دیئے گئے تو انہیں پوری فلم کی عکاسی سونپ دی گئی۔ چھوٹے ڈار نے بڑے ڈار کی دوسری فلم ”سلطنت“ کی بھی عکاسی کی۔ یہاں تک کہہ کر میں چند لمحوں کے لیے رکا۔ پھر خانزادہ کو مخاطب کر کے کہا۔

”میرا خیال ہے اسلم ڈار کی پہلی پشت کے بارے میں آپ کو بہت سی باتوں کا علم ہو چکا ہوگا۔ اب اگر کچھ پوچھنا ہو تو اسلم ڈار کے بارے میں پوچھیں کہ آج ہمارا موضوع گفتگو وہی ہے۔“

”اسلم ڈار صاحب کے بارے میں کچھ ایسی باتیں بتائیں جو اب تک کی گفتگو میں نہیں کی گئی ہیں مگر انہیں ان کا طرہ امتیاز کہا جاسکتا ہے۔“

”اسلم ڈار حقیقتاً ایک بہت اچھی سوچ فکر اور وژن

کے تخلیق کار تھے۔“ میں نے اپنی بات سمجھاتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ”جب فوٹو گرافی ترک کر کے انہوں نے فلمیں بنانے کا ارادہ کیا تو سب سے پہلے یہ سوچا۔ فلمیں تو بہت سے لوگ بنا رہے ہیں اگر میں نے بھی انہی کی طرح فلمیں بنائیں تو اس کا کیا فائدہ ہوگا؟ یہ وہ زمانہ تھا جب انور کمال پاشا، شوکت حسین رضوی، مسعود پرویز، خلیل قیصر، حسن طارق، جعفر ملک اور منشی دل جیسے نامور ہدایت کاروں کا فلم انڈسٹری پر راج تھا۔ اگر میں ان سب سے ہٹ کر کوئی ایسی فلم بناؤں جو ہمارے ہاں اب تک نہیں بنائی گئی ہے تو یہ میرا کنٹری بیوشن ہوگا۔ لوگ اسے خاص طور پر دیکھنے آئیں گے۔ اس طرح فلم بھی کامیاب ہوگی اور مجھے بھی کامیاب فلم سیکر تسلیم کیا جائے گا۔ لہذا بہت سوچ بچار کے بعد انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ نارتھ جیسی ایک فلم بنائیں گے۔ یورپ میں ایسی کئی فلمیں جو نارتھ کی کہانی پر بنائی گئیں ان سب نے بہت کامیابی حاصل کی۔ اس سوچ کے بعد انہوں نے ”دارا“ کے نام سے جو فلم بنائی وہ نارتھ نما تھی اور اس کا ٹائٹل رول انہوں نے نصر اللہ بٹ سے کروایا جو ادا کار نہیں، انعام یافتہ باڈی بلڈر تھا۔ اس فلم کی بہت سی فلم بندی سابق مشرقی پاکستان کے مشہور جنگل سندر بن میں ہوئی جس میں بہت سے ہاتھیوں نے بھی حصہ لیا۔ اسلم ڈار نے جیسا سوچا تھا ویسا ہی ہوا۔ یہ پاکستان کی پہلی نارتھ نما فلم تھی۔ اس نے خاطر خواہ کامیابی حاصل کی۔ نصر اللہ بٹ اپنے تن و توش کی وجہ سے نارتھ کے کردار میں خوب بچا۔ ان کی دوسری ایکشن فلم ”آخری چٹان“ تھی۔ اس فلم میں بھی نصر اللہ بٹ اور رانی نے کلیدی رومانوی کردار کیے تھے۔“

”دارا“ کے بارے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جب پروڈیوسر میاں مشتاق نے انہیں اپنی فلم ڈائریکٹ کرنے کی دعوت دی تو کس شرط پر انہوں نے میاں صاحب کی آفر قبول کی۔ اسلم ڈار نے میاں مشتاق سے کہا۔ ”میری چند شرطیں ہیں۔ جو یہ ہیں کہ میرا جو دل چاہے گا میں اس موضوع کو فلماؤں گا۔ اگر خدا نخواستہ فلم ناکام ہو گئی تو میں آپ سے ایک پیسا بھی نہیں لوں گا مگر کامیابی کی صورت میں فلم کی لاگت نکال کر آپ اپنے فائدے کا چوتھائی حصہ مجھے دیں گے۔“

یہ باتیں ایک ایسا شخص کہہ رہا تھا جس نے اب تک

کوئی فلم ڈائریکٹ نہیں کی تھی جب کہ عام طور پر نیا ہدایت کار پروڈیوسرز کے ہر حکم پر سر تسلیم خم کرتا ہے۔

میاں صاحب اس نوجوان عکاس کی صلاحیتوں سے واقف تھے کیوں کہ وہ ان کی دو فلموں ”چھو منتر“ اور ”رقاصہ“ کی عکاسی کر چکا تھا۔ اس ایک واقعے سے ڈار صاحب کی خود اعتمادی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

خود اعتمادی کے ضمن میں ہی نئے جہروں کے انتخاب کی بات کی جاسکتی ہے۔ انہوں نے اپنی فلموں میں کئی نئے چہرے پیش کیے جن میں سلطان راہی کا نام خصوصی طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ ایکسٹرا کے طور پر چھوٹے چھوٹے کردار کرنے والے سلطان راہی کو انہوں نے اپنی ایک بہت بڑی فلم ”بشیرا“ کے ٹائٹل رول میں پیش کیا جس کی پوری انڈسٹری نے مخالفت کی کہ یہ ان کا غلط فیصلہ ہے مگر وہ اپنے ارادے میں اٹل رہے۔ ”بشیرا“ کی نمائش کے بعد ثابت ہو گیا کہ ان کا فیصلہ کتنا درست تھا۔

”سلطان راہی تو پھر بھی ایکسٹرا کے طور پر ہی سہی فلموں سے وابستہ تھے مگر دو چھوٹے قد کے کامیڈین رفیق موچھے اور ٹینگو ٹینگو کا انتخاب بھی ان کی فن شناس نگاہوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ جن دنوں ”آخری چٹان“ زیر تکمیل تھی۔ ڈار صاحب اس فلم کا کامیڈی کیریئٹر رنگیلا سے گرانٹا چاہتے تھے مگر ان دنوں رنگیلا اپنی دوسری فلم ”دل اور دنیا“ بنانے میں مصروف تھے۔ ڈار صاحب رنگیلا کو سائن کرنے کی نیت سے ایورنیو اسٹوڈیو گئے تھے مگر انہیں حد سے زیادہ مصروف دیکھا تو سمجھ گئے رنگیلا ان کی ضرورت کے مطابق انہیں وقت نہیں دے سکے گا۔ وہ وہاں سے مایوس لوٹ رہے تھے کہ وہیں اسٹوڈیو میں انہیں ایک پستہ قد شخص نظر آیا۔ اسے دیکھتے ہی ڈار صاحب کی دور بین نگاہوں نے اندازہ لگالیا کہ اس میں ایک کامیاب کامیڈین بننے کی صلاحیت موجود ہے۔ ”آخری چٹان“ کے ہدایت کار نے اس سے پوچھا۔ تمہارا کیا نام ہے؟“

”رفیق۔“

”تم یہاں کیا کام کرتے ہو؟“

”میں درپن صاحب کے دفتر میں کام کرتا ہوں۔“

”تم فلموں میں کام کرو گے؟“

رفیق غیر متوقع سوال سن کر چونکا۔ ”جی..... میں کچھ سمجھا نہیں۔“

”میں تمہیں اپنی فلم ”آخری چٹان“ کے کامیڈی

رول میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔“

”آپ..... آپ ”دارا“ والے اسلم ڈار تو نہیں؟“

”ہاں میں وہی ہوں۔“

اور اس طرح ڈار صاحب نے ایک معمولی چہرہ نما شخص کو ایک کامیاب کامیڈین بنا دیا اس کے ساتھ ایک اور چھوٹے قد کے لڑکے ٹینگو ٹینگو کا پیئر بنا کر ”آخری چٹان“ میں پیش کیا تو تماشائیوں نے بطور مزاحیہ اداکاران دونوں کی خوب پذیرائی کی۔ رفیق موچھے نے ڈار صاحب کی دیگر فلموں ”بشیرا“ دل لگی اور کئی فلموں میں کام کیا۔ ”بشیرا“ میں رفیق موچھے کی ”رنگیلا“ اور ”دل لگی“ میں لہری کے ساتھ جوڑی بنائی گئی۔

”سید صاحب!“ میں نے ذرا توقف کے بعد کہا۔

”اسلم ڈار نے اپنے فلمی کیریئر میں ایک ایسا جرأت مندانہ کام کیا ہے جو شاید برصغیر کے کسی ڈائریکٹر نے نہیں کیا ہے۔ ہمارے ہاں اگر کوئی پیئر کسی ایک حیثیت میں کامیاب ہو جائے تو اسے دوسری حیثیت میں پیش نہیں کرتے مثلاً کسی فلم میں اگر کوئی ہیرو ہیروئن کے روپ میں پیش ہوئے ہیں تو اسے دوسری فلموں میں بھائی بہن یا باپ بیٹی کے کیریئٹرز میں پیش نہیں کیا جاتا مگر اسلم ڈار نے یہ رسک بار بار لیا۔ ”بشیرا“ میں ڈار صاحب نے عالیہ اور سلطان راہی کو بہن بھائی کے کردار میں پیش کیا۔ ان کی لازوال اداکاری کے نتیجے میں یہ فلم سپر ہٹ ہوئی ہے تو ”ذرق خان“ میں عالیہ اور سلطان راہی ہیروئن اور ہیرو کے روپ میں نمودار ہوتے ہیں۔ تماشائی اس مرتبہ بھی دونوں کو اس حیثیت میں پسند کرتے ہیں اور جب ڈار صاحب ”بابل صدقے تیرے“ بناتے ہیں تو عالیہ اور سلطان راہی کو باپ بیٹی کے رول میں پیش کرتے ہیں۔ اس بار بھی ڈار صاحب دونوں سے ایسی متاثر کن اداکاری کرواتے ہیں کہ فلم دیکھنے والوں کو اس بات کا خیال نہیں آتا کہ یہ وہی آرٹسٹ ہیں جنہوں نے بہن بھائی یا ہیرو ہیروئن کے کیریئٹر کیے تھے۔“

”اسی لیے برصغیر میں زیادہ تر آرٹسٹ اپنے اوپر کوئی مخصوص چھاپ لگوانا نہیں چاہتے۔“ خانزادہ بول پڑے۔

”غالباً وہ یہی چاہتے تھے کہ آرٹسٹ اپنے دلوں کو اس خوف سے آزاد کر دیں۔ اچھا آرٹسٹ وہ ہوتا ہے جو ہر طرح کے کردار میں فٹ ہو جائے بشرطیکہ اس سے کام لینے والا اسلم ڈار جیسا ہدایت کار ہو۔“

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety



ڈراما کا لاپتہ چہرا

حسن رزاقی

کراچی میں بنایا گیا ایک عجوبہ روزگار شیڈ جس کا صحیح معنوں میں افتتاح نہ ہو سکا پھر بھی اس پر حکومت برطانیہ نے ایک خطیر رقم خرچ کر دی تھی۔ وہ بد قسمت شیڈ استعمال کی آس میں برسوں تک برساتیں جھیلتا رہا۔

وہ شیڈ جس کی تعمیر دھوم دھڑکے سے ہوئی لیکن استعمال نہ ہو سکا

آج کا دن بہت ہی خاص اور اہم دن تھا کہ آج ہم لوگوں کو ائرپورٹ جانا تھا۔ کسی ایسے شخص سے، جس نے ائرپورٹوں کے ان گنت چکر لگائے ہوں، یہ جملہ دروغ گوئی میں شمار ہوگا۔ لیکن یہ آس زمانہ کی بات ہے جب ابھی میری ائرپورٹوں سے شناسائی نہیں ہوئی تھی۔ یہ واقعہ پاکستان بننے کے صرف چند سال بعد کا ہے۔ مجھے اپنے ماموں کو لینے کے لیے اپنے والدین کے ساتھ کراچی ائرپورٹ جانا تھا۔ ہوائی جہازوں کی پروازوں کے اترنے اور بلند ہونے

جانب پڑتا تھا لیکن اندھیرے کی وجہ سے صرف اس کا دھندلا سا ہیولہ دکھائی دے رہا تھا۔ جس کے اوپر سرخ رنگ کی بتیاں جل بجھ کر آنے جانے والے جہازوں کو اپنے وجود سے خبردار کر رہی تھیں۔ میں نے شاہد ماموں سے پوچھا

”آپ کالا چھپرا کے متعلق جانتے ہیں؟“

شاہد ماموں دانشور تھے ان کی معلومات بہت وسیع تھیں۔ انہوں نے مجھے کالا چھپرا کی کہانی سنا کر اتنی تفصیل سے نہیں جتنی تفصیل سے میں آپ کو سنانے جا رہا ہوں۔

☆.....☆

سلطنت برطانیہ برٹش ایسپائیئر کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ سورج جو سلطنت برطانیہ میں کسی ڈیوتا نہیں تھا اب ڈوبنے کی تیاریاں شروع کر چکا تھا۔ لیکن برطانوی سلطنت کے مقتدر اس حقیقت کو کبھی طور پر تسلیم نہیں کر رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ راج کی آخری سانسوں کو جمع کر کے کوئی ایسا کارنامہ یا کارنامے کر دکھائیں جو باقی دنیا میں ان کی کرنی ہوئی ساکھ کو بحال کر دیں یا کم از کم کچھ سہارا ہی دے دیں۔

اس زمانہ میں برطانوی حکومت ”امپیریل کانفرنس“ کا انعقاد کیا کرتی تھی۔ اس کانفرنس کا مقصد برطانیہ اور اس کے راج کے تحت جو ڈومین تھیں ان کو ایک میز پر لایا جانا تھا۔ یہ اجتماع 1887ء میں شروع ہوئے اور 1937ء تک جاری رہے۔ سوائے 1894ء اور 1933ء کے اجتماع کے تمام کی تمام امپیریل کانفرنس کا انعقاد برطانیہ میں ہوا۔ 1894ء اور 1933ء کے اجتماع کینیڈا کے شہر آٹوا میں منعقد ہوئے تھے جو کینیڈا کا دارالسلطنت ہے۔ زیادہ اہمیت رکھنے والی کانفرنسوں میں 1887ء کا اجتماع ہے جس میں ملکہ وکٹوریا کی گولڈن جوبلی شامل تھی جبکہ 1897ء میں ان کی ڈائمنڈ جوبلی۔ 1911ء میں جارج پنجم کی اور 1902ء میں ایڈورڈ ہفتم کی تاجپوشی۔ 1937ء میں آخری امپیریل کانفرنس منعقد ہوئی جس میں جارج ششم کی تاجپوشی کا اہتمام تھا۔

امپیریل کانفرنس کا ابتدائی مقصد برٹش راج کی یکجہتی تھا مگر اس میں دوسرے اہم امور بھی شامل تھے۔ ان ہی میں سے ایک تاریخی سنگ میل بالفور ڈیکلیریشن تھا جس کے تحت جتنی ڈومین تھیں ان کو سلطنت برطانیہ کے حلقے میں رہتے ہوئے ہی خود مختاری کا درجہ دیا گیا تھا۔ یعنی ایک طرح سے یہ سب سیاسی ہم پلہ ہو گئے تھے (پولیشکل ایکول) دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر امپیریل کانفرنس کی جگہ دولت مشترکہ کی کانفرنس کا انعقاد شروع کیا گیا۔

سے جو شور شرابہ پیدا ہوتا ہے اس سے بچنے کے لیے ساری دنیا میں یہ رواج ہے کہ ائرپورٹ شہروں کی گنجان آبادی کے باہر بنائے جاتے ہیں۔ کراچی شہر کا ائرپورٹ بھی اسی اصول کے تحت شہری آبادی سے کئی میل دور بنایا گیا تھا۔ تقسیم ہند کے وقت کراچی شہر کی گنجان آبادی صدر کے علاقہ سے چند میل آگے آ کر ختم ہو جاتی تھی۔ اس سے آگے بکھری بکھری سی آبادی ہوا کرتی تھی۔ کراچی ائرپورٹ کے نزدیک آتے آتے یہ آبادی تقریباً نہ ہونے کے برابر ہوا کرتی تھی۔ رات کے وقت یہ علاقہ بالکل سنان ہوتا تھا۔ مگر اسی سنان علاقے میں ائرپورٹ کی عمارت سے کچھ دور پہلے، ایک بہت بڑا ہیئرنگ ہوا کرتا تھا جس کا رنگ کالا تھا۔ اس کا لے رنگ کی مناسبت سے یہ ہیئرنگ ’کالا چھپرا‘ کہلاتا تھا۔ کراچی کے منظر نامہ پر کالا چھپرا بہت عرصے تک نمایاں رہنے کے بعد ایوب خان کے دور حکومت میں ڈھا دیا گیا۔ کالا چھپرا سے متعلق ایک اہم تاریخی واقعہ منسلک ہے۔ بلکہ کالا چھپرا کا وجود اسی تاریخی واقعہ کا مرہون منت تھا۔

☆.....☆

ہمارے پاس اپنی ذاتی گاڑی نہیں تھی۔ ہم لوگ والد صاحب کے ایک قریبی دوست کی گاڑی میں سفر کر رہے تھے۔ مغرب کا وقت ہو رہا تھا، اندھیرے کا راج شروع ہونے والا تھا سڑک پر روشنیوں کا کوئی خاص بندوبست نہیں تھا۔ لگتا تھا کہ ہم لوگ کسی انتہائی دور افتادہ مقام کے سفر پر رواں دواں ہیں۔ ائرپورٹ آچکا تھا میں دوڑتا ہوا ائرپورٹ کی عمارت میں داخل ہو کر اوپری منزل پر جانے کے لیے بیٹھیاں چڑھ رہا تھا۔

اوپری منزل پر جانے کی ایک خاص وجہ تھی۔ یہاں پر جہازوں کا نظارہ کرنے کے لیے وزیٹرز گیلری بنی ہوئی تھی۔ ٹارک پر پارک کئے ہوئے جہازوں کے ساتھ ساتھ ٹیک آف اور لینڈنگ کرنے والے جہازوں کا نظارہ بھی کیا جاسکتا تھا۔ گیلری کے اوپر کھلے آسمان پر تاروں نے جگمگا نا شروع کر دیا تھا۔ وزیٹرز گیلری میں کینک کا سامان تھا لیکن کینک کا سامان ساتھ لانے کی ضرورت نہیں تھی، چائے اور اس کے ساتھ کھانے کی متفرقات کا انتظام گیلری کے ریسٹورینٹ میں موجود تھا۔

شاہد ماموں کا جہاز اتر چکا تھا۔ انگریز اور کشم سے فارغ ہو کر ہم لوگ گاڑی میں بیٹھ کر گھر جانے کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ ائرپورٹ سے واپسی پر کالا چھپرا ہمارے دائیں

اس دور کے ہوائی جہاز طویل پروازوں کے لیے استعمال نہیں کیے جاسکتے تھے۔ ان جہازوں میں اتنی استطاعت نہیں تھی۔ برطانیہ اور اس کی ڈومین کے درمیان پانی کے جہاز استعمال کیے جاتے تھے جن کے سفر کا دورانیہ کئی ہفتوں تک بھی جاری رہ سکتا تھا۔

ہوائی جہاز ہوا سے بھاری ہوتے ہیں لیکن ایک ہوائی سواری ایسی بھی تھی جو ہوا سے ہلکی ہوتی تھی اور اس کو دور دراز پروازوں کے لیے استعمال کیا جاسکتا تھا۔ یہ سواری ائرشپ کہلاتی ہے۔ ہوائی جہاز تو اس قابل نہیں تھے کہ یہ برطانیہ کو اس کی ڈومین سے ملاتے لیکن اگر برطانیہ ایسے ائرشپ بنا سکے جو اس کو اس کی ڈومین سے ہوائی سفر کے ذریعہ ملا سکیں تو ایک پختہ دو کاج۔ نقل و حمل کا مسئلہ بھی حل اور سلطنت کی گرتی ہوئی ساکھ کی بحالی کا بھی کچھ کچھ روشن امکان۔ ائرشپ کے ذریعہ مغرب میں لندن سے کینیڈا تک اور مشرق میں لندن سے ہندوستان تک کا سفر طے کیا جاسکتا تھا۔ ساری دنیا پر رعب ڈالا جاسکتا تھا۔

ائرشپ ایک لمبوتر اساد یو بیکل اسٹرکچر ہوتا ہے۔ (اس کی شکل کچھ ایسی ہوتی ہے جیسے ایک گرتے ہوئے آنسو کو کھینچ کر لبا کر دیا جائے)۔ ائرشپ کے اس لیے سے آنسو نما ڈھانچے کو ہوا سے ہلکا بنانے کے لیے اس کے ڈھانچے کو ایک ہوا سے ہلکی گیس سے بھر دیا جاتا ہے۔ یہ گیس ہائیڈروجن ہے جو اس کرہ ارض پر پائی جانے والی ہلکی ترین گیس ہے۔ لیکن ہائیڈروجن گیس کے ساتھ ایک بہت بڑا اور خطرناک مسئلہ بھی ہے۔ یہ ذوالاشتعال ہوتی ہے، بہت جلدی آگ پکڑ لیتی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح عاشق کا دل آتش عشق میں جلنے کے لیے ہر لمحہ تیار رہتا ہے۔ ہائیڈروجن گیس کی موجودگی میں اگر ائرشپ میں آگ بھڑک اٹھے تو یہ اس آگ کو آنا فانا پورے ائرشپ میں پھیلا دے گی۔ لیکن جس طرح سے عاشق کا توڑ رقیب رو سیاہ سے کیا جاسکتا ہے اسی طرح سے ہائیڈروجن گیس کے بدلے ہیلیم گیس استعمال کی جاسکتی ہے کیونکہ ہیلیم بھی ہوا کے مقابلہ میں بہت ہلکی ہوتی ہے لیکن جس طرح سے رقیب رو سیاہ عاشق کا بدل کامل نہیں ہو سکتا اسی طرح سے ہیلیم بھی ہائیڈروجن کا کامل بدل نہیں ہے۔ دو وجوہ سے۔ ایک تو یہ کہ اس کی کارکردگی ہائیڈروجن سے احقر ہے دوسرے یہ کہ یہ بہت کمیاب ہے۔ اس کے زیادہ تر ذخائر امریکا میں ہیں اور پہلی جنگ عظیم کے بعد امریکا سے ہیلیم کا ملنا اتنا آسان نہیں رہا تھا۔ ہیلیم کے برعکس ہائیڈروجن کا پیدا کرنا آسان

ہے۔ بہت سی ایسی دھاتیں ہیں جن کے چھوٹے ٹکڑے یا برادہ سلفیورک ایسڈ میں ملایا جائے تو ان کے کیمیائی عمل سے ہائیڈروجن گیس خارج ہوتی ہے۔ لیکن جب بڑے پیمانے پر ہائیڈروجن گیس درکار ہو تو یہ پانی سے حاصل کی جاتی ہے۔ ہیلیکٹر ایس کے عمل کے ذریعہ جب پانی سے برقی رو گزاری جاتی ہے تو پانی ٹوٹ کر آکسیجن اور ہائیڈروجن میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ کم خرچ بالائشین۔ ایک دفعہ جب ائرشپ میں گیس بھردی جاتی ہے تو یہ ہوا سے ہلکا ہو کر اوپر اٹھ جاتا ہے۔ اگر آپ نے اس میں انجن بھی لگا رکھے ہیں تو آپ تھوڑا سا پیٹرول یا ڈیزل جلا کر دنیا کی سیر کر سکتے ہیں۔ یہی ہے ائرشپ کا بنیادی اصول۔ ائرشپ کی لفت یا اٹھان اسی طرح سے حاصل کی جاتی ہے۔ بمقابلہ ہوائی جہاز کے کہ جس کی اٹھان اس کے پروں کی مرہون منت ہوتی ہے۔ ہوائی جہاز جب ٹیک آف کے لیے دوڑ لگاتا ہے تو ایک رفتار ایسی آتی ہے کہ جس کے بعد ہوائی جہاز کے پروں کے اوپر سے گزرنے والی ہوا کا دباؤ کم اور پروں کے نیچے سے گزرنے والی ہوا کا دباؤ زیادہ ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں اگر جہاز کا منہ اوپر کی طرف کر دیا جائے تو جہاز ہوا میں بلند ہو جائے گا اور اگر آپ کی جیب میں جہاز کا کلٹ موجود ہے تو آپ ائرشپ کی بجائے اس جہاز میں سفر کر سکتے ہیں۔ بزرگ حضرات مکہ مدینہ اور نوجوان لوگ اپنے خوابوں کی جنت امریکا جاسکتے ہیں۔

ائرشپ میں مسافروں اور عملہ کے کیمین ایک گنڈولے،۔۔۔۔ میں بنائے جاتے ہیں۔ گنڈولا ائرشپ کے ڈھانچے کے نیچے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ ائرشپ اگر پھوٹا ہے تو اس کے انجن بھی گنڈولے میں ہی نصب کیے جاسکتے ہیں۔ بڑے ائرشپ کے انجنوں کے لیے الگ انجن روم بنائے جاتے ہیں جو گنڈولے سے متصل ہوتے ہیں۔ انجن روم کا عملہ کپتان کی ہدایات ٹیلیگراف کے ذریعہ وصول کرتا ہے۔ یہ ٹیلیگراف ای۔ او۔ ٹی کہلاتا ہے۔

برطانیہ اور کالونیوں کے درمیان رابطہ کا یہ سفید ہاتھی امپیریل ائرشپ اسکیم کے نام سے پکارا گیا۔ برٹش راج کی کوئی بھی چیز امپیریل سے کم نہیں ہو سکتی تھی۔ اس اسکیم کی داغ بیل 1921ء میں ڈالی جا چکی تھی مگر اس وقت یہ اسکیم زیادہ آگے نہ بڑھ سکی۔ اس کے بعد 1923ء میں جب کنزرویٹو حکومت برسر اقتدار آئی تو اس نے اس اسکیم کو آگے بڑھایا۔ 1923ء کا ائرشپ کا یہ پروجیکٹ برنیز اسکیم کہلایا۔ اس اسکیم کے تحت کل چھ ائرشپ بنائے جانے تھے۔ 1924ء میں

101- آر بن کرتیار ہو چکا تھا اس کی کارکردگی جانچنے کے لیے تجرباتی پروازوں کا آغاز کیا جاسکتا تھا۔ پہلی ٹیسٹ فلائیٹ 14 اکتوبر 1929ء کو عمل میں آئی۔ اس پرواز میں عملہ کے 38 ارکان کے ساتھ ساتھ 14 مسافر بھی مدعو تھے۔ یہ سب کھاتے پیتے لوگ تھے میری آپ کی طرح عام انسان نہیں تھے۔ ہماری قسمتوں میں اڑشپ کی سواری کہاں! ان اہم افراد میں 101- آر کے چیف ڈیزائنر ونسٹن رچمنڈ بھی شامل تھے۔ کھاتے پیتے لوگوں کو کھلانا پلانا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اس غرض سے ان لوگوں کے لیے انتہائی پُر تکلف لُنج تیار کیا گیا تھا۔ اس شکم سیر لُنج میں سوپ، سلاڈ، روسٹ، سبزی، پھل اور پنیر شامل تھے۔ لُنج کے اہم شغل سے فارغ ہونے کے بعد مسافروں نے اسموک روم کا رخ کیا تا کہ تمباکو نوشی اور چائے سے لطف اندوز ہو سکیں۔

اس پرواز کے کپتان میجر جارج ہربرٹ تھے جو ایک انتہائی تجربہ کار ہوا باز تھے۔ اڑشپ نے پہلے بیڈ فورڈ کے گرد پھر لگائے پھر اس کے بعد براستہ آکسفورڈ شہر لندن کا رخ کیا۔ فاصلہ تقریباً 300 میل، رفتار 61 میل فی گھنٹا بلندی تقریباً دو ہزار فٹ یعنی اڑشپ کی لمبائی کی صرف تین گنی۔ اس ٹیسٹ سے موصول ہونے والی پہلی رپورٹ کے مطابق اڑشپ کی کارکردگی اطمینان بخش تھی۔ دوسری ٹیسٹ فلائیٹ 13 اکتوبر 1929ء کو عمل میں آئی جس کا نظارہ شاہ جارج پنجم اور ملکہ میری نے بھی کیا۔

گوکہ اڑان کے حساب سے 101- آر کی کارکردگی تسلی بخش تھی، لیکن مسافروں اور سامان کے جس وزن کو لے جانے کے لیے یہ اڑشپ بنایا گیا تھا، یہ اس وزن کا پار نہیں اٹھا سکتا تھا۔ ڈیزائن کے مطابق 101- آر کو 60 ٹن وزن لے جانے کے قابل ہونا چاہئے تھا لیکن یہ صرف 35 ٹن وزن اٹھا سکتا تھا۔ اگر اس سے مطلوبہ 60 ٹن کے وزن کا پار اٹھواتا ہے تو اس کے ڈیزائن میں بڑی نوعیت کی تبدیلیاں کرنی پڑیں گی۔ اس کی لمبائی کو مزید کئی فٹ بڑھا کر 735 فٹ کی بجائے 770 فٹ کرنا پڑے گا جس کے لیے اڑشپ میں ایک 35 فٹ کا پونڈ لگایا جائے گا۔ یہ بہت بڑا کام تھا۔ اس کی ایک ہی ترکیب تھی۔ پہلے اڑشپ کو لُنج سے دو ٹکڑے کیا جائے گا اس کے بعد اس میں یہ 35 فٹ کا ٹکڑا جوڑا جائے۔ اس ٹکڑے کے جوڑنے کے ساتھ ہی ساتھ اڑشپ میں ہائیڈروجن کی مقدار بھی بڑھانی پڑے گی جس کے لیے مزید کیس بیک بھی لگائے جائیں گے جو اڑشپ کے اس اضافی

چڑھائی جاتی ہے۔ پلاسٹک کی یہ تہہ فیمبرک کو مضبوطی کے ساتھ ساتھ سختی بھی دیتی ہے۔ اب یہ فیمبرک موسم کی سختیاں برداشت کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ 101- آر پر جو فیمبرک منڈھا گیا تھا اس کے اوپر پلاسٹک کا طمع پہلے ہی چڑھایا جا چکا تھا پری ڈوپڈ فیمبرک۔

101- آر چونکہ ہندوستان کی پروازوں کے لیے استعمال ہوتا تھا جہاں کا درجہ حرارت زیادہ ہوتا ہے، اس میں پیٹرول کی بجائے ڈیزل انجن استعمال ہوں گے۔ اس لیے کہ ڈیزل کا نکتہ اشتعال پیٹرول سے بہتر ہوتا ہے۔ پیٹرول کم درجہ حرارت میں آگ پکڑ سکتا ہے۔ اس سے پہلے پہلی جنگ عظیم کے دوران رائیل نیوی کے اڑشپ 38- آر میں پیٹرول کے بخارات کے دھماکے سے آگ لگ چکی تھی جس میں کئی جانیں ضائع ہو گئی تھیں جن میں اس وقت کے اڑشپ ٹیکنالوجی کے بڑے بڑے ماہرین بھی شامل تھے۔

ڈیزائن کے مطابق اڑشپ میں چھ سلنڈر والے چار انجن استعمال کیے جانے تھے لیکن یہ انجن مطلوبہ طاقت فراہم نہ کر سکے جس کی بناء پر آٹھ سلنڈر والے پانچ انجن استعمال کیے گئے۔ آٹھ سلنڈر حاصل کرنے کے لیے چار چار سلنڈر والے دو دو انجنوں کو جوڑ کر ایک انجن بنایا گیا۔ ایک 18 سال کی دلہن کی بجائے دو نو نو سال کی دلہنوں سے کام چلایا گیا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ ان انجنوں کا وزن بھی پلان کے گئے انجنوں سے کہیں زیادہ نکلا۔ کپتان اور انجن روم کے رابطہ کا وہی طریق کار تھا جو ساس بہو کے رابطے کا پہلا اصول ہے۔۔۔۔۔ دور دور سے۔ یہ رابطہ ای۔ او۔ ٹی۔۔۔۔۔ انجن آرڈر ٹیلیگراف کے ذریعہ کیا جاتا تھا۔ یہ کوئی برقی ٹیلیگراف نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ ایک آٹھ دس انچ قطر کا ایک گچٹ ہوتا ہے جس کے ذریعہ کپتان انجن کے انجینئر کو بتاتا ہے کہ انجن کو کس طاقت پر چلاتا ہے۔

مسافروں کے کیبن گنڈولے میں بنائے گئے تھے۔ گنڈولے۔۔۔۔۔ دو منزلہ تھا اور حسب دستور اڑشپ کے مرکزی ڈھانچے کے نیچے جڑا ہوا تھا۔ اوپری منزل پر مسافروں کے لیے انتہائی پُر تعیش کیبن بنائے گئے تھے۔ نچلے ڈیک پر اسموک روم (مسافروں کی بیٹھک۔۔۔۔۔ تمباکو نوشی کے لیے) بنایا گیا تھا جس کی دیواروں کو ایسبیسٹوس کی چادروں سے ڈھانکا گیا تھا۔ یہ تدبیر آتشزدگی کے امکانات کو کم کرنے کے لیے اختیار کی گئی تھی۔ عملہ کے کیبن، باورچی خانہ اور کھانے کا کمرہ بھی نچلی ڈیک پر ہی بنائے گئے تھے۔

دیکھا جائے کہ انجن فل اسپڈ کا بوجھ سہا سکتے ہیں یا نہیں۔
 دوسری طرف وزیر ہوا بازی لارڈ تھامسن چاہتے تھے
 کہ وہ ائرشپ پر ہندوستان کا چکر لگا کر 20 اکتوبر کو ہونے
 والی اگلی امپیریل کانفرنس سے پہلے پہلے انگلستان واپس پہنچ
 جائیں تاکہ کانفرنس کے شرکاء اور ان سے زیادہ ساری دنیا پر
 ڈولتی ہوئی سلطنت برطانیہ کا رعب ڈالا جاسکے۔ امپیریل
 کانفرنس سے پہلے ہندوستان کی پرواز کا حکم انہوں نے واضح
 الفاظ میں نہیں دیا تھا صرف ڈھکے چھپے الفاظ میں اس کا اظہار
 کیا تھا۔ لیکن..... حکم حاکم مرگ مفاجات۔ مزید دو دن کی
 تیاری کے بعد بروز ہفتہ مورخہ 4 اکتوبر 1930-101۔ آر
 عازم ہندوستان ہوا۔ ہندوستان میں اس کی منزل اپناروشنیوں
 کا شہر کراچی تھا جو اس وقت اتنا روشن نہیں ہوا کرتا تھا۔ بنیادی
 طور پر اس کو چھبیروں کا شہر سمجھا جاتا تھا۔ کراچی کا نام ایک
 زمانہ میں کولاجی ہوا کرتا تھا۔ کراچی میں اس وقت اگر
 روشتیاں نہیں تھیں تو آجکل کی دہشت کا راج بھی نہیں تھا۔
 پُرسکون شہر تھا۔

لندن سے کراچی کا فاصلہ زیادہ تھا 101۔ آر بغیر راستہ
 میں رکے ہوئے یہ سفر طے نہیں کر سکتا تھا۔ اس درمیانہ مستقر کی
 جگہ کے لیے مصر کے شہر اسماعیلیہ کو چنا گیا۔ اسماعیلیہ اور کراچی
 میں 101۔ آر کو پارک کرنے کے لیے بیگر تعمیر کئے گئے۔
 کراچی میں تعمیر ہونے والا بیگر ”کالا پھیرا“ کے نام سے
 موسوم ہو گیا۔ 101۔ آر کا بیگر بنانے کے لیے کراچی کو تین
 وجوہ کی بناء پر چنا گیا تھا۔ کراچی کا جغرافیائی محل وقوع، یہاں
 کا معتدل موسم اور رائیل ایئر فورس کا ڈرگ ایئر فیلڈ جو آج
 فیصل ایئر بیس کے نام سے موسوم ہے۔ ڈرگ ایئر فیلڈ میں ہر
 طرح کی فنی اور دیگر سہولتیں موجود تھیں۔ یہاں کا ایئر وکلب
 کنٹری کلب کے نام سے مشہور تھا جہاں دیگر تقریبات کے
 ساتھ ساتھ جوان جہان جوڑے شادی کے مقدس بندھن میں
 بندھ کر بعد میں پچھتایا کرتے تھے۔ ایروکلب کی اپنی ایئر
 اسٹریپ بھی ہوا کرتی تھی جو چھوٹے ہوائی جہازوں کے پرواز
 کی اڑان پکڑنے اور اترنے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ یہ
 ایئر اسٹریپ آج کے گلشن اقبال کے قریب سے شروع ہو کر
 نیشنل اسٹیڈیم کے قریب تک جایا کرتی تھی۔ آج کی یونیورسٹی
 روڈ کنٹری کلب روڈ کہلاتی تھی اور اسی نام کی مناسبت سے
 نیشنل اسٹیڈیم کا وہ سراجو اس سڑک کے رخ ہے کنٹری کلب
 روڈ اینڈ کہلاتا ہے۔

کراچی کے ایروکلب نے بہت سے مایہ ناز ہواباز

نکلے کو ہوا سے ہلکا بنائیں گے۔ سارا کھیل ائرشپ کے ہوا
 سے ہلکے ہونے کا تھا۔ 1930ء کے موسم گرما تک یہ تمام
 تبدیلیاں مکمل ہو چکی تھیں۔ ان تبدیلیوں کے بعد 100۔ آر
 اور 101۔ آر برطانیہ سے کینیڈا اور ہندوستان کا سفر 50 ٹن
 وزن (بے لوڈ) کے ساتھ طے کر سکیں گے۔ (100 آر میں
 ابھی یہ تبدیلیاں نہیں کی گئی تھیں)۔

تمام تبدیلیوں (ماڈی فیکیشن) کے بعد جب
 101۔ آر مکمل کیا گیا تو اس کی لمبائی 770 فٹ ہو چکی
 تھی۔ اس لمبائی کی ہیئت کا اندازہ اس طرح لگایا جاسکتا ہے
 کہ بوئینگ کے 747۔ بی کی لمبائی 232 فٹ ہوتی ہے
 (آج سے چند سال پہلے تک 747۔ بی دنیا کا سب سے
 بڑا مسافر بردار ہوائی جہاز ہوا کرتا تھا) یعنی اگر 3 بوئینگ
 747۔ بی منہ سے ڈم لگا کر کھڑے کر دئے جائیں تو ان کی
 مشر کہ لمبائی کل 696 فٹ بنے گی۔ 101۔ آر کی لمبائی
 اس سے بھی 74 فٹ زیادہ تھی۔ یعنی ایک اور چھوٹے
 جہاز کے کھڑے کرنے کی گنجائش موجود تھی۔ اور اس تمام تر
 لمبائی میں کتنے مسافر سائے تھے۔ صرف 60..... جبکہ تین
 747 اور ایک چھوٹے جہاز میں کل ملا کر 1400 کے لگ
 بھگ مسافر سائے ہیں۔

نئے ڈیزائن کے مطابق تکمیل شدہ 101۔ آر پہلی
 اکتوبر 1930ء کو اپنے بیگر سے باہر لا کر مورنگ باسٹ
 کے ساتھ ڈاک (پارک) کیا گیا اور اس کے عملہ نے 24
 گھنٹے دورانہ کی ٹیسٹ فلائٹ کی تیاریاں شروع کر دیں۔
 طے یہ ہوا کہ اگر ائرشپ کے ابتدائی ٹیسٹ اطمینان بخش
 ہوئے تو ٹیسٹ کا دورانیہ 24 گھنٹے سے کم کیا جاسکتا ہے۔
 یہ ٹیسٹ فلائٹ صرف 17 گھنٹا جاری رہی اس لیے کہ
 ائرشپ کی کارکردگی تسلی بخش قرار دی جا چکی تھی۔ کارکردگی
 تسلی بخش تو تھی مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ سنجیدہ تحفظات بھی
 تھے کہ اس پرواز کے دوران موسم اچھا اور موافق تھا۔ خراب
 موسم کے لیے ائرشپ موزوں تھا یا نہیں اس کا اندازہ نہیں
 لگایا جاسکتا تھا جب تک کہ خراب موسم میں اس کو اڑایا نہ
 جائے۔

دو دن بعد 101۔ آر کو ہندوستان کے لیے روانہ ہونا
 تھا۔ ڈائرکٹر ائرشپ ڈیولپمنٹ کا کہنا تھا کہ 101۔ آر کی
 ہندوستان کی پرواز کے لیے ضروری ہے کہ اس پرواز سے پہلے
 اس کو خراب موسم میں اڑانے کا تجربہ کیا جائے اور ساتھ ہی
 ساتھ انجنوں کو فل اسپڈ (پوری طاقت) پر اڑا کر اس کا نتیجہ بھی

تیار کئے۔ کالا چھپرا اور ایئر شپ کو ڈاک کرنے کے لیے مورنگ ماسٹ کی تعمیر 1927ء میں شروع کی جا چکی تھی۔ کالا چھپرا کی لمبائی 850 فٹ، چوڑائی 180 فٹ اور اونچائی 170 فٹ۔ اس کی لمبائی 850 فٹ اس لیے رکھی گئی تھی کہ 101۔ آر کے ساتھ ہی ساتھ اس کے اندر مستقبل میں بنایا جانے والا ایئر شپ 102۔ آر بھی سما سکے جس کی لمبائی 822 فٹ ہوتی تھی

Downloaded from paksociety.com

برطانوی ٹی وی پر ایک پروگرام نشر ہوا کرتا تھا جو بعد میں پاکستان ٹی وی پر بھی نشر ہونے لگا 'سٹریٹس منسٹر'۔ بعد میں جب منسٹر صاحب کی ترقی ... ہو گئی تو یہ پروگرام بھی ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا 'سٹریٹس منسٹر' بن چکا تھا۔ اس پروگرام کو دیکھنے کے بعد مجھ پر یہ عقده کھل چکا تھا کہ بیوی شوہر کا حکم ٹال سکتی ہے لیکن ماتحت عملہ منسٹر کا حکم نہیں ٹال سکتا۔ بیوی شوہر کے احکامات سے روگردانی کر سکتی ہے..... بلکہ شوہر کو گئی کا ناچ بچا سکتی ہے لیکن ماتحت عملہ منسٹر کے آگے چوں بھی نہیں کر سکتا۔ لہذا جب برطانیہ کے ہوا بازی کے منسٹر لارڈ تھامسن نے فرمائش ظاہر کی کہ وہ 14 اکتوبر 1930ء کو اس وقت کے ہندوستان کے شہر کراچی کا چکر لگا کر واپس آنا چاہتے ہیں تو کسی نے اس کی مخالفت نہیں کی حالانکہ تکنیکی ماہرین کو اس پرواز کے بارے میں سنجیدہ تحفظات تھے۔ لیکن آنے والی امپیریل کانفرنس سے پہلے ایئر شپ کے ذریعہ ہندوستان کا سفر کر کے کانفرنس کے شرکاء اور باقی دنیا پر برٹش راج کا رعب جمانا وقت کی اہم ترین ضرورت بن چکا تھا۔

101۔ آر 4 اکتوبر 1930ء شام ساڑھے چھ بجے

ہندوستان کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ پہلے اس نے بریڈ فورڈ کے گرد چکر لگائے پھر لندن کا رخ کیا۔ رات 8 بجکر 20 منٹ پر ایئر شپ لندن کے اوپر سے گزرا۔ رات 9 بجکر 35 منٹ پر اس نے ہیسٹنگز کو اس کیا۔ ایئر شپ سے پیغام موصول ہوا کہ بارش شروع ہو چکی ہے، ہوائیں بھی تیز ہیں۔ ہوا کا رخ جنوب مغربی۔ رات ساڑھے گیارہ بجے ایئر شپ انگلش چینل پار کر کے فرانس کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ چینل کا فاصلہ تقریباً 60 میل۔ ایئر شپ اس وقت 800 فٹ کی بلندی پر پرواز کر رہا تھا۔

آدھی رات ہو چلی تھی کارڈ بکنگن میں پیغام موصول ہوا "اس وقت ہم ایب ول سے تقریباً 15 میل جنوب مغرب کی طرف ہیں۔ رفتار 33 ناٹ، بلندی 1500 فٹ، درجہ حرارت 51 ڈگری فیرن ہائیٹ۔ وقفہ وقفہ سے بارش ہو

ماہنامہ سرگزشت

READING
Section



میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک نیا اور منسرد سلسلہ باتیں "بہار و خزاں کی....." پیش کیا جا رہا ہے جس میں ہر قاری بہن دے گئے سوالوں کے جوابات دے کر شمولیت اختیار کر سکتی ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

تو قارئین آج ہی اکتوبر کا

ماہنامہ پاکیزہ

اپنے ہا کر سے جب کروالیں

رہی ہے۔ رات دو بجے عملہ نے گاڑ ڈیوٹی تبدیل کی۔ کوئی قابل ذکر بات نہیں ہوئی۔ اس موقع پر انجینئر سچ نے انجن روم میں جا کر انجن چیک کیے ہر چیز معمول کے مطابق پائی۔ وہ سگار پینے اسموک روم چلے آئے۔ اس وقت ائرشپ نووے کے اوپر سے گزر رہا تھا۔ یکا ایک اس نے ایک گہرے زاوے کا غوطہ لگایا۔ انجینئر سچ نے اس کا جھٹکا اسموک روم میں محسوس کیا۔ اسموک روم کا فرنیچر آگے کو سرکنے لگا وہاں کھڑے ہوئے لوگوں کو اپنا توازن قائم رکھنے میں مشکل محسوس ہوئی۔ لیکن پائیلٹ نے جلد ہی اس غوطہ پر قابو پا لیا۔ نووے کا سمندری علاقہ ہوا کے خطرناک جھکڑوں کے لیے مشہور ہے۔ ائرشپ کا یہ غوطہ ان ہی جھکڑوں کی وجہ سے ہوا تھا کہ یہ غوطہ 90 سیکنڈ کے دورانیے کا تھا۔ ہوا کی تندی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس غوطہ سے باہر نکلنے کے لیے ایلویوٹراپنی پوری حد تک کھینچا جا چکا تھا لیکن اس کے باوجود ائرشپ کا منہ آفت سے صرف 3 ڈگری اونچا کیا جاسکا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ائرشپ کا منہ بہت بھاری ہے۔ نوز ہیوی ہو چکا ہے۔ اس کی ایک ہی ممکنہ وجہ ہو سکتی تھی..... ائرشپ کے اگلے حصہ میں جو گیس بیک نصب تھے ان میں سے ہائیڈروجن گیس خارج ہو چکی تھی۔ ہائیڈروجن کی جگہ ہوانے لے لی تھی جس کی وجہ سے نوز کا ہلکا پن بری طرح سے متاثر ہو چکا تھا۔ اسی اثناء میں ائرشپ نے دوسرا غوطہ لگایا اور دائیں بائیں جھولنے لگا۔ 'آسیلیٹ' کرنے لگا۔ اگر یہ 'آسیلیٹ' مزید بڑھ گئے تو ائرشپ کو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ ائرشپ نے ایک بار پھر نیچے کی طرف آنا شروع کر دیا یہاں تک کہ اس کا منہ زمین سے ٹکرا گیا۔ منہ زمین سے ٹکرایا ضرور تھا لیکن اس کی شدت امپیکٹ اتنی زیادہ نہیں تھی۔ ایک طرح سے یہ ایک ہلکی..... سافٹ لینڈنگ تھی۔ نوز کے ساتھ ساتھ ایک انجن کے پتکے بھی زمین سے ٹکرا چکے تھے اور اس کی انجن کارٹریڈز گئی تھی۔ ائرشپ کی رفتار صرف 14 میل فی گھنٹا کے قریب تھی مسافروں کے بچنے کی امید تھی۔ لیکن یکا ایک آگ بھڑک اٹھی جس نے پورے ائرشپ کو اپنی لپیٹ میں لیتے ہوئے اس کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ قیاس ہے کہ اس آگ کی وجہ انجن کارٹریڈز جانا تھا جس کی وجہ سے انجن کی گرم ہوانے گیس بیک سے خارج ہوتی ہوئی ہائیڈروجن گیس کو بھڑکا دیا۔ جس کے بعد تمام گیس بیک ایک کے بعد ایک زوردار دھماکوں سے پھٹنا شروع ہو گئے۔ عملہ اور

مسافروں میں سے کل 8 افراد ائرشپ سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو سکے۔ انجینئر سچ اسموک روم میں تھے۔ وہ بچ گئے۔ ان کے علاوہ 3 مزید انجینئر اور ایک رگر اپنے اپنے انجن روم میں تھے۔ انجن روم گنڈولہ سے متصل مگر اس کے باہر تھے اس لیے یہ چاروں افراد بھی بچ گئے۔ ایک اور رگر جن کا نام چرچ تھا وہ بھی بچ گئے تھے مگر بعد میں زخموں کی تاب نہ لاسکے اور تین دن بعد اس دارقانی سے کوچ کر گئے۔

جاں بحق ہونے والوں کی چرچ سروس لندن کے سینٹ پال کیتھیڈرل میں منعقد کی گئی جس کے بعد مرحومین کے تابوت بذریعہ ٹرین بریڈ فورڈ لے جائے گئے جہاں پر ان کے لیے کارڈ ٹکٹس میں تدفین کا بندوبست کیا گیا تھا۔ 101۔ آر کارڈ ٹکٹس کے ٹکٹ سے ہی ہندوستان پرواز کے لیے روانہ ہوا تھا۔ پہنچی وہیں پہ ناک جہاں کا خیر تھا۔ مرنے والوں میں وزیر ہوا بازی لارڈ تھا من بھی شامل تھے۔

101 آر کی تباہی تاج برطانیہ کے لیے ناقابل تلافی نقصان تھا۔ اس کی لمبی اور مکمل تحقیقات کی گئیں۔ اس سانحہ کا زیادہ تر ملبہ لارڈ تھا من کے حصہ میں آیا کہ انہوں نے امپیریل کانفرس کی وجہ سے 101۔ آر کی اڑان میں جلد بازی کا مظاہرہ کیا۔ جس کی وجہ سے ائرشپ کے خراب موسم میں اڑان، انجن کا ٹل اسپڈ ٹیسٹ اور بعض دوسرے ٹیسٹ نہیں کیے گئے۔ اپنے ایک مضمون میں سر مورلیس جے ڈین نے اس حادثہ کے بارے میں اس طرح اپنے خیالات کا اظہار کیا "اگر لارڈ تھا من نے 101۔ آر کی اڑان میں جلدی کی تھی تو اس جلدی کی قیمت انہوں نے اپنی جان دے کر ادا کی۔"

101۔ آر کی تباہی نے راج برطانیہ کی امپیریل ائرشپ اسکیم کے تابوت میں آخری کیل کا کردار ادا کیا۔ آخرش یہ اسکیم طاق نسیاں ہو گئی۔

100۔ آر جو 101۔ آر کے ساتھ ساتھ بنایا جا رہا تھا اس کو مکمل نہیں کیا گیا اور اس کے بعد بنائے جانے والے 102۔ آر کے منصوبہ کو لپیٹ کے رکھ دیا گیا۔ کالا چھپرا کی ضرورت ختم ہو چکی تھی اب اس کو ڈھایا جاسکتا تھا۔ کالا چھپرا کی مثال اس دہن کی سی ہے جو شب عروسی اپنے ساجن کی راہ نکلتے نکلتے سو گئی تھی اور اسی نیند کے دوران اس کی نقدی حیات ختم ہو چکی تھی۔

الوگھا گھر

ڈاکٹر عبد الرب بھٹی

مکانوں کی تعمیر بھی ایک فن ہے جب کہ ہم مکان تعمیر کرتے وقت چھوٹی چھوٹی اہم باتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ماحول بھی آلودہ ہو رہا ہے اور ہم بھی متاثر ہو رہے ہیں۔ امریکا میں آٹے بجلی کے بحران سے اس نے سبق حاصل کیا اور ایک ایسا گھر ڈیزائن کر لیا جو خود میں منفرد ہے۔

توانائی بچانے والے اس گھر کی انفرادیت آپ کو حیران کرے گی

توانائی کے اس شدید بحران اور لوڈ شیڈنگ کے عذاب میں مبتلا لوگوں کے لیے روٹان کا یہ طریقہ آزمانا چاہیے، جب 1970ء میں امریکا توانائی کے ایک شدید بحران کا شکار ہو گیا تھا تو ایک عام سے مگر ذہین نوجوان نے کس طرح اس کا حل نکالا تھا یہ غور طلب امر ہے۔ صحرائے مोजیو نامی ایک امریکی صحرائے میں جب شدید گرم، خشک اور بدن کو جھلسا دینے والا دن ہو اور آپ اس... تمازت سے بچنے کے لیے ”برٹ روٹان“ اہرام نما صحرائی گھر



2-Macintosh کمپیوٹر کے ذریعے ایک مکان کارف
سائنس منصوبہ بنایا، جس میں برآمدہ اور کمروں کی ترتیب دکھائی
گئی تھی۔ پھر اس نے اپنی ضروریات اور دیگر خصوصیات کی
فہرست بنائی اور ایک ٹھیکیدار ڈگ اسٹون اور ایک آرکیٹیکٹ
ڈیوڈ کیسل کی خدمات حاصل کیں۔

ایسے میں آرکیٹیکٹ ڈیوڈ کیسل نے ہی ایک نیا
منصوبہ پیش کر دیا جو کہ روٹان کو بے حد پسند آیا۔ یہ نیا منصوبہ
دراصل روٹان کی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے اور اس
میں مزید کچھ سہولتوں کا اضافہ کر کے تیار کیا تھا۔

روٹان کا کہنا ہے کہ اس نے اصل میں ایک
Super Insulated ڈھانچے کا ڈیزائن بنایا
تھا جس میں ایک کھوکھلی چٹان کو حرارت محفوظ رکھنے کے لیے
شامل کیا گیا تھا۔

اس کے علاوہ اس میں کچھ حد تک سورج کی مدد سے
گرم اور ٹھنڈا رکھنے کا سسٹم بھی شامل تھا۔ لیکن یہ ایک مربع
نما گھر تھا۔

کیسل کے منصوبے میں جو گھر دکھایا گیا تھا وہ تین
ہزار ایک سو مربع فٹ پر مشتمل ایک چھ کونوں والا گھر تھا
جس کے ساتھ ایک چھ کونوں والا گیراج بھی منسلک تھا۔
اس گیراج میں تین کاروں اور ایک کشادہ دکان کی
مہنجائش رکھی گئی تھی۔

اہرامی چھتیں اس طرح کی تھیں کہ وہ سردیوں میں
اندرونی حرارت کو محفوظ رکھ سکیں اور گرمیوں میں اسے خارج
کر سکیں، لیکن اس روٹان نے اپنے کمپیوٹر پر اس میں بہت سی
تبدیلیاں کیں لیکن اس نے بنیادی ڈھانچا وہی رکھا
ہے۔ اس گھر پر تقریباً تین لاکھ چالیس ہزار امریکی ڈالر خرچ
ہوئے، لہذا یہ اس علاقے کے مہنگے ترین مکانوں میں شامل
ہوتا ہے۔ لیکن دیگر اخراجات جو کیلیفورنیا کے تقریباً اتنی ہی
قیمت کے مکانوں کو ٹھنڈا یا گرم رکھنے کے لیے ہوتے ہیں یہ
اس کا صرف پندرہ فیصد ہی خرچ کرتا ہے۔

روٹان نے اس گھر میں جو تبدیلیاں کیں ان میں سے
ایک تبدیلی یہ تھی کہ دوہری کھڑکیوں کی تعداد کو نصف کر دیا
جائے اور ان کو دیوار میں اوپر گہرائی میں لگایا جائے۔ اس
تبدیلی کی وجہ یہ تھی کہ وہ خود دن کے وقت گھر میں نہیں ہوتا، تو
اتنی ساری کھڑکیاں سورج کی روشنی اور زیادہ حرارت اندر
لانے کے لیے بے مقصد تھیں۔ اب جس طرح کھڑکیاں
نصب کی گئی ہیں، گرمیوں کے دنوں میں سورج کی حرارت

میں چلے جائیں تو یقیناً آپ محسوس کریں گے کہ ابھی ابھی
پرندے چھبانا شروع کر دیں گے۔

صحرائی اہرام نما یہ گھر جو کہ ایک عظیم تخلیق ہے، دیکھنے
میں تو قدیم اہرام کی شکل کا ہے لیکن اس میں جدید دور کی فنی
مہارت نظر آتی ہے۔ دن ڈھلے جب سورج تمام نمی کو جذب
کر چکا ہوتا ہے اور آپ کا گھر کے سامنے والے دروازے
سے اندر لاتے ہیں تو گھر میں داخل ہوتے ہی آپ کا خشک
چہرہ ٹھنڈی اور نمدار ہوا کا جھونکا محسوس کرے گا اور آپ
خود کو تازہ محسوس کریں گے۔

اس وقت گھر کے اندر کا درجہ حرارت 79 ڈگری
فارن ہائیٹ ہے۔ خواہ باہر کا درجہ حرارت 179 ڈگری
فارن ہائیٹ ہی کیوں نہ ہو۔

روٹان کا کہنا ہے کہ جب اسے اور بھی کم درجہ حرارت
درکار ہوتا ہے، مثلاً 75 ڈگری فارن ہائیٹ، تو وہ ایئر
کنڈیشنرز کو چند منٹوں کے لیے آن کر دیتا ہے۔ اس کے بعد
ایئر کنڈیشنرز کا تھر مو اسٹیٹ ایئر کنڈیشن کو بند کر دیتا ہے۔ ایئر
کنڈیشنرز کے چلنے کی آواز تو پانی کے چھوٹے چھوٹے
تالابوں کے جوڑے میں بہنے والے پانی کی موسیقی میں ہی
گم ہو جاتی ہے، جو ایک ٹھوں چٹان سے بنی ہوئی دیوار کے
ساتھ بنے ہوئے ہیں۔

ان تالابوں کے پہلو میں لکڑیاں جلانے والا آتش
دان ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو روٹان کے گھر کو ٹھنڈک اور
حرارت کی توانائی فراہم کرتی ہیں۔

اس گھر کی دیواروں اور چھتوں میں بہت سا تھرمل
میٹریل استعمال کیا گیا ہے۔ روٹان کہتا ہے کہ سردیوں کے
موسم میں اس علاقے میں برف باری کی وجہ سے بہت زیادہ
ٹھنڈک ہو جاتی ہے۔ مگر لکڑی کے دو ٹکڑے اس پورے گھر کو
گرم رکھنے کے لیے کافی ہوتے ہیں، جو انگیٹھی میں جلانے
جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ گرمی کا ایک ذریعہ چٹان بھی
ہے۔

1970ء میں توانائی کا جو شدید بحران آیا تھا اس کے
بعد سے کم سے کم توانائی خرچ کرنے والا گھر بنانا اور ڈیزائن
کرنا روٹان کا خواب تھا جو بالآخر پورا ہو گیا۔ اب تو روٹان
خود کہتا ہے کہ اگر وہ جہازوں کا ڈیزائن نہ ہوتا تو ایک
آرکیٹیکٹ ہوتا۔

ورسا کیڈ (versacade) نامی۔۔۔ سافٹ ویئر
استعمال کرتے ہوئے روٹان نے اپنے میکوش ٹو

کیا آپ شوگر سے مستقل نجات چاہتے ہیں؟

آج کل تو ہر انسان شوگر کی مرض سے سخت پریشان ہے۔ کیونکہ شوگر انسان کو اندر ہی اندر کھوکھلا اور اعصابی طور پر کمزور کر دیتی ہے۔ ہم نے دسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں پر ریسرچ کر کے خاص قسم کا ایک ایسا شوگر نجات کورس ایجاد کر لیا ہے جس کے استعمال سے ان شاء اللہ شوگر سے مستقل نجات مل سکتی ہے شفاء منجانب اللہ پر ایمان رکھیں۔ شوگر کے وہ مریض جو آج تک اپنی شوگر سے نجات حاصل نہیں کر سکے وہ ایک بار ہمارا شوگر نجات کورس بھی آزما کر دیکھ لیں۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر اپنی تمام علامات بیان کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP شوگر نجات کورس منگوا لیں۔

المسلم دارالحکمت رجسٹرڈ

ضلع حافظ آباد۔ پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

فون اوقات

صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک

ان کے راستے اندر نہیں آتی۔ لیکن اس طرح کھڑکیوں کی واضح کمی ہوگئی تھی، جس کو پورا کرنے کے لیے اس نے مختلف آئینوں سے کام لیا۔

اس نے دیواروں پر مختلف جگہوں پر اس طرح آئینے نصب کروائے جس سے کھڑکیوں کی تعداد دگنی لگتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک آئینہ Elevated Top کے سامنے نصب ہے، تو اس پر دو ہرا اثر ہوگا۔

اس طرح روشنی کو گھر کے مختلف حصوں میں پہنچایا جاسکتا ہے، اس کے علاوہ صحرا کا منظر بھی آئینوں کے ذریعے بیڈ روم تک اس طرح لایا جاسکتا ہے کہ جیسے یہاں کھڑکی ہے۔

یہ گھر ایک جہاز کے ڈیزائن کی اپنی اور کاروباری ضروریات پوری کرتا ہے۔ اس گھر میں ایک جدید حفاظتی نظام بھی نصب ہے۔ گھر کے مختلف حصوں میں نصب مقامی کمپیوٹروں کا نیٹ ورک بنانے کے لیے خاص وائرنگ بھی کی گئی ہے۔ دو کمروں میں میکینوش کمپیوٹر ہیں جن کے ساتھ ایک لیزر پرنٹر بھی منسلک ہے۔ غسل خانے میں ایک اپیل ٹو جو کہ کمپیوٹرنیٹ ورک سے بالکل آزاد ہے۔ یہ مطالعہ کرنے کی بجائے گیم کھیلنے والوں کے لیے ہے۔

گھر میں کیبل ٹی وی کے لیے پیشگی وائرنگ بھی کروائی گئی ہے۔ اگرچہ روٹان کے پاس اپنا ڈش اینٹینا بھی ہے، ایک اضافی تھر مو انٹیٹ بھی ہے، جو اس وقت کام آئے گا جب گھر کے گرم اور ٹھنڈا کرنے کے نظام کو کمپیوٹر سے منسلک کیا جائے گا۔

علاوہ ازیں کئی ٹیلی فون لائنیں بھی وائرنگ کے ذریعے پھیلائی گئی ہیں، ٹھوس کھوکھلی چٹان کا منصوبہ ختم کر دیا گیا ہے، کیونکہ یہ توانائی بچانے میں بہت کم کردار ادا کرتی اس کی وجہ یقیناً یہی تھی کہ روٹان ایسے گھر کو یعنی بنانا چاہتا تھا جس میں کم سے کم توانائی خرچ ہو۔

چھت بھی عام چھتوں کی طرح سینٹ سے بنائی گئی ہے۔ اس پر بارہ انچ فائبر گلاس انسولیشن اور اس پر پلائی وڈ کی تہ لگائی گئی ہے۔ اس کے اوپر واٹر پروف ریز پلاسٹک کی تہ چڑھائی گئی ہے، اور سب سے اوپر دو انچ اسٹار فوم اور پھر ٹار پیپر اور پھر سٹکو Stucco کے کئی کوٹ کے گئے ہیں۔

سٹکو کے پہلے کوٹ میں فائبر گلاس فلامینٹ مشبوطی کے لیے استعمال کیے گئے ہیں، اور آخری کوٹ

مطلب یہ ہے کہ گھر کی کچھ حرارت فرش کے ذریعے زمین میں جذب ہوتی رہتی ہے، لہذا قالین کا استعمال سردیوں میں حرارت کو جذب ہونے سے روکنے میں مددگار ثابت ہو گا۔

سردیوں کے موسم میں ایک چھوٹے سے بجلی کے کوائل ہیٹر کو کچھ دیر چلانے سے بھی گھر کے لیے کافی حرارت مل جائے گی۔ لیکن روٹان کے مطابق بجلی کی لائنوں اور پاور چپی خانے کی چیزوں کے استعمال سے بھی حرارت حاصل ہوتی ہے۔

لکڑیاں جلانے والی اینگیٹھی کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ اینگیٹھی کے قریب واٹر وہیل درجہ حرارت اور نمی کی مقدار برقرار رکھتا ہے۔ یہ وہیل پانی کے تالابوں کے درمیان اس طرح ڈیزائن کیا گیا ہے کہ ایک تالاب اونچا اور دوسرا نیچا ہے ان دونوں تالابوں میں 300 میلین پانی آتا ہے۔ یہ درجہ حرارت کو موسم گرما میں 76 ڈگری فارن ہائیٹ پر مستحکم رکھنے میں اہم کردار کرتا ہے۔

Plexi شیشے سے بنا ہوا یہ وہیل اپنی مرضی سے چلایا اور بند کیا جاسکتا ہے۔

اس کے اندر جب پانی داخل ہوتا ہے، یہ پانی کو اس انداز سے گردش دیتا ہے کہ پانی اس کے مختلف خانوں سے گزرتا ہوا پھوار کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ پھوار گھر میں نمی کو برقرار رکھنے میں مدد دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پانی گھر کی حرارت کو جذب کرتا رہتا ہے۔

اس گھر کا زیادہ تر فرنیچر بھی روٹان نے خود ہی ڈیزائن کیا ہے۔ اور کچھ چیزیں اپنے جہاز کے پلانٹ پر ڈیزائن کروائی ہیں، مثلاً کھانے کی میز اور کارز ٹیبل وغیرہ۔ اس نے ایک دلچسپ اسکرین بھی ڈیزائن کی ہے۔ جس پر پروجیکٹر کی مدد سے ٹی وی دیکھا جاسکتا ہے۔

یہ اسکرین اس کے ماسٹر بیڈ روم کی کھڑکی کے آگے نصب ہے اور اس کی لمبائی آٹھ فٹ ہے۔ اس کی دوسری جانب ایک تصویر لگائی ہوئی ہے، جب ٹی وی نہ دیکھنا ہو تو بن دبانے پر ایک موٹر کے ذریعے اسکرین الٹی ہو کر کھڑکی کے نیچے دیوار پر پہنچ جاتی ہے، اور اسکرین گئی بجائے دیوار پر تصویر نظر آنے لگتی ہے۔

روٹان کا کہنا ہے کہ یہ گھر میری آخری کوشش ہے اور میں اسے پسند کرتا ہوں۔

سفید کیا گیا ہے تاکہ اگر حرارت منعکس ہو سکے اس چھت کا انسولیشن ریٹ R-55 حاصل ہوتا ہے۔ دیواریں بھی اس طرح ڈیزائن کی گئی ہیں کہ وہ حرارت کے بہاؤ کو روک سکیں۔ اندرونی آرائشی پلاسٹر کے پیچھے آٹھ انچ موٹائی کے کنکریٹ کے بلاکوں کی دیواریں بنائی گئی ہیں۔

تین انچ موٹا پورٹ لینڈ ٹھنڈی نامی فوم اور چار انچ موٹا اشار ٹرو فوم بھی استعمال کیا گیا ہے۔

دیواروں کے ساتھ ریٹیلٹی زمین کو چھت کے زاویے کے مطابق یعنی تیس ڈگری تک اٹھایا گیا ہے جس کے باعث سورج کی روشنی براہ راست دیواروں پر نہیں پڑتی ہے۔ تقریباً بارہ گھنٹے کے بعد دیوار سے گزر کر گھر کے اندر منتقل ہوتی ہے۔ یعنی رات کے درمیانی حصے میں اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب باہر صحرا میں کافی خشکی ہوتی ہے اور رات کی ٹھنڈک دوپہر میں دیواروں کے اندر پہنچتی ہے۔

روٹان کا کہنا ہے کہ اسی طرح سے رات کی ٹھنڈک میں دیواریں کچھ حد تک گرم اور دوپہر کی گرمی میں ٹھنڈی محسوس ہوتی ہیں۔

ایک ایئر کنڈیشنز گھر کو اضافی ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔ ایک سنگل راستہ یا تالی پورے گھر میں ہوا کی گردش کے لیے استعمال کی گئی ہے۔ ایک ایگزاسٹ فین گرم ہوا کو باہر خارج کرتا ہے۔ سردیوں میں گرم ہوا گھر کے اندر گردش میں رکھنے کا خاص بندوبست ہے۔

گرم علاقے میں ہونے کے باوجود گھر میں سارا دن موسم خوشگوار رہتا ہے۔

روٹان عام طور پر دن میں اگر ٹھنڈک میں اضافے کے لیے تھر مو اسٹیٹ کو 83 ڈگری پر کر دے تو پھر چند ہی گھنٹوں کے بعد دوبارہ 77 پر کر دیتا ہے کیونکہ ٹھنڈک خود بخود اعتدال پر آ جاتی ہے، وہ کہتا ہے کہ اس گھر میں 24 گھنٹوں میں درجہ حرارت میں صرف 5ء1 ڈگری فارن ہائیٹ کا فرق آتا ہے، جبکہ اس علاقہ میں بنے دوسرے معیاری گھروں میں یہ تبدیلی 10/1 ڈگری تک ہوتی ہے۔

گھر کے فرش پر قالین نہیں ہیں، ماسوائے ماسٹر بیڈ روم کے، چھ کونوں پر مشتمل بڑی بڑی ٹائلیں سخت قسم کے کنکریٹ میں نصب کی گئی ہیں، جس کی وجہ سے فرش کا درجہ حرارت 65 ڈگری فارن ہائیٹ سے نہیں بڑھتا۔ اس کا

چالاک چیتا

اے آر راجپوت

وہ چیتا انتہائی چالاک تھا، ایسے عیار و مکار چیتے کا آدم خور بن جانا کسی شکاری کے لیے چیلنج سے کم نہیں، بہار اور بنگال کے سنگم پر واقع جنگل میں شکار اور شکاری کے درمیان آنکھ مچولی کھیلی جا رہی تھی



شکار کتھا پڑھنے والوں کے لیے

ان دنوں میں بنگال کے شہر بہرم پور میں تعینات تھا۔ بہرم پور کبھی ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جو مرشد آباد سے بہت قریب اور دریا کے کنارے ہونے کی وجہ سے انگریزوں کو پسند آ گیا۔ نواب سراج الدولہ کو شکست دینے کے بعد

انگریزوں نے بہرم پور میں فوجی چھاؤنی بنالی اور آہستہ آہستہ یہ گاؤں شہر میں تبدیل ہو گیا۔ تمام سرکاری دفتر یہیں تھے۔ محکمہ جنگلات کے دفاتر بھی یہیں تھے۔ چیف فاریسٹ آفیسر ہونے کی وجہ سے مجھے شہر کے قلب میں دفتر

کے احاطے میں بنگلا ملا تھا۔ بنگلے کے سامنے بڑا سالان تھا جہاں بیٹھ کر میں شام کی چائے پیتا تھا۔

اس دن بھی میں دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا کہ مجھے اطلاع ملی کہ ستر میل دور میں بڑھڑ وا کے مقام پر ایک چیتا آدم خور بن گیا ہے اور اب تک بیسیوں انسانوں اور مویشیوں کو اپنا نوالہ بنا چکا ہے۔

جن دنوں اس چیتے نے اپنی وارداتوں کا آغاز کیا میں اپنے فرائض منصبی میں اس قدر الجھا ہوا تھا کہ فی الفور اس پر دھیان نہ دے سکا تھا۔ البتہ اس دوران چند معروف شکاریوں نے اس چیتے کی بیخ کنی کی اپنی سی کوششیں کر ڈالیں، مگر ناکامی ان کا مقدر ٹھہری۔

کوئی بھی درندہ آدم خور بن جانے کے بعد زیادہ دیر زندہ نہیں رہ پاتا اور جلد یا بدیر حضرت انسان کا شکار ہو جاتا ہے۔ مگر مذکورہ چیتے نے محاورتا نہیں بلکہ حقیقتاً، شکاریوں کو کئی کاٹاچ نچا دیا تھا۔

بڑھڑ وا بہار اور بنگال کے سنگم پر واقع ہے۔ کیول جنگشن سے صاحب گنج لوپ لائن ہے۔ اسی لائن پر بھاگلپور اور صاحب گنج ہے۔ صاحب گنج سے کلکتہ جانے والی لائن بڑھڑ وا چھوٹا سا قصبہ ہے جو جنگل اور پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے۔ وہاں سے آنے والی آدم خور کی وارداتوں کی خبریں سن کر میں تنگ آ گیا۔ بالآخر میں نے محکمے کو طویل المیعاد چھٹی کی درخواست دی اور چیتے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

اگرچہ میں اپنی شکاری زندگی میں کئی مردم آزار درندوں کو موت سے ہمکنار کر چکا تھا، مگر یہ تسلیم کرنے میں مجھے کوئی عار نہیں کہ بڑھڑ وا کے علاقے سے اپنی وارداتوں کا آغاز کرنے والا یہ چیتا کسی اور ہی مٹی کا بنا ہوا تھا۔ اس نے جس انداز میں اپنا بچاؤ کیا اور انسانوں کو ہلاک کرنے کے ساتھ ساتھ میرے تعاقب میں بھی لگا رہا، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی حیات عام چیتوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی تیز تھی۔

عام چیتے کی فطرت ہے کہ وہ کسی منصوبے کے تحت انسانوں یا جانوروں پر حملہ نہیں کرتا مگر وہ چیتا اپنے شکار پر حملہ کرنے سے قبل نہ صرف باقاعدہ منصوبے باندھتا بلکہ آنے والے واقعات کا اندازہ کر کے اپنی حفاظت کا بندوبست بھی کر لیتا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ چالاک آدم خور درندہ اب تک شکاریوں سے محفوظ چلا آ رہا تھا۔

میں اکثر یہ سوچ کر حیران ہو جاتا کہ اس میں یہ نادر

حس آخر کیوں کر بیدار ہوئی؟

بہر طور جیسے ہی میں نے اپنے مخصوص انداز میں اس کی تلاش کا آغاز کیا تو ایسے ایسے انکشاف ہوئے کہ میں انگشت بدنداں رہ گیا۔

مجھے یقین ہے کہ میری شکاری زندگی کا یہ باب پڑھنے کے بعد آپ بھی حیران ہوئے بغیر نہیں رہیں گے۔

میں نے سب سے پہلے ان تمام مقامات کا دورہ کیا، جہاں آدم خور گھومتا پھرتا دیکھا گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ کہیں نہ کہیں ہمارا آنا سامنا ہو جائے گا مگر ایسا نہ ہو سکا۔

آس پاس کی بستیوں اور چند شکاریوں سے ملنے والی معلومات سے پتا چلا کہ چیتا دن کے وقت عموماً مغرب کی جانب کوئی پندرہ میل دور ایک ویران بستی میں آرام کرتا ہے۔ اس بستی میں پندرہ بیس گھر اور چند جھونپڑے تھے۔ چیتے نے ساٹھ ستر نفوس پر مشتمل اس بستی کے بیشتر مکینوں کو اپنا قہر بنا ڈالا تھا۔ بقیہ اپنی جانیں بچا کر دوسری بستیوں کا رخ کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اب تک تین گھاگ شکاری چیتے کی تلاش میں اس بستی کا رخ کر چکے تھے مگر ان میں سے ایک بھی واپس نہیں لوٹا۔

ہم اپنی مہم کے دوسرے مہم ڈھل پران نامی بستی پہنچ گئے جو چیتے کی آماجگاہ سے دس میل دور واقع تھی۔ یہ ایک بڑی بستی تھی۔ اس میں گرد و نواح کی کئی چھوٹی بستیوں کے سہے ہوئے... مکین بھی پناہ لے چکے تھے۔ ہر خاندان کا کوئی نہ کوئی فرد اس آدم خور کا نوالہ بن چکا تھا۔ ان میں سب سے اہم اس زمیندار کا بیان تھا، جس کے ملازم لڑکے کو آدم خور چار دن پہلے مویشیوں کے باڑے سے اٹھالے گیا تھا۔

زمیندار نے بتایا کہ اس نے اٹھارہ سالہ ایک یتیم لڑکا مویشیوں کی دیکھ بھال کے لیے رکھا ہوا تھا۔ وہ چونکہ ہندوؤں کی کم تر ذات سے تعلق رکھتا تھا، اسی لیے زمیندار کے گھر اس کا آنا جانا ممنوع تھا۔ اس کی رہائش مویشیوں کے باڑے میں ہی تھی، جہاں وہ ایک کونے میں چار پائی پر رات بسر کر لیتا۔

عام حالات میں باڑے کا دروازہ باہر سے زنجیر چڑھا کر بند کر دیا جاتا، مگر جب سے چیتا علاقے میں وارد ہوا تھا۔ زمیندار حفاظت کے پیش نظر کنڈی میں لکڑی پھنسا دیتا۔ لڑکا اندر سے خاصا وزنی پتھر دروازے کے ساتھ رکھ کر کھلنے کے امکانات کو ختم کر دیتا۔

ان تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود چیتا اپنی

”واردات“ اس صفائی سے کر گیا کہ گاؤں کے تو ہم پرست
مکین پورے وثوق سے کہنے لگے کہ آدم خور درحقیقت ایک
بھوت ہے، جو بند دروازے کھول کر گھروں میں گھسنے کی
صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

بعد ازاں میں نے باڑے کا معائنہ کیا تو دروازے
اور چوکھٹ پر درندے کے پنجوں کے نشانات نمایاں نظر
آئے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ گنڈی میں پھنسا لکڑی کا ٹکڑا
چیتے کی جدوجہد کے دوران نکل گیا۔ جس کے بعد اس کے
لیے زنجیر گرا کر دروازہ کھولنا مشکل نہ رہا۔

موشیوں کا کمر اندر سے دیکھنے کے بعد ہم دونوں
حیرت زدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ کمر اتنا بڑا نہیں تھا کہ
موشیوں کے درمیان چیتے کو آزادانہ گھومنے پھرنے کی جگہ
مل پاتی۔ لڑکے تک پہنچنے کے لیے اس نے درمیانی فاصلہ
یقیناً موشیوں کی ٹانگوں کے نیچے سے رینگ کر طے کیا ہو
گا۔ اس دوران موشی ڈکرائے ضرور ہوں گے۔ مگر لڑکے
نے توجہ اسی لیے نہیں دی کہ موشی یوں بھی رات بھر
ڈکراتے رہتے ہیں۔ وہ یقیناً اس امر کا عادی ہو چکا تھا۔

بہر طور اس بات پر ہم دونوں حیرت زدہ تھے کہ
دروازہ کھولنے کی جدوجہد کے دوران لڑکا بدستور نیند میں...
کیوں کر گمن رہا؟ اگرچہ بظاہر یہ بات بھی ناقابل یقین لگتی ہے
مگر میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا کہ گیارہ گائے بھینسوں
میں سے کسی کو چیتے کے پنجوں سے خراش تک نہیں آئی تھی۔

وہ زمیندار ہمیں اپنے گھر لے گیا جہاں اس نے
ہماری خاطر تواضع کی۔ اس کا تعلق برہمن ذات سے تھا۔
اس نے ہمارے رہنے کا بھی انتظام کر دیا۔ ہمارا ارادہ اگلی
صبح آدم خور کی تلاش میں نکلنے کا تھا۔ میرا ذاتی خیال تھا کہ
جس بستی کو چیتے نے ٹھکانا بنا رکھا ہے وہاں ہماری کامیابی
کے امکانات زیادہ ہیں۔

اس بستی کو ایک طرف سے تو ندی تو دوسری طرف
سے جنگل نے گھیر رکھا تھا۔ شمال میں وہ بستی تھی جہاں ہم مقیم
تھے۔ جنوب میں جنگل سے ذرا ہٹ کر ایک چھوٹی سی جاگیر
تھی، نام پیر پینی تھا۔

کہتے ہیں کہ برسوں قبل اس علاقے میں ایک برگزیدہ
ہستی نے آکر اسلام کی تبلیغ کی تھی۔ انہی کی تبلیغ نے آدمی
وہی یعنی جنگلیوں کو اسلام قبول کرنے پر راغب کیا۔ انہی کا
مزار اس علاقے میں ہے اسی وجہ سے اس گاؤں کا نام پیر
پاہنتی پڑ گیا۔

اگلی صبح میرے ساتھی نے تجویز پیش کی کہ آدم خور والی
بستی کا معائنہ کرنے سے قبل، جنگل کا ایک چکر لگایا جائے۔
میں نے اس کی رائے سے اتفاق کیا اور ہم ضروری
سازوسامان سے لیس ہو کر جنگل کی طرف روانہ ہو گئے۔

جنگل کافی گھنا تھا، اور اس میں تناور برگد، پتیل، مہوہ
اور اہلی کے درخت جا بجا نظر آئے۔ اس روز ہمارا ارادہ
صرف علاقے کا جائزہ لینا تھا۔ یوں بھی مجھے آدم خور سے ڈر
بھڑکی کوئی اُمید نہ تھی۔ میں آدم خور درندوں کی فطرت سے
بہ خوبی واقف ہوں۔ کسی مخصوص علاقے میں، اُد پر تلے
واردائیں کرنا، آدم خور کی خصلت کے خلاف ہے۔ پھر ہمارا
پالاتاویسے درندے سے پڑا تھا جو اپنی عیاری اور مکاری کے
واضح ثبوت فراہم کر چکا تھا۔

ہماری نظریں اطراف کا بہ خور جائزہ لے رہی تھیں۔
جنگل کے قریب پہنچ کر ہم مزید محتاط ہو گئے۔ ہماری رفتار
قدرے سست ہو گئی۔ راستہ ہر آن خطرناک اور ڈسوار ہوتا
جا رہا تھا۔ بے پناہ نشیب و فراز تھے پھر جا بجا خار دار
جھاڑیاں راہ میں حائل ہو کر مزید مشکلات پیدا کر رہی تھیں۔
ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم ایک پگڈنڈی نما
راستے تک پہنچ کر رُک گئے۔

وہ راستہ جنگل کے وسط سے شرقاً غرباً گزرتا تھا۔
میں نے اس مقام پر زمین کا جائزہ لیا تو ایک نر چیتے
کے نقوش پا بکثرت نظر آئے۔

نشانات دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ چیتا یہ راستہ
باقاعدہ طور پر استعمال کرتا ہے۔

راجو نے مجھ سے اتفاق کیا۔ ہم نے باڑے کے آس
پاس جو نشان دیکھے تھے، وہ ان نقوش سے گہری مماثلت
رکھتے تھے۔ اب میری ڈھارس بندھی اور مجھے یقین ہو گیا
کہ وہ راستہ آدم خور ہی کے زیر استعمال تھا۔

”اگر اس مقام پر گھات لگائی جائے تو با آسانی آدم
خور کو جہنم واصل کیا جاسکتا ہے۔“ راجو نے رائے دی۔

”لیکن میرا خیال ہے کہ ایسا کوئی قدم اٹھانے سے
قبل ہمیں وہ بستی بھی ایک نظر دیکھ لینی چاہیے جس کے
بارے میں مشہور ہے کہ وہاں اُس چیتے نے اپنا ٹھکانا بنا رکھا
ہے۔“ میں نے دھیرے سے کہا۔ ”مجھے یقین ہے یہ نقوش پا
اسی بستی تک جا رہے ہیں۔“

میرا اندازہ درست تھا۔ ایک گھنٹے بعد ہم ان کا
تعاقب کرتے ہوئے اس بستی کی حدود میں داخل ہو

سکتا تھا۔ پھر میں نے جس کمرے کو مسکن بنایا اس کی دیواروں پر بنی درزوں سے میں باہر کا منظر بھی بہ خوبی دیکھ سکتا تھا۔

جھونپڑی کا دروازہ اندر سے بند کر کے میں کمرے میں نہیں بیٹھا بلکہ وقفوں وقفوں سے کھانس کر اور کبھی سیٹی بجا کر اپنی وہاں موجودگی کا احساس دلاتا رہا۔ جھونپڑی کے باہر چوہے اور گیدڑ حرکت کر رہے تھے۔ تین گھنٹے بعد چاند کی روشنی اس حد تک پھیل گئی کہ درزوں میں سے چاندنی چھن چھن کر اندر آنے لگی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر چیتا کہیں آس پاس موجود ہوا تو میری بو پا کر جھونپڑے کا رخ ضرور کرے گا۔ مزید تین گھنٹے یوں ہی گزر گئے مگر چیتے کی آمد کے آثار پیدا نہیں ہوئے۔

میں نے درزوں میں سے باہر جھانکا۔ چاند کی روشنی اس حد تک پھیل چکی تھی کہ چالیس پچاس فٹ دور پھیلی جھاڑیاں اور دوسرے جھونپڑے صاف نظر آ رہے تھے۔ وقت چینی کی رفتار سے ریگ رہا تھا۔ آخر میں اس خود ساختہ قید سے اکتا گیا۔ جی میں آیا کہ دروازہ کھول کے باہر نکل جاؤں۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ دور سے بندروں کے خو خیانی کی آوازیں سنائی دیں۔ تھوڑی دیر بعد ہی بستی کے باہر گیدڑ زور زور سے چلانے لگے۔ میں رائفل ہاتھ میں تھامے بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا۔ بندر اور گیدڑ مسلسل خوخی اور چلا رہے تھے اور خبردار کر رہے تھے کہ ”ہوشیار! دشمن آ رہا ہے۔“ میں کمرے سے نکلا تھا۔ جھونپڑی کے چھوٹے صحن کے وسط میں جا کھڑا ہوا اور لگا زور زور سے کھانسنے۔

جھونپڑی کی جس دیوار میں دروازہ نصب تھا، وہ تختوں سے بنائی گئی تھی اور میرا رخ اسی جانب تھا۔ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ چیتا اسی طرف سے حملہ آور ہوگا۔ دفعتاً فضاء میں سکوت طاری ہو گیا۔ میں اپنی جگہ اب پتھر کے بت کی طرح کھڑا تھا کہ اچانک درندے نے جھونپڑی کے دروازے کو زور سے ٹکرائی اور پوری جھونپڑی جیسے لرز گئی۔ دہشت سے میرا بدن پتھر ہو گیا۔ پُر شور آواز کے ساتھ دونوں پٹ وا ہوئے اور چیتا عین میرے سامنے آن کودا۔

میں نے زندگی میں بیسیوں درندے شکار کیے ہیں مگر میں دعویٰ سے کہہ سکتا تھا کہ اس سے زیادہ قد آور درندہ میں

مئے۔ دور سے دیکھنے پر ہی وہ ویران معلوم ہوتی تھی۔ گھاس پھوس سے بنی تیس چالیس جھونپڑیوں کے بارے میں ہمیں بتایا گیا تھا کہ چیتے کی آمد سے قبل وہاں لکڑہاروں کی رہائش تھی۔ آدم خور نے اپنی وارداتوں کا آغاز بھی اسی بستی سے کیا تھا۔ گھاس پھوس کی دیواریں توڑ کر شکار کرنے میں اسے یقیناً کوئی وقت نہ ہوئی ہوگی۔ تین چار وارداتوں کے بعد لکڑہاروں نے وہ مقام غیر محفوظ تصور کرتے ہوئے چھوڑ دیا۔ ادھر چیتے کو اس بستی کی شکل میں ایک محفوظ ٹھکانہ مل گیا۔

جیسے جیسے ہم آگے بڑھے بستی کی ویرانی ہمارے دل و دماغ پر مسلط ہونے لگی۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا جیسے وہ آدم خور اس بستی میں ہمارے ساتھ موجود ہے۔

وسط میں پہنچ کر ہم رک گئے۔ وہاں دو انسانی پنجر اس حال میں پڑے ہوئے تھے کہ ایک نظر ڈالتے ہی دل کانپ گیا۔ لباس کے پتھروں سے ہم نے اندازہ لگایا کہ وہ دونوں آدم خور کا لقمہ بننے والے بدنصیب شکاری تھے۔ ”آدم خور یقیناً بستی اور جنگل کے درمیان آزادانہ گھومتا پھرتا ہے۔“ میں نے محتاط نگاہیں چار سو پھیرتے... ہو گئے کہا۔

”اس کا مطلب ہے صاحب! ہمیں ان دونوں مقامات کی نگرانی کرنی ہوگی۔“ افضل نے تائیدی انداز میں سر ہلا کر تجویز دی۔

”اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ہمارا پالا نہایت ہی مکار درندے سے پڑا ہے۔ اگر ہم اکٹھے رہے تو بچید نہیں کہ ہماری توجہ آدم خور سے زیادہ ایک دوسرے پر مرکوز رہے اور ہم اسے شکار کرنے کی بجائے خود شکار ہو جائیں۔ لہذا میں بستی میں رکتا ہوں۔“ میں نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔ ”تم جنگل میں نگرانی کرو اور زمین کی بہ نسبت تم کسی مضبوط درخت کی بلندی پر محفوظ بھی رہو گے۔“

افضل نے سرکواشات میں جنبش دی اور اپنا سازو سامان سنبھال کر اس پگڈنڈی پر ہولیا جو جنگل کی طرف جاتی تھی۔

افضل کو روانہ کرنے کے بعد میں نے ایسی جھونپڑی کا انتخاب کیا جو بستی کے وسط میں واقع اور نسبتاً مضبوط تھی۔ اس کی تعمیر میں گھاس پھوس کے ساتھ ساتھ لکڑی کے تختے بھی استعمال کیے گئے تھے۔ جھونپڑی کا محل وقوع کچھ ایسا تھا کہ اگر کوئی اس کی طرف بڑھتا تو میں فوراً اُسے نشانے پر لے

نے آج تک نہیں دیکھا۔ ہم دونوں فوراً جائے وقوع پر پہنچے، جہاں بچے کے

والدین گریہ و زاری کر رہے تھے۔ مکان کے باہر ہم نے نشانات کا کھوج لگانا چاہا، مگر کوئی ایسا نشان نہ ملا جس سے معلوم ہوتا کہ درندہ شکار لے کر کس سمت گیا ہے۔ دراصل وقوعہ کے بعد وہاں کئی لوگ جمع ہو گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے قدموں سے چھپتے کے نقوش مٹ گئے۔

میں نے لوگوں کو تائید کی کہ ہمارے علاوہ کوئی گاؤں کی حدود سے باہر نہ جائے اور پھر میں راجو کو ساتھ لے کر گاؤں کے گرد چکر لگانے لگا کہ شاید کہیں نشانات کا سراغ مل جائے۔ ہم گھومتے ہوئے گاؤں کے مغربی حصے پہنچے تو زمین پر ٹھیسٹے جانے کے واضح نشان نظر آ گئے۔ مگر کچھ دور چل کر وہ نشانات غائب ہو گئے اور چھپتے کے نقوش پارہ گئے۔ اسی لمحے میری چھٹی حس چیخ کر نادیدہ خطرے کا اعلان کرنے لگی۔ میں نے افضل سے پیٹھ جوڑ کر چاروں طرف نظریں دوڑائیں مگر وہاں کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں آدم خور چھپ سکتا ہو۔ معاً میرا دھیان اس درخت کی طرف گیا۔

اب جو میں نے نظریں اٹھائیں تو میری نگاہیں درخت کے اس حصے پر جم کر رہ گئیں، جہاں شاخوں میں سے بچے کا ایک خون آلود ہاتھ جھانک رہا تھا۔ درخت بلندی پر جا کر خاصا پھیل گیا تھا اور وہاں کئی ایسی شاخیں تھیں جن پر چیتا یا آسانی خود کو پتوں میں چھپا سکتا تھا۔

میں نے راجو کو خاموشی کا اشارہ کیا اور ہم دونوں اُلٹے پیروں درخت سے دور ہوتے چلے گئے۔ ہماری...

نگاہیں اور رائفلوں کے دہانے درخت پر مرکوز تھے۔ دس قدم دور ہو کر ہم رک گئے۔ درخت کے آس پاس زمین پر نگاہیں دوڑانے کے بعد میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔

”جناب! چیتا اسی درخت پر چھپا بیٹھا ہے۔“ معاً افضل نے میرے کان میں سرسرائی سرگوشی کی، مگر میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔

”نہیں افضل!“ میں نے سرگوشی میں جنبش دیتے۔ ہوئے کہا۔ ”اگر یہ عام آدم خور ہوتا تو شاید تمہاری بات درست ہوتی مگر یہاں معاملہ دوسرا ہے۔ ہمارا پالا ایک چالاک اور شاطر درندے سے پڑا ہے۔“

افضل کبھی مجھے اور کبھی اس درخت کو دیکھتا جس پر سے میں نے اپنی رائفل کا دہانہ ہٹا لیا تھا۔

”آپ کا مطلب ہے کہ چیتا درخت پر موجود نہیں

اگلے ہی لمحے اضطراری طور پر لیلی دبا دی۔ دھماکا ہوا اور چیتا وہاں موجود ہی نہیں تھا۔ میں نے فوراً باہر نکل کر ادھر ادھر دیکھا، مگر چھپتے کا کہیں نام و نشان ہی نہ تھا۔

یہ میری خوش قسمتی ہی تھی کہ میں اس وقت زندہ سلامت اپنی جگہ کھڑا تھا۔ ورنہ میری بے خودی سے فائدہ اٹھا کر درندہ میری ٹکا بوٹی بھی کر سکتا تھا۔

مجھ سے قبل آنے والے بد قسمت شکاریوں کے ساتھ اسی قسم کا حادثہ رونما ہوا ہوگا۔

میرے زندہ بچ جانے کی ایک ہی توجیہ پیش کی جاسکتی ہے اور وہ یہ کہ ابھی میری زندگی کے دن باقی تھے۔ بہر حال ایک خطرناک درندہ میرے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ میں نے جھونپڑے کی گنڈی چڑھا کر پائپ سلگایا، اور برآمدے میں بیٹھ گیا۔

میرا ذہن بھول بھلیوں میں بھٹک رہا تھا کہ صبح ہو گئی۔ اجالا پھلتے ہی افضل بھی مجھے ڈھونڈتے ہوئے وہاں آ گیا۔ ساری رات آنکھوں میں کاٹ دینے کے باوجود اس کا چھپتے سے آمناسا سنا نہیں ہوا تھا۔ جب اسے میرے ساتھ پیش آنے والے واقعے کا علم ہوا تو وہ بھی ہراساں نظر آنے لگا۔

”آپ کی قسمت اچھی ہے صاحب! کہ زخمہ بچ گئے۔“ وہ خوف زدہ لہجے میں گویا ہوا۔

”ہاں!“ میں نے ایک ہمکاری خارج کر کے جواب دیا۔ ”مگر افسوس کہ اس آدم خور چھپتے کی قسمت مجھ سے بھی زیادہ اچھی ہے، میں نے اسے مارنے کا سنہرا موقع کھو دیا۔ خدا جانے اب وہ دوبارہ ہاتھ آئے گا بھی یا نہیں؟“ میں نے حسرت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

ہم دل برداشتہ واپس گاؤں پہنچ گئے مگر ہم نے اپنی ناکامی کی خبر گاؤں والوں کو نہیں سنائی، ورنہ وہ مزید خوف زدہ ہو جاتے۔ ہم ناشتا کرنے کے بعد رات جگے کے باعث کسل مندی کا شکار ہو گئے۔ زمیندار کے مشورے پر ہم نے نیند پوری کرنا مناسب جانا۔

اگر دوپہر کے وقت شور و غل سے میری آنکھ نہ کھلتی تو خدا معلوم میں کب تک یونہی پڑا سویا رہتا۔ شور سن کر افضل بھی جاگ گیا تھا۔ ہم نے باہر نکل کر دیکھا تو لوگوں کا جم غفیر جمع تھا۔ پتا چلا کہ چیتا ابھی ابھی ایک بچے کو اٹھا کر لے گیا ہے مگر کسی کو خبر نہیں تھی کہ وہ کس طرف گیا ہے؟

ہے۔۔۔ وہ متوحش انداز میں بولا۔

”اس نے ہمیں دھوکا دینے کے لیے لاش درخت پر

چھپائی ہے، مگر یہ ثابت کیسے ہوگا۔؟“

”ایسے۔۔۔ میں نے درخت کے دامن میں نظر آنے

والے بچوں کے نشانات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اب افضل بھی اس طرف متوجہ ہو گیا۔ بچوں کے

نشانات جنگل کی طرف جارہے تھے۔

افضل کے منہ سے ایک طویل سانس خارج ہو گئی۔

”وہ ہمیں ٹچ دینا چاہتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تا کہ

ہم اس امر کا انتظار کریں کہ وہ کب اپنا شکار کھانے واپس

آئے۔ اور اس دوران وہ یہاں سے دور نکل جائے۔ لیکن

میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔“ یہ کہہ کر میں نے اسے اپنے

پچھے آنے کا اشارہ کیا۔ اور جنگل کی سمت بڑھ گیا۔

چیتا ذرا گھوم کر مشرق کی طرف سے جنگل میں داخل

ہوا تھا۔ جنگل نے پوری رعنائی، دہشت اور پُرشور آوازوں

کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔ درخت ہوا کے جھونکوں سے ہل

رہے تھے اور چاروں طرف عجیب بھیا تک آوازیں گونج

رہی تھیں۔ ہم دونوں خاموش اور یوں چل رہے تھے کہ نہ

قدموں کی آہٹ بلند ہو اور نہ خشک پتوں کے پیروں تلے

روندے جانے کی چرچاہٹ ابھرے۔

آدم خور کے شکار میں کامیابی اور حفاظت کا بہترین

طریقہ یہی ہے کہ شکاری ممکنہ خاموشی سے پیش قدمی کرے۔

میری نظریں اطراف کا بہ غور جائزہ لے رہی تھیں۔ رفتہ

رفتہ جنگل گھٹنا ہوتا گیا۔ زمین پر پھیلے خشک پتوں اور دوسرے

جانداروں کے نقش پا کے درمیان چیتے کے نقش پانظروں

سے اوجھل ہو گئے۔ فریب ہی درختوں پر سرخ منہ والے

بندروں کا غول چیخ رہا تھا۔ کچھ خرانٹ قسم کے بندر ہماری

طرف متوجہ بھی ہوئے، لیکن اگلے لمحے ہم آگے بڑھ گئے۔

ابھی ہم نے جنگل کے اندر نصف فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ

پچھے جھاڑیوں میں سرسراہٹ سن کر ہمارے قدم جہاں تھے

وہیں بٹخ ہو گئے۔

ہم نے پلٹ کر اس طرف دیکھا، جہاں آواز سنائی

دی تھی۔ مگر ہمارے رکتے ہی وہ آواز بھی بند ہو گئی۔ معاً

بائیں طرف ایک درخت پر بیٹھے پرندے زور سے چیخے اور

فضاء میں پرداز کر گئے۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی

میرے اندر کا شکاری چوکننا ہو گیا۔

ہم دونوں ایک دوسرے سے پیٹھ جوڑے، جنگل کے

تاریک گوشوں کو گھور گھور کے دیکھنے لگے۔ مجھے ایسا محسوس ہو

رہا تھا جیسے کہیں کسی گوشے میں چھپا بیٹھا کوئی ہماری حرکات و

سکناات کا بغور جائزہ لے رہا ہے۔

میں نے افضل کو مخصوص انداز میں شہو کا دیا اور رائفل

کے ٹریگر پر ہاتھ رکھے آگے بڑھا۔ بارہا مجھے اپنے پیچھے کسی...

جانور کے قدموں کی چاپ محسوس ہوئی، لیکن یہ فیصلہ کرنا

میرے لیے مشکل ہو گیا کہ وہ کسی کھر دار جانور کی قدموں

تلے روندے جانے والے پتوں کی آواز تھی یا گدی دار پیر

والے چیتے کی۔ میں نے چند قدم پیچھے ہٹ کر رائفل کا دہانہ

اسی طرف گھما دیا۔

اچانک ہمارے سامنے قد آدم درختوں سے نیچے کوئی

جانور کودا۔ اس سے قبل کہ ہم اس کا نشانہ لیتے، وہ اُونچی گھاس

... میں کہیں گم ہو گیا۔ میں اسے دیکھتے ہی پہچان گیا۔

یہ وہی چالاک چیتا تھا جو ہمارے ساتھ ساتھ

تھاڑیوں میں پھپھتا چھپتا چل رہا تھا۔

درندوں میں چیتا سب سے زیادہ مکار اور ہوشیار...

جانور ہے۔ وہ شیر کی طرح نہ تو گرج کر حملہ کرتا ہے اور نہ ہی

دوسرے درندوں کی طرح اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔

وہ بلی کی طرح دبے قدموں شکار کا تعاقب کرتا موقع ملتے

ہی اسے دیوچ لیتا ہے۔

معا ہمارے سامنے قد آدم گھاس میں جنبش ہوئی اور

مجھے چیتے کی دم کا بالائی حصہ نظر آیا جو سانپ کے پھن کی

طرح دھیرے دھیرے لہرا رہا تھا۔ اگر دم نظر نہ آتی، تو میں

کبھی یہ اندازہ نہیں لگا پاتا کہ وہ کہاں چھپا ہوا ہے۔

میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں افضل کو ساکت

رہنے کا اشارہ کیا، آہستہ بہت آہستہ سے رائفل اُوپر اٹھائی

اور پھر ہاتھوں کی ہلکی اور نرم جنبش سے اس مقام کا نشانہ لیا

جہاں میرے اندازے کے مطابق چیتے کا دھڑ تھا۔

ابھی میری اُنکھیاں بہ مشکل لبلبی تک پہنچی تھیں کہ چیتے

نے یکنخت سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور پھر ایک چٹکھاڑ کے ساتھ

میری جانب چھلانگ لگا دی۔ اس کے اور میرے درمیان

ابھی چند گز کا فاصلہ تھا کہ میرے فائر کی آواز گونجی اور

دوسرے ہی لمحے چیتا اپنی پوری طاقت اور وزن کے ساتھ

میرے اُوپر گرا۔ یہ سب اتنی تیزی سے ہوا کہ میں کچھ سمجھ نہ

سکا اور رائفل ہاتھوں سے چھوٹ گئی۔

چیتے کا ایک پنجہ زور سے میرے کاندھوں پر لگا اور میں

لڑھکتا ہو گھاس میں جا گرا۔ چیتے نے چھلانگ لگائی اور عرا کر

منا (منی)

مکہ معظمہ اور عرفات کے درمیان وہ مقام جہاں حج کے بعد قربانی دی جاتی ہے اور رمی جمرہ کی جاتی ہے۔ یہ مقام مکہ سے عرفات جانے والی سڑک پر مکہ کی مشرقی پہاڑیوں میں واقع ہے جو مکہ سے پانچ میل کے فاصلے پر ایک تنگ وادی میں ہے۔ یہی جگہ عقبہ بھی کہلاتی ہے۔ قصبے میں پتھر کے مکانات ہیں اور ہر طرف کنکریاں بکھری ہوئی ہیں۔ اسی جگہ تین جمرے ہیں جن پر حاجی کنکریاں مارتے ہیں۔ اسی مقام پر مسجد الحسین ہے جسے سلطان صلاح الدین ایوبی نے بنوایا تھا۔ تمام سال تو یہ جگہ سنسان پڑی رہتی ہے لیکن حج کے زمانے میں یہاں کی رونق اور مجمع دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے یہ جگہ مقدس سمجھی جاتی ہے۔ حج کے موقع پر 8 ذی الحجہ کو ظہر کی نماز یہیں ہوتی ہے اور اگلی صبح تک یہیں قیام رہتا ہے۔ یہاں سے حاجی عرفات کو جاتے ہیں۔ وہاں سے فارغ ہو کر پھر منی کو لوٹتے ہیں۔ یہیں قربانی کی جاتی ہے۔ بال ترشوائے جاتے ہیں۔ آخر میں طواف کعبہ کے بعد تین روز پھر یہاں قیام رہتا ہے اور گویا حج اس مقام پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ گوا بھی ایک اور طواف باقی رہتا ہے جسے طواف وداع کہا جاتا ہے اور یہ طواف مکہ معظمہ سے رخصت ہوتے وقت کیا جاتا ہے۔

مرسلہ: یعنی سہیل۔ کراچی

میرے زخموں کی دیکھ بھال کرتا رہا، مگر تکلیف روز بہ روز بڑھتی گئی۔ بخار بھی رہنے لگا۔ میری ذاتی رائے تھی کہ چھتے کے دانتوں اور پنجوں کا زہر میرے خون میں سرایت کر چکا ہے۔ میری حالت کی خبر ڈپٹی کمشنر تک پہنچی تو انہوں نے اگلے ہی روز مجھے علاقے کے سول اسپتال میں داخل کرنے کے احکامات صادر کر ڈالے۔

بھاگلپور اسپتال میں پڑے پڑے مجھے دو ماہ ہو گئے۔ اس دوران راجو نے میری خدمت کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ وہ صحیح معنوں میں ارفیق ثابت ہوا۔ مجھے آدم خور کی

میرے کندھے میں دانت گاڑ دئے۔ وہ لحوہ میں زندگی بھر فراموش نہیں کر سکتا۔ حد درجہ تکلیف کے ساتھ ہی موت کے احساس نے بل بھر کے لیے میرے اعصاب جکڑ لیے۔ میں ابھی طرح جانتا تھا کہ ایسے موقع پر افضل کبھی گولی نہیں چلائے گا۔ اب جو بھی کرنا ہے مجھے ہی کرنا تھا۔ گھٹنوں کے بل اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے اپنے... شکاری خنجر کے دستے پر ہاتھ جمایا اور اسے میان سے باہر نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی لمحے چھتے نے غرا کر میرا کندھا چھوڑا، تو ایک جھٹکے کے ساتھ خنجر میرے ہاتھ میں آ گیا۔ اس دوران چھتے کی تیز سانسیں مجھے اپنی گردن اور کان پر محسوس ہو رہی تھیں۔ میں نے دیکھے بغیر خنجر اپنے پیچھے کھڑے چھتے کے جسم میں پھوست کر دیا۔ چیتا خون آشام غراہٹ کے ساتھ تلمسایا اور میری پیٹھ سے اتر کر ایک طرف بھاگ گیا۔ راجو شاید اسی لمحے کا منتظر تھا۔ اس نے آن واحد میں کئی گولیاں فرار ہوتے چھتے پر داغ دیں مگر وہ پلک جھپکتے میں غائب ہو گیا تھا۔

افضل نے فوراً آگے بڑھ کر مجھے اٹھایا۔ میرے زخمی کندھے سے ابلتا خون سارے جسم کو تر کر رہا تھا۔ اس نے مجھے کندھے پر اٹھایا اور جنگل سے باہر دوڑ لگا دی۔ اس دوران میں درد کی شدت سے بے ہوش ہو گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں زمیندار کی حویلی کے صحن میں ایک چارپائی پر پڑا تھا۔ میری ٹیس اتار کر زخموں کی مرہم پٹی شاید افضل نے خود کی تھی، کیونکہ وہ ادویہ کا بکس اٹھائے میرے سر ہانے ہی کھڑا تھا۔ صحن میں گاؤں والوں کا ہجوم تھا۔ سب میری طرف پر تشویش نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

اس موذی نے مجھے اس قدر پریشان کر دیا تھا کہ اس کا ہولہ ذہن میں آتے ہی اپنے زخم کی تکلیف فراموش کر کے میں افضل کی مدد سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب میں ہر قیمت پر اس چھتے کو موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا تھا۔ میں نے گاؤں والوں کو اکٹھا کیا اور ان سے کہا کہ وہ میرے ہمراہ اس زخمی چھتے کو تلاش کریں۔ کہیں نہ کہیں ضرور اس کا سراغ مل جائے گا۔ دراصل زخمی حالت میں اس کے فرار کے بعد میں خاصا پند امید ہو گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ چند روز تک اپنے زخم چائے گا، اور اس جنگل سے نکل کر کہیں نہیں جائے گا۔

میری گردن، گھٹنے اور انگلیوں پر بھی گہری خراشیں آئی تھیں۔ ایک ہفتہ شدید تکلیف کے عالم میں بسر ہوا۔ اس دوران افضل کے علاوہ قرہی قصبے سے ایک نا تجربہ کار ڈاکٹر

”سرگرمیوں“ کی بھی خبریں ملتی رہیں۔ وہ اتنا ڈر ہو چکا تھا کہ دن دھاڑے کسی نہ کسی کو پکڑ کر لے جاتا۔ ایک مرتبہ اس نے بڑھڑواریلوے اسٹیشن پر نمودار ہو کر سنسنی پھیلا دی۔ اس کے بعد متضاد خبریں آنے لگیں۔ کبھی معلوم ہوتا کہ آدم خور مارا گیا اور کبھی پتا چلتا کہ نہیں مرا۔

افضل بڑی بے قراری سے میری صحت یابی کی... دعائیں مانگا کرتا تھا۔ خود میری طبیعت اسپتال میں پڑے پڑے بیزار ہو چکی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے اس کمرے سے نکلوں اور آدم خور سے بدلہ لے کر حساب چکنا کروں۔ مگر ڈاکٹروں نے میری ایک نہ چلنے دی۔

خدا خدا کر کے ڈھائی ماہ بعد مجھے اسپتال سے رخصت ملی، تو میں افضل کے ہمراہ سیدھا ہو کر خان پہنچ گیا۔ اسٹیشن کے باہر سرکاری اہل کاروں نے اونچی اونچی بلیاں باندھ کر لوہے کی باڑ نصب کر رکھی تھی۔ ہر طرف مہیب سناٹا اور دہشت کی فضاء چھائی ہوئی تھی۔

آدم خور کے تعاقب میں مجھے دن کا چھین تھا نہ رات کا ہوش۔ بس میرے دل و دماغ پر یہی ڈھن سوار تھی کہ کسی طرح اسے جہنم واصل کر دوں۔ افضل سائے کی طرح میرے ساتھ تھا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ اگر وہ میرا ساتھ نہ دیتا تو شاید میں کبھی آدم خور کو جہنم واصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ اس دوران ہمیں آدم خور کے بارے میں خاطر خواہ معلومات مل رہی تھیں۔

میری صحت یابی تک وہ۔ منحوس ورنندہ ڈیڑھ سو افراد کو اپنا لقمہ بنا چکا تھا۔

تین دن بعد پیر پاکٹی سے یہ خبر ملی کہ وہاں ایک چودہ سالہ لڑکے کو آدم خور اٹھالے گیا ہے۔ یہ حادثہ پیر پاکٹی کی پہاڑی ڈھلوانوں کے قریب پیش آیا تھا۔

ہم نے اسی وقت گھوڑے سنبھالے اور روانہ ہو گئے۔ ہمیں وہ جھونپڑی دکھائی گئی جہاں چیتے نے واردات کی تھی۔ وہ شکار منہ میں دبائے پہاڑی کی طرف بھاگ گیا تھا۔ لوگوں کے بیانات سے میں نے اندازہ لگایا کہ آدم خور لاش کو پہاڑیوں میں لے گیا تھا اور شاید اب تک وہیں ہو۔

کسی نے بھی اب تک چیتے کا تعاقب کرنے کی جرأت نہ کی تھی۔ اس جگہ مسلمانوں کی آبادی خاصی زیادہ تھی۔ شکار ہونے والا لڑکا بھی مسلمان ہی تھا۔ سمجھانے سمجھانے پر ہمارے ہمراہ آٹھ نو جوان پہاڑیوں تک جانے کے لیے راضی ہو گئے۔ اگر چہ سورج غروب ہونے میں زیادہ دیر نہ

تھی، لیکن میں آج ہی کھنڈر جانا چاہتا تھا۔

راستہ انتہائی ڈشوار اور خطرناک تھا۔ جوں جوں ہم آگے بڑھے ہمارے ساتھ آنے والے نو جوان سرا سیملی کا شکار نظر آنے لگے۔ جب مجھے احساس ہوا کہ وہ آگے بڑھنے سے کترار ہے ہیں، تو میں نے مزید وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور انہیں وہیں رکنے کی ہدایت دے کر افضل کے ہمراہ پتھروں کو پھلانگتا خاردار جھاڑیوں کی پرواہ کیے بغیر پہاڑیوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

پہاڑیوں میں داخل ہوتے ہی میری چھٹی حس خطرے کا اعلان کرنے لگی۔ میں نے افضل کو اشارہ کیا، اور لیلی پر انگلی جمائے چاروں طرف نظریں دوڑانے لگا۔ دائیں جانب واقع جھاڑیوں میں ہلکی کھڑکھڑاہٹ سن کر میں نے اپنی سماعت اسی جانب مرکوز کر دی۔ مجھے اپنی قوت سماعت پر کامل بھروسہ تھا۔ جھاڑیاں مجھ سے تیس گز دور تھیں۔

میں عجلت کا مظاہرہ کر کے بنا بنایا کام بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ آدم خور اپنی فطرت کے مطابق مجھے بے خبری میں دیو چنا چاہتا ہے۔

دفعۃً آدم خور کی سانسیں کی آواز ابھری اور میں برقی سرعت سے اس جانب گھوم گیا۔ اسی لمحے جھاڑیوں میں دیکھے ہوئے آدم خور نے اپنا سراٹھایا اور اس کی آہٹوں کی مانند دھمکتی آنکھیں جیسے میرے وجود میں سوراخ کرنے لگیں۔

آدم خور کی اس تنویری قوت کا مجھے ماضی قریب میں۔۔ کافی تلخ تجربہ ہو چکا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ جست لگا کر میرے سر پر پہنچتا، میری گولی اس کا داہنا شانہ توڑتی ہوئی نکل گئی۔ زخمی ہونے کے باوجود چیتا دل دہلا دینے والی غراہٹ کے ساتھ میری جانب جھپٹا۔ میں نے فوراً زمین پر لوٹ لگائی اور سیدھا ہوتے ہی دوسری گولی داغ دی جو اس کی گردن میں سوراخ کرتی ہوئی نکل گئی۔

تڑپتے تڑپتے وہ ایک بار پھر فضاء میں اُچھلا، لیکن فوراً ہی میری گولی اس کی گھونپڑی میں پیوست ہو گئی اور وہ دوبارہ نہ اٹھ سکا۔

جب میں اور افضل چیتے کی پیمائش کر چکے تو اسے ایک درخت کے سائے میں ڈال دیا گیا۔ اگلے روز صبح سے شام تک سینکڑوں مرد اور عورتیں اسے دیکھنے آتے رہے۔

امین بھایانی / کشمالہ حسن

خواب دیکھنا انسانی فطرت میں شامل ہے، ہر کوئی خواب دیکھتا ہے۔ بعض خواب سچے بھی ہوتے ہیں اور قبل از وقت آگہی کا اشارہ بھی کہلاتے ہیں۔ خوابوں کا تذکرہ قرآن مجید میں بھی آیا ہے لیکن ہم خواب کیوں دیکھتے ہیں، کس وجہ سے خواب نظر آتے ہیں، خوابوں کی حقیقت کیا ہے، اس بارے میں ہمارا علم محدود ہے۔

ایک چشم کشا تحریر، قصہ دلپذیر

”ارے بھئی شاکر! کن سوچوں میں گم ہو۔“
شاکر علی اس بیخ ستارہ ہوٹل کی لابی کے بیش قیمت تھلی
صوفوں میں دھنسا اطراف کے رُرونیق ماحول اور رنگ و نور
برساتے سماں کے باوجود نہ جانے کن خیالات میں گم تھا، یکدم
چونک پڑا۔
کوئی آدھ گھنٹے قبل ہوٹل کی پول سائیڈ جہاں شہر کے
ایوان صنعت و تجارت کی سالانہ تقریب ختم ہونے کے بعد
ایک نہایت ہی پُرکلف عشاءے کا آغاز ہوا تو شاکر علی



کرتا ہے۔ یوں کہہ لو کہ وہ خوابوں کے بند دروازے کھولتا ہے۔

”کیا مطلب!“ شاکر علی کے چہرے پر شدید حیرت نمایاں تھی۔

”مجید کا کہنا ہے کہ ان دنوں امریکا بھر کی یونیورسٹیوں میں خواب پر ہونے والی تحقیقات سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ اکثر خواب لاشعور کی جانب سے شعور کو ارسال کردہ کوڈ پیغام ہوتے ہیں۔“

”اور وہ جو ہم ایک زمانے سے سنتے آرہے ہیں کہ خواب ہماری ذہنی خواہشات کا عکس ہوتے ہیں؟“

”دیکھو بھائی شاکر، میں کوئی مجید کی طرح ماہر نفسیات تو ہوں نہیں۔ میں تو وہی کچھ بتا رہا ہوں جو اس نے میرے ایک خواب کا تجزیہ کرتے ہوئے بتائی تھی۔“

”کیسا خواب؟“

”مجھے اکثر خواب آیا کرتا تھا کہ میں ایک جنگل میں اپنے گھر والوں کے ساتھ کھڑا ہوں۔ میرے ہاتھ میں ایک پٹا ہے جس سے ایک شیر بندھا ہے۔ سامنے وہ سب لوگ کھڑے ہیں جو مجھے ناپسند ہیں۔ شیر اپنی کھلی ٹانگوں پر بیٹھا دم ہلاتے ہوئے کبھی میری طرف تو کبھی سامنے کھڑے لوگوں کو دیکھتا ہے کہ جیسے میری اجازت کا طلبگار ہو۔ میں سر ہلاتے ہوئے پٹا چھوڑ دیتا ہوں۔ شیر آزاد ہوتے ہی ایک خوفناک چنگھاڑ کے ساتھ ان لوگوں کی طرف چھلانگ لگا دیتا ہے۔ مگر اچانک پلٹ کر دھاڑتا ہوا مجھ سمیت میرے گھر والوں پر حملہ آور ہو جاتا ہے۔ شیر کو اپنی جانب آتا دیکھ کر ہم سب کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں اور جان بچانے کی خاطر ادھر ادھر دوڑ پڑتے ہیں۔ یہ سارا منظر دیکھ کر وہ لوگ زور زور سے تھپتھپے لگا کر ہمارا مذاق اڑانے لگتے ہیں۔“

”یہ تو بڑا ہی عجیب خواب ہے۔“ شاکر علی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”تو پھر پروفیسر مجید نے کیا بتایا؟“

”پہلے بہت سے سوالات کیے۔ میرے گھر والوں کے متعلق دریافت کیا۔ پھر میری عادات و مشاغل کے بارے میں پوچھا۔ اس دوران ایک ایسی بات سامنے آئی کہ اس نے خواب میں چھپے پیغام کوڈی کوڈ کر لیا۔“

”کیسی بات؟“

”بس کیا بتاؤں!“ جلال مرزا کے لہجے میں ایک ہلکا سا ہٹ سی تھی۔ ”ہماری ملاقات محض ایوان کی میٹنگوں، عشاءوں یا پھر ویک اینڈ کی شام جم خانہ میں ہوتی ہے۔ ظاہر

دھیرے دھیرے چلتا ہوا ہوٹل کی لابی میں آ نکلا اور صوفے پر جا بیٹھا۔ اس دوران ایک ویٹریس آیا تو اسے ”ون کافی ود کریم“ کہہ کر خود سوچوں میں گم ہو گیا۔ اب وہ کافی بھی صوفے کے سامنے لگی ٹیبل پر رکھی نہ جانے کب کی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

Downloaded from paksociety.com

وہ اپنے حلقہ احباب میں ایک زندہ دل انسان کے طور پر جانا جاتا تھا۔ ایوان صنعت و تجارت کی انتظامی کمیٹی کا فعال رکن ہونے کے سبب وہ ہمیشہ پیش پیش رہا کرتا اور اس قسم کی تقاریر کی توجان سمجھا جاتا تھا۔ البتہ کچھ عرصے سے اس میں ایک تبدیلی ضرور آئی تھی۔ اکثر گم صم سامنے لگا تھا۔ باتیں کرتے کرتے اچانک چپ ہو کر نہ معلوم کن سوچوں میں ڈوب کر خلاؤں میں گھورنے لگتا۔

”کیا ہوا تم نے کھانا بھی نہیں کھایا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ شاکر کو مخاطب کرنے اور ساتھ والے صوفے پر بیٹھتے ہی اس نے فوراً دوسرا سوال داغ دیا۔

”ہاں یار جلال مرزا، وہاں کھن سی محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ کھانے کو میرا جی بالکل بھی نہیں چاہ رہا تھا تو میں پہاں چلا آیا۔“ شاکر علی کے چہرے پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔ پھر یکدم یوں چونکا جیسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ ”اور ہاں بھئی وہ خوابوں کی تعبیر بتانے والے تمہارے پروفیسر صاحب جن کے بارے میں ذکر ہوا تھا، آئے ہیں یا نہیں؟“

”ہاں ہاں بھئی، وہ آیا تو ہے مگر وہاں چند دوسرے دوستوں نے اسے گھیر رکھا ہے۔“

”یار مرزا، کیا وہ سچ سچ خوابوں کی تعبیر بتا سکتا ہے؟“

شاکر کے چہرے پر بے یقینی کے بادل منڈلا رہے تھے۔

”کہیں یہ کوئی فراڈ باباجی ٹائپ آدمی تو نہیں؟“

جلال مرزا نے اختیار ہنس پڑا پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔ ”پروفیسر مجید محسن اسکول کے زمانے میں میرا کلاس فیلو تھا۔ نفسیات میں پی ایچ ڈی کرنے کے بعد گذشتہ کئی سال سے ایک مقامی یونیورسٹی کے شعبہ نفسیات میں تدریس کے فرائض سرانجام دے رہا ہے۔ خواب کے نفسیاتی پہلو پر تحقیق اس کا شوق ہے اور اس موضوع پر ایک تحقیقاتی کتاب بھی لکھ رہا ہے۔“

”مگر تم یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ خواب کی تعبیر بالکل درست بتاتا ہے؟“

”اس کا کہنا ہے کہ وہ خوابوں کی تعبیر نہیں بتاتا بلکہ ان کا نفسیاتی تجزیہ کر کے ان میں مخفی پیغام ڈی کوڈ کرنے کی کوشش

ہے کہ تم میری سب عادات سے تو پوری طرح آگاہ نہیں ہو سکتے۔“

”اب ایسی کوئی عادت ہے جس کا تعلق اس عجیب و غریب خواب سے ہو سکتا ہے؟“ شاکر علی کے لہجے میں تعجب تھا۔

”بات یہ ہے کہ جب مجھے غصہ آتا ہے تو میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہوں۔ ہتھے سے اکڑ کر اکڑ اور ری ایکٹ کرتے ہوئے نہ جانے کیا اول فول یک جاتا ہوں اور بات بگڑ جاتی ہے۔ لوگ یہ سب دیکھ کر میرا مسخراڑاتے ہیں۔ اس غصے کے سبب میرے گھر والوں کی سبکی ہوتی ہے۔ اکثر ان کا بھی مذاق اڑایا جاتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جس بات پر مجھے شدید غصہ آتا ہے بعد ازاں غور کرنے پر احساس ہوتا کہ وہ کوئی ایسی بہت بڑی بات بھی تھی۔“

”تو پھر اس خواب میں تمہارے لیے کیا پیغام تھا؟“
 وہ پروفیسر کے تجزیے کے مطابق وہ شیر میرا وہی غصہ ہے جس پر قابو نہ پاسکنے کی وجہ سے وہ بجائے دوسروں کے خود مجھے اور میرے گھر والوں کو ذہنی و نفسیاتی طور پر نقصان پہنچا رہا ہے اور میرا سچ بھی خراب ہو رہا ہے۔ سواب میں کوشش رہا ہوں کہ اپنے غصے پر قابو پاؤں اور شکر اللہ، مجید کے دیئے مشوروں پر عمل کر کے بڑی حد تک کامیاب بھی رہا ہوں۔“
 ”واقعی اگر غور کیا جائے تو تمہارا خواب بالکل روز روشن کی طرح عیاں تھا۔ اب کی بار شاکر علی کے لہجے میں تحسین تھی۔

”اسی لیے میں نے اپنے مہمانوں کے کونے میں مجید کو بھی مدعو کر لیا۔ بڑی مشکل سے راضی ہوا۔ کہنے لگا کہ تم بیوی پاروں کے عشائیے میں مجھ جیسا کتابی کیرا محض بور ہی ہو سکتا ہے۔ مگر جب تمہارے خواب کا ذکر کیا تو وہ فوراً آنے کو تیار ہو گیا۔ ویسے مجید صرف اپنے قریبی دوستوں اور خاص جاننے والوں ہی کے خوابوں کا تجزیہ کرتا ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ اس طرح سے مختلف نوعیت کے کیسز کی اسٹڈی کا موقع مل جاتا ہے۔ تم نے بہت اچھا کیا کہ پچھلے ہفتے جم خانہ میں اپنے خواب کا ذکر کیا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ تمہاری ملاقات مجید سے کروادی جائے۔“

”اچھا تو پھر کب ملتا ہے؟“
 ”ہاں بس وہ آ ہی رہا ہوگا۔ آرگنرائزنگ کمیٹی کا کنوینر ہونے کے سبب تنظیمین کے لیے ہوٹل میں جو کرا بک کروایا گیا ہے اس کی چابی میرے پاس ہی ہے۔ میں نے وہ چابی

مجید کو دے کر اسے وہیں آنے کا کہہ دیا تھا۔“
 اچانک جلال مرزا کے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اسکرین دیکھ کر چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ فون کان سے لگا کر کچھ دیر سنتا رہا پھر بولا۔ ”ہاں بس، ابھی دو منٹ میں شاکر علی پاس آ رہا ہے۔ میری طرف سے معذرت، مجھے ذرا عشائیے سے متعلق معاملات بھی دیکھنے ہیں۔“

اتنا کہہ کر وہ صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا اور شاکر علی کو اٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”ارے بھئی ہم یہیں باتیں کرتے رہ گئے اور مجید کمرے میں تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“
 کچھ ہی دیر بعد ہوٹل کے ایک کمرے میں لگی میز پر وہ دونوں آمنے سامنے براجمان تھے۔

”جی شاکر صاحب، اب بتائیں اپنے خواب کے بارے میں جس نے آپ کو ابجمن میں ڈال رکھا ہے؟“ کوئی چالیس بیس تالیس کے لگ بھگ عمر کا ماسٹر کن چہرے مہرے اور شخصیت کا حامل پروفیسر مجید ذہانت کی چمک سے بھرپور آنکھوں کے ساتھ مسکرا کر مخاطب ہوا۔

”ان خوابوں میں ہمیشہ میں نے خود کو ایک بچے کی صورت دیکھا۔“ شاکر علی نے دور کہیں خلاؤں میں گھورتے ہوئے بولنا شروع کیا۔ ”جو یا تو کبھی اپنے بالنے میں مجھ کو خواب ہے تو کبھی کسی میدان میں کھیل رہا ہے تو کسی باغ میں لگے جموں پر جمول رہا ہے تو کبھی کلاس روم میں اپنا سبق پڑھ رہا ہے تو کبھی کسی بات پر درود کرہاں ہوتا ہے۔“

”تو پھر اس میں ابجمن والی کوئی بات ہے؟“
 ”ان سارے خوابوں میں جو ابجمن کی بات ہے، وہ ہے ماسٹر حیدر بخش!“

”ماسٹر حیدر بخش؟“
 ”جی! دراصل وہ ہمارے اسکول میں ریاضی کے استاد تھے اور انہوں نے ہی مجھے چھٹی جماعت سے لے کر میٹرک تک ریاضی پڑھائی۔“

”مگر ان کا آپ کے خوابوں سے کیا تعلق ہے! مگر ذرا ٹھہریں! کیا نام بتایا آپ نے! ماسٹر حیدر بخش!“

پروفیسر مجید اچانک سوچ میں ڈوب گیا۔ ”ارے! کہیں یہ وہی تو نہیں، مشہور تعلیم پھیلاؤ تحریک کے بانی، جنہوں نے کئی سال پہلے اسکول کی ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد بے سروسامانی کے عالم میں تحریک کا آغاز کیا اور آج ان کی کوششوں سے ملک بھر میں اگنت غریب و نادار بچے مفت تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔“

"ارے صاحب، وہ تو نادانی کا دور تھا۔" شاکر علی

کھسپائے لہجے میں بولا۔ "اپنے اچھے برے کی کچھ خبر نہ تھی۔

میں انہیں ایک ایسا ظالم اور اکھڑا استاد سمجھتا تھا جو بھری جماعت

میں مشق درست نہ کرنے پر سب کے سامنے تھپڑ رسید کر دیا

کرتا۔ ہر وقت روک ٹوک کرتا۔ جب میں میٹرک میں تھا تو وہ

ان کا بھی ملازمت میں آخری سال ہی تھا۔ وہ ریٹائر ہو گئے

اور میں کالج چلا گیا۔ اگر چاہتے تو وہ بھی اپنا ذاتی ٹیوشن،

کوچنگ سینٹر وغیرہ یا پھر کوئی چھوٹا موٹا برائٹ اسکول کالج

کھول کر اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھو کر بلکہ غسل کر سکتے تھے جن میں

ان جیسے دیگر ریٹائرڈ اساتذہ دن رات ڈبکیاں لگاتے ہیں۔

یا پھر بیکار گھر بیٹھ کر اپنی پینشن کے سہارے بہت زیادہ نہ سکی

پھر بھی کسی حد تک تو آرام کی زندگی گزار ہی سکتے تھے۔

مگر انہوں نے اپنی صلاحیتوں کو ملک و قوم کے مناد میں

استعمال کرنے پر ترجیح دی۔ اپنے جیسے ریٹائرڈ لوگوں کے ساتھ

لے کر غریب و نادار بستیوں کے گھروں سے بچوں کو پکڑ لائے

اور گلی محللوں کے فٹ پاتھوں، پارکوں اور ریلوے پلوں کے

نیچے پڑھانا شروع کر دیا۔ میں کالج سے یونیورسٹی جا پہنچا۔

دورانِ تعلیم ادھر ادھر چھوٹی موٹی نوکریاں بھی کرتا رہا۔ باقاعدہ

عملی زندگی کا آغاز ایک چھوٹے سے کاروبار سے کیا۔ اپنی

شبانہ روز انتھک محنت سے ایک کامیاب بزنس مین بن گیا۔

اس دوران ماسٹر صاحب ایک ایسے قوم کے طور پر سامنے

آئے جن کا اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا اور اوڑھنا بچھونا قوم کے

نادار و مفلس بچوں کی تعلیم سے وابستہ ہے۔ اگر وہ اس کام کا

بیڑا اٹھاٹھاتے تو شاید لاکھوں نادار بچے تعلیم جیسی عظیم نعمت سے

محروم رہ جاتے۔ میں غیر محسوس طور پر ان کا شیدائی بنا چلا گیا

اور سمجھ میں آیا کہ اگر وہ سختی کرتے تھے تو وہ میری ہی بھلائی کے

لیے تھی جس روز مجھے اپنے کاروبار کا پہلا منافع ملا۔ میں نے

اپنی کمپنی کی جانب سے ایک بڑی رقم کا امدادی چیک خاموشی

کے ساتھ انہیں روانہ کر دیا۔"

"ہوں۔" پروفیسر مجید ایک بار پھر خلا میں گھورتے

ہوئے بڑبڑایا۔ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ "شاکر صاحب،

آپ کے تعلقات اپنے والد کے ساتھ کیسے ہیں؟"

اس سوال میں نہ جانے ایسی کیا بات تھی کہ شاکر علی کا

چہرہ بھگ سا گیا اور اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ پھر ایک گہری سانس

لے کر دھیرے دھیرے اپنی ناک سے خارج کرتے ہوئے

جب اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا تو پروفیسر مجید نے دیکھا کہ اس

"واہ صاحب، تو آپ ان کے شاگرد رہ چکے ہیں؟"

"جی ہاں اور مجھے ہر خواب میں ماسٹر صاحب بھی ضرور

نظر آتے ہیں۔ جو مجھے مشفقانہ نظروں سے دور کھڑے تک

رہے ہوتے ہیں۔ ہر بار خواب کا اختتام کچھ یوں ہوتا ہے کہ

اچانک میری نظر ان کی طرف پڑتی ہے تو میں مسکرا دیتا ہوں

جو اب ان کے چہرے پر بھی محبت سے بھر پور مشفقانہ مسکراہٹ

آ جاتی ہے۔"

"ہاں تو بھلا اس میں ایسی کونسی الجھن والی بات ہے؟

دیکھیں شاکر صاحب، اپنے بچپن اور دورِ طالب علموں میں جن

اساتذہ سے متاثر ہوتے ہیں وہ نہ صرف ہمیں عمر بھر یاد رہتے

ہیں بلکہ گاہے بگاہے خواب میں بھی نظر آتے ہیں۔"

"جی جی تو الجھن والی بات ہے۔" شاکر علی کے چہرے

پر پچھاری سے لبریز مسکراہٹ تھی۔ "مجھے اپنے اسکول کے

زمانے میں وہ بالکل بھی اچھے نہیں لگے اور چونکہ میرا شمار ہمیشہ

سے ہی ریاستی کے پھسڑی طالب علموں میں ہوا کرتا تھا تو ماسٹر

صاحب بھی مجھے کچھ خاص پسند نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اکثر میں

ان کے زیرِ عتاب رہا کرتا۔"

"اوہ!"

"جی پروفیسر صاحب! مجھے یہ خواب گزشتہ کئی سالوں

سے مسلسل آرہے تھے مگر پچھلے کچھ پانچ چھ ماہ سے آنے

بالکل بند ہو گئے ہیں۔"

"انٹرنٹنگ۔" پروفیسر مجید، شاکر علی کے سر کے اوپر خلا

میں گھورتے ہوئے دھیرے سے بڑبڑایا۔ پھر جیسے اچانک کوئی

سرا ہاتھ آ گیا ہو، شاکر علی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

بولا۔ "اچھا جب وہ اپنی تحریک کے سبب مشہور ہو گئے تو کیا

آپ نے بھی ان سے ملنے کی کوشش کی۔"

"جی بھی نہیں۔"

"وہ کیوں بھلا؟"

"جی وہ! میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میں ان کا ایک

تالاق سا شاگرد تھا۔ کئی موقعوں پر ان کی جھاڑیں اور

جھانپڑیں دونوں ہی کھا چکا ہوں تو بھلا کیا منہ لے کر جاتا۔

ہاں البتہ ان کی تحریک کے لیے باقاعدگی کے ساتھ چندے کی

ایک بڑی رقم کا چیک اپنی کمپنی کی معرفت ضرور ارسال کرتا

ہوں۔"

"ارے! مگر ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ آپ ان کو

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

کی آنکھوں میں ایک عجیب سی ویرانی تھی۔ پھر وہ اندھے کنویں سے آتی ڈوبی ڈوبی آواز میں بولا۔ ”جی۔ جی۔ جی! جی کچھ خاص اچھے نہیں!“

”آپ اس بات کی کچھ وضاحت کرنا پسند کریں گے؟“

”پروفیسر صاحب، میرے والد شروع سے ہی ایک بہت ایماندار اور اصول پسند انسان تھے۔ تمام عمر اعلیٰ سرکاری عہدوں پر کام کرتے رہے۔ ان کے دوسرے ساتھی افسران گاڑیاں، بنگلے، بیٹک بیلنس بناتے رہے۔ اپنی اولادوں کو بڑے بڑے بزنس کروادئے یا اعلیٰ تعلیم کے نام پر بیرون ملک بھیجا کر انہیں وہیں سیٹل کروادیا۔ سارے نھیال اور دوھیال میں ہمارا ہی واحد گھر تھا جہاں ہمیشہ پیسے کی تنگی رہی۔ خاندان میں کم وبیش ہر کسی نے چھوٹی موٹی ملازمت سے ہی آغاز کیا۔ کبھی ہم سنتے کسی نے اپنا کاروبار شروع کر لیا تو کوئی بیرون ملک چلا گیا۔ ابو بہت پڑھے لکھے ذہین آدمی تھے۔ انہوں نے تو اپنی ملازمت کا آغاز ہی افسری سے کیا تھا۔ خاندان کے دوسرے مرد جو تعلیم و ذہانت میں کسی طور ابو کے پاسنگ بھی نہ تھے، ترقی پہ ترقی کرتے کہیں کے کہیں جا پہنچے۔ مگر ابو معیشت کی دوڑ میں وہیں کے وہیں کھڑے رہ گئے۔ لوگوں نے ان کو بہتیرا سمجھایا کہ بھی فخر علی دیکھو زمانہ قیامت کی چال چل کر کہیں کا کہیں پہنچ گیا اور تم نے ایمان داری اور اصول پرستی کو اپنی راہ کی دیوار بنا رکھا ہے۔ اگر اوپر کی کمائی نہیں کرنا چاہتے تو کوئی کاروبار وغیرہ ہی کر لو۔ مگر ابو نے نہ تو کبھی اوپر کی کمائی کو ہاتھ لگایا اور نہ ہی کبھی کاروبار کرنے کا سوچا۔ وہ کہتے کہ میں کاروباری ذہنیت کا آدمی ہی نہیں۔ میں ٹھہرا دو اور دو چار کے اصول والا اور کاروبار میں تو وہی کامیاب ہو سکتا ہے جو دو اور دو بائیس کرنا جانتا ہو۔ مجھ سے تو کاروبار نہ ہوگا۔ ہم دو بھائی اور ایک بہن ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ہم تینوں بہن بھائی خاندان میں ہونے والی ہر تقریب میں اپنے کزنوں اور دیگر رشتے دار بچوں سے کٹے کٹے سے رہتے۔ وہ سب شہر کے بڑے اور مہنگے ترین اسکولوں میں جاتے، بڑے بڑے گھروں میں رہتے۔ ہر تقریب میں ایک سے بڑھ کر ایک نئے اور قیمتی کپڑے پہن کر گاڑیوں میں سوار ہو کر آتے جبکہ ہم وہی ہمیشہ خاص خاص تقاریب کے لیے سنبھال کر رکھے گئے کپڑوں میں ابو اور امی کے ہمراہ بسوں اور اگر بہت ہو گیا تو رکشا ٹیکسی میں دھکے کھاتے پہنچتے کیونکہ ابو دفتر کی گاڑی نجی استعمال میں لانے کو حرام سمجھتے تھے۔“

شا کر علی جو کسی زامی کی طرح آنکھیں بنا جھپکائے، ہوا میں گھورتا بس بولے چلا جا رہا تھا ایک لٹکے رکھا اور میز پر رکھے پانی کے گلاس کو اٹھا کر ایک ہی گھونٹ میں آدھا خالی کر کے واپس رکھ دیا اور پھر ایک گہری سانس لے کر دوبارہ بولنے لگا۔

”میرے والد سیلف میڈ اور ایک سفید پوش گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ میرے دادا کثیر العیال ہونے کے سبب اپنی اولاد کو بہت زیادہ تعلیم نہ دلوا سکے۔ مگر ابو کو تعلیم حاصل کرنے کا ایک جنون سا تھا۔ نویں جماعت سے ہی کام کرنا شروع کر دیا۔ بہتر سے بہتر تعلیمی نتائج کے حصول کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ تعلیم اور کام کا سلسلہ ساتھ ساتھ جاری رہا۔ بمشکل کوئی چند گھنٹے ہی سوتے۔ سارا سارا دن کام کرتے اور پھر شام کو کالج اور پھر یونیورسٹی جاتے۔ رات دیر گئے تک کبھی اپنے کسی دوست کے گھر تو کبھی گھر پر اپنا ذاتی کمراتہ ہونے کے سبب کچن میں ہی گرمی سردی کی پرواہ کیے بغیر پڑھائی کرتے۔ تعلیمی مدارج طے کرتے کرتے بالآخر مقابلے کے امتحان میں جا بیٹھے اور کامیاب ہو کر اعلیٰ سرکاری افسر بن گئے۔ مگر چونکہ ایمانداری کا بھوت سوار تھا تو کبھی کسی ایک محکمہ میں جم کر کام نہ کر سکے اور یکے بعد دیگرے ان کے تبادلے ہوتے رہے اور اپنے اعلیٰ افسران کی گڈ بکس میں نہ ہونے کے سبب مزید ترقی بھی نہ کر سکے۔“

”اچھا تو ان سب باتوں کے سبب آپ اپنے والد کو پسند نہیں کرتے؟“ پروفیسر مجید نے اس وقفے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

یہ تو مجھے خود بھی نہیں معلوم۔ ہاں مگر اتنا ضرور ہے کہ ہم دونوں کے درمیان ہمیشہ سے ہی ایک سرد مہری رہی۔ کئی بار میں ابو سے ان باتوں کے سبب الجھ بھی پڑتا۔

”کیا کبھی آپ کے والد نے اس سبب آپ پر ہاتھ بھی اٹھایا؟“ پروفیسر مجید نے سپاٹ لہجے میں دریافت کیا۔

”جہیں کبھی نہیں، ابو اس معاملے میں روایتی باپ کبھی نہیں رہے۔ ہاں وہ میری باتوں پر اکثر تلخ ضرور ہو جایا کرتے مگر انہوں نے مجھ پر یا میرے کسی دوسرے بہن بھائی پر کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا۔“

اتنا کہہ کر شا کر علی ایک لٹکے رکھا۔ اس کے بھینچے ہوئے ہونٹوں پر ایک ہلکا اداس سا تبسم ابھرا۔ پھر سوچ میں ڈوبی ہوئی آنکھوں پر زور ڈالتے ہوئے اس نے اپنے ہونٹوں کو مزید سختی سے بھینچ لیا جیسے اسے کوئی ایسی پرانی بات یاد آگئی ہو جس کا

ملاں اسے اب بھی ہوا اور وہ نہ چاہتا ہو کہ اس کے ہونٹ کھلیں اور وہ بات باہر نکل پڑے۔ پھر اپنے بچنے ہوئے ہونٹوں کو دھیرے سے کھولتے ہوئے بولنا شروع کیا۔ ”ایک بار جب میں کالج کے سکیئنڈ ایئر میں تھا۔ میں نے کاروبار کے سلسلے میں ان سے مدد اور سفارش کے لیے کہا۔ انہوں نے یہ کہتے ہوئے اپنی چیک بک میرے ہاتھ میں تمہادی کہ میاں یہ میری عمر بھر کی وہ بھوڑی بہت جمع پونجی ہے جو میں نے تم بہن بھائیوں کی تعلیم کے لیے پس انداز کر رکھی ہے۔ اس میں سے جو چاہو لے لو مگر میں اپنا نام، عہدہ اور تعلقات کے استعمال کی اجازت ہرگز نہیں دے سکتا۔ میرا جوان خون جوش میں آ گیا۔ میں نے چیک بک زور سے زمین پر شیخ دی اور چلا کر بولا کہ جائیں جا کے دیکھیں! والدین اپنی اولاد کی ترقی اور بہتر مستقبل کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے! ایک آپ ہیں۔! آج تک آپ نے ہمارے لیے کیا ہی کیا ہے؟ حیرت انگیز طور پر انہوں نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ بس ویران نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے جھکے اور فرش پر پڑی چیک بک اٹھالی۔ شاید اس روز ان کے اندر کوئی شے ٹوٹ سی گئی تھی۔ ان کی آنکھوں میں چھائی ویرانی دھیرے دھیرے ان کے سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لیتی چلی گئی۔ اس روز کے بعد ہم دونوں جب چادر کی بکلی مارا ایک دوسرے سے اتنا دور ہوتے چلے گئے کہ ایک ہی چھت تلے رہتے ہوئے بھی ہم پھر کسی موڑ، کسی راہ پر مل نہ پائے۔“

”بس شاکر صاحب، میرے سوالات چل ہوئے۔“

پروفیسر سوچ میں ڈوبی آنکھوں کے ساتھ دانتوں سے اپنے نچلے ہونٹ کو ایک جانب سے مسلتا ہوا بولا۔

”تو کیا آپ میرے خوابوں کی تہ تک پہنچ گئے؟“

”دیکھیں شاکر صاحب، ہمارا لاشعور ہمارے ہر کام، ہر مسئلے، ہر الجھن اور ہر پریشانی کا ہر لمحہ تجزیہ کرتا رہتا ہے۔ مگر ہمارے شعور کی طرح سے براہ راست ہم سے مخاطب نہیں ہو سکتا۔ لہذا خوابوں کے ذریعہ ہمیں کئی طرح کی باتیں کہہ لیں کہ اشارتاً ہمارے الجھے ہوئے معاملات کو سمجھنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔ چونکہ لاشعور کے کام کا طریقہ کار خود بہت پیچیدہ ہے تو فراہم کردہ کئی اشارت بھی اکثر پیچیدہ ہوا کرتے ہیں۔“

”آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میرے یہ سارے خواب دراصل میرے لاشعور کی جانب سے میری کسی الجھن کے حل کی طرف اشارے ہیں؟“ شاکر کے لہجے میں ایک بے یقینی سی تھی۔

”اچھا ایک بات اور بتائیں کہ ان سارے خوابوں

میں آپ نے خود کو کتنی عمر کا دیکھا؟“ پروفیسر نے شاکر کی بات کا جواب دئے بغیر ایک اور سوال کر دیا۔

”پیدائش سے لے کر لگ بھگ آٹھ دس برس کی عمر تک کا۔“ شاکر علی اپنی آنکھیں سکیڑ کر سوچتے ہوئے بولا۔

”جبکہ آپ کا کہنا ہے کہ ماسٹر حیدر بخش آپ کے استاد چھٹی سے میٹرک تک کی جماعتوں کے دوران ہی رہے۔ لہذا یہ تو کسی طور بھی ممکن نہیں کہ... وہ آپ کو نوزائیدگی کے دوران پالنے میں لیٹے اور دو برس کنسنی میں پلے گراؤنڈ اور پارکوں میں کھلیتا دیکھتے رہے ہوں۔ تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ شخص کون ہے جو ان سارے مراحل کے دوران نہ صرف آپ کو دیکھتا رہا بلکہ اس کے دیکھنے میں ایک خاص محبت و شفقت بھی تھی؟“ پروفیسر مجید نے بھرپور معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ شاکر علی کی طرف دیکھا۔

شاکر علی کے چہرے پر ایک لمحہ سوچ کی گہری لکیریں ابھریں مگر پھر وہ ساری لکیریں تیزی سے پھیلتی آنکھوں میں ڈوبتی چلی گئیں جہاں اب اچانک بے یقینی و حیرت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر نظر آ رہا تھا۔ ”مم! میرے...!۔۔۔!۔۔! شاکر علی لڑکھڑاتے لہجے میں فقط اتنا ہی کہہ سکا۔

”جی ہاں سو فیصدی درست۔“ پروفیسر کی معنی خیز مسکراہٹ اب ایک مطمئن سے تبسم میں ڈھل گئی۔ دراصل آپ کی زندگی میں آپ کے والد اور ماسٹر حیدر بخش کی نوعیت کم و بیش ایک ہی رہی ہے۔ دونوں آپ کو اپنے سخت اصولوں کے سبب ناپسند ہے۔ ماسٹر حیدر بخش سے تو ذہنی طور پر آپ نے کسی تا کسی طور سمجھوتا کر لیا مگر اپنے ابو سے سمجھوتا نہ کر پائے۔ حالانکہ لاشعوری طور پر آپ اپنے ابو سے بے حد محبت کرتے ہیں مگر شعوری طور پر کبھی نہ تو اس بات کا اقرار کیا اور نہ ہی ادراک۔ یہ سارے خواب آپ کے لاشعور کی طرف سے آپ کو اشارہ ہیں کہ جس طرح ماسٹر حیدر بخش جنہیں آپ ایک وقت میں بالکل پسند نہیں کرتے تھے تا صرف ان کے معتقد ہو گئے بلکہ متاثر ہو کر انہیں باقاعدگی سے چندے کی رقم بھی بھجوانے لگے۔ تو آپ کی زندگی میں آپ کے والد کا بھی ایک اہم مقام و کردار ہے۔ ان ہی کی کوششوں، محبتوں، شفقتوں کے سبب آپ وہاں پہنچنے میں کامیاب ہو پائے ہیں ماشاء اللہ جہاں آج آپ ہیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ آپ اس بات کو جانتے ہوئے بھی نہ جانتیں اور مانتے ہوئے بھی نہ مانتیں!“

شاکر علی، پروفیسر مجید کی باتیں یوں سن رہا تھا جیسے کسی

جید عالم دین کا کوئی سرید کسی محفل میں بیٹھا اس کا کوئی ایسا وعظ سن رہا ہوں جسے سن کر اس کی روح کا پور پور بھیگ رہا ہو اور اس نمناک روح کی نمی آنکھوں کے راستے زار و قطار بہتی چلی جا رہی ہو۔

”دیکھیں شاکر صاحب، میں آپ کی کیفیت کو بہت اچھی طرح سے سمجھ سکتا ہوں۔“ پروفیسر مجید نے میز پر رکھے ٹشو پیپر کے باکس میں سے ایک ساتھ بہت سارے ٹشو نکال کر شاکر علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ وہ ٹشو شاکر علی نے جھپٹ کر اپنی چھم چھم برستی آنکھوں سے یوں لگا کر سر جھکا لیا کہ جیسے وہ ٹشو پیرز نہ ہوں کوئی مقدس اوراق ہوں۔

”میں سمجھ سکتا ہوں کہ یہ سب آپ کے لیے بہت مشکل ہے۔“ پروفیسر مجید ہمدردانہ لہجے میں مخاطب ہوا۔ ”مگر آپ ایک بار اپنے ابو کے قریب تو جا کر دیکھیں، وہ آپ کو فوراً اپنے گلے سے لگا لیں گے۔ بس ذرا اپنی انا کے خول سے باہر آنے کی ضرورت ہے۔ یہ کام اتنا بھی مشکل نہیں جتنا آپ سمجھ رہے ہیں۔“

”پروفیسر صاحب بات انا کی نہیں۔“ شاکر علی بھرتائی ہوئی آواز میں سر جھکائے ہوئے اس بولا۔

”تو پھر اور کیا بات ہے؟“

شاکر علی نے اپنا سر اٹھایا تو پروفیسر مجید نے دیکھا کہ اس کی سرخ متورم آنکھوں میں کرب کا ایک سمندر لہرا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں پروفیسر مجید کو اس لمحہ شاکر علی پر بہت ترس آیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ آگے بڑھ کر شاکر علی کو گلے سے لگا کر اسے دلا سہ دے اور کہے کہ کوئی بات نہیں شاکر علی، ہمت سے کام لو۔ ہم سب انسان ہی تو ہیں۔ غلطیاں انسانوں ہی سے ہوا کرتی ہیں اور خیر یہ کوئی اتنی بڑی غلطی بھی نہیں کہ جس کا مداوانہ ہو سکے۔ ایک بار اپنے باپ کے گلے لگ کر تو دیکھو۔ سینے میں چھپا سارے کا سارا پچھتاوا تمہارا باپ اپنی چھاتی میں تاسمو لے تو!

ابھی پروفیسر اتنا ہی سوچ پایا تھا کہ اچانک شاکر علی کے ہونٹ یوں پھڑ پھڑائے جیسے کسی آتش فشاں کا دھانہ کھلنے سے قبل لرز رہا ہو۔ پھر ان پھڑ پھڑاتے ہونٹوں سے بیجان لہجے میں ایک انجان سی آواز برآمد ہوئی۔

”پروفیسر صاحب! آج سے کوئی پچھ ماہ قبل میرے ابو انتقال کر گئے!“

☆.....☆

شاکر علی کے ساتھ جو کچھ ہوا یہ کیا ہے۔ اس سوال پر ہے۔“

جب ہم غور کرتے ہیں تو جواب ملتا ہے کہ خوابوں کے بے شمار پہلو ہیں۔ بے شمار کیفیات ہیں۔ ایک امریکی ماہر نفسیات کا یہ کہنا ہے کہ خواب دراصل آپ کے اپنے وہ خط ہوتے ہیں جو آپ اپنے آپ کو بھیجتے ہیں۔ جس کا ذکر اوپر بھی ہوا ہے۔ اگر آپ ان خطوں کو پڑھنا سیکھ لیں تو بہت سی حقیقتیں واضح اور روشن ہو جائیں گی۔ بہت سے ابہام کھل جائیں گے۔

ہم نے اس موضوع کو کئی حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ جن کو آپ ذیلی موضوعات سمجھ لیں۔

جیسے نیند کیا ہے؟

خواب کیا ہیں؟

دنیا کے لٹریچر میں خوابوں کا عمل۔

خواب اور روحانیت، منتشر اور سچے خواب۔

تکلف قدیم اور جدید تہذیبوں میں خوابوں کا تصور۔

ہم خواب کیوں دیکھیں۔ خوابوں کی تعبیر وغیرہ۔

ان میں سے ہر موضوع اپنی جگہ بہت وسیع ہے۔ میں نے خوابوں کے اس سلسلے میں دن کے خوابوں کی بات نہیں کی ہے۔ انہیں میں نے شیخ چلی کے لیے رہنے دیا ہے حالانکہ کیتھارلس کے لیے وہ بھی ضروری ہیں۔

ہمارا موضوع وہ خواب ہیں جو ہمیں اس وقت دکھائی دیتے ہیں جب ہمارا شعور سوچکا ہوتا ہے اور لا شعور اپنی ورکنگ شروع کر دیتا ہے۔

لیکن اس سے پہلے کہ ہم خوابوں پر جائیں، نیند کی مختلف کیفیات کا جائزہ بہت ضروری ہے۔ کیونکہ ہمارے خواب ہماری نیند سے مشروط ہیں۔

بلاشبہ نیند خدا کی عظیم ترین نعمتوں میں سے ایک ہے۔ آپ ذرا ان کے پاس جائیں جنہیں نیند نہیں آتی، جو بے خوابی Insomnia کے مریض ہیں۔

انہیں نیند کے لیے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں۔ خواب آور گولیوں سے لے کر سیلف ہینا لیس تک۔ ساری رات کروٹیں لیتے ہوئے گزر جاتی ہے۔

پُرسکون، بے فکری اور بے نیازی کی نیند درویشوں کے یہاں پائی جاتی ہے۔

ایک سرمائے دار کو مزدور پر اس وقت رشک آتا ہے جب وہ مزدور کو ایشیوں کا ٹکیہ بنا کر سویا ہوا دیکھ لیتا ہے۔

فرنیکلین نے کہا تھا کہ ”تھکن سب سے بہتر ٹکیہ

سے ممکن ہو جاتا ہے۔ یہ پیمائش جس مشین سے کی جاتی ہے اسے Eeg-Electro Enfeslograf کا نام دیا گیا ہے۔
Downloaded from paksociety.com
لوگوں کے سروں پر الیکٹروڈز لگا کر دماغی عمل کا ریکارڈ حاصل کرتے ہیں۔

اب ذرا مختلف کیفیات بھی دیکھ لیں۔
شروع شروع میں جب کوئی آدمی سویا اور آدھا جاگا ہوا ہو تو اس مشین میں ایک متوازن لہر کی ریڈنگ آتی ہے۔ اس کو الفاروہم کا نام دیا گیا ہے۔ یہ ایک ہلکی نیند ہوتی ہے۔ اس میں فون کی گھنٹی یا کوئی آہٹ فوراً بے دار کر دیتی ہے۔
اس پہلے اسٹیج کے بعد دماغ غشی کے دوسرے دور میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے بعد آخر میں آدنی گہری نیند میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اب جو لہریں ہوتی ہیں وہ طویل اور گہری ہوتی ہیں۔ ان کو ڈیلٹا ویوز کہا جاتا ہے۔ ان لہروں کی وضع ایک تسلسل کے ساتھ تیز تر ہوتی ہے۔ اس حالت کو آرتھ ڈرکس سلیپ Ortuodox Sleep کہا جاتا ہے۔

نیند کی ایک اور سطح بھی ہوتی ہے جس کو ظاہری نیند کہا گیا ہے یعنی ہیراڈاکسیک سلیپ۔
1950ء کے آخر میں ڈاکٹر Nathanial نے تجربات کے ذریعے نیند اور خوابوں کے مطالعے سے کئی اہم انکشافات کیے۔

پتا چلا کہ لوگ نیند کے کئی وقتوں سے گزرتے ہیں۔ جب ایک گہری نیند کا عرصہ گزر جاتا ہے تو پھر نسبتاً کم گہری یا پایاب نیند شروع ہوتی ہے۔

وہ سو رہے ہوتے ہیں لیکن ان کی آنکھیں حلقوں میں جنبش کرتی رہتی ہیں اوپر نیچے اور دائیں بائیں۔ اگرچہ ان کی پلکیں بند ہوتی ہیں۔

اس عمل کو Rem کا نام دیا گیا ہے۔ یعنی Rapideyes Movement۔ اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب انسان خواب دیکھتا ہے۔ اگر اس دوران اسے اٹھا دیا جائے تو سترنی صد کو اپنے خواب یاد رہ جاتے ہیں۔

آپ نے سنا ہوگا کہ صبح کے خواب یاد رہ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بے دار ہونے سے پہلے زیم کا عمل تیز ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد شروع ہوتے ہیں خوابوں کے مراحل۔ خوابوں سے پہلے نیند کے مراحل سے گزرنا ضروری تھا۔

نظام گڑبڑ ہو جاتا ہے۔ اس کا تجربہ لوگوں کو ہوا کرتا ہے جو جہاز سے سفر کر کے ایک براعظم سے دوسرے براعظم میں جاتے ہیں۔ اس وقت ان کا یہ ردہم ڈسٹرب ہو جاتا ہے اور اسے سیٹ ہونے میں کئی دن لگ جاتے ہیں۔

یاد وہ لوگ جو مسلسل رات کی ملازمت کرتے ہیں ان کے ساتھ بھی یہی ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ جو کچھ بھی کر رہے ہیں وہ قانون فطرت کے خلاف ہے۔ خدا نے رات اور دن کی تقسیم اس لیے کی ہے کہ دن کام کے لیے اور رات آرام کے لیے۔

اس سلسلے میں سورہ انعام کی یہ آیت قابل غور ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے۔ وہی اللہ پر وہ شب کو چاک کر کے صبح نکالتا ہے۔ اس نے رات کو سکون کا وقت بنایا ہے۔ اس نے چاند اور سورج کے طلوع اور غروب کا حساب مقرر کیا ہے۔

تو پتا یہ چلا کہ دن ہمیں کام کی تلقین کرتا ہے اور رات ہمیں آرام کا مشورہ دیتی ہے۔ یہ سارے عناصر ایک دوسرے سے الگ الگ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے منسلک بھی ہیں اور نصرت انسان کے لیے ایک دوسرے سے تعاون بھی کر رہے ہیں۔

سورہ نحل میں ارشاد ہوا۔ "اس نے تمہاری بھلائی کے لیے رات اور دن کے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے۔ ہندوؤں کی مقدس کتاب رگ وید کا اشلوک ہے۔ "اس نے دن اور رات بنائے۔"

ہم نیند کی بات کر رہے ہیں۔ قرآن شریف میں اصحاب کہف کی نیند کا پورا حال بیان کیا گیا ہے۔ یہ سات وہ لوگ تھے جنہیں ان کے کتے کے ساتھ سلا دیا گیا ہے۔ اب ہم اس نیند کی طرف آتے ہیں جس کو طبی یا میڈیکل نیند کہتے ہیں۔

جب آپ سو جاتے ہیں تو اس حالت میں جسم میں کئی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ جیسے نبض اور دل کی رفتار کا مدہم ہو جانا۔ جسم کے درجہ حرارت کا کم ہو جانا۔ یا نظام ہضم کا ست پڑ جانا وغیرہ۔

سونے کے ساتھ ہی آپ کے لاشعور کی ورکنگ شروع ہو جاتی ہے اور خواب دیکھنے کا پروسس شروع ہوتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آپ کی نیند کیسی ہے۔ دماغی کیفیات کیا ہیں۔

نیند کے دوران ذہن کی کیفیت کا معاملہ۔ مطالعہ خواب کے نکتہ نظر سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ سائنس دانوں نے معلوم کیا ہے کہ دماغی عمل کی پیمائش برقی محرکات کی پیمائش

آ کے خواب میں۔ جاگے تھے سخت خفتہ تمنا کے خواب میں۔“
محبوب جورات کو شاعر کے پہلو میں آ کر سو گیا تو شاعر کا
نصیب جاگ اٹھا۔ یہاں فرائڈ کے اس اصول کا اطلاق ہوتا
ہے کہ بعض خوابوں کے پیچھے آدمی کی نامکمل جنسی خواہش کی
تکمیل کا جذبہ ہوتا ہے۔

اب دوسرا شعر دیکھیں۔ آنکھوں کو بند کر کے وہیں
کھول دیں گرہیں۔ یوسف کناں کے مجھ تماشا کے خواب
میں۔

مجھ خواب شخص کے دماغ کے سوائے ہوئے حصے میں
کسی بھی قسم کی صورت نمودار ہو سکتی ہے۔ لیکن جس کو دیکھنے کی
آرزو انسان کے لاشعور میں ادبی ہو۔ وہ صرف اس کو دیکھنا پسند
کرتا ہے کسی اور کا نظارہ اسے پسند نہیں ہے۔ چاہے وہ یوسف
جیسا حسین ذہن ہی کیوں نہ ہو۔

اب خواب کی ایک اور قسم۔ ”کابوس میں بتاتے مجھے
راہ تو رشک ہے۔ کاش اور کوئی آئے اطبا کے خواب میں۔“

پہلے تو کابوس کو دیکھیں۔ کابوس ایک ایسا مرض ہے جس
میں دماغ میں رطوبت کی کثرت کی وجہ سے آدمی خواب میں
خونناک مناظر دیکھتا ہے۔ پھر مختلف حرکتیں کرتا ہے اور ڈر جاتا
ہے۔

تو شاعر کا یہ کہنا ہے کہ محبوب جب میرے خواب میں
آتا ہے تو میری کیفیت عجیب ہو جاتی ہے اور حکیم حضرات یہ
سمجھتے ہیں کہ میں کابوس کے مرض میں مبتلا ہوں۔ کاش میرے
محبوب جیسا کوئی ان حکیموں کے خوابوں میں آئے تو انہیں پتا
چل جائے۔

اب ایک خواب اور دیکھیں۔ ایک نرم و نازک اور کوئل
کی لڑکی کا خواب۔ جو اس بے رحم معاشرے میں جینے کے لیے
خوابوں کا سہارا ڈھونڈ رہی ہے اور خواب اسے آسودہ کرتے
رہتے ہیں۔

”دھنک دھنک مری پوروں کے عذاب کر دے گا۔ وہ
لس میرے بدن کو گلاب کر دے گا۔“

شیکسپیر نے بھی خوابوں سے بہت کام لیا ہے۔ خواب
اس کے یہاں ایک مستقل علامت کے طور پر ہیں۔ اس کے
مشہور ڈرامے جو لیس سینئر میں سینئر کی بیوی کے ایک خواب کا

خوابوں تک پہنچنا آسان نہیں ہے۔ آپ یہ دیکھیں کہ
اس سے پہلے کیسے کیسے مراحل آئے ہیں۔ آرام وہ بستر،
پرسکون ذہن، ڈپریشن اور ٹینشن سے پاک وغیرہ۔
دام پر موح میں ہے حلقہ صد کام فیسنگ۔ دیکھیں کیا
گزرے ہے قطرے پر گہر ہونے تک۔

ابھی ہم براہ راست خوابوں تک نہیں جا رہے۔ بلکہ ہم
خوابوں کے سماجی، نفسیاتی، ادبی، جنسی اور مذہبی محرکات کا
جائزہ لے رہے ہیں۔

خواب بنی کا عمل نیند کے طبعی عمل سے جڑا ہوا ہے۔ دنیا
بھر کے ادب میں خوابوں کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔

ادیب اور شاعر چونکہ بہت حساس ہوتے ہیں۔ اس
لیے ان کے خوابوں میں زندگی کا ہر پہلو موجود ہوتا ہے۔ ان
لوگوں نے خوابوں کے حوالے سے اپنے آپ کو اور زندگی کو
سمجھنے کی بہت کوششیں کی ہیں۔

قافی کا مشہور شعر ہے۔ ”اک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے
کا۔ زندگی کا ہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا۔“

ایک تو زندگی اتنی الجھی ہوئی ہے۔ پھر خواب اور وہ بھی
دیوانے کا خواب۔ شاعر کو شہری اور کاسیانی دونوں سے واسطہ
پڑتا ہے۔ کچھ خواب اسے ماضی کی تکلیفوں کی یاد دلاتے ہیں۔
وہ ایسے خوابوں کو اپنی یادداشت کی تجوری میں نہیں رکھنا چاہتا۔

جاں نثار اختر نے کہا تھا۔ ”اسی سبب سے شاید عذاب
جتنے ہیں۔ جھٹک کے پھینک دو پلکوں پہ خواب جتنے ہیں۔“

خواب دل کش بھی ہوتے ہیں اور پریشان کرنے
والے بھی۔ خوابوں میں دل کشی عام طور پر ایوٹن یا فریب نظر
کی وجہ سے آتی ہے۔

سگمنڈ فرائڈ کا ایک مشہور قصہ ہے لیکن اس جملے سے
پہلے مومن کا ایک شعر سن لیں۔ اس کے بعد وہ جملہ سمجھ میں
آ جائے گا۔

وہ شعر ہے۔ ”وہ کہاں ساتھ سلاتے ہیں مجھے۔ خواب
کیا کیا نظر آتے ہیں مجھے۔“

اور وہ جملہ یہ ہے کہ خواب ہماری نا آسودہ خواہشات کی
تکمیل کا ذریعہ ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس جملے کے بعد مومن کا

یہ شعر واضح ہو گیا ہوگا۔

اب یہ دیکھیں کہ شاعروں کے خواب کیسی کیسی جہتی
گرہیں کھولتے ہیں۔

مومن ہی کا شعر ہے۔ ”شب وہ جو سو رہے مرے پاس

ذکر ہے۔ جس میں اس نے اپنے شوہر کو قتل ہوتے دیکھ لیا تھا۔
خوابوں کی یہ ایک اور قسم ہے۔ جن میں آنے والے
چند واقعات کا پتا چل جاتا ہے۔

نیوڈوروسٹووسکی کے مشہور ناول جرم و سزا کا ماحول
بھی خوابوں سے گندھا گیا ہے۔

اس طرح اور لاتعداد کہانیاں ہیں جن میں خواب اپنی
پوری توانائی اور جذبات کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔

فراق صاحب کا ایک خوب صورت شعر یاد آ رہا ہے۔
”ستارے جاگتے ہیں رات لٹ چھٹکائے سونی ہے۔ دے
پاؤں کس نے آ کے خواب زندگی بدلا۔“

یہ تھے خوابوں کے کچھ ادبی پہلو۔ ہم نے یہ دیکھا کہ
شاعروں کے پاس نہ صرف خواب دیکھنے کی صلاحیت ہے بلکہ
وہ اس کے مناسب اظہار کا قرینہ بھی جانتے ہیں۔

خوابوں کا ایک اور مفہوم ایک اور پہلو خواہش بھی ہے۔
تعمیری اور مثبت خواہش۔ جسے علامہ اقبال نے خوابوں کو ایک
زبردست قوت عمل اور جدوجہد سے تشبیہ دی ہے۔

”ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے۔ نسل کے
ساحل سے لے کر تباہ خاک کا شغریہ۔“

تو یہ کیا ہے۔ ایک زبردست خواہش۔ علامہ اقبال کی
تعمیر، والدہ محترمہ کی یاد میں، تاریخی کا خواب وغیرہ۔ یہ
سب اعلیٰ ترین خوابوں کی اعلیٰ ترین مثالیں ہیں۔

علامہ اقبال بھی فرماتے ہیں۔ ”ہے دید کا جو شوق تو
آنکھوں کو بند کر۔ ہے دیکھنا ہمیں کہ نہ دیکھا کرے کوئی۔“

میں خواہش اور تمنا کے حوالے سے ایک تقریر کا ذکر کرنا
چاہوں گا۔ یہ تقریر اگست 1928ء میں جونیئر مارٹن لوٹھر کنگ
نے کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی یہ تقریر ادب کا شاہکار ہے۔

اس نے کہا تھا۔ ”میں خواب دیکھتا ہوں کہ کھیتوں میں کام
کرنے والے سیاہ قام غلام کسان اپنے گورے آقاؤں کے
ساتھ بیٹھ کر ایک ہی دسترخوان پر کھا رہے ہیں۔“

تو یہ اس کی خواہش تھی جس کو اس نے خواب کا نام دیا
تھا۔ شاید مارٹن لوٹھر کو معلوم نہیں تھا کہ اس قسم کا عملی مظاہرہ
حضور اور ان کے ساتھیوں کے زمانوں میں ہو چکا ہے۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز۔ نہ کوئی بندہ
رہا نہ کوئی بندہ نواز۔

خوابوں کے حوالے سے ایک بات بہت اہم ہے کہ
خواب مایوس نہیں ہونے دیتے۔ امیدوں کی شمعیں روشن
رکتے ہیں۔

غریب ترین شخص بھی خود کو بادشاہ بنا ہوا ضرور دیکھتا
ہے۔ ایسے خواب اس کی نا آسودہ خواہشات کی تکمیل کر رہے
ہیں۔

یہ اور بات ہے کہ بے داری کے بعد زندگی اور بھیا تک
اور دشوار محسوس ہو۔ آپ اندھیرے میں ماچس کی تیلی
جلائیں، تیلی کے جلتے ہی اچانک ذرا سی دیر کے لیے روشنی کا
ایک جھماکا سا ہوتا ہے اور تیلی کے بجھتے ہی اندھیرا اور گاڑھا
ہو جاتا ہے۔

جس کا خوشی ہے نام وہ قیمت نہ پوچھیے۔ رقص شرر کے
بعد کی ظلمت نہ پوچھیے۔

لیکن جیسے بھی خواب دیکھتے رہیں مایوس نہیں ہوتا ہے۔
یہ خواب ہی تو آگے بڑھنے کا شوق دلانے رہیں گے۔

یاد رکھیں کہ ایک امکان جب ختم ہوتا ہے تو اس وقت
فطرت دوسرے امکان کا دروازہ کھول دیتی ہے۔ سورج
غروب ہوتا ہے تو زمین چاند کا جھومرا اپنے ماتھے پر سجالتی
ہے۔

بات خوابوں کی ہو رہی ہے تو خواب تو ہمیشہ کے لیے
انسان کے لیے مہمار ہے ہیں۔ وہ ان کی گھنٹیاں سلجھانے کی
کوشش کرتا رہا ہے اور جب نہیں سلجھ سکیں تو خوابوں کو ایک
پراسرار عمل سمجھ لیا گیا۔ ”ہم جسے چھو نہ سکیں اس کو خدا کہتے
ہیں۔“

آئیے اب یہ دیکھتے ہیں کہ دنیا کی مختلف تہذیبوں نے
خوابوں کو کیا سمجھا ہے۔

میسوپوٹامیہ کے نظریات۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے
والے ہر شخص کو معلوم ہے کہ انسانی تاریخ میں میسوپوٹامیہ
تہذیب کی ایک اہمیت رہی ہے۔

انسان کی جانی ہوئی تہذیبوں میں میسوپوٹامیہ کے لوگ
کتنے ایڈوانس تھے اس کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ وہ
لوگ قبل از مسیح میں خوابوں پر ریسرچ کیا کرتے تھے۔

ان کے خوابوں میں بھی جنسی تشبیہات ہوا کرتیں۔ جن
کی وہ اپنے انداز سے تشریح کیا کرتے۔ مثال کے طور پر اگر
ایک شخص نے خود کو دیوار پر پیشاب کرتے ہوئے اس پیشاب
کو گزر گاہ پر پھلتے ہوئے دیکھا ہے۔ تو اس سے یہ مراد لی جاتی
تھی کہ اس کے گئی بچے ہوں گے۔

فرائڈ نے اڑنے والے خوابوں کو جنسی خوشی کا نمائندہ
بتایا ہے۔ لیکن میسوپوٹامیہ تہذیب کے افراد ایسے خوابوں کو
خوف یا موت کی علامت سمجھا کرتے تھے۔

اور لاشعور کی راہ پر بھی نہیں آئیں گے۔ منزل تو بہت دور کی بات ہے۔

چینیوں نے خوابوں میں نظر آنے والی تشبیہات اور علامات پر کئی کتابیں لکھ ڈالی تھیں۔ ان میں آئی چنگ نامی کتاب سب سے زیادہ مشہور ہے اور آج مغرب میں اس کتاب پر ریسرچ ہو رہی ہے۔

چینی ماہرین نے تعبیر بتانے والوں اور خواب دیکھنے والوں کی جسمانی حالت ان کی ذہنی کیفیت کے علاوہ موسم کی حالت کو بھی مد نظر رکھنا ہے۔ انہوں نے خوابوں کو کئی اقسام میں بانٹ دیا۔ یہ اقسام 500 قبل از مسیح کی ایک کتاب لیوزو میں درج ہیں۔

اب ایک اہم نظریہ بھی سن لیں۔ دیگر قدیم اقدام کی طرح چینی قوم کا ہی یہ نظریہ تھا اور یہ نظریہ آج بھی بہت سے لوگوں کا ہے۔ وہ نظریہ یہ تھا کہ نیند میں جسم کا ایک حصہ بھٹکتے رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جس سے اس شخص کو خوابوں کا تجربہ ہوتا ہے۔ اس لیے سونے والے کو بہت احتیاط سے آہستہ آہستہ اٹھایا جائے۔ کیوں کہ اس وقت اس کی روح آسٹریل پر ڈیجکشن میں بھٹک رہی ہوتی ہے۔

جسم کی مختلف حالتوں کو قدیم ہندوستانوں نے بھی محسوس کیا۔ انہوں نے یہ آئیڈیا دیا کہ جسم کے چار افعال ہوتے ہیں۔

(1) جاگی ہوئی کیفیت (2) خواب دیکھتی ہوئی کیفیت (3) بے خواب نیند کی کیفیت اور ایک چوتھی پراسرار حالت۔ وہ ہے بھگوان سے رابطے کی۔

ہندوستانی خوابوں کی ایک قدیم کتاب اتیروید بھی ہے۔ جو پندرہ سو سے ایک ہزار سال قبل مسیح سے تعلق رکھتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ خواب یوں ہی نہیں ہوتے۔ ان کا ایک موقع ہوا کرتا ہے۔

ان کے یہاں خوابوں کی دو اقسام تھیں۔

1۔ عام قسم کے خواب جو روز مرہ کی زندگی اور مشاہدوں سے تعلق رکھتے تھے اور نمبر 2 ایسے خواب جن کی کشادہ معریت ہوا کرتی۔

فرائڈ نے بتایا تھا کہ تلواری، کلہاڑی یا جھنڈا وغیرہ جنسی علامت ہیں۔ جب کہ ان کا خیال تھا کہ یہ مسرت کی علامت ہیں۔

آسمان سے سورج یا چاند کا گر جانا یا سمندر اور پہاڑوں

ان کا عقیدہ تھا کہ خواب بدروحوں یا آسیبوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی ایک دیوی ماسو ہوا کرتی جس سے وہ دعا کیا کرتے کہ ان کے خواب بھی پورے نہ ہوں۔

بائبل میں بائبل کے ایک بادشاہ کے خواب کا ذکر ہے۔ اس نے ایک زبردست تیزی سے پروان چڑھتے ہوئے ایک درخت کو دیکھا۔ پھر کسی نے اسے بددعا دی تو وہ سوکھ گیا۔ اس زمانے میں حضرت دانیال موجود تھے۔ وہ خوابوں کے مفسر کے طور پر مشہور تھے۔ انہوں نے بتایا کہ تمہارا خواب تمہاری دیوانگی کی علامت ہے۔

بائبل میں لکھا ہے کہ ایک سال بعد بادشاہ پاگل ہو کر مر گیا تھا۔

یہ خواب مشہور ماہر نفسیات یونگ کے اس نظریے کی تائید کرتا ہے کہ خواب اپنی ہی ذات کا عکس ہوتے ہیں۔ جس طرح درخت بادشاہ کے ذہن کی علامت تھا۔

مصریوں نے بھی خوابوں میں بہت دلچسپی لی تھی۔ ان کے یہاں خوابوں کے حوالے سے بہت کچھ تھا۔ وہ خوابوں کی جڑیں تلاش کرتے پھرتے تھے۔

Old testament خوابوں کی کہانیوں سے بھرا ہوا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور اس مشہور فرعون کا خواب ہے۔

اس نے سات موٹی اور تازی گائیں دیکھیں۔ پھر سات سوکھی اور بد صورت گائیں دیکھیں۔ جس کی تعبیر حضرت یوسف نے بتائی تھی کہ سات برسوں تک خوب غلہ ہوگا۔ اس کے بعد سات برسوں کے لیے قحط پڑ جائے گا۔

خواب کے لیے جو مصری لفظ آتا ہے اس کے معنی ہی جھکائے رکھنا۔ یہ لفظ بتاتا ہے کہ قدیم مصر کے لوگ خوابوں کو ایک ایسے عمل سے تعبیر کرتے تھے جس کی بدولت اندھیرے میں پوشیدہ چیزوں کو جاننا اور دیکھنا ممکن تھا۔

خواب کے پیغامات پر ان کا اتنا گہرا عقیدہ تھا کہ مندر کے برابر میں ایک کمرہ ہوا کرتا۔ جس میں خوابوں کی تعبیر بتانے والے ہوا کرتے تھے۔ لوگ ان سے خوابوں کی تعبیر معلوم کیا کرتے اور وہ معاوضہ لے کر تعبیر بتا دیتے تھے۔

چینیوں اور ہندوستانوں نے خوابوں کی تعبیر اور ان کی توجیہ پر اتنی دسترس حاصل کر لی تھی کہ ان کے بہت سے نظریات آج درست سمجھے جا رہے ہیں۔

چینی ماہرین اس دور میں انسانی شعور کے درمیان فرق قائم کر چکے تھے۔ جب کہ مغربی ماہرین نفسیات اب شعور

خواب کا ذکر کیا تو انہوں نے بیٹے کو منع کر دیا کہ تم اس خواب کا تذکرہ اسے بھائیوں سے مت کرنا۔ خدا تمہیں نبوت دے گا اور خوابوں کی تفسیر کا علم بھی عطا فرمائے گا۔

پھر فرعون کا خواب۔ جس میں اس نے سات دہلی پتلی اور سات موٹی تازی گائیں دیکھیں اور اس خواب کی تعبیر حضرت یوسف نے بیان فرمادی۔

اب ایک خواب حضرت عبداللہ بن مبارک کا ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ دو فرشتے ان کے کمرے میں بیٹھ کر کوئی حساب کتاب کر رہے ہیں۔

ان میں سے ایک نے کہا کہ اس سال چھ لاکھ آدمی حج میں شریک ہوئے تھے۔ ان میں سے صرف ایک آدمی کا حج قبول ہوا ہے اور وہ فلاں شہر کے فلاں محلے میں رہتا ہے اور بیٹے کے لحاظ سے موچی ہے۔ آپ اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ وہ موچی ملا۔ اس نے بتایا کہ وہ توج پر جا ہی نہیں سکا تھا۔ صرف اتنا ہوا تھا کہ اس نے حج کے لیے ساری زندگی جو کچھ جمع کیا تھا وہ اپنے ایک پڑوسی کو دے دی کیوں کہ اس کے یہاں کئی دنوں سے فاقے تھے اور وہ مردار کھا رہے تھے۔

حضرت عبداللہ بن مبارک نے اس کا ہاتھ چوم لیا اور فرمایا خدا کے بندے تیری یہی بات تو خدا کے حضور قبول ہوئی ہے۔ اور چھ لاکھ انسانوں میں سے اس سال صرف تجھ ہی کو حج کا ثواب ملا ہے۔

تو اس قسم کے خواب بھی ہوتے ہیں اور یہ خواب القایا الہام کا درجہ رکھتے ہیں اور عام طور پر کسی کو ایسے خواب اس وقت آتے ہیں جب روحانی طاقتیں اس شخص کو کسی عظیم الشان مرتبے کے لیے تیار کر رہی ہوتی ہیں۔

یعنی ایسے خواب اس کی ذہنی ٹریننگ اور قدرت کی پلاننگ کی وجہ سے آتے ہیں۔

آنحضرت کی حدیث مبارک ہے۔ ”آثار نبوت میں سے اب کوئی شے باقی نہیں رہی۔ سوائے بشارت کے۔“ صحابہ نے دریافت کیا۔ ”حضرت یہ بشارت کیا ہے؟“ تو آپ نے جواب دیا۔ ”سچے خواب جو مومن دیکھتا ہے۔“

اس لیے ایک موقع پر ارشاد فرمایا۔ ”مومن کا خواب نبوت کا چھیا لیسواں حصہ ہوتا ہے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اپنے خواب یا تو کسی ہمدرد اور مخلص دوست کے سامنے بیان کرو یا کسی وانا کے سامنے۔ یعنی ہر ایک سے اپنے خواب بیان نہ کیا کرو۔“

کے خواب خطرے اور خوف سے تعبیر کیے جاتے تھے۔

یونان اور روم کا قدیم دنیا میں خوابوں کو آنے والے دنوں کے آنے والے واقعات سے تشبیہ دی جاتی تھی۔ یہ مومن نے اپنی مشہور داستان ایلید میں بھی خوابوں کے حوالے سے بہت کچھ لکھا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ خوابوں کے ذریعے مرض کی صحیح تشخیص کر کے مریض کا علاج بھی کیا جاسکتا ہے۔

پوپ کریش نے بھی خوابوں کے حوالے سے ایک کتاب لکھی ہے جو کلاسیکی عہد کی باقی رہ جانے والی چند کتابوں میں سے ایک ہے۔

یہ وہی پوپ کریش ہے جس کے نام کی قسم کھائی جاتی تھی۔ Hipo cratic oath اور عام طور پر ڈاکٹر حضرات یہ قسم کھاتے تھے۔

افلاطون نے تشریح خواب کا جو نظریہ پیش کیا اس کی تائید فرائڈ نے بھی کی۔ وہ کہتا تھا کہ رات کو ہمارے اندر ایک وحشی جانور دوڑتا پھرتا ہے جب کہ Reason سویا ہوا ہوتا ہے۔

یہی وحشی جذبہ ہمارے اندر بیدار ہو کر ہمیں مختلف جرائم کی ترغیب دیتا ہے۔

قدیم دنیا کے خوابوں کے بارے میں سب سے پہلی تصنیف آرمیدورس کی تھی۔ اس شخص کا تعلق دوسری صدی عہد سے تھا۔ یہ شخص ساری زندگی خوابوں کے بارے میں مواد جمع کرتا رہتا تھا۔

آرمیدورس کی رائے اس حقیقت پر مبنی ہے کہ کئی خوابوں کی شبیہات جنسی عنصر کی حامل ہوتی ہیں۔ جیسے کھیت میں ہل چلانا، گھوڑا اور گاڑی وغیرہ۔ فرائڈ نے بھی اس کے کام اور تھیوریز کو آگے بڑھایا ہے۔

بہر حال جنسی تہذیبیں ہیں اتنے ہی نظریات ہیں۔

اب ہم آجاتے ہیں خوابوں کے اسلامی نظریات پر۔

دیکھتے ہیں قرآن اور احادیث سے ہمیں کیا رہنمائی ملتی ہے۔ کئی خوابوں کا ذکر قرآن میں بھی آیا ہے۔ جیسے حضرت ابراہیم کا وہ خواب جو مسلسل تین راتوں تک آتا رہا کہ اپنی سب سے عزیز شے کی قربانی دو۔ ظاہر ہے کہ نبی کا خواب سچا ہوتا ہے۔ اس لیے انہوں نے حضرت اسماعیل کی قربانی دینے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر حضرت یوسف کا وہ خواب جو انہوں نے اپنے بچپن میں دیکھا تھا کہ گیارہ ستارے اور چاند اور سورج ان کو سجدہ کر رہے ہیں۔

انہوں نے جب اپنے والد حضرت یعقوب سے اس

”آپ نے یہ بھی فرمایا کہ زیادہ سچا خواب صبح کے وقت کا ہوا کرتا ہے۔“

”پھر آپ نے برا خواب دیکھنے والے کے لیے نصیحت فرمائی... اگر ایسا خواب دیکھنے کے بعد آنکھ کھل جائے تو فوراً لاجول پڑھ کر تین دفعہ بائیں طرف تھکار دے۔ اس کے بعد دوسری کروٹ پر سو جائے۔“

حضرت علیؓ کا ارشاد ہے کہ اگر مومن کوئی خواب دیکھے یا کوئی اور مومن کو خواب میں دیکھے تو اس کی تعبیر جان لینا اس شخص پر لازم ہے تاکہ نیک خواب سے خوشی حاصل ہو اور برے خواب سے امان میں رہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا۔ ”خواب ایک حقیقت ہے۔ ایک خواب کے ذریعے حضورؐ کو نبوت کی بشارت اور جبرئیلؑ کی زیارت حاصل ہوئی تھی۔“

ابن خلدون نے کہا کہ جب نفس انسان جسمانی مصروفیات سے فارغ ہوتا ہے تو وہ روحانیت کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اس موقع پر خواب میں جو صورت حال پیش آتی ہے وہی روایات صادقہ ہے۔

ان ہی کا کہنا ہے کہ تمام انسانوں اور انبیاء کے خوابوں میں فرق کی وجہ انبیاء کی روحانی صلاحیت ہے۔

ایک اور خواب کا ذکر سن لیں۔ خلیفہ مہدی کو خواب آیا کہ اس کے پورے چہرے پر سیاہی پھیل گئی ہے۔ اس کی تعبیر کوئی نہ بتا سکا۔ حضرت ابراہیمؑ کرمانی نے تعبیر بیان فرمائی کہ خلیفہ کے یہاں لڑکی پیدا ہوگی۔

اس تعبیر کی تاویل انہوں نے قرآن کی آیت سے دی تھی۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ ”خواب میں بھی جب ان لوگوں کو لڑکی پیدا ہونے کی خوش خبری دی جاتی ہے تو ان کے چہرے پر غم کی سیاہی پھیل جاتی ہے۔“

سبحان اللہ، کیا لوگ تھے۔ بعد میں یہ خواب سچ ثابت ہوا تھا۔

خوابوں پر موسم، وقت، ماحول، صاحب خواب کی ذاتی زندگی، اس کے کردار، چاند کی تاریخوں وغیرہ کا بھی اثر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ خواب دیکھنے والے کی ذہنی کیفیت بھی دیکھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ رات کے وقت صاحب خواب نے کیا کھایا تھا۔

مثال کے طور پر اگر کوئی شخص سانپ، پھوپھا کسی سیاہ چیز کو دیکھ کر ڈر جائے تو اس کا مطلب ہے کہ اس نے رات کے وقت کوئی نیکل چیز کھائی تھی جو ہضم نہیں ہو سکی۔

اس لیے خواب کی تعبیر بتانے والے کو ان سب باتوں کا جاننا ضروری ہے اور اس لیے تاکید فرمائی گئی ہے کہ اپنے خواب ہر ایک سے بیان نہ کرو۔

اب یہ دیکھیں کہ مختلف اوقات کا خوابوں پر کیا اثر ہوتا ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ رات کے خواب کی تعبیر کچھ اور ہوتی ہے اور دن کے اسی خواب کی تعبیر کچھ اور ہوتی ہے۔

دن کا خواب رات کے خواب پر فضیلت رکھتا ہے۔ رات کے پہلے حصے کے خواب غیر معتبر (کیونکہ اس وقت وہ شخص اصفا لہروں کے تابع ہوتا ہے) اور نصف شب کے خواب پریشان کن اور صبح کے وقت جو خواب آئے وہ بڑی حد تک قابل اعتبار ہوتے ہیں۔

عام طور پر گہری رات کے خواب کی تعبیر پانچ سال بعد، آدھی رات کے خواب کی تعبیر چھ ماہ بعد اور صبح کے خواب کی تعبیر ایک ماہ میں سامنے آ جاتی ہے۔

اس کے علاوہ جو خواب چاند کی 6 تاریخ سے لیے کر 16 تاریخ تک دیکھے جائیں وہ عام طور پر سچ ثابت ہوتے ہیں۔

اتنا ہی نہیں بلکہ ستاروں کی چال کے اثرات بھی خوابوں پر ہوتے ہیں کہ صاحب خواب نے کس رات خواب دیکھا۔ اس رات کون سا ستارہ کس برج میں تھا۔

علم تعبیر کی بہت بڑی فضیلت ہے۔ یہ پیغمبروں کا علم ہے۔ سورہ یوسف میں ارشاد ہے کہ ”اس طرح ہم نے یوسف کو اس ملک میں سلطنت عطا فرمائی اور اس کو علم تعبیر سکھایا۔“ حضورؐ نے واقعہ معراج کے بعد ایک خواب دیکھا جس کا ذکر قرآن میں کچھ یوں ہے۔ ”کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے خواب کو سچ کر دکھایا۔“

تعبیر خواب ایک بہت بڑا علم، بہت بڑا فن ہے۔ اس وقت فرائڈ، یونگ اور ایڈلر وغیرہ کے حوالے سے بات نہیں کر رہا بلکہ اسلامی تاریخ سے چند نام پیش کر رہا ہوں جو اس فن کے ماہرین تھے۔

حضرت دانیال، حضرت یوسف، حضرت امام جعفر صادق، حضرت محمد ابراہیم کرمانی، حضرت محمد ابن سیوہن، حضرت اسماعیل بن اشف، امام ابن تیمیہ وغیرہ۔

اور اس فن کی کچھ کتابوں کے نام سن لیں۔ کتاب اصول، کتاب تفسیر، کتاب التعمیر اور ابن سیرین کی لاجواب تصنیف کتاب التعمیر وغیرہ۔

اکتوبر کی شخصیات

صائمہ اقبال

عیسوی کلینڈر کے اس دسویں مہینے سے جڑی ان اہم شخصیات کا مختصر مختصر سا تذکرہ جنہوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ جن کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہیں اور یہ تذکرہ صرف اس لیے دیا جا رہا ہے تاکہ معلومات حاصل کر کے شائقین کی تشنگی دور ہو سکے۔

ایک ایسی خصوصی تحریر جسے قارئین سب سے زیادہ پسند کرتے ہیں

جلال الدین محمد اکبر

مشوروں پر عمل کرتے ہوئے وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ 1556ء تک وہ دہلی، آگرہ، پنجاب، گوالیار، اجمیر اور جون پور سر کر چکا تھا۔ 1562ء میں مالوہ بھی اس کی سلطنت کا حصہ



بن گیا۔ چتوڑ، گجرات، بنگال بھی زیر تسلط آئے۔ اس کی سلطنت میں کابل، کشمیر، سندھ، اڑیسہ، احمد نگر کے علاقے شامل تھے۔ بنگال سے افغانستان تک اور کشمیر سے دکن تک پھیلی اکبر کی سلطنت طاقت کی انوکھی مثال تھی۔

وہ ہندوستانی تاریخ کے عظیم ترین شہنشاہوں میں سے ایک تھا۔ ایک کرشماتی شخصیت۔ مغل حکومت کو جو قوت اس کے دور میں نصیب ہوئی، اس کی مثال نہیں ملتی۔ سلطنت مغلیہ کا یہ تیسرا فرمان روا جلال الدین محمد اکبر ہمایوں کا بیٹا تھا۔ ہمایوں نے اپنی جلاوطنی کے زمانے میں ایک ایرانی خاتون حمیدہ بانو سے شادی کی تھی۔ اکبر اسی کے بطن سے 15 اکتوبر 1542ء کو عمرکوٹ میں پیدا ہوا۔

ہمایوں کی وفات کے وقت اکبر کی عمر چودہ برس تھی اور وہ اپنے اتالیق بیرم خان کے ساتھ سکندر سوری کے تعاقب میں تھا۔ باپ کی موت کی خبر اُسے کلانور ضلع گروداسپور کے مقام پر ملی۔ بیرم خان نے وہیں اکبر کی رسم تخت نشینی ادا کی اور خود اس کا سرپرست بنا۔

نئے بادشاہ کو کئی چیلنجز کا سامنا تھا۔ اُسے اپنے دادا شہنشاہ بابر کا مقام حاصل کرنا تھا۔ حوصلے بلند تھے۔ اس نے پانی پت کا معرکہ سر کیا۔ مشرق میں عادل شاہ سوری کے قدم اکھاڑے۔ دھیرے دھیرے سلطنت پھیلنے لگی۔

آگے کی کہانی حیرت ناک ہے۔ اپنے اتالیق کے

گودہ ناخواندہ تھا، جنگوں نے پڑھنے کا موقع فراہم نہیں کیا مگر قدرت نے اسے بلا کی ذہانت عطا کی تھی۔ ابوالفضل، فیضی، بیربل جیسے عالم اس کے دربار کا حصہ تھے جن کی صحبت نے اس کی ذہنی صلاحیتوں کو مزید جلا بخشی۔ وہ سیاسی طور پر انتہائی بالغ تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اکثریت پر اس کی مرضی کے بغیر زیادہ عرصے حکومت نہیں کی جاسکتی۔ اس نے



1940ء میں مرکزی
قانون ساز اسمبلی کے رکن
منتخب ہونے تک وہ یوپی
کی اسمبلی کے رکن
رہے۔ انہیں قائد اعظم کا
دست راست تصور کیا
جانے لگا۔

1932ء میں
انہوں نے دوسری شادی
کی۔ بیگم رعنا لیاقت علی

ایک ماہر تعلیم اور معیشت داں تھیں۔ وہ لیاقت علی خان کی
سیاسی زندگی میں بہترین معاون ثابت ہوئیں اور تحریک
پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ 1946ء میں وہ مشترکہ
ہندوستان کے فنانس منسٹر ہو گئے۔ ان کے تیار کردہ بجٹ کو
ماہرین معیشت ایک کارنامہ قرار دیتے ہیں۔ ہٹوارے کے
بعد انہوں نے پاکستان کے پہلے وزیر اعظم کی حیثیت سے
حلف اٹھایا۔ وہ پاکستان کے پہلے وزیر دفاع بھی تھے۔ تقسیم
کے بعد کشمیر اور کامن ویلتھ جیسی اہم وزارتیں ان کے پاس
رہیں۔

انہیں سوویت یونین نے دورے کی دعوت دی تھی مگر
لیاقت علی خان اور ان کی کابینہ نے امریکا سے ہاتھ ملانے کا
فیصلہ کیا۔ اس دورے نے اس خطے پر گہرے اثرات مرتب
کیے۔

16 اکتوبر 1951ء کی خونیں شام راولپنڈی کے جلے
میں سید اکبر نامی ایک افغانی باشندے نے گولی مار کر اس عظیم
شخص کو شہید کر دیا۔ مرتے وقت لیاقت علی خان کی زبان پر
”اللہ۔ پاکستان“ کے الفاظ تھے۔ حملہ آور کو موقع ہی پر قتل کر دیا
گیا۔

اس واقعے پر پوری قوم غم و غصے سے بھر گئی۔ اس کیس
نے ایک معصے کی شکل اختیار کر لی۔ ان گنت سوالات اٹھائے
گئے۔ لوگوں نے اسے ایک سازش قرار دیا۔ اہم ترین سوال یہ
تھا کہ اس جلسے میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ ممتاز دولتانہ، مسلم لیگ
کے سیکریٹری جنرل یوسف خٹک، آئی جی پولیس قربان علی خان
کی عدم موجودگی کے کیا اسباب تھے۔

جلسہ گاہ میں فرانٹس منجھی پر مامور پولیس کا اعلیٰ ترین
عہدے دار راولپنڈی کا ایس پی نجف خان تھا۔ کچھ رپورٹس
کے مطابق گولی کی آواز سنتے ہی نجف خان نے پشتوں میں چلا کر

ہندوؤں کی تالیف قلب کی خاطر انہیں مراعات دیں، رشتے
قائم کیے۔ اکبر کی جو دھابائی سے شادی بھی اسی پالیسی کا حصہ
تھی جس سے اس کا بیٹے جہانگیر ہوا۔

کچھ مؤرخین اکبر کی روشن خیالی کو تنقید کا نشانہ بناتے
ہیں۔ سیاسی افہام و تفہیم کے لیے وہ ایک ایسی راہ پر چل پڑا تھا
جس نے اُسے دین الہی کے نام سے ایک نیا مذہب ایجاد
کرنے پر مجبور کر دیا۔ یہ انتہا پسندانہ اقدام اکبر کے ہندو رتنوں
کی مسلسل کوششوں کا نتیجہ تھا۔ دین الہی کی وجہ سے وہ مسلمان
علماء کی نظروں میں ناپسندیدہ قرار پایا۔

اکبر ناخواندہ ضرور تھا مگر اس کے گرد عالموں کا ہجوم
ہوتا۔ اسے بہترین سالار میسر تھے جن کی بدولت اُس نے
پچاس سال بڑی شان و شوکت سے حکومت کی اور اپنے
جانشینوں کے لیے ایک عظیم سلطنت چھوڑ گیا۔ اکبر کا 27
اکتوبر 1605ء کو انتقال ہوا۔

ہمارے ہاں اکبر کے بیٹے جہانگیر (سلیم) اور انارکلی
کے عشق کی کہانی بے حد مشہور ہے۔ چند مؤرخین کا خیال ہے کہ
اس قصے کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

لیاقت علی خان

تحریک پاکستان کے عظیم قائد نواب زادہ لیاقت علی
خان کو بلا مبالغہ تحریک پاکستان کہا جاسکتا ہے۔ انہوں نے اس
جدوجہد کو کامیابی سے ہم کنار کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا اور
پاکستان کے پہلے وزیر اعظم کی حیثیت سے خدمات انجام
دیں۔

لیاقت علی خان 2 اکتوبر 1895ء کو ہندوستان کے
علاقے کرنال میں پیدا ہوئے۔ وہ نواب رستم علی خان کی
دوسری اولاد تھے۔ دینی تعلیم گھر سے حاصل کی۔ 1918ء میں
ایم اے او کالج علی گڑھ سے گریجویشن کیا۔ 1918ء ہی میں
ان کی جہانگیر بیگم سے شادی ہوئی پھر وہ برطانیہ چلے گئے۔
انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔
1923ء میں ہندوستان لوٹ کر انہوں نے مسلم لیگ
میں شمولیت اختیار کر لی۔ 1924ء میں قائد اعظم کی زیر قیادت
مسلم لیگ کالاہور میں اہم اجلاس ہوا، جس کا مقصد مسلم لیگ
کو دوبارہ منظم کرنا تھا۔ لیاقت علی خان نے اس اجلاس میں بھی
شرکت کی اور ان کا شمار اہم رہنماؤں میں ہونے لگا۔
1926ء میں وہ اتر پردیش سے قانون ساز اسمبلی کے رکن منتخب
ہوئے۔ 1936ء میں وہ مسلم لیگ کے سیکریٹری جنرل ہو گئے۔

میں مسلم لیگی حکومت قائم کی۔ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے صدر رہے۔ 1946ء میں اقوام متحدہ کے جنیوا میں ہونے والے اہم ترین اجلاس میں ہندوستان کی نمائندگی کی۔ کلکتہ سے ایک اخبار جاری کیا۔ کلکتہ میں مسلم ایوان تجارت قائم کیا۔ قیام پاکستان کے بعد وہ مشرقی پاکستان کے پہلے وزیر اعلیٰ بنے۔ گورنر جنرل رہے۔ حلف لینے کے بعد 1953ء تک وزیر اعظم کے عہدے پر فائز رہے۔

ان کے دور میں خارجہ پالیسی میں واضح تبدیلی نظر آئی۔ پالیسی کا اہم ترین نکتہ اسلامی ممالک کی حمایت اور ان کا اتحاد تھا۔ انڈونیشیا کے ساتھ خوشگوار تعلقات استوار ہوئے۔ البتہ سوویت جنگ میں ان کا موقف مصر کے بجائے برطانیہ کی حمایت کرتا تھا۔

ان کے دور میں پیدا ہونے والے گندم کے بحران کی وجہ سے انہیں کڑی تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ انہیں دستور سازی اور قانون ساز مجلس میں مشرقی و مغربی پاکستان کی برابر نمائندگی جیسے چیلنج درپیش تھے۔ ان ہی کے دور میں مشرقی پاکستان میں اردو کو قومی زبان بنانے پر فسادات ہوئے۔ ڈھاکا یونیورسٹی میں ہڑتال کی گئی۔ وہ سازشوں اور موقع پرستی کا بھی شکار ہوئے۔ گورنر جنرل ملک غلام محمد نے ان کی شرافت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں وزارت عظمیٰ کے منصب سے برطرف کر دیا۔ اس غیر قانونی اقدام کے خلاف انہیں اپنے مسلم لیگی رفقاء کی سرد مہری کا دلی صدمہ تھا۔ انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ ایوب خان کی جانب سے انہیں کنونشن مسلم لیگ کی صدارت پیش کی گئی مگر آپ نے مادر ملت کے کہنے پر مسلم لیگ کو از سر نو منظم کرنا اہم سمجھا۔ دسمبر 1962ء میں وہ لاہور تشریف لائے تو ان کا فقید المثال استقبال ہوا۔ مادر ملت کی صدارتی مہم میں انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان کے ہمراہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے دورہ کیے۔ اسی مہم کے دوران 22 اکتوبر 1964ء کو ڈھاکا میں ان کا انتقال ہوا۔

محمد علی بوگرہ

پاکستان کے تیسرے وزیر اعظم محمد علی بوگرہ کا شمار صوبہ بنگالہ کے اہم مسلم سیاست دانوں میں ہوتا ہے۔ تحریک آزادی میں ان کا کردار نمایاں رہا۔ سفارت کاری کے میدان میں بھی انہوں نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔

وہ 19 اکتوبر 1909ء کو باریسال میں نواب زادہ الطاف علی کے گھر پیدا ہوئے۔ ان کے دادا سید نواب علی

کہا "اسے مار دو" سید اکبر کو ہلاک کرنے والا انسپکٹر محمد شاہ بھی پشتون تھا۔ پنڈی کے جلسے میں ایس پی کا پشتو میں حکم دینا ایک مشکوک فعل تھا، خصوصاً اس وقت جب قاتل کو زندہ گرفتار کرنا ضروری ہو۔ واضح رہے کہ سادہ لباس پولیس اہل کاروں نے سید اکبر کو قابو کر لیا تھا مگر انسپکٹر شاہ محمد نے اس پر ایک دو نہیں، پوری پانچ گولیاں چلائیں۔

لیاقت علی کے صاحبزادے اکبر لیاقت علی کا بھی یہی موقف تھا کہ سید اکبر کو خواہ مخواہ نشانہ بنایا گیا، اصل قاتل کوئی اور تھا۔ یہ بھی کہا گیا کہ لیاقت علی خاں کو گولی سامنے سے نہیں، عقب سے ماری گئی تھی۔ واضح رہے کہ جلسے میں کسی زخمی کو اسپتال لے جانے کے لیے ایمبولنس تک موجود نہیں تھی۔ اوپر سے پولیس نے ہوائی فائرنگ شروع کر دی۔

تفتیش کے خاطر خواہ نتائج نہیں نکلے۔ عام رائے ہے کہ یہ قتل امریکی اور افغان خفیہ ایجنسیوں کی ملٹی بلت کا نتیجہ تھا جس میں پاکستانی انتظامیہ کے کچھ لوگ بھی شامل تھے۔

خواجہ ناظم الدین

خواجہ ناظم الدین کا شمار تحریک پاکستان کے مرکزی قائدین میں ہوتا ہے۔ قائد اعظم کی وفات کے بعد انہیں گورنر جنرل چنا گیا۔ لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد انہوں نے پاکستان کے دوسرے وزیر اعظم کے طور پر حلف اٹھایا۔



انہوں نے 19 جولائی 1894ء کو نوابین ڈھاکا کے خاندان میں آنکھ کھولی۔ ابتدائی تعلیم برطانیہ سے حاصل کی۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے۔ بنگال سے سیاسی سفر کا آغاز کیا۔ جلد ہی ان کا شمار اہم سیاست دانوں میں ہونے لگا۔

1922ء میں ڈھاکا میونسپل کمیٹی کے صدر بنے۔ 1929ء وزیر تعلیم کا عہدہ سنبھالا۔ 1935ء میں بنگال کے وزیر اعظم کا منصب سنبھالا۔ اس خطے میں انہوں نے مسلم لیگ کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ 1943ء میں بنگال



چوہدری ڈھاکا یونیورسٹی کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ بوگرہ میں پلے بڑھے۔ انہوں نے کلکتہ کے پریزیڈنسی کالج سے تعلیم حاصل کی۔ 1937ء میں انہوں نے مسلم لیگ کے پلیٹ فورم سے بوگرہ سے الیکشن لڑا اور بنگال کی قانون ساز اسمبلی کے رکن

بنے۔ مسلم لیگ کو ایک سیاسی قوت بنانے میں ان کا کردار اہم رہا۔ 1946ء میں وہ سہروردی کی کابینہ میں وزیر رہے۔ انہوں نے ڈھاکہ میڈیکل کالج اور کلکتہ لیگ میڈیکل کالج کی بنیاد رکھی۔

پاکستان بننے کے بعد انہوں نے اردو کو اکلوتی قومی زبان قرار دینے کی مخالفت کی تھی۔ گو اس وقت ان پر کڑی تنقید ہوئی مگر بعد کے حالات نے ان کے اندیشوں کو درست ثابت کیا۔ انہوں نے برما، کینیڈا اور امریکا میں سفیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

1953ء میں انہوں نے وزیر اعظم کا حلف اٹھایا۔ اس زمانے میں غلام محمد بطور گورنر جنرل طاقت کا مرکز تھے اور سازشیں شروع ہو چکی تھیں۔ ان کے اور نہرو کے درمیان ہونے والے مذاکرات عالمی میڈیا کی توجہ کا مرکز رہے۔ آئین سازی کی کوششیں بھی قابل قدر تھیں۔ اس ضمن میں ان کا بوگرہ فارمولا خصوصی اہمیت کا حامل تھا۔ انہوں نے وفاقی پارلیمانی نظام اختیار کرنے کی تجویز پیش کی۔ عوام کی جانب سے اسے سراہا گیا مگر گورنر جنرل غلام محمد نے 1954ء میں اسمبلی تحلیل کر دی۔ اسکندر مرزا نے ان کی جگہ سنبھال لی۔ شدید دباؤ پر انہیں استعفیٰ دینا پڑا۔

انہیں ایک بار پھر امریکا میں سفیر مقرر کیا گیا۔ وہ ایوب کابینہ میں وزیر خارجہ رہے۔ 1963ء میں ان کا انتقال ہوا۔ انہیں مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلادیش) کے بوگرہ پبلس میں دفنایا گیا۔

غلام اسحاق خان

پاکستانی تاریخ کے بااثر ترین افراد کی فہرست بنائی جائے تو اس میں 22 فروری 1915ء کو پیدا ہونے والے

غلام اسحاق خان بنگلہ کا نام بھی شامل ہوگا۔ پاکستان کے اس سابق صدر نے سیاست میں آمد سے قبل بیوروکریسی میں اہم عہدے سنبھالے۔

وہ ضلع بنوں کے گاؤں اسماعیل خیل میں پیدا ہوئے۔ پشاور سے گریجویشن کرنے کے بعد انڈین سول سروس میں شمولیت اختیار کی۔ صوبہ سرحد میں وزیر اعلیٰ کے سیکرٹری اور ہوم سیکرٹری رہے۔ قیام پاکستان کے بعد سیکرٹری اطلاعات مقرر ہوئے۔ ون یونٹ کے زمانے میں مغربی پاکستان کے



سیکرٹری آپریشن کے عہدے پر کام کیا۔ واپڈا کے سربراہ کی حیثیت سے مصروف رہے۔ چھ برس سیکرٹری خزانہ رہے۔ وہ ایک بااختیار سیکرٹری تھے۔ 20 دسمبر 1971ء کی جس تصویر میں نجی خان ذوالفقار علی بھٹو کو اقتدار منتقل کر رہے ہیں،

اس تصویر میں تیسرے آدمی غلام اسحاق خان ہیں جو اقتدار منتقلی کی دستاویز پر دستخط کر رہے ہیں۔ بھٹو دور میں وہ گورنر اسٹیٹ بینک رہے۔ سیکرٹری جنرل برائے دفاع کا قلمدان ان کے پاس تھا۔ اس حیثیت میں وہ پاکستان کے جوہری پروگرام کے نگران رہے۔ مارشل لانے ان کے سیاسی سفر پر کسی قسم کے اثرات مرتب نہیں کیے۔ پہلے مشیر خزانہ، پھر وزیر خزانہ بنائے گئے۔ اسی زمانے میں انہیں ستارہ پاکستان اور ہلال پاکستان کے اعزازات سے نوازا گیا۔ 1984ء میں انہیں سینیٹ کا چیئرمین بنایا گیا۔ 17 اگست 1988ء کو ضیاء الحق کا طیارہ تباہ ہونے کے بعد عام انتخابات میں پیپلز پارٹی اکثریتی جماعت کے طور پر ابھری۔ پی پی پی اور آئی جے آئی کی مشترکہ حمایت سے غلام اسحاق خان دسمبر 1988ء میں پاکستان کے ساتویں صدر منتخب ہو گئے۔ آٹھویں آئینی ترمیم کے تحت وہ ایک بااختیار صدر تھے۔ بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف سے ان کے شدید اختلافات رہے۔ پہلے بے نظیر بھٹو اور پھر نواز شریف حکومت اٹھانے اور ٹی بی کا شکار ہو گئیں۔

سپریم کورٹ نے 1988ء اور 1990ء میں تو صدر کی جانب سے حکومت کی برطرفی کو غیر آئینی قرار نہیں دیا، البتہ

بھٹو نے پارٹی کی قیادت سنبھالی۔ کچھ تجزیہ کار اس واقعے کو پی پی پی کی نظریاتی سیاست میں تبدیلی کا اولین اشارہ سمجھتے ہیں۔

آنے والے برسوں میں وہ دوبار رکن قومی اسمبلی منتخب ہوئیں۔ وہ کیبنٹ منسٹر اور ڈپٹی پرائم منسٹر رہیں۔ مرتضیٰ بھٹو کی سیاست میں آمد کے بعد وہ ایک نئے روپ میں نظر آئیں۔ انہوں نے اپنے بیٹے کا ساتھ دیا۔ مرتضیٰ بھٹو کے قتل نے ان پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ چند حلقوں کے مطابق یہی سانحہ ان کے ذہنی توازن بگڑنے کا سبب بنا۔ اپنی زندگی کے آخری چند برس وہ اپنی بیٹی کے ساتھ رہیں۔ 23 اکتوبر 2011ء کو ان کا وہی میں انتقال ہوا۔

فاروق احمد خان لغاری

سیاست فاروق لغاری کی کھٹی میں تھی۔ وہ خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے۔ وہ 29 مئی 1940ء کو جنوبی پنجاب کے ضلع ڈیرہ غازی خان کے نواحی علاقے چوٹی زریں کے ایک زمین دار گھرانے میں پیدا ہوئے، جو علاقائی سیاست میں نمایاں مقام کا حامل تھا۔ لاہور سے گریجویشن کرنے بعد انہوں نے برطانیہ کا رخ کیا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں زیر تعلیم رہے۔ وٹن لوٹ کر سول سروس کا حصہ بن گئے۔ والد کی وفات کے بعد سول سروس سے علیحدہ ہو گئے اور پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کی۔ سیاسی مراحل تیزی سے طے کیے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دور حکومت میں وہ سینیٹ کے رکن بنے۔ پھر پیداوار کی وزارت کا قلم دان سنبھالا۔ 1988ء میں وہ پنجاب کی وزارت اعلیٰ کے مضبوط امیدوار تھے مگر پی پی



وہاں حکومت قائم نہیں کر سکی تو انہوں نے وفاقی کابینہ میں بجلی کے وزیر کا عہدہ سنبھالا۔ 1990ء میں پیپلز پارٹی کے ڈپٹی پارلیمانی لیڈر رہے۔ نگران حکومت میں وزیر خزانہ بھی رہے۔

1993ء میں رکن قومی اسمبلی منتخب ہونے کے بعد وزیر خارجہ کا منصب سنبھالا۔ صدارتی انتخابات میں انہوں نے وسیم سجاد کو شکست دی۔ کچھ عرصے بعد ان کے اور

شریف حکومت کی برطرفی کو غیر آئینی قرار دیتے ہوئے مئی 1993ء میں اس کی بحالی کا حکم جاری کر دیا۔ اس کے نتیجے میں ڈیڈ لاک ہو گیا۔ آخر بری فوج کے سربراہ جنرل عبدالوحید کا کڑ درمیان میں آئے۔ یوں وزیر اعظم اور صدر دونوں ہی کو گھر جانا پڑا۔

غلام اسحاق خان ایک سختی آدمی تھے جن کے کیریر پر کرپشن کا کوئی داغ نہیں، البتہ سیاست میں حصہ لینے والے ان کے دامادوں پر کرپشن کے الزامات لگے۔ صدارت کے منصب سے الگ ہونے کے بعد وہ پشاور میں رہے۔ 27 اکتوبر 2006 کو نمونیا کے حملے سے ان کا انتقال ہوا۔

نصرت بھٹو

70 کی دہائی میں جن خواتین نے پاکستانی سیاست میں کلیدی کردار ادا کیا، ان میں بیگم نصرت بھٹو کا نام سرفہرست ہے۔

23 مارچ 1929ء کو اصفہان میں پیدا ہونے والی نصرت بھٹو پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی چیئر مین ذوالفقار علی بھٹو کی دوسری بیگم تھیں۔

انہوں نے ایک ممتول گھرانے میں آنکھ کھولی۔

Humanities

کے مضمون میں اصفہان

یونیورسٹی سے گریجویشن

کیا۔ کراچی میں

ذوالفقار علی بھٹو سے پہلی

ملاقات ہوئی۔ ستمبر

1951ء میں وہ رشید

ازدواج میں بندھ گئے۔ بھٹو صاحب سے ان کے چار بچے

(بینظیر بھٹو، مرتضیٰ بھٹو، شاہنواز بھٹو، صنم بھٹو) ہوئے۔

خاتون اول کی حیثیت سے ان کا کردار نمایاں رہا، تاہم بھٹو

صاحب کی گرفتاری کے بعد ان کے سیاسی سفر کا حقیقی معنوں

میں آغاز ہوا۔ مارشل لا کے سخت ترین زمانے میں انہوں نے

پیپلز پارٹی کی قیادت کی اور بحالی جمہوریت کی تحریک میں

کلیدی کردار ادا کیا۔ اس دور میں قید و بند کی صعوبتیں کئیں۔

کبھی گھر میں نظر بند، کبھی جیل یا ترائی۔ قذافی اسٹیڈیم میں ان پر

پولیس اہل کاروں نے تشدد کیا۔ 1982ء میں طبی بنیادوں پر

انہیں بیرون ملک جانے کی اجازت دی گئی۔ بعد میں بے نظیر



کہ انہوں نے ملازمت چھوڑ کر مشرقی ادویہ کی اہمیت اور افادیت اجاگر کرنے کو اپنا مشن بنالیا۔ اس مایہ ناز حکیم نے نہ صرف پاکستان، بلکہ اسلامی دنیا کے لیے اہم خدمات انجام دیں۔ مذہب، طب اور حکمت پر 200 سے زائد کتب تصنیف و تالیف کیں۔ ان کی ادویہ اور پراڈکٹ کی دنیا بھر میں مانگ تھی۔ حکیم صاحب کے ہاتھ میں شفا تھی۔ وہ پاکستان کے بڑے شہروں میں ہفتہ وار مریضوں کو دیکھتے تھے۔

1985ء میں انہوں نے ہمدرد یونیورسٹی قائم کی۔ اس درس گاہ اور اس کے تحت مدینہ الحکمت جیسے شہر کی تعمیر کو ان کی علمی و تعلیمی تحریک کا سنگ میل قرار دیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے ہمدرد کے نام سے بچوں کا رسالہ شروع کیا جسے رجحان ساز قرار دیا جاتا ہے۔ نونہال ادب کے نام سے بچوں کے لیے کتب کا ایک خوبصورت سلسلہ شروع کیا۔ 1993ء میں انہیں سندھ کا گورنر بنایا گیا۔ وہ چند ہی ماہ اس عہدے پر رہے۔ 17 اکتوبر 1998ء کو اس درویش صفت انسان کو شہید کر دیا گیا۔ اس کا الزام مختلف سیاسی گروہوں پر عائد کیا گیا۔ کچھ لوگوں کو سزائیں بھی ہوئیں، البتہ آج بھی کئی سوالات حل طلب ہیں۔

ان م راشد

بیسویں صدی میں اردو شاعری کے افق پر جو تابغہ روزگار شخصیات ظاہر ہوئیں، ان میں ایک نام ن م راشد کا بھی ہے۔ ناقدین ان کا موازنہ فیض اور جوش سے کرتے ہیں۔ ان کا اصل نام نذر محمد راشد تھا۔ وہ 1910ء میں ضلع گوجراں والا کے قصبے وزیر آباد میں پیدا ہوئے۔ اوائل عمری میں علامہ مشرقی کی خاکسار تحریک سے بہت متاثر تھے۔



گورنمنٹ کالج لاہور سے اکتساب علم کیا۔ شاعری میں جدید رجحانات کے حامل تھے۔ اردو شاعری کو بین الاقوامی دھارے میں شامل کرنے والوں میں ان کا اور میراجی کا نام سرفہرست ہے۔ ناقدین کے مطابق ان دو شعرا کی آمد سے قبل اردو نظم سیدھی

بینظیر بھٹو کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے۔ نومبر 1996ء میں انہوں نے 58 ٹوپی کے ذریعے اسمبلیاں تحلیل کر دیں۔ پی پی رہنما ملک معراج خالد نگران وزیر اعظم بنے۔ اسی دور میں احتساب آرڈیننس نامی قانون متعارف کرایا تھا جو بعد میں نواز شریف کے دور میں احتساب ایکٹ کہلایا۔ پرویز مشرف نے اس قانون کو نیب یعنی قومی احتساب بیورو کا نام دیا۔

اس آرڈیننس کی وجہ سے وہ تنقید کی زد میں رہے۔ 1997ء میں میاں صاحب نے وزیر اعظم بننے کے بعد صدر سے اسمبلی توڑنے اور فوجی سربراہان کی تقرری کا اختیار واپس لینے کا فیصلہ کیا۔ اس ترمیم کی حزب اختلاف کی قائد بینظیر بھٹو نے بھی مکمل حمایت کی۔ حالات اس نہج پر پہنچ گئے کہ انہیں استعفیٰ دینا پڑا۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے ملت پارٹی کی بنیاد رکھی۔ چند برس بعد اسے ق لیگ میں ضم کر دیا۔ 2008ء میں وہ رکن قومی اسمبلی منتخب ہوئے مگر اب وہ بیمار یوں میں گھرے ہوئے تھے۔ 20 اکتوبر 2010ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

حکیم سعید

پاک و ہند میں حکمت سے وابستہ شاید ہی کسی شخص کو وہ مقام ملا ہو جو حکیم سعید کے حصے میں آیا۔ اس کا سبب ان کی گراں قدر علمی و تحقیقی خدمات اور کارنامے تھے۔ یہ نیک طینت انسان 9 جنوری 1920ء کو دہلی کے ایک علمی و ادبی گھرانے میں پیدا ہوا۔ دہلی ہی میں ان کے اجداد نے ہمدرد دوا خانے کی پہلی اینٹ رکھی تھی۔ دہلی یونیورسٹی سے گریجویشن کرنے کے بعد وہ خاندانی دوا خانے سے وابستہ ہو گئے۔

تقسیم کے بعد جما جمایا کاروبار چھوڑ کر خالی ہاتھ پاکستان آ گئے۔ کراچی کو اپنا مسکن بنایا اور ثابت کر دکھایا کہ بے سروسامانی میں بھی ایک پُر عزم آدمی اپنی دنیا آباد کر سکتا ہے۔ 1948ء میں انہوں نے اپنا مطب قائم کیا۔ انہوں نے تدریس کا پیشہ اختیار کیا تھا مگر ایوب دور میں ایسے حالات پیدا ہو گئے





1945ء میں ان کا ایجوکیشن کورس میں تبادلہ ہوا۔ 1957ء میں کرنل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ وہ ڈائریکٹر آرمی ایجوکیشن مقرر ہوئے۔ 1969ء میں اسی عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

لکھنے پڑھنے کی عادت بچپن ہی میں پڑ گئی تھی۔ گاؤں کے زمانے میں ایک کہانی لکھی، جو ڈرتے ڈرتے بچوں کے رسالے "رہنمائے تعلیم" میں بجوائی۔ کہانی شائع ہوئی تو لکھنے کی مزید تحریک ملی۔ پیشہ وارانہ سفر میں قلم اور کاغذ ہمیشہ ساتھ رہے۔ ان کی پہلی کتاب "جنگ آمد" نے مزاج نگاری کی دنیا میں مقبولیت پائی۔ ان کی پختہ نثر، بذلہ سنجی اور صورت حال سے پرمزاج پہلو برآمد کرنے کا ہنر متاثر کن تھا۔ اگلی دو کتابیں "بسلامت روی" اور "بزم آرائیاں" کا بھی بڑا چرچا ہوا۔ چوتھی کتاب "بدلیسی مزاج" مغربی ادب کا سلیبس اردو ترجمہ ہے۔ یوں تو ہر کتاب قابل ستائش مگر پڑھنے والے "جنگ آمد" کے سحر سے نہیں نکل سکے۔

ڈاکٹر انور رسدید لکھتے ہیں "کرنل محمد خان کا شمار ان مزاج نگاروں میں ہوتا ہے، جو زندگی کے بچھے ہوئے ماحول میں داخل ہوتے ہیں۔ پھولوں کو فضا میں بکھیرنا شروع کرتے ہیں۔ ماحول پہلے انہیں حیرت کی نظر سے دیکھتا ہے اور پھر فضا میں ہر طرف اڑتے ہوئے پھولوں کو سمیٹنے لگتا ہے۔"

قاری میں خوشی کی کیفیت جگانے والے اس تخلیق کار کا 23 اکتوبر 1999ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔

شان الحق حقی

الفاظ اپنی وقعت کھو چکے، آج ہر دوسرے قلم کار کو ہمہ جہت قرار دینے کی وبا عام ہے۔ حقیقت میں تو یہ ترکیب شان الحق حقی جیسے تخلیق کاروں کو زیب دیتی ہے جنہوں نے زندگی تحقیق میں صرف کر دی۔ جتنے بڑے عالم، اتنے بڑے ادیب۔ باکمال شاعر۔ مستند ماہر لسانیات۔ ماہر مترجم۔ سنجیدہ محقق۔ اس پر مستزاد، تمام حلقوں کے لیے قابل احترام۔

اصل نام شان الحق تھا۔ جی تخلص کرتے۔ وہ 15 ستمبر 1918ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ (کچھ جگہ تاریخ پیدائش

لکیر پرچل رہی تھی، موضوعات پر خارجی اثرات غالب تھے مگر انہوں نے رویف وقافیہ کی بندش سے آزاد ہو کر داخلی، علامتی اور تجریدی نوعیت کے موضوعات کا چناؤ کیا۔

1942ء میں ان کا پہلا مجموعہ "ماورا" شائع ہوا، جسے آزاد نظم کا پہلا باقاعدہ مجموعہ قرار دیا جاتا ہے۔ راشد کے اسلوب، موضوعات اور پیشکش کے انداز نے پوری نسل کو گرویدہ بنا لیا۔ "ایران میں اجنبی" اور "لا = انسان" ان کے دیگر مجموعے تھے۔ کتاب "گمان کا ممکن" ان کی موت کے بعد شائع ہوئی۔

لوگوں نے راشد کا تقابل فیض سے تو کیا اور فیض صاحب بھی راشد کی قابلیت کا اعتراف کرتے تھے، البتہ سنجیدہ ناقدین اسے غیر ضروری قرار دیتے ہیں کہ دونوں کی شاعری کا انداز اور دائرہ الگ ہے۔

اظہار کی نارسائی ان کا پسندیدہ موضوع تھی۔ ان کی نظم "حسن کوزہ گر" ایک ایسے فن کار کا المیہ بیان کرتی ہے، جو کوزہ گری کی صلاحیت سے محروم ہو گیا ہے۔ اس شاہکار نظم کی تفہیم سے متعلق مباحث ایک عرصے جاری رہے۔

راشد نے جدید دور کا انسان اور مذہب کے موضوع پر بھی قلم اٹھایا۔ ان کی بعض نظموں پر مذہبی حلقوں کی طرف سے خاصی لے دے ہوئی۔ راشد کا انتقال 19 اکتوبر 1975ء کو لندن میں ہوا تھا۔ ان کی آخری رسوم کے وقت صرف دو تین افراد موجود تھے۔ ایک ان کی انگریز بیوی شیلیا، دوسرے عبداللہ حسین اور تیسرے ساقی فاروقی۔ ان کی آخری رسومات سے متعلق بھی طرح طرح کے قصے مشہور ہیں۔

کرنل محمد خان

گو جدید اردو نثر کی عمر زیادہ طویل نہیں مگر اس مختصر عرصے میں مشتاق احمد یوسفی، ابن انشا اور شفیق الرحمان جیسے ممتاز مزاج نگار سامنے آئے جنہوں نے اس فن کو اوج بخشا۔ اس فہرست میں چوتھا نام کرنل محمد خان کا ہے جن کی شگفتہ نثر اور متاثر کن بیان نے قارئین کے دل موہ لیے۔

محمد خان 5 اگست 1910ء کو ضلع چکوال کے ایک گاؤں بلکسر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں ہی سے حاصل کی۔ 1931ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے بی اے کیا۔ 1934ء میں ایم اے اقتصادیات کا مرحلہ طے کیا۔ کچھ عرصہ درس و تدریس میں گزرا۔ 1940ء میں فوج میں شامل ہو گئے۔ عراق، مصر اور لیبیا کی لڑائیوں میں شریک رہے۔

جاتے ہیں۔ ٹیسٹ کرکٹ میں انہوں نے بنگلادیش کے خلاف 224 رنز کی شان دار اننگز کھیلی۔ ناصر جمشید کے ساتھ 224 رنز کی شراکت بھی یادگار تھی۔

محمد حفیظ 17 اکتوبر 1980ء کو سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ 3 اپریل 2003ء کو زمبابوے کے خلاف اپنے ون ڈے کیریئر کا آغاز کیا۔ پہلا ٹیسٹ اسی برس اگست میں بنگلادیش کے خلاف کھیلا۔ ٹی 20 فارمیٹ میں اتنے کامیاب رہے کہ مصباح کے بعد انہیں کپتان چنے گیا، تاہم 2012ء کے ٹی 20 ورلڈ کپ میں ناکامی کے بعد کچھ تنازعات کا شکار ہو کر کپتانی سے الگ ہو گئے۔

محمد حفیظ نے 44 ٹیسٹ میچز میں 2,970 رنز اسکور کیے، جن میں آٹھ سنچری شامل ہیں۔ اس فارمیٹ میں 51 وکٹیں لیں۔ 166 ون ڈے میچز میں وہ دس سنچریوں کے ساتھ پانچ ہزار رنز اسکور کر چکے ہیں، جب کہ 129 وکٹیں ان کے حصے میں آئیں۔ وہ پہلے کھلاڑی



ہیں، جنہوں نے ٹی 20 کرکٹ میں ہزار رنز اسکور کیے اور 40 وکٹیں لیں۔ پہلے پاکستانی کپتان، جنہوں نے اس

فارمیٹ میں لگا تار تین نصف سنچریاں اسکور کیں۔ وہ پاکستان کے دوسرے کھلاڑی ہیں جنہوں نے ایک ہی ون ڈے میں سنچری اسکور کی اور چار وکٹیں لیں۔ 2011ء میں وہ کیریئر کے عروج پر تھے جیسکے انہوں نے دس بار مین آف دی میچ کا ایوارڈ حاصل کیا۔

اسلم خان خٹک

صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختون خوا) کی سیاست اور بیوروکریسی پر اسلم خان خٹک نے گہرے اثرات چھوڑے۔ یہ اسلم خان خٹک ہی تھے جنہوں نے چوہدری رحمت علی کی مشہور کتاب ”اب یا کبھی نہیں“ کی تدوین میں ان کا ہاتھ بٹایا۔ پیشہ وارانہ سفر میں انہوں نے کلیدی عہدوں پر خدمات انجام دیں۔ اسلم خان خٹک 5 اپریل 1908ء کو چترال میں پیدا



1917ء درج ہے۔ لکھنے پڑھنے کا شوق وراثت میں ملا۔ ان کے والد مولوی احتشام الدین حتی اپنے زمانے کے مشہور ماہر لسانیات تھے۔ انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔ سینٹ اسٹیفنز کالج، دہلی سے انگریزی میں ایم

اے کی سند حاصل کی۔ بعد ازاں لندن سے صحافت کا ایک کورس کیا۔

وہ ہندوستان کے شعبہ اطلاعات کے مشہور پریس ”آج کل“ سے وابستہ رہے۔ 1950ء سے 1968ء تک حکومت پاکستان کے محکمہ مطبوعات و قلم سازی کا حصہ رہے۔ پاکستان ٹیلی ویژن سے بطور ڈائریکٹر سلیکشن سکریٹری۔ ایک طویل عرصہ اردو بورڈ میں خدمات انجام دیں، اس کی فتنیم اور مستند لغت کی تیاری میں کلیدی کردار ادا کیا۔

وہ ممتاز ادبی جریدے ماہ نو کے مدیر رہے۔ اس عرصے کتنے ہی قلم کاروں کو متعارف کروایا۔ وہ ثقافتی اداروں میں کلیدی عہدوں پر فائز رہے۔ کتب کی فہرست طویل ہے، جن میں سے درجہ ذیل نمایاں ہیں۔ انتخاب ظفر، انجان راہی (ترجمہ)، تار پیراہن (منظومات)، دل کی زبان، پھول کھلے ہیں رنگ برنگے (منظومات)، نکتہ راز (تنقیدی مقالات)، لغات تلفظ، آپس کی باتیں، افسانہ در افسانہ (خودنوشت سوانح)، حرف دل رس، اوکسفرڈ انگریزی اردو لغت، شاخسانے۔

شان الحق حتی کی ادبی خدمات پر انہیں حکومت نے ستارہ امتیاز سے نوازا۔ 11 اکتوبر 2005ء کو اس عالم کا کینیڈا میں انتقال ہوا۔

محمد حفیظ

پروفیسر کی عرفیت سے پہچانے جانے والے پاکستانی ٹی 20 ٹیم کے سابق کپتان اور معروف آل راؤنڈ محمد حفیظ کو ہرن مولا کہا جائے، تو غلط نہیں ہوگا۔ گوبولنگ ایکشن کی پابندی کی وجہ سے ان کی اثر پذیری مین کمی آئی ہے مگر بلے بازی اور فیلڈنگ میں مہارت کی وجہ سے وہ ٹیم کا مستقل حصہ تصور کیے

اکتوبر 2015ء

126

ماہنامہ سرگزشت
READING
Section



اس زمانے کے ٹی

وی پروڈیوسر سچے پارکھ تھے۔ انہوں نے نوجوان میں چھپے فنکار کو پہچان لیا۔ آنے والے برسوں میں یوں تو سلیم ناصر نے کئی کردار کیے مگر انور مقصود کے ڈرامے ”آنگن ٹیڑھا“ میں اکبر کے کردار نے انہیں شہرت

کی بلند یوں پر پہنچا دیا۔ ”ان کہی“ ان کی صلاحیتوں کا ایک اور ثبوت۔ ایک آرٹ کریٹک کے مطابق اگر سلیم ناصر کے کردار کو ”ان کہی“ سے نکال دیا جائے، تو ڈراما بے رونق ہو جائے گا۔ نشان حیدر سیریز میں ”کیپٹن سردر شہید“ کے مرکزی کردار کے ساتھ بھی سلیم ناصر نے مکمل انصاف کیا اور مزاج کے بعد سنجیدہ کرداروں میں بھی اپنی صلاحیت تسلیم کرائی۔ تاریخی ڈراما سیریل ”آخری چٹان“ میں وہ اوج پر نظر آئے، جہاں انہوں نے سلطان جلال الدین خوارزم شاہ کا کردار ادا کیا۔ کچھ لوگوں کے مطابق وہ ان کے کیریئر کی بہترین اداکاری تھی۔ مکالموں کی پُر تاثیر اور ہر کردار میں ڈھل جانے کی صلاحیت نے انہیں اپنے زمانے کا منفرد اداکار بنا دیا تھا۔ ”جانگلوس“ ان کا آخری ڈراما تھا۔

انہوں نے ٹی وی ٹیپو کے نام سے شو بزنس کا ایک معروف پرچا نکالا۔ 19 اکتوبر 1989ء کو حرکت قلب بند ہونے کے باعث وہ انتقال کر گئے۔ اس منفرد فنکار کو بعد از مرگ تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا گیا۔

بدر منیر

بدر منیر کو پشتو فلموں کا بے تاج بادشاہ کہا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے کیریئر میں پشتو اور اردو کی پانچ سو کے لگ بھگ فلمیں کیں۔

عملی زندگی کا آغاز کراچی کی سڑکوں پر ایک رکشا ڈرائیور کی حیثیت سے کیا تھا۔ فلموں میں کام کرنے کی خواہش ان کے اندر سلگتی رہتی۔ پھر ایک ترکیب سوچھی۔ رکشا چھوڑ کر کار چلانی سیکھی اور وحید مراد کے اسٹوڈیو میں ڈرائیور لگ گئے۔

وحید مراد کی مشہور زمانہ فلم ”ارمان“ کے جشن والے روز

ہوئے۔ ان کے والد محمد قلی خان کا شمار نمایاں سیاسی شخصیات میں ہوتا تھا۔ انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ ریڈیو اسٹیشن پشاور کے پہلے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ بعد ازاں محکمہ تعلیم صوبہ سرحد کے ڈائریکٹر رہے۔ ڈائریکٹر صنعت و حرفت کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔

وہ افغانستان اور عراق میں پاکستان کی سفیر رہے۔ 1965ء وہ رکن اسمبلی منتخب ہوئے۔ بھٹو دور میں سرحد اسمبلی کے اسپیکر رہے۔ 1973ء تا 1974ء صوبہ سرحد کے گورنر کا عہدہ سنبھالا۔ ضیاء دور میں مجلس شوریٰ کے رکن رہے۔ 1985ء کے غیر جماعتی انتخابات کے بعد محمد خان جو نیجو کی کابینہ میں شامل ہوئے۔ نواز شریف کی کابینہ کا بھی حصہ رہے۔ اپنے علاقے کرک کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ انڈس ہائی وے جیسا منصوبہ بھی ان کی وزارت میں شروع ہوا۔

سیاسی بکھیڑے انہیں لکھنے پڑھنے سے دور نہیں کر سکے۔ وہ متعدد زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ انہوں نے کئی کتابیں لکھیں۔ عمر کے آخری حصے میں سیاست سے دستبردار ہو گئے۔ اکتوبر 2008ء میں ان کا انتقال ہوا۔

سلیم ناصر

پی ٹی وی نے کتنے ہی اداکاروں کو اوج بخشا۔ البتہ کچھ ایسے اداکار بھی گزرے، جن کی انفرادیت نے پی ٹی وی ڈرامے کی شہرت اور مقبولیت کے لیے مہمیز کا کام کیا۔ کردار میں ڈوب کر اداکاری کرنے والے سلیم ناصر ایسے ہی شخص تھے۔

ان کا اصل نام سید شیر خان تھا۔ وہ 15 نومبر 1944ء کو ضلع مردان کے ایک پشتون گھرانے میں پیدا ہوئے۔ گو انہیں اپنی لسانی اور خاندانی حیثیت پر فخر تھا مگر اردو سے بھی اتنی ہی محبت تھی، جتنی پشتو سے۔ وہ اتنی خوبصورتی اور چمکتلی سے اردو بولتے کہ اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ یہ ان کی مادری زبان نہیں۔

گریجویشن کے بعد وہ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کراچی میں بی آر او ہو گئے مگر سرکاری ملازمت نے ان کے اندر کے اداکار کو بے چین رکھا۔ وہ جانتے تھے کہ بیوروکریسی ان کی منزل نہیں۔ بالآخر شناخت کے سفر پر نکل پڑے۔ 1976ء میں وہ وحید مراد اور شمیم آرا کے ساتھ فلم ”زیب النساء“ میں نظر آئے۔



بدرمنیر نے ان کے سامنے فلموں میں کام کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ وحید مراد مان گئے اور یوں فلم ”جہاں ہم وہاں تم“ میں انہیں ایک چھوٹا سا کردار کرنے کا موقع ملا۔ وہ ہمیشہ وحید مراد کے احسان مند رہے اور ان کی ناکامیوں کے دور میں اپنی پشتو فلم ”پختون بہ ولایت کما“ میں انہیں کاسٹ کیا۔

1970ء میں قسمت کی دیوی ان پر مہربان ہو گئی۔ یاسمین خان کے ساتھ ان کی فلم ”یوسف خان شیر بانو“ بلاک بسٹر ثابت ہوئی۔ 1970ء تا 1990ء کا میاں جوڑی کئی فلموں میں دکھائی دی۔ ان کی مقبولیت کے پیش نظر اردو اور پنجابی فلموں کے پروڈیوسرز نے بھی انہیں کاسٹ کیا۔ وہ نشو، نیلی، بابہ شریف، دیبا، چکوری اور روحی بانو کے مد مقابل نظر آئے۔ وہ پنجابی نہیں جانتے تھے۔ پنجابی فلموں میں وہ پختون لب و لہجے میں اردو بولتے نظر آتے۔
بدرمنیر کی آخری پشتو فلم ”زمانہ یا گل جانا“ 2005ء میں ریلیز ہوئی مگر پھر انہیں بیماریوں نے گھیر لیا۔ وہ آخری بار ایک ٹی وی شو میں نظر آئے۔ 11 اکتوبر 2008ء کو ان کا انتقال ہوا۔
Downloaded from paksociety.com

کمال نے ہر قسم کے کردار کیے۔ انہوں نے شمیم آراء، دیبا، زیبا، نسیم خان، نشو، ممتاز اور روزینہ کے ساتھ کئی ہٹ فلموں میں کام کیا۔ ان کی ڈائریکٹ کی ہوئی فلموں میں شہنائی، انسان اور گدھا، ہنی مومن، دوسری ماں، درد دل اور جوکر قابل ذکر ہیں۔



”بہن بھائی“ کو کچھ لوگ ان کی بہترین فلم قرار دیتے ہیں، جس کے لیے انہیں نگار ایورڈ سے نوازا گیا۔ کمال نے سیاست میں بھی حصہ لیا مگر یہ شعبہ انہیں راس نہیں آیا۔ بعد میں انہوں نے ”سیاست“ کے نام سے ایک فلم بنائی۔ انڈسٹری کے زوال کے بعد وہ ٹی وی کی سٹ آگئے۔ کئی ڈرامے کیے۔ کراچی سینٹر سے نشر ہونے والے ”کمال کا شو“ کو خاصا پسند کیا گیا۔ آج کل ان کے صاحبزادے غالب کمال بھی ٹی وی پر شو کر رہے ہیں۔ سید کمال طویل عرصے سے عارضہ قلب میں مبتلا تھے۔ یکم اکتوبر 2009ء کو 75 برس کی عمر میں کراچی میں انتقال کر گئے۔

نصرت فتح علی خان

فن گائیکی کے افق پر شاید ہی کوئی ایسا ستارہ چمکا ہو، جو اپنے فن کی پہچان بن جائے۔ استاد نصرت فتح علی خان ایسی ہی نابغہ روزگار شخصیت تھے، جس کے فن نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بطور قوال شروع ہونے والا سفر ایسی بلندیوں پر لے گیا جس کا تصور بھی محال ہے۔ جاپان میں انہیں دیوتا سے تشبیہ دی جاتی تھی۔

نصرت فتح علی خان 13 اکتوبر 1948ء کو فیصل آباد میں پیدا ہوئے۔ اجداد کا تعلق جالندھر سے تھا۔ والد فتح علی خان اور تایا مبارک علی خان اپنے وقت کے معروف قوال تھے۔ فن کشی میں تھا۔ جلد موسیقی کے اسرار و رموز سمجھ لیے۔ پہلے علاقائی سطح پر خود کو منوایا، پھر آڈیو کیسٹ اور ریڈیو کے ذریعے ان کی جادوئی آواز ملک بھر میں پھیلی۔ ”علی مولا“ اور ”میرا پیا گھر آیا“ ان ہی دنوں کی یادگار ہیں۔ انہوں نے لوک

سید کمال

160 اور 70 کی دہائی میں جن اداکاروں نے فلم بینوں کو گرویدہ بنایا، ان میں سید کمال کا نام نمایاں ہے۔ وہ ایک تخلیقی آدمی تھے۔ فقط اداکاری نہیں کی، اسکرپٹ لکھے، ہدایت کاری کی۔ مزاحیہ اداکاری میں انہیں ملکہ حاصل تھا۔ شہرت کی ایک وجہ اور تھی۔ ان کی شکل معروف ہندوستانی اداکار اور ہدایت کار راج کپور سے بہت ملتی تھی۔ اسی وجہ سے انہیں پاکستان کا راج کپور کہا جاتا تھا۔
27 اپریل 1934ء کو سید کمال میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ تقسیم کے بعد پاکستان آگئے۔ 1958ء میں فلم ”ٹھنڈی سڑک“ بنائی۔ فلم ”توبہ“ نے انہیں شایقین کی آنکھ کا تارہ بنا دیا۔ جلد ہی ان کا شمار معروف اداکاروں میں ہونے لگا۔

وہ 8 اکتوبر 1954ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ اداکاری کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ 1974ء میں جب پہلی فلم دھماکار ریلیز ہوئی، اس وقت فقط انیس برس کے تھے۔



جلد ان کی صلاحیتوں کو شناخت کیا جانے لگا۔ آنے والے برسوں میں وہ کئی ڈراموں اور فلموں میں نظر آئے اور ان کا شمار نمایاں اداکاروں میں ہونے لگا۔

ہدایت کاری کا سفر 1995ء میں ریلیز ہونے والے فلم ”مشکل“ سے شروع ہوا، جسے

ناقدین نے خاصا سراہا۔ 1995ء میں ریلیز ہونے والی ”یہ دل آپ کا ہوا“ اس وقت کی مہنگی ترین فلم تھی۔ اس کے ذریعے جاوید شیخ نے پاکستانی انڈسٹری کو بین الاقوامی دنیا سے جوڑنے کی کوشش کی۔ فلم نے نوٹکار ایوارڈ اپنے نام کیے۔

انہوں نے ہندوستانی فلموں میں بھی خود کو منوایا۔ ”اوم شانتی اوم“ اس کی نمایاں مثال تھی۔ 2008ء میں بھاری سرمایہ کاری سے بننے والی ان کی فلم ”کھلے آسمان کے نیچے“ ریلیز ہوئی۔ آج بھی وہ بڑے بڑے پروڈیوسر کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ ان کے بھائی سلیم شیخ اور بہنوئی بہروز سنوارا بھی انڈسٹری کی نمایاں شخصیات ہیں۔ ان کا بیٹا اور بیٹی بھی شوہر انڈسٹری سے وابستہ ہیں۔

فیصل قریشی

اگر ورسائل اداکاروں کا تذکرہ ہو، مارنگ شوہر کے مقبول میزبانوں کی بات ہو، تو ہمہ جہت فنکار فیصل قریشی کا نام ذہن میں آئے گا۔ اوائل عمری میں شوہر کی دنیا میں قدم رکھنے والے فیصل قریشی کو شہرت تو فلموں سے ملی مگر شناخت ٹی وی ڈرامے سے۔

فیصل قریشی 26 اکتوبر 1974ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ افشاں قریشی بھی شوہر انڈسٹری سے وابستہ تھیں۔ ان کے ساتھ وہ اکثر ٹی وی سٹیج پر جایا کرتے۔ اس مشق نے خود میں چھپے اداکار کو شناخت کرنے کا موقع فراہم کیا۔

گیتوں کے ساتھ ہم عصر شعرا کا کلام گا کر کامیابی کے جھنڈے گاڑے اور قوالی سے لگاؤ نہ رکھنے والے طبقے کو بھی اپنی جانب راغب کیا۔

یہ غیر ملکی دورے تھے، جنہوں نے انہیں اوج بخشتا۔ انہوں نے مغربی ممالک میں اس



ڈھب سے قوالی پیش کی کہ وہ افراد جو ان کی زبان نہیں جانتے تھے، ان کی آواز اور سروں پر جھومتے نظر آئے۔ قوالی کو ایک بین الاقوامی صنف کا درجہ ان ہی کے طفیل ملا۔ ان کی کوششوں سے صوفیاء کا کلام دنیا کے کونے کونے میں پہنچا۔

ان کی گائیکی اور دھنوں نے جنم لیا، انہیں گرویدہ بنایا، ان میں برطانوی موسیقار اور گلوکار پیٹر کبریل بھی شامل تھے۔ ان ہی کی دھنوں پر خان صاحب نے مشہور زمانہ قوالی ”دم مست قلندر مست“ پیش کی۔ بین الاقوامی سطح پر ان کا پہلا شاہکار 1995ء میں ریلیز ہونے والی فلم ”ڈیڈ مین واکنگ“ کا ساؤنڈ ٹریک تھا۔ انہوں نے ہالی ووڈ کی فلم ”دی لاسٹ کینڈل“ میں آف کرائسٹ اور پھولن دیوی کی زندگی پر بننے والی فلم ”بینڈٹ کوئین“ کے لیے موسیقی ترتیب دی۔ جدید مغربی موسیقی اور مشرقی کلاسیکی موسیقی کے ملاپ سے ایک نیارنگ پیدا کیا، جس نے قوالی کو یکسر بدل ڈالا۔ کچھ حلقے اس عمل پر تنقید بھی کرتے ہیں۔

17 اگست 1997ء کو وہ 48 برس کی عمر میں انتقال

کر گئے۔

جاوید شیخ

ایسے اداکار کم ہی ہوں گے جنہیں چھوٹے اور بڑے پروڈیوسرز پر یکساں پزیرائی ملے، جو اپنے دلیر فیصلوں اور تخلیقی ایج کے طفیل رجحان ساز ٹھہرائے جائیں۔ جاوید شیخ ان ہی کیاب کا کاروں میں سے ایک ہیں۔ وہ فقط اداکاری تک محدود نہیں رہے۔ بطور ہدایت کار یادگار فلمیں بنائیں۔ اہم ترین پہلو یہ کہ جس زمانے میں اردو سینما زوال کی جانب گامزن تھا، لوگ فلموں پر پیسے لگانے کو تیار نہیں تھے، انہوں نے میگا بجٹ فلمیں بنانے کا رسک لیا۔



بھی شاہکار کا درجہ حاصل ہے۔ 60 کی دہائی کے آخر میں ان کی پروڈکشن کمپنی تنازعات کا شکار ہو گئی۔ پرویز ملک الگ ہو گئے۔

مقبولیت..... نے مزید اختلافات کو جنم دیا۔ ان کی شہرت سے خوفزدہ لابی متحرک ہو گئی۔ کہا جاتا

ہے کہ زیبا، شبنم اور نشو کو ان کے شوہروں نے وحید مراد کے ساتھ کام کرنے سے منع کر دیا تھا۔ یوں وہ صرف اول کی اداکاروں سے محروم ہو گئے۔ اس رکاڈ کے باعث اہم ڈائریکٹر اور پروڈیوسر ان سے دور ہونے لگے۔ انہیں جان بوجھ کر سپورٹنگ کرداروں میں کاسٹ کیا جانے لگا۔ اداکار ندیم کا ستارہ اوج پر تھا۔ پھر 80ء میں ان کا ایکسٹنٹ ہو گیا، جس میں ان کا چہرہ شدید زخمی ہوا۔ اس واقعے کے بعد وہ یاسیت میں اتر گئے۔ ناکامیوں سے دل برداشتہ وحید مراد 23 نومبر 1983ء کی صبح انتقال کر گئے۔ ”ہیرو“ ان کی آخری فلم تھی، جو 1985ء میں ریلیز ہوئی اور سپر ہٹ ثابت ہوئی۔

انہیں نگار ایوارڈ اور ستارہ امتیاز سمیت کئی اعزازات ان کے حصے میں آئے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ کسی ایوارڈ کے محتاج نہیں تھے۔ ان کے مداحوں کی جتنی بڑی تعداد آج پاکستان میں موجود ہے، وہ کسی اور ہیرو کو نصیب نہیں ہو سکی۔

علی حیدر

پاکستانی پاپ انڈسٹری کو استحکام بخشنے اور اوج پر لے جانے والے گلوکاروں میں ایک نام علی حیدر کا بھی ہے جن کے گانے ”پرانی جینز“ نے شہرت کے تمام ریکارڈ توڑ ڈالے تھے۔ اس گانے کی شہرت ہندوستان بھی پہنچی۔

90 کی دہائی میں انہوں نے ایک کے بعد ایک ہٹ آڈیو البم دیے۔ ان کے گانے چارٹ پر نمبروں کی پوزیشن پر براجمان رہے۔ ”قرار“، ”ظالم نظروں سے“، ”دلبر جاناں“ اور ”چاند سا نکھڑا“ ان کے مقبول گیتوں کی فقط چند مثالیں ہیں۔ انہوں نے ٹی وی ڈراموں میں بھی اپنے فن کے جوہر دکھائے۔ پاکستانی فلم ”چلو عشق لڑائیں“ میں نظر آئے۔

وہ کراچی کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔

چائلڈ آرٹسٹ کی حیثیت سے پی ٹی وی سے سفر شروع کیا۔ ”اندھیرا اجالا“ اور ”ایمر جینسی وارڈ“ میں نظر آئے۔ 1992ء میں ریلیز ہونے والی ”سزا“ پہلی نمایاں فلم تھی۔ اس وقت عمر فقط اٹھارہ برس تھی۔ اگلے چند برسوں میں کئی فلموں میں کام کیا مگر فلم انڈسٹری کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ دھیرے دھیرے وہ ٹی وی کی سمت چلے آئے۔ اوائل میں تو چھوٹے موٹے رول کیے مگر ”بونا فرام ٹوبہ ٹیک سنگھ“ سے لاکھوں لوگوں کو گرویدہ بنا لیا۔ ”چاند پور کا چندو“ میں بھی ان کا کردار بہت مضبوط تھا۔ آنے والے سالوں میں انہوں نے پرائیویٹ پروڈکشن کے کئی کامیاب ڈراموں میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔ مارننگ شو کے میدان میں، جہاں خواتین کا غلبہ ہے، فیصل قریشی نے خود کو منوایا۔ انہوں نے تین شادیاں کیں۔

وحید مراد

ان کا شمار جنوبی ایشیا کے مقبول ترین اداکاروں میں ہوتا تھا۔ وہ نوجوانوں کے لیے رول ماڈل تھے۔ ان کا ہر انداز کاپی کیا جاتا۔ جو شہرت ہندوستان میں دلیپ کمار کو ملی، وہی پاکستان میں ان کے حصے میں آئی۔ گو فقط 24 فلموں میں کام کیا مگر ان کے اثرات سینکڑوں فلمیں کرنے والے اداکاروں سے زیادہ ہیں۔ احمد رشدی کی آواز پر ان کی پر فارمنس نے کتنے ہی گیتوں کو لازوال بنا دیا۔

یہ چاکلیٹی ہیرو وحید مراد کا ذکر ہے، جو 2 اکتوبر 1938ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ وہ فلم ڈسٹری بیوٹر نثار مراد کے بیٹے تھے۔ کراچی گرامر اسکول سے ابتدائی تعلیم حاصل کی، ایس ایم آرٹس سے گریجویشن کیا، کراچی یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ماسٹرز کیا۔

کیریر کا آغاز بطور پروڈیوسر کیا تھا۔ ”انسان بدلتا ہے“ پہلی فلم تھی۔ یہ زیبا کی تجویز تھی کہ وہ فلموں میں بطور ہیرو آئیں۔ معروف ہدایت کار اور ان کے دوست پرویز ملک نے بھی اس کی تائید کی۔ ”اولاد“ سے فنی سفر کا آغاز کیا، جس میں ان کے سپورٹنگ رول کو بہت سراہا گیا۔ ”ہیرا اور پتھر“ میں پہلی بار بطور ہیرو نظر آئے۔ ان کے پروڈکشن ہاؤس کی فلم ”ارمان“ کو پاکستانی انڈسٹری میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اس نے باکس آفس کے تمام ریکارڈ توڑ ڈالے۔ اس کے گیت ”کو کورینا“ ”اکیلے نہ جانا“ اور ”بے تاب ہو“ آج بھی سماعتوں میں رس گھولتے ہیں۔ ان کی فلم ”دیور بھابی“ کو

خواجہ شمس الدین عظیمی معروف بزرگ قلندر بابا اولیا کے مرید ہیں، جن کا تعلق بابا تاج الدین ناگوری کے خاندان سے تھا۔ وہ 17 اکتوبر 1927ء کو ضلع سہارنپور، یوپی میں پیدا ہوئے۔ زندگی کا کچھ زمانہ مشرقی پاکستان میں گزرا۔ یہاں آ کر انہوں نے قلندر بابا اولیا کی نگرانی میں سلوک کی منازل طے کیں۔ انہوں نے سیرت، روحانیت، پیراسائیکالوجی اور دیگر موضوعات پر 61 کتابیں تصنیف کیں۔ انگریزی اور روسی سمیت ان کی کتب کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان کے مقالات کئی درس گاہوں میں نصاب کا حصہ بنے۔ خواجہ شمس الدین عظیمی نے پاکستان اور بیرون پاکستان کی یونیورسٹیز، تعلیمی اور دیگر اداروں میں پچھڑ دیے۔



کامیابی کے کیریئر کا آغاز اس وقت کیا، جب وہ این ای ڈی میں زیر تعلیم تھے۔ 1988ء میں آنے والا ”جانے جاں سن“ پہلا البم تھا۔ اس کے بعد ”چاہت“، ”ترنگ“ اور ”قرار“ آئے۔ ”قرار“ ان کے کیریئر کا عروج ثابت ہوا۔ شہرت اسکینڈلز بھی ساتھ لائی۔ بعد کے برسوں میں وہ ذاتی مسائل میں الجھے نظر آئے۔ انہیں دھمکیاں ملنے کی بھی خبریں آئیں جس کی وجہ سے وہ انڈسٹری سے دور ہو گئے۔ واپسی کے بعد ان کی توجہ کا اصل محور نعتیں اور صوفیانہ کلام رہا۔

ان کے نزدیک انسان کی زندگی کا مقصد روحانی علوم کا حصول اور روح کی بالیدگی ہے، جس کے لیے پیغمبروں اور صوفیاء کے نقش قدم پر چلنا ضروری ہے۔ وہ روحانی بالیدگی کے لیے مراقبہ کو شرط تصور کرتے ہیں۔ ان کی تعلیمات میں مرد اور عورت کو یکساں مقام حاصل ہے۔

راشد لطیف

جب البانی کے جذبے سے سرشار راشد لطیف پاکستانی کرکٹ میں حق گوئی کا استعارہ ہیں۔ جس زمانے میں انہوں نے بیچ فلنگ جیسے ناسور کی نشان دہی کی، اس وقت کلمہ حق کہنے کے لیے بڑی جرات درکار تھی۔

اس باصلاحیت کھلاڑی نے 37 ٹیسٹ میچز میں 1381 رنز اسکور کیے۔ ویسٹ انڈیز کے خلاف 150 رنز ٹیسٹ کیریئر کی سب سے بڑی اننگز۔ ٹیسٹ میں وکٹوں کے پیچھے سے 130 شکار کیے۔ جن 37 ٹیسٹ میچز میں راشد نے دستاں سنبھالے، ان میں سے 25 میں پاکستان نے کامیابی حاصل کی۔ 166 ون ڈے میچز میں ان کے بلے نے تین نصف سنچریاں اگلیں۔ وکٹوں کے پیچھے 220 شکار کیے۔

وہ 14 اکتوبر 1968ء کو کراچی کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ 84ء میں میٹرک کرنے کے بعد گورنمنٹ سائنس کالج ملیر کینٹ سے انٹر کیا۔ این ای ڈی یونیورسٹی میں داخلہ لیا گیا مگر کرکٹ کے عشق کے باعث تعلیمی سفر ادھورا رہ گیا۔

”قائد اعظم کرکٹ کلب“ سے کلب کرکٹ کا آغاز

شمس الدین عظیمی

پاکستان کے جن روحانی اسکالر کو عالمی توجہ ملی، ان میں خواجہ شمس الدین عظیمی نمایاں ہیں۔ اس کا سبب ان کی روحانیت اور سائنس کو قریب لانے کی منظم و مربوط کوششیں ٹھہریں، جو مراقبہ ہال، اکیڈمی، کتب، مقالات اور سیمینارز کی صورت ظاہر ہوئیں۔ انہوں نے مابعد الطبیعیات کی تفہیم کی نئی صورت پیدا کی۔ ان کا شروع کردہ ”روحانی ڈائجسٹ“ اس موضوع پر اردو کا مقبول ترین پرچہ ہے۔ کلر تحریر اپنی، یعنی



رنگوں کے ذریعے علاج ان کا مقبول سلسلہ ہے۔ ان کے قلمی سفر کا آغاز اخبارات و رسائل میں قارئین کے خطوط کا جواب اور خوابوں کی تعبیر جیسے سلسلوں سے ہوا۔ آج ان کے شاگرد یہ سلسلے سنبھالے ہوئے ہیں۔



گیارہ برس کے تھے کہ والدہ کا انتقال ہو گیا۔ کچھ عرصے بعد والد کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا مگر وہ ان سانحات سے ابھر آئے۔ 1944ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے گریجویشن کرنے کے بعد فلسفے اور انگریزی میں ایم اے کیا۔ 1954ء



ہوا۔ پھر ملیر جیم خانہ کا حصہ بن گئے۔ 87ء میں کراچی انڈر 19 کا حصہ بنے۔ 90-89 کے ڈومیسٹک سیزن میں 47 شکار کیے۔ 92ء میں انگلینڈ کا دورہ کرنے والی ٹیم کے لیے منتخب ہوئے۔ ٹیسٹ ڈیبیو پر شان دار نصف سنچری

اسکور کی۔ ٹیم آسٹریلیا گئی، تو وہاں بھی کارکردگی متاثر کن رہی۔ یوں وہ قومی ٹیم کا مستقل حصہ بن گئے۔ چار سال بعد میچ فلکسٹ کے انکشافات سامنے آئے۔ وہ زمبابوے کا ٹور چھوڑ کر واپس پاکستان آ گئے۔ ڈیڑھ برس سچ کہنے کی پاداش میں ٹیم سے دور رکھا گیا۔ 96ء میں واپسی ہوئی تو آسٹریلیا کے خلاف آٹھ شکار کر کے دسیم باری کا ریکارڈ توڑا۔ انگلینڈ کے دورے پر انہوں نے اپنی جگہ معین خان کے لیے خالی کر کے انوکھی مثال قائم کی۔ 98ء میں انہیں قیادت سونپی گئی۔ آنے والے برسوں میں کئی نشیب و فراز آئے۔ کبھی ٹیم سے باہر ہو جاتے۔ لوٹتے تو پکتان بنا دیے جاتے۔ ورلڈ کپ 2003ء میں پاکستان کی مایوس کن کارکردگی کے بعد ٹیم کی تشکیل نو کا فیصلہ کیا گیا تو قیادت پھر ان کے حصے میں آئی مگر ایک بار پھر حالات بگڑنے لگے۔ آئی سی سی نے ان پر چند میچز کی پابندی عاید کر دی۔ اس کے بعد انضمام الحق کو قیادت سونپ دی گئی۔ کچھ عرصے بعد انہوں نے ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیا۔

انہوں نے 2000ء میں کراچی میں راشد لطیف اکیڈمی کی بنیاد رکھی جس کے طفیل پاکستان کرکٹ کو کئی باصلاحیت کھلاڑی ملے۔

جسٹس جاوید اقبال

یوں تو شاعر مشرق کا بیٹا ہونا ہی ایک مضبوط حوالہ ہے مگر ڈاکٹر جاوید اقبال کی قانون اور فلسفے کے میدان میں خدمات بھی کسی صورت نظر انداز نہیں کی جاسکتیں۔ عصری اسلامی نظریہ اور سیاسی فلسفے پر گراں قدر تحقیق کرنے والے یہ صاحب 5 اکتوبر 1924ء کو علامہ اقبال کی دوسری زوجہ سردار بیگم کے بطن سے پیدا ہوئے۔ انہی

نامہ سرگزشت
READING
Section

صبیحہ خانم

16 اکتوبر 1936ء کو کجرات میں پیدا ہونے والی صبیحہ خانم کا اصل نام مختار بیگم ہے۔ ان کے کیریئر کی کہانی دل چسپ ہے۔ 1948ء میں سیالکوٹ میں ہونے والی ایک تقریب میں مختار بیگم نے فلم سسی پنوں کا ایک گیت گایا، تو سامعین سے شان دار رد عمل ملا۔ معروف ڈراما رائٹر اور شاعر نفیس خلیلی کو ان کی قابلیت نے متاثر کیا۔ انہوں نے ہی نے مختار بیگم کا نام صبیحہ خانم رکھا، ان کی درخواست پر مسعود پرویز نے ”بیلی“ میں انہیں موقع دیا۔ اس کے بعد وہ ”دو آنسو“ میں نظر آئیں۔ فلم ”آغوش“ میں بھی ان کی صلاحیتیں ابھر کر

اکتوبر 2015ء

132

کنارے ایک چھوٹی سی بستی میں رہائش اختیار کی۔ وہیں مرزا قلیچ بیگ کی پیدائش ہوئی۔

انہوں نے انتہائی قلیل عرصے میں سندھی، عربی اور فارسی پر عبور حاصل کر لیا۔ ان کے والد جدید تعلیم کی اہمیت سے واقف تھے۔ ان ہی کی کوششوں سے مرزا قلیچ بیگ نے 1872ء میں میٹرک کیا۔ پھر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے بمبئی چلے گئے۔ کچھ عرصے وہ بمبئی یونیورسٹی میں پڑھاتے بھی رہے مگر والدہ کی وفات کی وجہ سے سندھ لوٹ آئے۔ یہاں انہوں نے سرکاری ملازمت اختیار کی۔ وہ شکار پور کے تحصیل دار ہو گئے اور ترقی کرتے کرتے کلکٹر کے عہدے تک پہنچے۔ وہ سندھ میں اس عہدے تک پہنچنے والے پہلے مقامی تصور کیے جاتے ہیں۔ 1910ء میں ریٹائر ہوئے۔

ان کی زندگی علم و ادب کی ترویج کے لیے وقف تھی۔ انہوں نے عالمی ادب کا سندھ میں ترجمہ کیا اور ایسی بہت سی کتابیں تصنیف کیں، جو سندھی ادب میں رجحان ساز ثابت ہوئیں۔ 3 جولائی 1929ء کو ان کا انتقال ہوا۔

نعمت اللہ خان

2001ء میں کراچی کے ناظم کا عہدہ سنبھالنے والے نعمت اللہ خان کا شمار موجودہ جماعت اسلامی کے اہم رہنماؤں میں ہوتا ہے۔ وہ کراچی کے ناظم کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دے چکے ہیں۔

وہ یکم اکتوبر 1930ء کو انجیر میں پیدا ہوئے۔ شاہ جہاں پور سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پاکستان آنے کے بعد



انہوں نے انتہائی کمپری کے حالات میں سفر شروع کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔ کراچی یونیورسٹی سے قانون اور صحافت کی ڈگریاں لیں۔ پھر وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ جماعت اسلامی کا حصہ بننے کے بعد کلیدی

عہدوں پر فائز رہے۔ جماعت کو شہر کراچی میں منظم کرنے میں مرکزی کردار ادا کیا۔ تمام تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ 85ء کے انتخابات کے بعد وہ سندھ اسمبلی میں اپوزیشن



سامنے آئیں۔ 50 کی دہائی میں وہ فلم بینوں کے دلوں کی دھڑکن تھیں۔ 1953ء میں انور کمال یا شا کی فلم ”غلام“ میں ان کی اداکاری نے سب کو چونکا دیا۔ سنٹوش کمار اور ان کی جوڑی بہت مقبول ہوئی۔ ان کی معروف

فلموں میں وعدہ، یاسبان، شیخ چلی، سات لاکھ، گنام، دیوانہ، سسی، سوہنی، چھوٹی بیگم، داتا، مغل، پرواز، طوفان، موسیقار، سرفروش نمایاں ہیں۔ کئیر، دیور بھابی، پاک دامن، انجمن، محبت، تہذیب، ایک گناہ اور سبھی میں انہوں نے کریکٹروں کیے۔ انہوں نے اردو اور پنجابی دونوں زبانوں کی فلموں میں اپنے یکساں جوہر دکھائے۔ وہ پاکستانی سلور اسکرین کی پہلی خاتون تھیں جنہیں پرائڈ آف پرفارمنس ملا۔

مرزا قلیچ بیگ

شمس العلماء کا خطاب پانے والے مرزا قلیچ بیگ ایک عہد ساز شخصیت تھے۔ سندھی ادب میں جدید رجحانات متعارف کروانے کا سہرا ان ہی کے سر ہے۔ اس زبان کے ابتدائی ماہر لسانیات میں ان کی گنتی ہوتی ہے۔ ان کے افکار نے اس خطے پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

وہ 7 اکتوبر 1853ء کو موجودہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے اجداد کا تعلق جورجیا سے تھا۔ ان کے والد

مرزا فریدوں بیگ ایک جنگی قیدی کی حیثیت سے عثمانی اور ایرانی درباروں سے ہوتے ہوئے تالپور دربار تک پہنچے۔ اپنی ذہانت اور قابلیت کے طفیل وہ جلد ہی شاہ کے نزدیک آگئے۔ انگریزوں کے قبضے کے بعد انہوں نے دریائے سندھ کے



سمجھوتا نہیں کیا۔ نیپ کی حکومت کے خاتمے پر وزارت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس جراث کی پاداش میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ بھٹو سے اختلافات تھے مگر ضیاء الحق کا ساتھ دینا گوارا نہیں تھا۔ انہوں نے ”ایم آر ڈی“ کے پلیٹ فارم سے بحالی جمہوریت کے لیے آواز اٹھائی۔ بعد کے برسوں میں وہ مختلف ترقی پسند جماعتوں کے پلیٹ فورم سے سرگرم رہے۔ 98ء میں ”تحریک انصاف“ کا حصہ بن گئے مگر 2003 میں اختلافات کے بعد راستے جدا ہو گئے۔

حمید اختر خان

ایسی شخصیات کم ہی ہوتی ہیں، جو صلے کی خواہش سے بے پروا ہو کر اپنی زندگی انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کر دیں۔ درویش صفت حمید اختر خان بھی ایسے ہی شخص تھے۔ وہ ایک ترقی پسند مفکر اور زرعی و عمرانی سائنس داں تھے، جنہیں اس خطے میں دیہی ترقی کے لیے شروع کردہ پروگراموں کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔

وہ 15 جولائی 1914ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ مطالعے کے طفیل تاریخ، سیاست اور معیشت جیسے موضوع میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ آگرہ کالج اور میرٹھ کالج میں زیر تعلیم رہے۔ 1934ء میں ماسٹرز کرنے کے بعد تدریس کی سمت آ گئے، بعد ازاں سول سروس کا حصہ بن گئے۔ کلکٹر کی حیثیت سے انہیں بنگال کے دیہی علاقوں میں کام کرنے کا موقع ملا۔ 1943ء کے قحط نے گہرے اثرات مرتب کیے۔ انہوں نے انڈین سول سروس سے استعفیٰ دے دیا۔ پھر جامعہ ملیہ دہلی کا حصہ بن گئے۔ 1950ء میں پاکستان چلے آئے۔



اگلے آٹھ برس مشرقی پاکستان کے کومیلا وکٹوریا کالج کا حصہ رہے۔ اسی زمانے میں دیہی مسائل ان کی توجہ کا محور بنے۔ انہوں نے نہ صرف ان پر تحقیق کی، بلکہ دیہی ترقی کے موضوع پر امریکا سے تربیت بھی حاصل کی اور کومیلا میں پاکستان اکیڈمی فار رورل ڈیولپمنٹ اور کومیلا کا پریٹو پائلٹ پروجیکٹ کی بنیاد رکھی، جس نے اس علاقے کا نقشہ بدل

لیڈ رہے۔ جماعت اسلامی کے تحت کام کرنے والے قلاتی عظیم الخدمت کی ذمے داریاں سنبھالیں۔ 2002ء میں کراچی کے ناظم بنے۔ ان کے زمانے میں شہر میں کئی ترقیاتی منصوبے شروع کیے گئے۔ ان کے مخالفین بھی ان کا ذکر بڑے احترام سے کرتے ہیں۔

معراج محمد خان

مائیہ ناز ترقی پسند سیاست داں، معراج محمد خان 19 اکتوبر 1938ء کو ناگ پور، ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد تاج محمد خان طبیب تھے۔ وہ ممتاز صحافی رہنما مہناج برنا کے چھوٹے بھائی ہیں۔

وہ جامعہ ملیہ، دہلی میں زیر تعلیم رہے۔ 56ء میں پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کیا۔ ایس ایم آرٹس کالج، کراچی میں سوشلسٹ نظریات سے متعارف ہوئے۔ 57ء میں نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا حصہ بنے۔ 58ء میں امریکی



صدر، آئزن ہاور کی پاکستان آمد کے موقع پر احتجاج کی منصوبے بندی کے الزام میں پہلی بار گرفتار ہوئے۔ ایوب سرکار کے خلاف طلباء کو منظم کیا اور کئی تحریکوں کی قیادت کی۔ مارشل لا کورٹ نے انہیں ایک سال کی سزا سنائی۔ 62ء میں انہیں شہر بدر کر دیا گیا۔

پولو گراؤنڈ، کراچی میں کنونشن مسلم لیگ کا پہلا ہوتا تھا جلسے کو سبوتاژ کرنے والوں کی قیادت معراج محمد خان ہی کر رہے تھے۔ اس جرم میں پھر شہر بدری کا حکم صادر ہوا۔ 64ء کے صدارتی انتخابات میں فاطمہ جناح کا ساتھ دیا۔ گو حکومت نے خریدنے کی کوشش کی مگر وہ ڈٹے رہے۔ ایوب خان کی کابینہ سے الگ ہونے کے بعد جب بھٹو صاحب نے پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی، تو یہ معراج محمد خان ہی تھے، جنہوں نے ان کا پیغام ملک بھر کے طلباء تک پہنچایا۔ اسی زمانے میں بھٹو صاحب نے انہیں اپنا چائٹمن مقرر کیا۔ انہوں نے مشرقی پاکستان میں ہونے والے فوجی آپریشن کی مخالفت کی۔

پیپلز پارٹی کی حکومت میں وہ وزیر تھے مگر اصولوں پر

گھر کے ہر فرد کے لئے
بے مثال تحریروں کا مجموعہ

کراچی
ماہنامہ
پاک سوسائٹی

میں نیا دل گدا از سلسلے وار ناول

مگر شدہ
محبت

بہت جلد صفحات کی زینت بننے جا رہا ہے

ہردلعزیز اور مایہ ناز مصنفہ

انجم انصار

کے ماہرانہ قلم کا شاہکار..... شوخ و چنگل..... جملوں
سے سجا..... معاشرتی و نفسیاتی گہری کھولتا یہ ناول
محبت کے ایک نئے اور بے حد خوب صورت رنگ سے
بھی روشناس کرائے گا۔

دیا۔ ان کی ادارت کو بھی بواروں کے ساتھ بیرون ملک بھی
سراہا گیا۔ کئی درس گاہوں نے انہیں اعزازات سے نوازا۔
مستوطان ڈھاکہ کے بعد پاکستان چلے آئے۔ انہوں نے
حکومت کو کومیل ماڈل کی پاکستان کے پسماندہ دیہی
علاقوں میں اطلاق کی پیشکش کی مگر سیاسی بنیادوں پر اس
مضمندانہ پیشکش کو رد کر دیا گیا۔ انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ
مختلف پیٹ فورمز سے اپنے خیالات لوگوں تک پہنچاتے
رہے۔ 2008 کی دہائی میں انہوں نے اورنگی پبلک پروجیکٹ
کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے چھوٹے قرضوں کے انقلابی
تصورات متعارف کروائے۔ 19 اکتوبر 1999ء کو ان کا
امریکا میں انتقال ہوا۔

سعید اجمل

جنب شہزاد آفاق آف اسپینز مرزا دھرن دنیائے
کرکٹ سے رخصت ہو رہے تھے، تب ایک ایسے پاکستانی
کھلاڑی نے میدانوں میں قدم رکھا، جو صلاحیتوں میں یکتا
تھا۔ کچھ ہی برس بعد اسے جادوگر کہہ کر پکارا جانے لگا۔ مگر
کیریئر کے اوج پر بد قسمتی نے اس پر حملہ کر دیا، مشکوک ایکشن
کا آسیب پیچھے لگ گیا۔ آج یہ کھلاڑی اپنی کھوئی ہوئی فارم
حاصل کرنے میں بٹتا ہے۔

یہ سعید اجمل کا تذکرہ ہے، جنہوں نے 14 اکتوبر
1977ء کو فیصل آباد میں آنکھ کھولی۔ 18 برس میں عمر میں
فرسٹ کلاس کرکٹ شہینی شروع کی۔ اس فارمیٹ میں سنی ہی
کا میا بیاں اپنے نام کیں مگر قومی ٹیم کا حصہ بننے کے لیے انہیں
تھوڑا انتظار کرنا پڑا۔ انہوں نے 33 ٹیسٹ میچز میں 169
وکٹیں حاصل کیں۔ دس
وکٹیں لینے کا کارنامہ
چار بار انجام دیا۔ ایک
انٹرنیشنل سات وکٹیں
لیتا ان کی بہترین
کارکردگی تھی۔ 110
رون ڈے میچز میں ان
کی وکٹوں کی تعداد
182 ہے۔ اپنے کیریئر
میں انہیں مصباح الحق



کی بھرپور حمایت حاصل رہی۔
رون ڈے کیریئر کا آغاز 2 جولائی 2008ء کو انڈیا کے

تھا مگر مقبولیت نے جلد ہی اسے مفت روزہ اور پھر 1944ء میں روزنامے کے قالب میں ڈھال دیا۔ ان پر فکر اقبال کے گہرے اثرات تھے۔ ان کے اداریے شاعر مشرق کے نظریات کی تشریح میں خاصے معاون تھے۔

مسائل اور محدودات کے باوجود انہوں نے نوائے وقت کو عوام کی آواز بنا دیا۔ ان کی تحریروں نے تحریک پاکستان کو نظریاتی قوت عطا کی۔ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے جمہوریت کی بھرپور حمایت کی۔ وہ اسکندر مرزا اور ایوب مارشل کے آمرانہ اقدامات کے مخالفین میں شمار ہوتے تھے اور آمریت کو سیاہ رات کہا کرتے تھے۔ کمونزم پر بھی ان کا موقف خاصا سخت تھا۔

25 فروری 1962ء کو ان کا لاہور میں انتقال ہوا۔ اس واقعے پر ملک بھر میں سوگ منایا گیا۔ تجزیہ کاروں کے مطابق انہوں نے اردو صحافت میں جو رجحان متعارف کروائے، انہوں نے باقاعدہ ایک اسکول کی شکل اختیار کر لی جس کے ماننے والے آج بھی ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔

سلمان بٹ

انسان جو بولتا ہے، وہی کاٹتا ہے، سلمان بٹ اس کی ایک بڑی مثال ہیں۔ ایک کھلاڑی جس کے روشن مستقبل کی پیش گوئیاں کی جا رہی تھیں جو پاکستانی ٹیم کی کپتانی کے نزدیک پہنچ گیا تھا، اسپاٹ فلنگ کے چنگل میں پھنس کر خود تباہ کر بیٹھا۔

پانچ سال کی پابندی اور جیل بھگتنے کے بعد اب سلمان بٹ انٹرنیشنل کرکٹ میں واپسی کے لیے کوششیں کر رہے ہیں۔ ان کی صلاحیتوں سے انکار نہیں مگر راہ میں حائل رکاوٹیں اور ان کے بارے میں پائے جانے والے منفی تصور کی وجہ سے یہ سہل نہیں ہوگا۔



بائیں ہاتھ سے بیٹنگ کرنے والے سلمان بٹ نے 17 اکتوبر 1984ء کو لاہور میں آنکھ کھولی۔ اپنی قابلیت کے بل بوتے پر انیس برس کی عمر میں قومی ٹیم کا حصہ بن گئے۔ 2003ء

خلاف کیا۔ 2009ء میں سری لنکا کے خلاف انہیں ٹیسٹ میں موقع ملا۔ جلد وہ ٹیم کا مستقل حصہ بن گئے۔ ان کی گیند ”دوسرا“ بے بازوں کے لیے درد سہمی۔ ان کا شمار دنیا کے خطرناک ترین کھلاڑیوں میں ہونے لگا تھا۔

2011ء میں انہوں نے پچاس وکٹیں لے کر اپنی عظمت ثابت کر دی۔ 2012ء میں انگلینڈ کے خلاف ٹیسٹ سیریز میں انہوں نے 24 کھلاڑیوں کو پولیٹین کا راستہ دکھایا۔

کامیابی اپنی جگہ مگر تنازعات نے کبھی پیچھا نہیں چھوڑا۔ 2009ء میں ان کا ایکشن پہلی بار مشکوک قرار دیا گیا۔ 2015ء میں اسی باعث وہ ورلڈ کپ اسکوڈ سے باہر ہو گئے۔ ثقلمین مشتاق کی نگرانی میں ان کا ایکشن درست کیا گیا۔ تجزیہ کاروں کا خیال ہے کہ ایکشن کی تبدیلی کے بعد اب وہ پہلے جتنے موثر نہیں رہے۔

حمید نظامی

جدید اردو صحافت کے نمایاں ترین مدیران میں حمید نظامی کسی روشن ستارے کی مانند ہیں۔ پاکستانیت کے اس علم بردار کی زندگی جدوجہد سے عبارت تھی۔ انہوں نے پوری ایک نسل کی آبیاری کی۔

وہ اکتوبر 13 اکتوبر 1915ء کو لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کے مضافات میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اسلامیہ کالج سے گریجویشن کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کا مرحلہ طے ہوا۔

زمانہ طالب علمی وہ سیاست میں خاصے متحرک رہے۔ وہ مسلم لیگ کی



ذیلی تنظیم پنجاب فیڈریشن آف مسلم لیگ کے بانیوں میں سے تھے۔ اس کے صدر کی حیثیت سے فعال کردار ادا کیا۔ صحافت میں قدم رکھا، تو قلم کو نظریات کی ترویج کا ذریعہ بنایا جس کی وجہ سے مسلم لیگی قائدین میں انہیں پسند کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

1940ء میں انہوں نے نوائے وقت شروع کیا جس نے اردو صحافت پر دیر پا اثرات مرتب کیے۔ پہلے یہ ماہ نامہ

میں بنگلادیش کے خلاف اپنا پہلا ٹیسٹ کھیلا۔ اگلے برس ویسٹ انڈیز کے خلاف انہوں نے ون ڈے ڈیبیو کیا۔ جلد وہ ٹیم کا مستقل حصہ بن گئے۔ انہوں نے 33 ٹیسٹ میچز میں تین سنچریوں کی مدد سے 1,889 رنز اسکور کیے۔ 78 ون ڈے میچز میں آٹھ بار سو کا ہندسہ عبور کیا۔

جولائی 2010ء میں ٹیم کی کپتانی سونپی گئی۔ انہوں نے انگلینڈ کو اس کے ہوم گراؤنڈ پر شکست دی۔ تجزیہ کاروں کو اُمید تھی کہ وہ طویل عرصے تک کپتانی کے عہدے پر فائز رہیں گے مگر اسپاٹ فلگنگ کے زلزلے نے پاکستان کرکٹ میں کھرام مچا دیا۔ یہ دنیائے کرکٹ کے تہلکہ خیز ایکنڈز میں سے ایک تھا جس میں وہ براہ راست ملوث تھے۔ انہیں کپتانی اور ٹیم میں اپنی جگہ سے ہاتھ دھونا پڑا۔ پانچ برس کی سزا سنائی گئی۔ انہیں محمد آصف اور محمد عامر کے ساتھ جیل جانا پڑا۔ گو وہ انٹرنیشنل کرکٹ میں واپسی کے لیے پُر امید ہیں مگر تجزیہ کاروں کے مطابق ان کا مستقبل ابہام کی دھند میں لپٹا ہے۔

جسٹس ایم آر کیانی

پاکستان کی عدالتی تاریخ پر جن منصفوں نے انمٹ نقوش چھوڑے، ان میں جسٹس ایم آر کیانی کا نام بھی شامل ہے۔ آمریت کے خلاف تو انا ترین آواز تصور کیے جانے والے یہ صاحب 1958ء سے 1962ء تک مغربی پاکستان کے چیف جسٹس رہے۔

وہ 18 اکتوبر 1902ء کو کوہاٹ میں خان بہادر عبدالصمد خان کیانی کے گھر پیدا ہوئے۔ انہوں نے کوہاٹ کے اسلامیہ ہائی اسکول سے میٹرک کرنے کے بعد ایڈورڈ کالج لاہور سے ایف اے کیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی میں ماسٹرز کی سند حاصل کی۔



سول سروس سے اپنا کیریئر شروع کیا۔ 1938ء میں ان کا تبادلہ قانون کے محکمے میں ہو گیا۔ 1949ء میں وہ پنجاب ہائی کورٹ کے جج بنے۔ آنے والے برسوں میں وہ کئی اہم عہدوں پر فائز رہے۔

عدالت میں ویسے جانے والے ان کے ریمارکس ان کی دلیری، ذہانت اور بذلہ سنجی کی مثال تھے۔ ان کی تقریر میں کاٹ اور گہرے معنی پوشیدہ ہوتے۔ اخبارات میں ان ریمارکس کو خصوصی توجہ دی جاتی۔ حق گوئی کے ایسے جو یا کہ صدر پاکستان کو بھی رعایت نہیں دیتے تھے۔ ان کی تقریر Not the Whole، The Whole Truth اور Half Truth، Truth A judge May Laugh کے زیر عنوان کتابی صورت میں آئیں اور بیسٹ سیلر ثابت ہوئیں۔

وہ 1962ء میں ریٹائر ہوئے۔ ماہرین کا خیال تھا کہ وہ مستقبل کے چیف جسٹس بننے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں مگر شاید آمریت کا ناقد ہونے کی وجہ سے انہیں اس عہدے کے لیے مناسب خیال نہیں کیا گیا۔ عوام کی جانب سے انہیں ”لسان پاکستان“ کا خطاب دیا گیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ان کے بیانات کا مقصد مشکل کے دنوں میں عوام کا مورال بلند رکھنا اور انہیں ڈپریشن سے نکالنا تھا۔ وہ مشرقی پاکستان میں بھی بہت مقبول تھے۔ نومبر 1962ء میں انہوں نے ڈھا کا بار کی دعوت پر دورہ کیا۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔ بستر کے قریب میز پر ان کی نامکمل تقریر دھری تھی جو وہ اس شام کرنے والے تھے۔

فواد عالم

جن کھلاڑیوں کو پاکستان کرکٹ کا مستقبل کہا جاتا ہے، ان میں ایک نام فواد عالم کا بھی ہے۔ ورلڈ کپ



2015ء کے بعد انہیں کپتانی کا مضبوط امیدار تصور کیا جا رہا تھا مگر قرعہ قال اظہر علی کے حق میں نکل آیا۔

بائیں ہاتھ سے بلے بازی کرنے والے فواد عالم نے 8 اکتوبر 1985ء کو کراچی میں آنکھ کھولی۔ کرکٹ کا شوق

دراشت میں ملا۔ ان کے والد فرسٹ کلاس کرکٹ کے ایک جانے مانے کھلاڑی تھے۔ فواد نے اپنے باصلاحیت والد کے نقوش پا کا تعاقب کیا۔ 17 سال کی عمر میں فرسٹ کلاس کیریئر کا

شاعری اور ہدایت کاری بھی ان کی شناخت کا اہم حوالہ تھا۔ انہوں نے ہمز، چنگاری اور گھونگٹ جیسی معیاری فلمیں بنائیں۔ فیض احمد فیض کے ساتھ ان کی بہت اچھی دوستی رہی۔ خواجہ صاحب نے کبھی اصولوں پر سمجھوتا نہیں کیا۔ اس منفرد فن کار نے 130 اکتوبر 1984ء کو جہان فانی سے کوچ کیا۔ ان کی موت پر احمد راہی نے کہا تھا۔ ”عزت کی روٹی تو سب کھاتے ہیں لیکن عزت سے بھوکا رہنا صرف خورشید صاحب کو آتا تھا۔“

نعیم بخاری

ہیں تو وہ وکیل مگر شہرت کا اصل حوالہ ٹی وی شو کی میزبانی۔ اس میدان میں وہ رحمان سا زرارہ پائے۔

127 اکتوبر 1948ء کو لاہور میں پیدا ہونے والے نعیم بخاری کی بذلہ سخی، بے ساختگی اور گفتگو میں پنجابی زبان کے تڑکے نے انہیں اپنے ہم عصروں میں نمایاں مقام عطا کیا۔

ان کے والد ڈاکٹر سید الطاف حسین بخاری ایک جانی مانی شخصیت تھے۔ نعیم صاحب معروف ٹیٹ کرکٹر سلیم الطاف بخاری کے چھوٹے بھائی ہیں۔ انہوں نے پی ٹی وی کے کئی معروف شو کی میزبانی کی۔ جیو ٹی وی کے مقبول



پروگرام ”خبرناک“ کی میزبانی بھی کی۔

بطور وکیل بھی ایک معروف شخصیت ہیں۔ تنازعہ بھی رہے۔ 2007ء میں ان کے چیف جسٹس افتخار چوہدری کے خلاف لکھے خط ہی کو اس عدالتی بحران کا بنیادی سبب تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد پرویز مشرف نے افتخار چوہدری کو معطل کر دیا تھا۔ اس واقعے کے بعد پنجاب بار کونسل نے ان کی ممبر شپ منسوخ کر دی تھی۔

آغاز کرنے والے اس نوجوان نے اس فارمیٹ میں کامیابیوں کی کتنی ہی داستانیں رقم کیں۔ اس وقت وہ نیشنل بینک اور پاکستان اے ٹیم کی کپتان ہیں۔ انہوں نے 2007ء میں سری لنکا کے خلاف اپنا پہلا ون ڈے کھیلا۔ دو برس بعد اسی ٹیم کے خلاف ٹیسٹ ڈیبیو کیا۔ گوٹیٹ میں انہوں نے 168 رنز کی ایک یادگار اننگز کھیلی مگر انہیں فقط تین میچز ہی میں موقع مل سکا۔ انہوں نے 35 ون ڈے میچز میں 948 رنز اسکور کیے۔ 24 ٹی 20 میچز میں پاکستان کی نمائندگی کی۔ وہ اٹلے ہاتھ سے گیند کرنے والے اچھے پارٹ ٹائم بولر ہیں۔ ان کا شمار موجودہ نسل کے بہترین فیلڈرز میں ہوتا ہے۔

خواجہ خورشید انور

خواجہ خورشید انور کو دھنوں کا جادو گر کہا جائے تو غلط نہیں

ہوگا۔ مہدی حسن کی دل کش آواز میں ریکارڈ ہونے والا گیت ”مجھ کو آواز دے“ اور میڈم نور جہاں کے گائے ہوئے ”دل کا دیا جلایا“ اور ”رم جھم رم جھم پرے پھوار“ ان ہی کی دھنوں پر مشتمل تھے۔



خواجہ خورشید انور 21 مارچ 1912ء کو میانوالی میں

پیدا ہوئے۔ ان کے والد خواجہ فیروز الدین ایک معروف وکیل تھے۔ انہوں نے 1935ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے فلسفے میں ایم اے کیا۔ 1936ء میں آئی سی ایس کا امتحان پاس کیا، لیکن ان کے انقلابی نظریات اور بھگت سنگھ کی تنظیم بھارت سما سے وابستگی راہ میں رکاوٹ بن گئی۔

سروں سے دوستی بچپن ہی میں ہو گئی تھی۔ تخلیقی سفر کا آغاز 1939ء میں آل انڈیا ریڈیو، لاہور سے ہوا۔ 1941ء میں بطور موسیقار فلمی انڈسٹری میں قدم رکھا۔ جلد اپنی جگہ بنا لی۔ 1953ء میں لاہور منتقل ہو گئے۔ پاکستانی فلم انڈسٹری میں ان کی آمد تازہ ہوا کا جھوٹکا ثابت ہوئی۔ انہوں نے انتظار، ہیرا، نچھا اور کویل جیسی کامیاب فلموں کی موسیقی دی۔ فلم انتظار کا گانا ”چاند نیسے دنیا بے“ بہت مقبول ہوا، جو میڈم نور جہاں کی آواز میں ریکارڈ ہوا۔

تاخیر خالی از علت نہیں تھی۔ تخلیق کے اس سفر میں کسی اور نے بھی ہم سفر بننا تھا۔ تخلیق کی لذت کہ جس کے آگے اس مادی دنیا کے تمام ذائقے ہیچ ہیں۔ بالآخر زندگی کی شریک سفر میر انیس کی اہلیہ محترمہ بول انھیں۔ ”حضرت! کس الجھن میں ہیں آپ؟“

مرثیہ نگاری کے امام میر بے علی انیس (1803 تا 1874) ایک روز مشق سخن میں محو گھر میں ٹہل رہے تھے۔ اہل بیت طہین و طاہرین کی مدح میں ایک مصرع تو موزوں ہو گیا تھا۔ مگر اس پہ گرہ نہیں لگ رہی تھی مصرع تھا کہ۔

بانوئے نیک نام کی کھیتی ہری رہے
اسی کیفیت میں خاصی دیر گزری میر انیس تخلیق کے
سمندر میں غوطہ زن رہے۔ لیکن قدرت کی طرف سے یہ

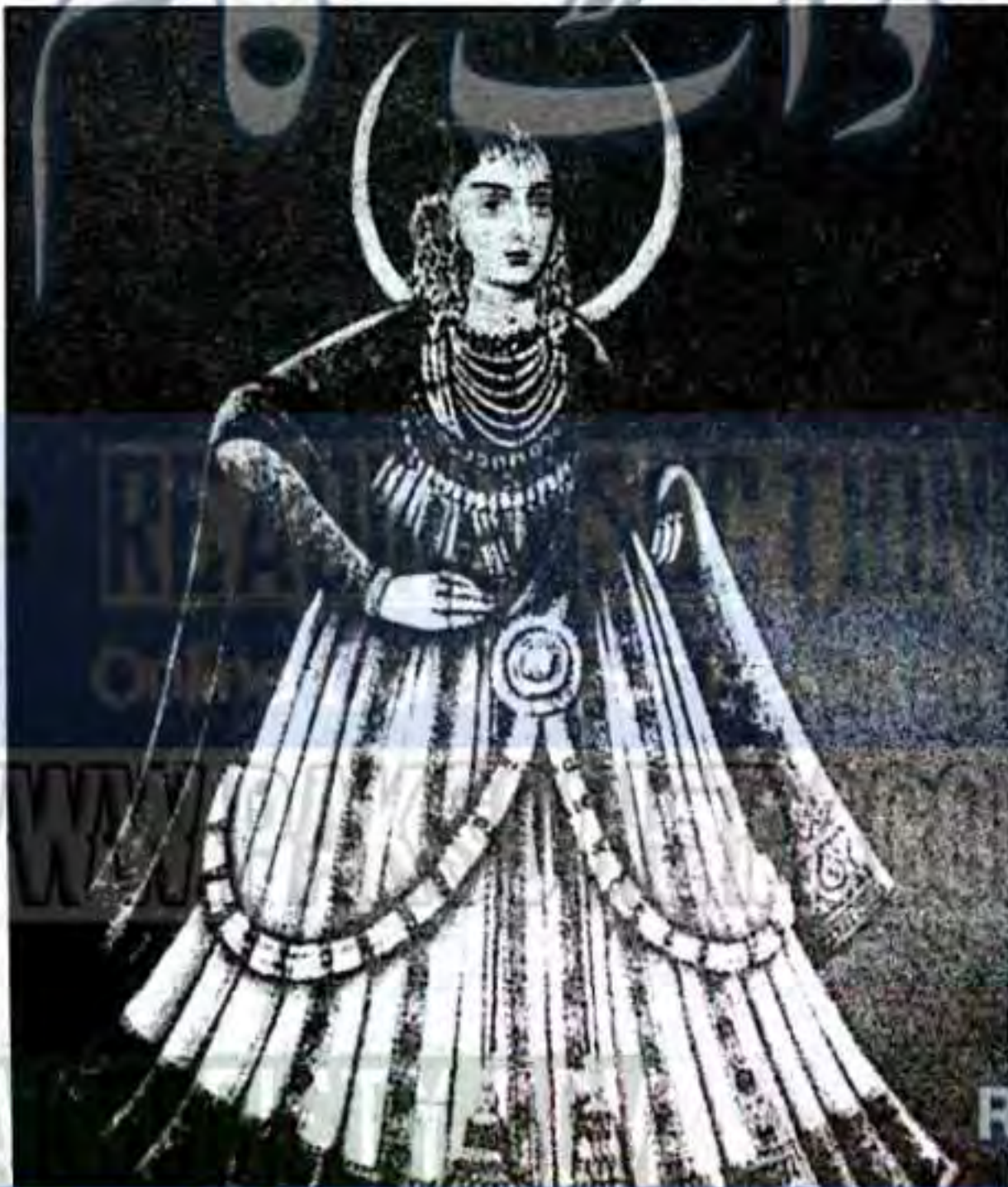
میر انیس بولے۔ ”بیوی! ایک مصرع موزوں ہوا ہے
اس پہ گرہ نہیں لگ رہی۔“ اس پر شریک حیات نے استفسار
کیا۔ ”اجی۔ میں بھی تو سنوں۔ مصرع کیا ہے؟“

شاعرات

محمد ایاز راہی

ادب میں شاعری کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس صنفِ سخن کے گیسو کو سنوارنے میں شاعرات کی تعداد بھی کم نہیں اس دور میں جب لڑکیوں کو ابجد تک سکھایا نہیں جاتا تھا، اس دور میں بھی کئی شاعرات نے اعلیٰ درجے کی شاعری میں نام پیدا کیا۔

ادب نوازِ حلقے کے لیے تحریر، قصہ و لہجہ



READING
Section

کردیا کہ

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
نسوانی جمال۔ فن و ہنر میں ڈھل کے اک چکا چوندی
پیدا کر دیتا ہے۔ چند باکمال خواتین کا تعارف نذر قارئین
ہے۔

Downloaded from paksociety.com

سیفیو (سافو) SAPPHO (600 قبل از مسیح)

یہ لازوال شاعرہ آج سے تقریباً دو ہزار چھ سو سال پہلے
گزری ہے۔ اصل نام سافو تھا یونان کی بہت بڑی شاعرہ
اور نجیب الطرفین خاتون تھی۔ جزیرہ لیسبوس کی رہنے والی تھی
مگر زندگی کا زیادہ حصہ شہر "موتی لے نے" میں بسر کیا جو ماں کا
آبا کی شہر تھا۔ باپ غالباً جزیرہ لیسبوس اور ایتھنز کی کسی جنگ
میں مارا گیا تھا۔ اسے خاندان یا سسرال کی سیاسی سرگرمیوں کی
بناء پر سیفیو کو جلا وطنی بھی کاٹنی پڑی اور کچھ عرصہ وہ جزیرہ سلسلی
(صقلیہ) میں بھی پناہ گزیر رہی۔ یہ وہی جزیرہ سلسلی ہے
جہاں سیفیو سے کوئی تین سو سال بعد مشہور عالم انجینئر ریاضی
واں ارشمیدس (287 تا 213 قبل از مسیح) علم و ہنر کی روشنی
پھیلاتا رہا اس کے دریافت کردہ علم و حکمت کے اصول آج بھی
مسلم ہیں۔ سیفیو عام سی شکل و صورت، چھوٹے قد اور سانولے
رنگت کی خاتون تھی مگر قدرت نے اسے تخلیقی دولت سے مالا
مال کر رکھا تھا، اس زمانے میں یونان کی قدیم ریاستوں میں
عورت آزادی سے ابھی آشنا نہیں تھی مگر جزیرہ لیسبوس اس
سلسلے میں قدرے آزاد تھا۔ چنانچہ سیفیو نے لڑکیوں کے
لیے باقاعدہ تربیت گاہ (اکیڈمی) کھول رکھی تھی۔ جہاں اچھے
گھرانوں کی لڑکیوں کو تہذیب و آداب، گانا بجانا، رقص اور
سکھڑپنے کی تعلیم دی جاتی تھی۔ تربیت گاہ میں حسن کی دیوی
ایفرودیٹ (ونوس۔ زہرہ۔ ناہید۔ سوک۔ رنی وغیرہ) سے
عقیدت کا خاص اہتمام ہوتا۔ دیوی کی مدح میں مل جل
کر گیت گائے جاتے جو سیفیو کی تخلیق بھی ہوتے، رقص بھی
ہوتا، سیفیو خود بھی کھل کر اپنے اندرونی جذبات اور احساسات کا
اظہار کرتی اور دیگر لڑکیوں کی بھی حوصلہ افزائی کرتی۔ سو وہ ہم
جنس پرست کے طور پر مشہور ہو گئی جو کہ بالکل غلط ہے اس کی
آزاد خیالی اور روشنی طبع کو غلط رنگ دیا گیا۔ سیفیو شادی شدہ اور
ایک بچی کی ماں تھی جسے اپنی بچی سے بے حد پیار تھا۔ اس کی
اپنی زندگی میں اس کی شہرت بے داغ رہی مگر بعد میں صرف
اس کے آزاد کلام کو دیکھ کر کسی نے اسے طوائف کہا تو کسی نے
ہم جنس پرست۔ سیفیو کا کلام سات یا نو کتابوں پر مشتمل ہے۔
مگر تمام کھلمیں ادھوری اور ٹوٹی پھوٹی ہیں پھر بھی ان بے

میرا نہیں نے مصرع سنایا۔

بانوئے نیک نام کی کھیتی ہری رہے
خاتون خانہ نور ابولیس۔

صندل سے مانگ بچوں سے گودی بھری رہے
میرا نہیں بے ساختہ واہ کہہ اٹھے۔ یقیناً کسی لمبھی فن
و ہنر میں کامیاب مرد کے پیچھے عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ شاعری
کلی طور پر عطیہ، خداوندی ہے۔ اسی لیے شاعر کو تمکید الرحمن
(اللہ کا شاگرد) کہا جاتا ہے۔ بہ قول غالب

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں

غالب صریح خامہ نوائے سروش ہے

موزوں طبیعت یا ذہن انسان کا طرہ امتیاز ہے فرشتے
جنات یا کوئی دیگر مخلوق اس وصف سے عاری اور تخلیق کی
لذت سے نا آشنا مخلوق ہے۔ خود قرآن پاک اعلیٰ شعر۔ نظم اور
موزوں کلام سب کچھ ہے۔ سورہ رحمن کا صوتی آہنگ اور سورہ
کور کا شاعرانہ آہنگ کسی تعارف کا محتاج نہیں، فنون لطیفہ میں
شاعری کا شمار اولین اور بنیادی عنصر کے طور پر ہوتا ہے۔ دنیا
بھر کا مذہبی ادب نیز ادب عالیہ کا بیشتر حصہ شاعری اور موزوں
کلام پر ہی مبنی ہے۔ وہی بات کہ بقول انگریز شاعر جان کیٹس
(1795-10-31 تا 1821-02-23) "شاعری
رقص ہے اور نثر پیدل چلنے کا نام"۔ شاعری میں جہاں مردوں
نے نام کمایا وہاں خواتین شعرا بھی نمایاں نظر آتی ہیں۔ مرد
شعراء خدایان سخن کہلائے تو خواتین شعراء نے بھی صنف
شاعری میں آن مٹ نقوش چھوڑے اور دوام پایا۔ عورت
ذات بنیادی طور پر تخلیق کا کام کرنے کے لیے وجود میں آئی
ہے اسی لیے اسے باری (پیدا کرنے والی جنس) بھی کہا گیا اور
پھر جہاں ہر دو تخلیقی کام (افزائش نسل اور ادب نگاری) ایک ہی
ذات میں جمع ہو جائیں تو پھر عورت مرد سے یکسر علیحدہ، منفرد
اور یکساں نظر آتی ہے چنانچہ یہ ذات باری خدا اور انسان دونوں کا
تخلیقی رنگ اپنا کر خود کو لافانی روپ میں ڈھالتی ہے۔ ایسے
میں چند نا بالذہ روزگار خواتین نے مردوں کا چراغ بھی نہ جلنے
دیا۔ گو کہ ایسی خواتین بہت کم ہیں مگر تاریخ کے صفحات پر نقش
اور امر ہیں۔ ان کے فن اور عظمت کا اعتراف اسے اپنے
دور میں اپنوں پرانیوں، مردوزن اور چھوٹوں بڑوں سمی نے
کیا۔ عورت جس کا منصب چار دیواری کے اندر گھر کو جنت
بنانا ہی ہوتا ہے اور جو چراغ خانہ کہلاتی ہے کہ اسی میں اس کی
عزت و آبرو ہے۔ مگر پھر بھی چند خواتین نے اپنے علم و فن کے
زور سے نہ صرف گھر بلکہ باہر پوری دنیا میں اجالا کیا اور ثابت

ترتیب نظموں میں کم و بیش پچاس بحرؤں کا سراغ ملا ہے۔ سیفو کی صرف ایک نظم ”رفعت مآب کے بارے میں“ تقریباً مکمل ہے۔ جب کہ ایک ہی نظم۔ ”ایفروڈائیٹ دیوی سے التجا۔“ پوری اور مکمل ہے جس میں وہ حسن کی دیوی ایفروڈائیٹ سے التجا کرتی ہے کہ۔ ”آؤ اور مجھ دکھیااری کی بگڑی بناؤ۔“ ایک نظم میں سیفو نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ شاعری، سخن و رکوع غیر فانی بنا دیتی ہے۔ مغربی ادب میں یہ اولین تصور و خیال ہے۔ افلاطون (347-429 قبل از مسیح) نے سیفو کو شاعری کی دسویں دیوی قرار دیا تھا۔ افلاطون جو بالآخر خیر کی فضیلت کا قائل ہو گیا تھا۔ سیفو کا ایک قول بھی انہی خیالات کا مظہر ہے کہ ”جو حسین ہے اس کے حسن تک نظر کی رسائی ہو سکتی ہے لیکن جو نیک ہے وہ بھی تو حسین ہوگا۔“ سیفو نے گیت میں داخلی جذبے کا اظہار کیا۔ گویا تنقیدی شعور کے ساتھ گیت کی صفت کو ہیئت کی سوز و حسرت کے اعتبار سے داخلی جذبات کے اظہار سے وابستہ کر دیا۔ اسی کی کوکھ سے ODE (غنائیہ نظم) نے جنم لیا اور کورس گیت وجود میں آئے۔ بد قسمتی سے ہوا یوں کہ تقریباً سترہ صدیوں بعد 071 عیسوی میں روم اور قسطنطنیہ میں عیسائیوں نے سیفو کے تمام کلام کو سر بازار آگ لگا کر راکھ کر دیا کہ یہ فحش اور سبکی اخلاق کے خلاف ہے۔

الخساء (645-575 عیسوی)

جزیرہ عرب بلکہ عربی ادب کی سب سے بڑی مرثیہ نگار شاعرہ۔ عہد جاہلیت میں عکاظ کے سالانہ میلے میں اس شاعرہ کے خمیے پر مجنڈا نصب ہوتا جس پر لکھا ہوتا کہ۔ ارثی العرب۔ یعنی عرب کی سب سے بڑی مرثیہ گو۔ اسلام سے پہلے اور بعد میں بھی یکساں طور پر مقبول و معروف شاعرہ۔ عربی دنیا کی سب سے بڑی، جامع، کامل ترین اور زندہ زبان ہے خود کو عرب (بولنے والا) اور باقی دنیا کو عجم (گونگا) کہنے والے سماج میں ”ارثی العرب“ کا دعویٰ اور پھر اس دعوے کو برقرار رکھنا اس پہ پورا اترا۔ اللہ اللہ۔ اک شخصی معجزہ ہی تو ہے۔ خساء کس پائے کی عالمہ اور شاعرہ تھی۔ آئیے۔ دیکھتے ہیں۔ بازار عکاظ کے مشہور سالانہ میلے میں بڑا مشاعرہ تھا۔ صدارت نابغہ الذبیانی کر رہا تھا۔ خساء نے بڑا زوردار قصیدہ پیش کیا۔ صدر مشاعرہ بے اختیار کہہ اٹھے کہ ”ابھی اگر ابو بصیر الاشمی نے پہلے اپنا قصیدہ نہ سنا دیا ہوتا تو میں فیصلہ دے دیتا کہ ”اے خساء۔ اس میلے میں جتنے شعراء ہیں نہ صرف ان میں تو سب سے بڑی شاعرہ ہے بلکہ انسانوں اور جنات میں سب سے بڑی شاعرہ ہے۔“ اس موقع پر حسان بن

ثابت بھی موجود تھے۔ انہوں نے جب نابغہ کے منہ سے خساء کی یہ تعریف سنی تو بولے۔ ”نابغہ! میں تجھ سے اور اس خساء سے بھی بڑا شاعر ہوں۔“

نابغہ بولا۔ ”بات ایسی تو نہیں۔“ پھر خساء کو جواب دینے کا اشارہ کیا۔ سو۔ خساء نے حسان سے کہا کہ اچھا۔ ابھی آپ نے اپنا جو قصیدہ پڑھا ہے اس کا سب سے اچھا شعر کون سا ہے؟ حسان نے کہا میرا یہ شعر کہ۔

لنا الجفناات الغریمعن بالفضحا

وآء سیافنا یقطنن من نجدتہ دما
شعر میں کو خساء نے تنقیدی کہ آپ نے اپنے اس شعر میں اپنے فخر کو محدود اور کم زور طریقے سے ظاہر کیا ہے اور سات آٹھ جگہ نقص پیدا کر دیا ہے۔ حسان نے پوچھا وہ کیسے؟ تو خساء بولیں آپ نے جفناات کا لفظ استعمال کیا ہے جو دس سے کم کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جفان کہا ہوتا تو زیادہ مناسب ہوتا پھر آپ نے الغر کہا ہے اور العزہ صرف پیشانی کی تنقیدی کو کہتے ہیں۔ یہاں۔ بیض۔ کا لفظ مناسب لگتا۔ اسی طرح آپ نے یلمعن۔ کا لفظ لیا ہے اور لعان اس چمک کو کہتے ہیں جو مستقل نہیں رہتی آتی جانی رہتی ہے۔ یہاں یشرقن (دیرپا چمک) لفظ لگانا تھا آپ نے باغی کہا ہے، بالذم کہا تھا معنی بھرپور ہو جاتے۔ اسی طرح ”سیاف“ دس سے کم کواڑوں کو کہتے ہیں۔ آپ یہاں سیوف کہتے تو بہتر تھا۔ یقطنن کی بجائے۔ یلمن زیادہ کے معنی دیتا ہے۔ آپ نے ”دما“ لفظ رکھا ہے حالانکہ ”الذما“ کے لفظ میں زیادہ وسعت ہے۔ اس پر حسان خاموش رہے اور کچھ بھی نہ بول سکے۔ حضور علیہ السلام خود خساء سے اشعار سنتے اور داد دیتے، فرماتے۔ ”ہاں بھی خناس۔ کچھ سناؤ۔“

اس نادر روزگار شاعرہ کا اصل نام تماضر تھا۔ عربی میں خساء چھٹی ناک کو کہتے ہیں چون کہ تماضر کی ناک پیدائشی چھٹی تھی۔ اس لیے الخساء (چھٹی ناک والی) لقب پڑ گیا۔ وہ عرب کے مشہور قبیلے مضر سے تھیں۔ باپ قبیلے کا سردار۔ دونوں بھائی معاویہ اور صخر خاندان کا فخر تو قبیلے کی آکھ کا تارا تھے۔ اس خاندانی پس منظر کے ساتھ خساء ایک خود دار، باوقار اور بھاری بھر کم شخصیت کی حیثیت سے ابھریں۔ بھائیوں سے بہت پیارتھا۔ وہ بھی بہن پر جان دیتے تھے۔ بد قسمتی سے دونوں بھائیوں کا قتل خساء کو ہمیشہ کے لیے رلا گیا۔ آگے چل کر جنگ قادسیہ میں چار جوان بیٹوں کی شہادت اسے تنہا کر گئی یوں کلام کا رنگ بدل گیا۔ عربی ادب کی پہلی شاعرہ جس نے

دل گداز مرثیہ گوئی کی بنیاد ڈالی اور اس میں مردوں کو بھی مات کر دیا بلکہ ضرب المثل بن گئی۔ خنساء کا مکمل دیوان موجود ہے۔ کئی بار چھپ چکا ہے۔

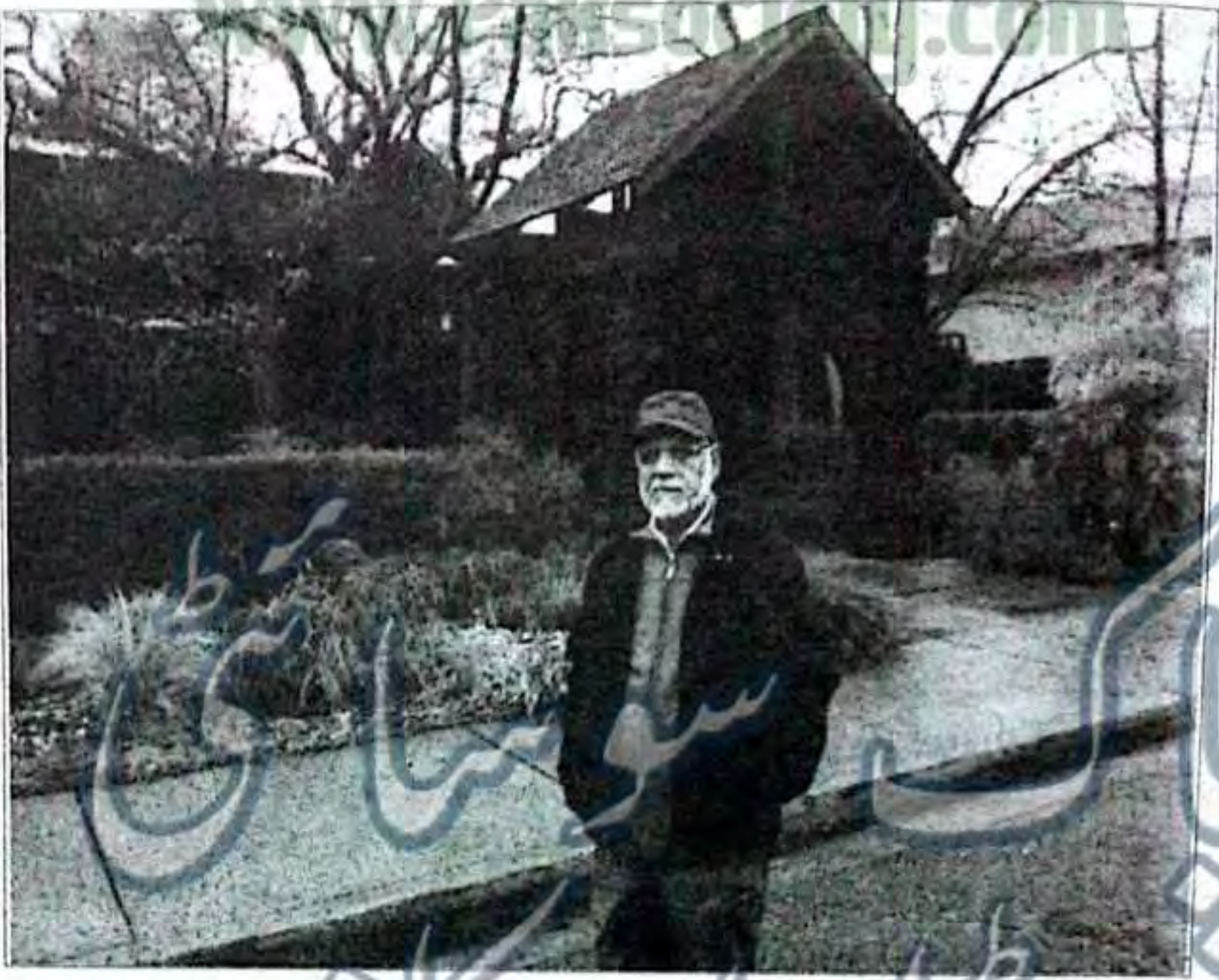
قرۃ العین طاہرہ
(1817 تا 1852-08-27 عیسوی)

فارسی زبان کی بے بدل شاعرہ۔ ایک طرف علم و فن پر مکمل دست رس تو ساتھ ہی قدرت کا عطا کردہ بے پناہ حسن اور جمال۔ نتیجہ یہ کہ اپنے وقت میں بڑے بڑے دینی علماء ادباء اور خصوصاً شعراء کو بے بس کر ڈالا۔ وہ بلند پایہ حسین عالمہ شاعرہ کہ بعد میں شاعر مشرق علامہ اقبالؒ۔ رابندر ناتھ ٹیگور۔ پنڈت جواہر لال نہرو۔ بلبل ہند سروجنی ٹائیڈ اور دیگر بہت سے بڑے لوگ متاثر رہے۔ اہل مغرب بھی اس نادر روزگار خاتون کے مداح ہیں۔ یہ یکتائے زمانہ خاتون انیسویں صدی کی دوسری دہائی کے آخر میں وہاں ایران کے شہر کزنہ قزوین جو اب تہران کے مضافات میں ہے حاجی ملا علیؒ کی بہو ٹھہری۔ بچی کی ذہانت کے پیش نظر والد نے گھر پہ ہی تعلیم دی کہ اس زمانے میں ایرانی معاشرہ عورتوں کی آزادی کے سخت خلاف تھا دراصل بادشاہ ناصر الدین قاجار (1831-07-06 تا 1896-05-01 عیسوی) برائے نام بادشاہ تھا اصل حکومت علمائے دین کی تھی۔ اس عظیم شاعرہ کا پیدائشی نام۔

فاطمہ برغانی تھا۔ برغانی خاندان کا نام تھا۔ والد پیار سے زریں تاج کہتے اور باقی خاندان والے اسے ام سلطی کے نام سے پکارتے تھے۔ اس خاتون نے بعد میں جب بزرگ عالم سید کاظم رشتی سے خط کتابت کا سلسلہ شروع کیا تو سید صاحب بڑے متاثر ہوئے اور اسے قرۃ العین (آنکھوں کی ٹھنڈک) کا لقب دیا۔ گوکہ دونوں کی ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ آگے چل کر قرۃ العین نے جب علی محمد باب کا ایجاد کردہ نیا دین بابی مذہب اپنایا تو علی محمد باب نے اسے طاہرہ (پاک صاف) کا لقب دیا۔ ان دونوں کی بھی ملاقات کبھی نہ ہو سکی۔ بابی یا بہائی مذہب کے راہنما اور پیروکار اسے ام عالم کے نام سے یاد کرنے لگے۔ مگر تاریخ میں یہ خاتون قرۃ العین طاہرہ کے نام سے ہی مشہور و معروف ہوئی اور باقی ساری عمر بہائی مذہب کی پُر جوش مبلغ رہی۔ ایرانی حکومت جان کے درپے ہوئی تو روپوشی کی حالت میں مگر مگر گھومتی تبلیغ کرتی رہی۔ لوگ لعنت ملامت اور کلوخ اندازی کرتے مگر یہ ڈٹی رہی۔ بہائی مذہب کے پیروکار ہر دم اس کے ساتھ رہتے اور حسن بن صباح

کے فدائین کی مانند ہر وقت جان دینے اور جان لینے پہ آمادہ و سرگرم رہتے۔ کرمان شاہ میں قرۃ العین طاہرہ نے وقت کے مجتہد عبداللہ سیستانی کو مناظرے میں شکست دے دی وہ بھی اس طرح کہ شاہ قاجار کے دربار میں مناظرہ ہو رہا تھا۔ ایک جانب مجتہد عبداللہ سیستانی تھے اور ان کے ساتھ تقریباً پچاس علما جبکہ دوسری جانب قرۃ العین اور اس کے ہمناو بہائی گروہ مناظرہ شروع عروج پیمہ پہنچا اور قرۃ العین کی شکست یقینی تھی کیونکہ علما نے قرآنی آیات اور ٹھوس دلیل سے ثابت کرنا شروع کر دیا تھا کہ آقائے دو جہاں ختم الرسل ہیں اور ان کے بعد کوئی رسول کوئی نبی نہیں آ سکتا۔ اسی دوران قرۃ العین اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی اور اس نے سر سے چادر اتار دی۔ علما اس کے حسن جہاں سوز پر گھبرا اٹھے اور لاجول پڑھتے ہوئے دربار سے باہر نکل گئے۔ اس کا کہنا تھا کہ بہائی مذہب میں پردے کا تصور نہیں ہے اور علما کا کہنا تھا کہ ہم بے پردہ عورت سے مناظرہ نہیں کریں گے۔ جب کہ مفتی بغداد اور دیگر کئی اہم دینی علماء اس ساحرہ کے حسن سے متاثر ہو کر بہائی مذہب اپنا چلکے تھے۔ سخت ترین حالات میں بھی قرۃ العین طاہرہ اگر کچھ کہتی بھی تو بس اتنا ہی کہتی کہ محبوب کی باتیں بیان کرنے میں جو بھی مصیبتیں تکلیفیں آئیں کم ہیں۔ بالآخر گرفتار ہو کے قیدی کی صورت اہلخانی (شاہی) باغ میں لائی گئی۔ مشیدی جلا د کو قتل کرنے کے لیے بھیجا گیا مگر وہ فوراً واپس بھاگ آیا کہ نہیں میں اتنی خوبصورت عورت کا گلہ نہیں گھونٹ سکتا۔ جلا د کو دوبارہ ڈرا دھمکا کے بہ زور بھیجا گیا تھوڑی دیر بعد آ کر وہ رونے لگ گیا۔ ”تم لوگوں نے مجھ سے آج کتنا بڑا گناہ کا کام کرایا ہے۔“ شاہی ملازموں نے جا کر دیکھا تو قرۃ العین طاہرہ آخری سانس لے رہی تھی اسے اسی زندہ حالت میں قریبی کنویں میں دھکیل دیا گیا اور کنواں پاٹ دیا گیا یوں انسانی حسن اور حسن بیان عبرت ناک انجام سے دوچار ہوا۔

دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو
قرۃ العین طاہرہ کا کلام اور دیگر تحریریں جلا کر رکھ کر دی گئیں۔ تینوں شاعرات (سینو۔ الخنساء اور قرۃ العین طاہرہ) کے درمیان تقریباً بارہ بارہ صدیوں کا فاصلہ ہے۔ علامہ اقبالؒ نے قرۃ العین طاہرہ کی انگریز پیروکار اور مداح مارتھاروٹ (1872-08-10 تا 1939-09-28) سے ملاقات کی اور قرۃ العین طاہرہ کی شاعری اور اس پر مارتھاروٹ کا کیا گیا تحقیقی مواد بھی حاصل کیا۔ مارتھاروٹ بہائی ہو گئی تھی۔



سفر امریکا

علیم شاہد

تیسرا حصہ

سفر وسیلہ ظفر کہلاتا ہے مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سفر تجربے کی دولت سے بھی مالا مال کرتا ہے۔ علیم شاہد کا تعلق قلم قبیلے سے ہے اس لیے انہوں نے اس سفر کو ایک نئے زاویے سے احاطہ تحریر میں لایا ہے۔ اس سفر نامے میں آپ کو امریکا ایک نئے انداز میں سامنے آتا محسوس ہو گا۔

سفر نامہ پسند کرنے والوں کے لیے ایک جداگانہ تحریر

سونے کی چمپا کلی پہن رکھی ہے۔ جس علاقے میں یہ بل ہے یہاں سمندر کی لہریں اپنی بھرپور قوت سے جوار بھانا دکھائی ہیں۔ یہاں بل کے دونوں طرف کچی پتھر ملی اور پانی سے بہت اونچی سنگین چٹانیں ہیں۔ یہاں 80-90 میل فی گھنٹے کی رفتار سے ہوا میں چلتی ہیں۔ یہاں بادل تیرتے ہیں، دھند چھا جاتی ہے اور دور تک فضا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی

گولڈن گی برج کا اوپر ذکر آیا ہے اس کے متعلق لکھنے کا سوچتا ہوں تو قلم ساتھ نہیں دیتا کہ یہ حسین، یہ خوب صورت، یہ عظیم بل کس طرح بنایا گیا ہے۔ یہ بل سان فرانسسکو کی وجہ سے مشہور ہے یا سان فرانسسکو شہر اس بل کی وجہ سے مشہور ہے۔ اس بل کی خوب صورتی میلوں دور سے نظر آتی ہے جیسے آسمان اور سمندر کی درمیانی فضا نے گلے میں

اکتوبر 2015ء

143

ماہنامہ سرگزشت

READING
Section

فرانسسکو کی رگوں کو شمالی کاؤنٹیز میں پھیلا دیا ہے۔ جو شہر کے لوگوں کو پسندیدہ ذہنی آسودگی اور تازگی مہیا کرتی ہے۔ اس پل کا ایک حصہ پانی میں ہے جو ساحل کی سطح سے 1125 فٹ نیچے ہے۔ برتج کے دونوں کناروں کے ہیوج پائکس یعنی بھاری چبوتروں کو پتھر ملی سنگین چٹانوں کے ساتھ ہیوج کنکریٹ سے جوڑا گیا ہے۔ ہر ستون کے چبوترے پر تیس ہزار مکعب فٹ کنکریٹ استعمال کی گئی ہے۔ برتج کی تعمیر پر لوہا 80,000 ٹن استعمال ہوا۔ اس پل کی لمبائی 8981 فٹ ہے جب کہ درمیانی جمولا 4200 فٹ ہے جمولے کی اونچائی سطح سے 220 فٹ بلند ہے۔ پل کی چوڑائی 90 فٹ ہے۔ پل پر سے روزانہ ایک لاکھ گاڑیاں گزرتی ہیں۔ اس پل کا رنگ اورنج ہے لیکن سورج کی شعاعیں اسے گولڈن گیٹ میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ یہ پل دو علاقے کے لوگوں کی سہولت کے لیے بنایا گیا تھا لیکن اس کی بناوٹ اس کی خوب صورتی، اس کی جھللاہٹ اس کے قریب کے باغات، ہری بھری پہاڑیوں، اس کے قریب کی ساحلی ٹیوں، بیچونے اسے سان فرانسسکو بلکہ کیلی فورنیا کی بلکہ امریکا کی حسین خوشگوار تفریح گاہ بنا دیا ہے جہاں بارہ مہینے دنیا بھر کے سیاحوں کا میلہ لگا رہتا ہے۔ یہاں آکر پل کی صناعتی دیکھ کر قدرت کے نظاروں اور موسم کے کرشموں سے اپنی آنکھوں اور روح کو سرشار کرتے ہیں۔ بے انتہا فوٹو گرافی کرتے ہیں۔ غرض گولڈن گیٹ امریکا کا تاج محل ہے۔

ایک دن حسب معمول میں 7 بجے سان فرانسسکو پاول اسٹیشن سے واپس آ رہا تھا۔ جلدی میں غلط ٹرین میں بیٹھ گیا جو ڈائریکٹ ڈبلن نہیں جاتی تھی۔ لہذا میں بے ایریا کے Lake Merit اسٹیشن پر اتر گیا تاکہ دوسری ٹرین پکڑ لوں جو ڈبلن جاتی ہو۔ دسمبر کا مہینا، سخت سردی، کھلا پلٹ فارم سنسان پڑا تھا، ہوائیں سرسرجھل رہی تھیں۔ ایک روشنی کے پول کے ساتھ لگی ایک سہرے بالوں والی گوری حسینہ کھڑی تھی اور بے تحاشا رو رہی تھی۔ آواز نہیں آرہی تھی لیکن ہچکیاں رک نہیں رہی تھیں۔ تنہائی کے خوف میں بھی مجھے اس سے ہمدردی ہوئی لیکن قریب جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اتنے میں گاڑی آگئی میں اندر گیا اور سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اسی دروازے سے وہ عورت بھی اندر آئی اور میرے قریب ہی بیٹھ گئی۔ کپارٹمنٹ خالی تھا صرف چند ہی مسافر بیٹھے تھے۔ میں نے ہمت کر کے اس سے پوچھا۔ If you mind not کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ اتنی افسردہ

ہے۔ جب بادل اور دھند فضا میں چھاتے ہیں تو روشنی سے آنکھ مجھولی ہونے لگتی ہے اور پل بھی اس آنکھ مجھولی میں شامل ہو جاتا ہے۔ کبھی غائب ہو جاتا ہے صرف اس کے پلرز نظر آتے ہیں۔ کبھی صرف جمولا نظر آتا ہے۔ کبھی ایک کنارہ نظر آتا ہے کبھی دوسرا کنارہ نظر آتا ہے۔ یہ پل سان فرانسسکو کے اور شمالی علاقے ساسی لوٹو کے درمیان ایسی جگہ واقع ہے جہاں اس کا بنانا آج بھی انسان کی سوچ سے بالاتر ہے۔ لیکن خدا جسے توفیق دے۔ اس پل کا خواب اور تصور جوزف برمن اسٹر اس کا مرہون منت ہے۔ برمن شکاگو کا انجینئر تھا جس نے بہت سے پل ڈیزائن کیے تھے۔ برمن صبح کی چہل قدمی کرنے جب اس پہاڑی چٹان کے قریب پہنچا تو بارش ہو چکی تھی اور Rainbow یعنی قوس و قزح، سات رنگوں کی دھنک کے ایک ہالہ نور نے سمندر کی دونوں جانب پہاڑیوں کو ملا دیا تھا۔ اسے اسی وقت خیال آیا کہ اس دشوار گزار علاقے میں جہاں کہرا اور بھرتا سمندر ہے جہاں دونوں طرف اونچی سنگین پہاڑی چٹانیں ہیں صرف ایسے ہی پل بن سکتا ہے جیسا کہ قدرتی دھنک کے کنارے دونوں پہاڑ کی چوٹیوں پر مل رہے ہیں۔ یعنی دونوں طرف پہاڑیوں پر سنگین چبوترے ہوں اور مضبوط فولاد کے ستون ہوں اور ستونوں کے درمیان جمولے کی شکل کا برتج ہو۔ برتج کو سنبھالنے کے لیے کیبل روپس ہوں یعنی تاروں سے بٹی ہوئی رسیاں ہوں اور ان رسیوں کو ستون سنبھالیں۔ غرض بڑی کاوش، محنت اور کثیر سرمائے سے یہ پل 1937ء میں وجود میں آیا۔ اس پل کی تعمیر پر ساڑھے تین کروڑ ڈالر خرچ ہوئے۔ اس کے ٹاور 746 فٹ اونچے ہیں جن پر سے 2 بڑے کیبل تاروں کے کچھے جن کی موٹائی 36 انچ ہے اتارے گئے ہیں۔ ہر 50 فٹ پر لوہے کی رسیاں ان دو کیبلوں سے لگتی ہیں اور نیچے کنکریٹ کی پل کی سڑک اور سڑک کے سائیڈ پیڈل چلنے والوں کی گلیوں کو سنبھالتی ہیں یعنی پل کے ٹریک کو اپنی رسیاں ہر 50 فٹ سے سنبھالتی ہیں اور 36 انچ موٹے بڑے کیبل ان رسیوں کو سنبھالتے ہیں اور فولادی ستون دونوں جانب ان کیبلوں کو سنبھالتے ہیں اور فولادی ستون چٹانوں کے سنگین پلیٹ فارم سنبھالتے ہیں۔ گولڈ گیٹ امریکا کی ہائی وے سڑک 101 سے جڑ جاتا ہے۔ یہ عظیم سڑک میکسیکو سے کناڈا تک پوسٹلک کو سٹ کے ہمراہ چلی چلی جاتی ہے۔ یہ سڑک سان فرانسسکو شہر کو ساسی لوٹو، میرین کاؤنٹی اور کیلی فورنیا کے شمالی حصوں سے ملاتی ہے۔ اس پل نے سان

دنیا کی شہرت یافتہ گیلریوں کو سجا دیا ہے۔ ان تصویروں کے بنانے والوں کا کمال یہ ہے کہ ان کے بعد مصوری کے شوق کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ ان کی تصویروں کو دیکھ کر ان سے سیکھ کر آرٹسٹ ہزاروں پیدا ہو گئے لیکن ڈیڑھ صدی گزر گئی ایسی تصویریں کوئی نہ بنا سکا۔

آج دنیا کے تعلیم یافتہ اور دانش وران تصویروں کو ان پینٹنگز کو دیکھنے سبق لینے دور دور سے آتے ہیں۔ گھنٹوں کھڑے ہو کر دیکھتے ہیں۔ مصوروں کے حالات زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ میں بھی دیکھتا رہا اور دیکھتا چلا گیا۔

میں میوزیم سے باہر آیا۔ 44 نمبر کی mussi بس پکڑی اور ڈاؤن ٹاؤن اتر گیا۔ چھ بج گئے تھے۔ سردی بڑھ رہی تھی۔ شہر میں رونق عروج پر تھی پورا ڈاؤن ٹاؤن روشنی سے جگمگ کر رہا تھا۔ سیاحوں، خریداروں، تفریح کرنے والوں، دنیا کے بہترین فیشن کرنے والوں کا ہجوم تھا۔ اونچی اونچی عمارتیں تھیں۔ قایم اشار ہوٹل تھے بڑے بڑے ریسٹوران تھے۔ ہر گلی میں اسٹور تھے۔ ابھی میں آرٹسٹوں کی پینٹنگز دیکھ کر آ رہا تھا اب شہر میں قدرت کے شاہکار دیکھ رہا تھا۔

کل من علیہا خان کہتا ہوا میں سوک سینٹر پارٹ ایشین میں اتر گیا۔ ٹکٹ بیچ کیا۔ ڈبلن پلیزینٹن پارٹ پکڑی جس نے ایک کمنے میں مجھے ڈبلن پہنچا دیا۔ راحت آئی اور مجھے لے گئی۔

اس عظیم الشان نمائش کے انعقاد پر فرانس کے صدر سرکوزی نے بھی اظہار خیال کرتے ہوئے جس انداز سے مصوری کی تاریخ پر روشنی ڈالی۔ وہ قابل توجہ ہے اور ذہن کے درپچوں کو کھول دیتی ہے۔ فرماتے ہیں۔ ”مصوری کا فن وہ ہے جو سب کی توجہ کا مرکز ہے جس کا سفر دنیا کے ہر گوشہ پر ہو ہر عہد میں ہو۔ ایسے فنی شاہکار جو عالمی مزاج رکھتے ہوں وہ کسی بھی فرد کے ہوں وہ باہمی ملکیت و مقبولیت کے حامل ہوتے ہیں۔ میوزیم کا کردار ان فن پاروں، شاہکاروں کی دیکھ بھال رکھنا اور ان کی حفاظت کرنا ہوتا ہے۔ میوزیم اچھی مصوری کو پروڈیوس کرتے ہیں روشناس کراتے ہیں اور اشاعت کے ذمہ دار بھی ہوتے ہیں۔ Musee-de-Orsay کئی سالوں سے نمائش اور مظاہرے کے اہتمام کر رہا ہے۔ 2010ء اور 2011ء میں فرانس میں اپنی گیلریز کو سجانے اور اس کی آرائش کے

سے سجا یا گیا تھا جیسا کہ ان کا حق تھا۔ امریکا بھر کے آرٹ کے شوقین، بڑے بڑے شاعر، رائٹرز، میڈیا کے لوگ، یونیورسٹیوں کے پروفیسرز، آرٹ کے طالب علم اور دانشور جمع تھے اور اپنے علم کی پیاس بجھا رہے تھے۔ کسی کمرے میں وان گوگ کے فن پارے تھے جن میں Starry Night کی جگمگاہٹ نے کمرے کو روشن کر دیا تھا۔ کہیں پال گاگن کی تصویروں میں Tahiti Women کو سجا یا گیا تھا۔ کسی جگہ جارج مسیورت اور پاک سلڈیک کی The Circus اور Women at Well بہار دکھلا رہی تھیں۔ کسی راہداری میں ہنری روسو The Snake Charmer چمک رہی تھی۔ کسی کمرے میں ہیری ہونارڈ کی The checked Blouse اور کسی جگہ پال سوزانے کی Still Life With Onions تھی۔ شائقین سے کمرے بھرے ہوئے تھے۔ لوگ بڑی توجہ سے بڑی تیز سے ان تصویروں کو دیکھ رہے تھے۔ کچھ رہے تھے۔ بنانے والوں کے حالات زندگی پڑھ رہے تھے۔ نوٹ کر رہے تھے۔ میں صرف چند تصویروں کے عنوان نوٹ کر سکا تھا جب کہ ہر فن پارہ انمول تھا۔ جن کا نیلام اگر ہو تو ہر پینٹنگ کی بولی دو دو، چار چار سو ملین ڈالر سے اوپر جائے۔ یہ تمام تصویریں انیسویں صدی کے آخر کی ہیں۔ ہر تصویر کی قیمت آج 25 سے 50 کروڑ روپے یا اس سے بھی زیادہ بنتی ہے۔ مجھے نادر روزگار، دنیا کے نامور آرٹسٹوں کی پینٹنگز دیکھنے کا شوق ضرور ہے لیکن اس فن کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ پھر بھی ان مشہور زمانہ تصاویر کو دیکھ کر میں حیران تھا کہ آسمانوں کی، زمینوں کی، فضاؤں کی، سمندروں کی، انسانوں جانوروں کی، پھولوں پھلوں کی حقیقت سے قریب، رنگوں اور زندگی سے بھرپور، منہ بولتی ہوئی یہ تصویریں آج سے ڈیڑھ سو دو سو سال پہلے کے آرٹسٹوں نے بنائی تھیں۔ جن کی زندگیاں فاقہ مستی میں، کرائے کے مکانوں میں، یتیم خانوں میں گزر گئیں۔ کسی نے زندگی کے بوجھ سے تنگ آ کر خودکشی کر لی۔ کوئی خیراتی اسپتال میں مر گیا۔ آج ان کی تصویروں کی نمائش کا اہتمام بینک آف امریکا۔ امریکا اور یورپ کے ارب پتی ادارے کرتے ہیں۔ سیکورٹی کے حساس ادارے گیلریوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

ان پینٹنگز نے آج کی ترقی یافتہ، تہذیب یافتہ اور

ذخیرہ اکٹھا کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایشین ممالک کے تعاون سے آرٹ اور کلچر کی نمائشیں ہوتی رہتی ہیں۔

اس مرتبہ انہوں نے جاپان کے تعاون سے

Five Centuries of Japan

Screen کی خصوصی نمائش کا اہتمام کیا ہے۔ میں نے

جاپان سے بزنس کیا ہے۔ میں 1978ء میں جاپان گیا

ہوں۔ جاپان کی طلسمانی الیکٹرونک ٹیکنالوجی کو دیکھا بھی

ہے اور متاثر بھی ہوا ہوں لہذا ڈی یوگ میوزیم کی سیر کے

بعد میری اس نمائش میں دل چسپی بڑھ گئی اور اگلے ہفتے ہی

ٹکٹ بک کرا کے میں ایشین آرٹ میوزیم لارکن اسٹریٹ

پہنچ گیا۔ یہ عمارت بھی شاندار ہے۔ شائقین کے

لیے Reception اور رہنمائی کا بہترین بندوبست

ہے۔ بہت بڑی Sovenior شاپ ہے، کافی شاپ اور

ریسٹورانٹ ہے اور معلومات کی عمدہ سہولتیں مہیا کی گئی ہیں۔

کمرے، راہداریاں، ایکسیلیٹر ز منزلیں، روشنی کا عمدہ انتظام

فرنیچر اور سجاوٹ دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں ہر منزل

یا اس کے حصہ میں پاکستان، جاپان ہندوستان اور فاریسٹ

کے ممالک کی گزری ہوئی تہذیبوں کی یادگاریں، آرٹ

اور نوادرات کا خزانہ امریکا نے دنیا بھر کے عجائب خانوں

کے تعاون سے جمع کیا ہے اور بڑی ترتیب سے بڑی تنظیم

سے بڑے سلیقے سے ان کی نمائش کا اہتمام کیا ہے۔ بیشتر

خزانے ان ملکوں میں بھی موجود نہیں ہوں گے جن کی یہ یادگاریں

نمائندگی کرتی ہیں۔

گراؤنڈ فلور کی پوری منزل سب سے زیادہ بچی ہوئی

تھی جس میں جاپان کی پانچ صدیوں کا سرمایہ تھا۔ پرانے

نامور مصوروں کی شاہکار تصاویر تھیں۔ انمول طفرے تھے،

قدیم نسخوں کے ٹائٹل بیج تھے، چوں پر، پرتوں پر، پردوں پر

صدیوں پرانی تحریریں تھیں۔ وڈ بلاک پرنٹس تھے۔ مختلف

دھاتوں پر مینا کاری، گل کاری۔ سادہ کاری اور انگریز

تھی۔

18 ویں اور 19 ویں صدی میں مغربی ممالک کے

آرٹسٹوں نے جو کام کیا ہے اس میں جاپانی فن سے گہری

وابستگی موجود ہے۔ وان گوگ جیسے عظیم مصور نے اپنی

تصویروں کو جاپانی پرنٹس اور رنگوں سے کاپی کر کے

Dcorate کیا ہے۔ یورپ کے چھاپے خانوں نے کاغذ

پر چھپائی میں جاپانی وڈ بلاک پرنٹنگ کا گہرا اثر قبول کیا۔

جاپانی وڈ بلاک پرنٹس میں یعنی چھپائی میں مہارت اور

دوران اپنے بہترین مصوری کے ذخیرے کے کچھ حصہ کے

ساتھ سفری نمائش کا اہتمام دوسرے ممالک میں بھی کیا ہے

جو فرانس کے ساتھ مضبوط، دراز، باہم ربط و ضبط اور دوستی کا

باعث بنتا ہے۔ خاص طور پر ثقافتی کلچرل سطح پر سان

فرانسکو کے فائن آرٹ میوزیم نے اپنے یہاں دو ایسی بے

مثال کامیاب نمائشوں کی میزبانی اور سان فرانسکو میں

Orsay Year منانے کا Creative a

Veritable فیصلہ کیا۔

پہلی نمائش کا اہتمام

of impressionism کے دوران کیا گیا۔ انہی

دنوں مصوری کی اجتماعی نمائش رونمائی کی گئی جس میں

Eugene, Berthe,

Morisot, Pissaro,

Degas, Moust, Cerame,

Boadin اور Renoir کے فن پارے پیش کیے گئے۔

دوسری نمائش Cerane-Guagin-Von

gog and beyond کے عنوان سے اب پیش

کر رہے ہیں جس میں great

impressionist Painters کی طرز خاص

1886ء کے بعد کی ترقی میں پیش کی جا رہی ہے جب سے

ان کی آخری مجموعی ذخیرے کی نمائش اور 1900ء کے

بدلتے ہوئے ماحول میں A vant garde نے

قدیم آرائشی شاہکاروں پر حملہ کیا۔

Movet and Villard کی محنت اور کام

گواہ ہے اس عظیم تبدیلی کا۔ ان دونوں نمائشوں میں ماسٹر

پیں شاہکار پیش کیے گئے ہیں۔

اس مرتبہ جب یہ شاہکار Musee de

Orsay کی گیلریوں میں واپس جائیں گے تو آئندہ کبھی

کسی بھی نمائش کے لیے مہیا نہ ہو سکیں گے۔ یعنی فرانس کے

باہر ایسی منفرد عظیم نمائش دوبارہ ناممکن ہوگی۔

مجھے اُمید ہے کہ یہ نمائش امریکی عوام کی دلچسپی میں

اضافہ کرے گی اور دونوں ملکوں کے تعلقات مضبوط

بنانے کا ذریعہ ثابت ہوگی۔

☆.....☆

سان فرانسکو جو بڑی بڑی آرٹ گیلریوں اور

میوزیم کا شہر کہلاتا ہے میں ایشین آرٹ میوزیم ہے۔ اس

میوزیم میں ایشیا کے صدیوں قدیم آرٹ اور نوادرات کا

اس کے علاوہ توریت جو عبرانی زبان میں ہے اس کی تلاوت آڈیو کے ذریعے سنائی گئی۔ تورات کے فرمان، احکام، اقوال، ہدایات کو طغروں کی شکل میں دیواروں پر سجایا ہوا تھا۔

توریت بے شک اللہ کا کلام ہے جو ہمارے نبی حضرت موسیٰ پر اترا ہے۔ وہ اگر تحریف یا تبدیلی سے پاک ہو تو وہ ساری ہدایات و ارشادات ربانی جو اس میں ہیں وہی مذہب اسلام میں بھی ہیں۔ توریت پڑھنے کے طریقے، لکھنے کے ڈھنگ بتائے گئے، اتنی احتیاط اور تحقیق سے کہ غلطی کی گنجائش نہ رہے اور صحت لفظی کمال ہو جائے۔

توریت کے قدیم اوراق مختلف ادوار کے بڑی محنت سے ساری دنیا کے سائنا گاک اور معبد خانوں اور لائبریریوں سے جمع کیے گئے، محفوظ کیے گئے، تحقیق کی گئی اور یہاں آویزاں کیے گئے۔ چڑوں پر، پتھر کی چھالوں پر، لکڑی پر مختلف دھاتوں پر لکھے، چھاپے اور کھودے گئے ان کی تشریحات ترجمے عبرانی، عربی اور انگریزی میں کیے گئے۔ قدیم دور میں توریت کے اوراق کو بڑی فنکاری اور خوش نویسی سے لکھا گیا۔ لکھنے کے طریقوں پر توجہ دی گئی۔ چاندی سونے کے بانی سے لکھا گیا۔ لکھنے کے لیے رنگوں اور سیاہی کو بنانے پر خصوصی توجہ دی گئی۔ مختلف قسم کے قلم بنائے گئے۔ لکھنے کے لیے تراشے گئے تاکہ توریت کو لکھنے کے فن کو خصوصی اہمیت حاصل ہو۔ پرانے زمانے کے لوگوں نے علم کے ساتھ قلم کو بھی بڑی اہمیت دی ہے۔ بہت ساری عمدہ قسموں کے لکڑی، ہاتھی دانت، لوہے، چاندی، سونے کے بڑے انمول خوشنما نقشین قلم بنائے گئے اور ان کی تراش پر بہت زور دیا گیا تاکہ معیاری اور حسین رسم الخط میں طرز خاص سے توریت کو لکھا جائے۔ نمائش میں ایسے بہت سے قلم موجود تھے جن کو نامور خوش نویسوں نے استعمال کیا تھا۔ جن کی تاریخ صدیوں پر محیط تھی۔ اس طرح قدیم اوراق کو محفوظ کرنے کے لیے صاحبان اقتدار نے بڑے قیمتی جزدان، غلاف، قیمتی لکڑی اور قیمتی دھاتوں کے گول ڈبے، صندوقچیاں ان پر اس زمانے کے بہترین نقش و نگار بنائے جن کو آج محفوظ دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے۔ غرض کچھ سمجھ آیا بہت کچھ سمجھ نہ آیا اور میں واپس ڈبلن کی پہاڑیوں اور ٹاسا ہارا کی رانچوں میں گم ہو گیا۔

☆☆☆

سنہالنے والے امریکا کے Intellectual Orthodox، متمول، باحیثیت، باختیار ادارے ہیں جن کی پہنچ دنیا بھر میں ہے جن کے نمائندے ساری دنیا کے تحقیقی اداروں سے منسلک ہیں۔ مجھے تو صرف دیکھنے کا شوق تھا لیکن تاریخ اور قدیم تحقیق کے متوالے اور طالب علم، یونیورسٹیوں کے پروفیسرز، آرکیالوجیکل ماہرین دنیا جہاں سے اپنے علم کی پیاس بجھانے، اپنی تحقیق کی آبیاری کرنے، اپنے تھیسس، مقالوں اور Ph.D کی تیاری کرنے یہاں آئے ہوئے تھے اور خاموشی سے تندہی سے فکر سے ایک ایک یادگار کے مطالعے میں مصروف تھے۔ مجھے اب جار کھٹنے ہو چلے تھے۔ میرے لیے ایسی یونیک انٹرنیشنل سلمبرٹی میں شرکت ہی بڑی بات تھی۔ باہر نکلا اور خراماں خراماں ڈبلن کی راہ لی۔

☆.....☆

مجھے پتا چلا کہ سٹی میں یہودیوں کا میوزیم ہے جس میں ان کی مذہبی ثقافتی نمائش ہو رہی ہے۔ میرے لیے یہ ایک دلچسپ معلوماتی وزٹ تھا لہذا حسب سابق ٹکٹ کا بندوبست کیا اور جیوش میوزیم پہنچ گیا۔ بلڈنگ یہ بھی شاندار ہے یہاں بھی ہر قسم کی سہولت موجود ہے لیکن وزیٹرز کی چیکنگ ایسی ہے جیسے ایئر پورٹ پر ہوتی ہے۔ چیکنگ کے بعد سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جاتے ہوئے انتہا درجے کی خاموشی تنہائی اور ماحول میں پراسراریت کا احساس ہوا۔ وہ گہما گہمی جو اس سے پہلے کی نمائشوں میں دیکھی تھی یہاں نظر نہ آئی۔ بہر حال لوگ موجود تھے جن میں زیادہ یہودی Typical Orthodox اور روایتی طالب علم تھے۔ یہ نمائش بڑے پیمانے پر یہودی مذہب، مذہبی تعلیم، مذہبی تحقیق، مذہبی تبلیغ اور ترویج و اشاعت کے لیے ترتیب دی گئی تھی جس میں امریکا اور اسرائیل کی مذہبی تنظیموں کا تعاون شامل تھا۔ مبہم خیالی اور تصوراتی خاکوں کے ذریعے حضرت موسیٰ کے دور کے مشہور واقعات کو دکھایا گیا تھا جو دیواروں پر آویزاں تھے۔ حضرت موسیٰ کو اللہ کا پیغام پہنچاتے ہوئے برائیوں سے روکتے ہوئے بتوں کی پرستش سے منع کرتے ہوئے دکھایا گیا۔ فرعون سے جنگ اور اللہ کے حکم سے پیدا ہونے والے دریائے نیل کے راستے سے محفوظ زندگی کی طرف سفر اور تعاقب میں آنے والے اسی فرعون کا غرق ہو جانا۔ یہ وہ حقائق ہیں جن کا ذکر قرآن میں ہے اور مسلمان قوم ان واقعات کو تسلیم کرتی ہے مختلف تصاویر میں یہودی قوم کی جدوجہد، پریشانیاں اور صحراؤں میں بھٹکتے رہنا

جادو

واقعات کے غیر فطری طور پر ظہور میں لانے کا فن۔ یہ علم ہر زمانے میں ہر قوم کے افراد کے عقیدے میں داخل رہا ہے اور مختلف اشخاص ہر جگہ اس کا دعویٰ کرتے چلے آئے ہیں۔ قدیم مصر کے پجاری اسی دعوے پر اپنی عبادت اور مذہب کی بنیاد رکھتے تھے۔ چنانچہ قربانیاں جادو ہی کی بنیاد پر کی جاتی تھیں۔ قدیم مصری، بابلی، ویدک اور دیگر روایتوں میں دیوتاؤں کی طاقت کا ذریعہ بھی جادو ہی کو خیال کیا جاتا تھا۔ یورپ میں باوجود عیسائیت کی اشاعت کے جادو کا رواج جاری رہا۔ افریقا میں اب تک ایسے ڈاکٹر موجود ہیں جو جادو کے ذریعے علاج کرتے ہیں۔ سیاہ علم یا کالا جادو، جنوں، دیوتاؤں اور بدروحوں کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے اور علم سفید یعنی سفید جادو نیک روحوں اور فرشتوں کے ساتھ ملاتا ہے۔ اس کے علاوہ قدرتی جادو قدرت کے واقعات میں تصرف کے قابل بناتا ہے۔ جوش اور نجوم بھی اسی کی شاخیں ہیں جو توہم پرستی پر مبنی ہیں مگر رمل، جعفر اور استخارہ کے بالکل الگ علم ہے۔ ہمارے ہاں بھی جادو کئی شکلوں میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ مثلاً جن اور بھوت کا چمٹنا اور اتارنا وغیرہ۔ جادو کے لیے عربی زبان کا لفظ ”سحر“ مستعمل ہے جس کا مطلب ہے امر خفی اور پوشیدہ شے، شرعی اعتبار سے اس کا مطلب ہوا وہ امر جس کا سبب پوشیدہ اور وہ اصل حقیقت کے خلاف خیال آنے لگے۔ سورۃ الزمر آیات 38-39 میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (اے پیغمبر اسلام) آپ ان سے کہہ دیں کہ تمہارا خیال ہے کہ اگر مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو کیا

ہماری ملاقات منزل بھائی اور ان کے بیٹے معظم سے ہوئی، یہ لوگ بھی اس ملاقات سے بہت محظوظ ہوئے، اپنی بیٹی کے گھر لے گئے، چائے پلائی۔ بھائی رخصتی، بیٹی اور داماد سے ملوایا اور یہ سب لوگ مجھے چھوڑنے کا رڈیف ڈرائیو آئے۔ رات کافی دیر تک ناظم آباد نمبر 4 کے پرانے ہمسائے آپس میں ملتے رہے۔ اپنے محلے کی خوشیوں اور غموں کا تذکرہ کرتے رہے اور رخصت ہو گئے۔

فیصل چونکہ شوروم بند کر کے آئے تھے لہذا دوسرے دن ہم نے واپسی کا سفر اختیار کیا اور راستے میں کچھ وقت یونیورسل اسٹوڈیو اور ہالی ووڈ ڈاؤن ٹاؤن کی سیر میں گزارا۔ یہ شہر لاس اینجلس جاتے ہوئے پہلے پڑتا ہے لہذا لاس اینجلس اور سان یا گو جانے والے یہاں ضرور آتے ہیں۔ ہالی ووڈ میں بڑے بڑے ایکٹروں، ایکٹریوں، فلم سازوں، فلم پروڈیوسرز، ٹیکنیشنز، سکرز، میوزک ڈائریکٹرز کی رہائش گاہیں ہیں لہذا ہالی ووڈ اس صوبہ کا پوش ایریا مانا جاتا ہے۔ ڈاؤن ٹاؤن میں داخل ہوتے ہیں تو فٹ پاتھ پر ماربل چپس کے ستارے بنائے گئے ہیں، ان ستاروں کے اندر عظیم نامور ہیرو، ہیروئنوں کے نام چھل کے حرفوں سے لکھے گئے ہیں جن کو روز پالش سے چمکایا جاتا ہے۔ ٹورسٹ آتے ہیں۔ ان ستاروں اور ستاروں میں چمکتے فلمی ستاروں کے نام دیکھتے ہیں اور تصویریں بناتے

پہلی مرتبہ 1998ء میں فیصل، نجمہ اور میں کار میں لاس اینجلس Batterfield سے ہوتے ہوئے اور نچ کاؤنٹی پہنچے تو دارا صاحب سے ملاقات ہوئی۔ دارا خان اور ان کی بیگم ہمارے ناظم آباد کے پرانے پڑوسی ہیں۔ اور نچ کاؤنٹی میں شاہنواز کے نام سے ریسٹورنٹ ہے۔ ہم سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ رات کا وقت تھا لہذا اپنے ریسٹورنٹ میں پُرکلف کھانا کھلایا پھر گھر لے گئے وہاں قریب میں رہنے والے دوسرے احباب کو بلوایا اس طرح ہماری ملاقات عشرت آپا ان کے بیٹے انجم سے بھی ہو گئی۔ پرانے ہمسائے ملے رات دیر تک ناظم آباد کی باتیں ہوتی رہیں۔ فیصل کے پاس وقت کم تھا لہذا صبح واپس ہو گئے۔ راستے میں ہم نے یونیورسل اسٹوڈیو اور ہالی ووڈ ڈاؤن ٹاؤن کی سیر کی اور واپس سان لیاڈ پہنچ گئے۔

دوسری مرتبہ 2006ء میں، میں اور عدیل بذریعہ کار اسی راستے پر سان یا گو تک آئے۔ ہم عدیل کے ماموں ڈاکٹر نیر صدیقی کے پاس ٹھہرے جن کا سان یا گو میں ساحل کے قریب Cardif drive میں خوب صورت مکان ہے نیر بھی میرے پرانے پڑوسی ہیں بڑی محبت سے پیش آئے ساحلی علاقوں کی سیر کرائی بہترین افغانی ریسٹورنٹ میں ڈنڈیا۔

سان یا گو ڈاؤن ٹاؤن کے ایک ریسٹورنٹ میں

تمہاری یہ دیویاں (جن کو تم اللہ کی بیٹیاں کہتے ہو) جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہو مجھے اس کے پہنچانے ہوئے نقصان سے بچائیں گی؟ یا اللہ مجھ پر مہربانی کرنا چاہے تو کیا یہ اس کی رحمت کو روک سکیں گی؟ بس ان سے کہہ دو کہ میرا اللہ ہی کافی ہے بھروسہ کرنے والے اس پر بھروسہ کرتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ سات مہلک امور سے اجتناب کرو۔ صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ وہ مہلک امور کون کون سے ہیں حضور نے فرمایا۔ ((1) اللہ کے ساتھ شرک کرنا ((2) جادو کرنا ((3) بلا جرم کسی کو قتل کرنا ((4) سود کھانا ((5) یتیم کا مال ہڑپ کر جانا ((6) میدان جنگ سے پیٹھ پھیر کر بھاگ جانا ((7) پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا۔ اس ضمن میں متعدد احادیث میں حضور نے جادو کرنے، جادو کا توڑ کرنے والوں کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا ایک حدیث میں آپ نے فرمایا۔ شگون، ہامہ اور صفر (اسلام کی نظر میں) کوئی چیز نہیں اور نہ ان کی کوئی اصل ہے۔ ایک دوسری حدیث میں کتے کی قیمت، زنا کی اجرت، کابن کو ہدیہ دینے سے منع فرمایا۔ ایک اور حدیث میں حضور نے فرمایا کہ (سمجھ لو تباہ کرنے والی چیزوں میں ایک چیز اللہ کے ساتھ شرک اور جادو ہے) ان (چیزوں سے بچو۔ حضرت ابو موسیٰ الاشعری سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ تین اشخاص جنت میں داخل نہ ہو سکیں گے۔ (1) داکھی شراب خور (2) جادو کو ماننے والا (3) رشتے کو ختم اور منقطع کرنے والا۔

اقتباس رواہ احمد ابن حبان فی صحیحہ۔
مرسلہ: ایاز راہی۔ مانسہرہ

دے گئے تھے لہذا فیصل کو چھٹیوں کا انتظار تھا۔ 24 دسمبر کی صبح ہم مرسدیز میں فیصل راحت نجمہ اور میں سوار ہوئے اور گاڑی ڈبلن سے Tray Liver more اور Modests سے ہوتی ہوئی جنوب کی جانب روانہ ہو گئی۔ یہاں آبادیوں کی سڑکوں کے قریب سے ہی بائی پاس فری وے مل جاتے ہیں جو بہت کشادہ ہوتے ہیں۔ 4-3 روکی سڑکیں ہوتی ہیں جن پر 60 سے 70 میل کی رفتار سے دور دراز کا سفر بغیر کسی رکاوٹ کے آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ ہم 580 پر سفر کر رہے تھے اب ہم لاس اینجلس کے لیے High Way 5 پر آ گئے۔ 24 دسمبر کا دن تھا بہت سے اداروں میں چھٹیاں تھیں۔ روڈ صاف بڑے تھے، چھوٹے موٹے ٹاؤنز اور پلین علاقوں، کھیتوں سے گزرتے ہوئے ہم Bur Bank کے پہاڑوں پر پہنچ گئے۔ لاس اینجلس کے راستے میں 4/5 ہزار فٹ تک اونچائی کے ہرے بھرے پہاڑ آتے ہیں اور گاڑی پہاڑی راستوں اور وادیوں میں سفر کرنے لگتی ہے۔ یہاں سردی بڑھ جاتی ہے اور پہاڑوں کے درمیان دن میں اندھیرا چھا جاتا ہے ہم تقریباً ساڑھے چھ گھنٹے میں لاس اینجلس یعنی امریکا پسیفک اوشن کے کنارے بڑے عظیم شہر میں تھے۔ تھوڑی دیر سستا کے ہم دوبارہ سان یا گوکی جانب روانہ ہو گئے اور ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم سن یا گو میں داخل ہو گئے۔ سن یا گو بھی پسیفک اوشن کے کنارے ہے۔ اس کے جنوب میں میکسیکو کی

ہوئے گزر جاتے ہیں۔ ہالی ووڈ وہ شہر ہے جس میں عالمگیر شہرت کے فنکار، قلموں کے ہیرو، ہیروئن جنہوں نے نصف صدی تک دنیا میں اپنی لازوال اداکاری سے اپنے چاہنے والے پیدا کیے ان کے دلوں پر حکمرانی کی۔ فلمی دنیا کے آسمان پر چاند سورج کی طرح چمکے اور یہاں کی مٹی کی نذر ہو گئے۔ ہالی ووڈ میں Disney Land اور عظیم یونیورسل اسٹوڈیو قائم ہے۔ اسٹوڈیو کیا ہے فلمی دنیا ہے جس میں رہائشی بنگلے، مکانات، فیکٹریاں، جھونپڑے، سڑکیں، گلیاں، بازار، سوئمنگ پول، چڑیا گھر، پنجرے، جانور، جھولے، مصنوعی پہاڑ، دریا، سمندر، ساحل، اسٹیشن، ایئر پورٹ، غرض ہر وہ چیز مہیا کی گئی ہے جس کی فلم بنانے میں ضرورت پڑتی ہے۔ ایک ہی علاقے میں فلم کا ہر سین فلما یا جاسکتا ہے۔ یہاں دنیا بھر کے ماہر ٹیکنیشنز، فوٹو گرافروں اور سیٹ بنانے والوں کی فوج ہے جو کم وقت میں ایسے سیٹ بناتے ہیں، ایسا ماحول بناتے ہیں..... ایسے Effects Create کرتے ہیں کہ فلم دیکھنے والا اس ماحول میں گم ہو جاتا ہے۔ ہم بھی ہالی ووڈ کی بھول بھلیوں میں گم ہوتے ہوئے جن راستوں سے گئے تھے انہی راستوں سے واپس الامیڈا اپنے گھر پہنچ گئے۔

جو ادا اور فارہ جاتے ہوئے باصرار سان یا گو کی دعوت

سڑکوں نے جنم دیا ہے۔ یہاں ہر شخص کے پاس گاڑی ہے کیوں کہ یہاں گیراج پارکنگ اور راستوں کی بے حد سہولت مہیا کی گئی ہے لہذا ساری دنیا میں گاڑیوں کے سب سے بڑے شورومز امریکا میں ہیں۔ ہم جس سڑک سے گزر رہے ہیں، ایک ایک دو دو اور تین تین میل لمبے گاڑیوں کے ڈسپلے گراؤنڈ ہیں، گاڑی پسند کرنے کے لیے بھی گاڑی میں سفر کرنا پڑتا ہے۔ سن یا گو اوپر بیان کیے ہوئے ماحول پر مشتمل پہاڑی علاقہ ہے۔ وادیوں پر پہاڑیوں پر، بڑی عمدہ پلاننگ کے ساتھ آبادیاں بنائی گئی ہیں۔ خوب صورت رہائشی علاقے، کمرشل بازار، اسکول، کالج، یونیورسٹیاں، غرض ہر شہری سہولت۔ ہر تھوڑی دور پر کسی میدان میں کسی فٹ بال پر کسی ڈھلوان پر، کسی چوٹی پر نظر آتی ہے۔ کسی پہاڑ کے ایک طرف اندھیرا ہے تو دوسری طرف چمک دمک روشنی ہے۔ غرض انہیں پہاڑی راستوں میں گم ہوتے ہوتے ہم رات 7 بجے البرٹو رانچ جواد کے گھر پہنچ گئے۔ دونوں میاں بیوی مل کر بہت خوش ہوئے۔ ان کا چھوٹا سا خوب صورت سا اپارٹمنٹ ہے۔ رات ہم نے کھانا کھایا اور سو گئے۔ 25 دسمبر کی صبح ناشتے کے بعد جواد ہمیں مشہور Coronado Lohya سٹیج لے گئے۔ یہ سٹیج سان یا گو کے مغرب میں ڈاؤن ٹاؤن سے 10 منٹ کی ڈرائیو پر واقع ہے۔

سان یا گو کا موسم شمالی علاقوں کی نسبت معتدل گرم رہتا ہے لہذا گرمیوں میں یہاں کے سٹیج مقامی لوگوں، تفریح کرنے والوں اور سیاحوں سے کھچا کھچ بھرے رہتے ہیں جو کھلے نیلے سمندر کی دودھیا لہروں میں نہاتے اور شفاف ریت پر سارا دن لیٹے سن باتھ لیتے رہتے ہیں۔ Lohia سٹیج میں پانی کی بھرتی لہریں جگہ جگہ سے پہاڑی چٹانوں سے سرکرائی ہوئی راستے بناتی ہوئی ریت پر دم توڑتی ہیں۔ اس پانی میں ہزاروں لوگ نہاتے اور اپنی عمریں بڑھاتے ہیں۔ ہم ساحلی پہاڑیوں کی لہرائی سڑک پر دور تک ٹھہرتے رہے اور قدرت کے شاہکار نظاروں میں شہک رہے۔ سان یا گو آنے والے ان بچوں پر ضرور آتے ہیں لہذا یہ ساحلی پہاڑی حصہ سارا سال گھومنے پھرنے اور فونو گرافی کرنے والوں سے بھر رہتا ہے۔ یہاں سے ہم لوما پوائنٹ گئے۔ لوما پوائنٹ South میں اونچے پہاڑ پر ایک تفریحی مقام ہے جہاں سے سارا سان یا گو شہر نظر آتا ہے۔ شہر کیا نظر آتا ہے پہاڑ سے نیچے چھوٹے سرسبز پہاڑ اور جنگل نظر آتے ہیں۔ سرسبز پہاڑیاں نظر آتی ہیں۔ وادیاں نظر آتی ہیں۔ پہاڑی چوٹیوں پر پہاڑی ڈھلوانوں پر فٹ بال

سرحد لگتی ہے۔ سن یا گو بڑا شہر ہے۔ بڑے بڑے سرسبز پہاڑوں، پہاڑیوں اور وادیوں کا شہر ہے۔ بڑے بڑے جنگلوں کا شہر بڑے بڑے رانچوں کا شہر ہے۔ دنیا کے بہترین ساحلوں اور پیچیز کا شہر ہے۔ مجھے پھر حیرانی ہے کہ اس قدر دشوار گزار پہاڑوں میں اتنا خوب صورت شہر کس طرح آباد ہو گیا۔

پہاڑ اور پہاڑیاں بھی قدرت کی عجیب کارگیری ہیں۔ ان کی اونچائی بادلوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں لہذا ان علاقوں میں بارشیں کثرت سے ہوتی ہیں۔ یہ علاقے ٹھنڈے رہتے ہیں۔ ان میں بڑے بڑے جنگلات جنم لیتے ہیں اور پہاڑ سرسبز رہتے ہیں۔ سبزے، رزق اور محفوظ پناہ گاہ کی تلاش میں جانور پہاڑوں کا رخ کرتے ہیں اور بڑے خطرناک جانوروں کی آماجگاہ بن جاتے ہیں۔ پہاڑوں کے درمیانی راستے وادیاں کہلاتی ہیں جن میں انسانی زندگی کا وجود بھی ہوتا ہے۔ انسانوں اور جانوروں کی مسلسل صدیوں سے آمد و رفت سے چڑھائی اور اترائی کے راستے یعنی پگنڈنڈیاں بنتی رہتی ہیں۔ مسلسل ہوتی بارشیں، جھرنے اور چشمے بھی راستے بناتے ہیں۔ پہاڑی علاقے ٹھنڈے، تازہ فریش آب و ہوا سے بھرے ہوتے ہیں۔ صحت افزا ہوتے ہیں۔ صدیوں سے انسان ایسے پرسکون قدرت کے نظاروں سے مزین صحت افزا مقامات کی تلاش میں رہتا ہے۔ جب کسی پہاڑی علاقے کو ترقی دی جاتی ہے۔ آباد کیا جاتا ہے تو یہ پگنڈنڈیاں ہی رہنمائی کرتی ہیں۔ ان کپے کپے اونچے نیچے دشوار گزار خطرناک راستوں کو ہی اکٹھا کیا جاتا ہے اور پھر بڑی محنت سے یہاں سڑکیں بنائی جاتی ہیں اور سڑکوں کے کنارے آبادیاں بنتی چلی جاتی ہیں۔ امریکا میں یہ محنت مسلسل پانچ سو سال سے جاری ہے، شاید یہاں کے لوگ پانچ سو سال سے سوئے نہیں ہیں۔ شاید یہاں کے لوگوں نے زندگی میں کبھی آرام نہیں کیا، کیوں کہ صرف صوبہ کیلی فورنیا میں ہزاروں اونچے نیچے پہاڑ پہاڑیاں ہیں جن میں لاکھوں سڑکیں بنی ہوئی ہیں، اتنی سڑکیں بنائی ہیں کہ آدمی سفر کرتے کرتے پاگل ہو جائے۔ لاکھوں گاڑیاں دن رات ان پر سفر کرتی ہیں۔ یہاں کے لوگوں کا شوق جستجو اور جدوجہد کا یہ عالم ہے کہ ان کا بس چلے تو سمندر کی تہ میں اور پہاڑ کی چوٹیوں پر مکان بنائیں۔ نہ صرف اپنا شوق پورا کریں بلکہ وہ سہولتیں بھی مہیا کریں کہ آپ ان کے پاس جا سکیں، دیکھ سکیں، رہ سکیں۔

دنیا بھر کی بڑی اور بہترین کاروں کی فیکٹریوں کو ان

کنسٹرکشن سے بھی سجایا گیا ہے۔ یہاں ایک مشہور مسلم چائیز ریستورانٹ Maaz ہے جو عمدہ مزیداری فوڈ ڈشز اور دوسری ڈشز کے لیے مشہور ہے۔ یہاں انڈین، پاکستانی، چائیز جمع ہوتے ہیں۔ ملتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں اور خوشی خوشی رخصت ہو جاتے ہیں۔ ہمیں بھی یہاں بہت سی پاکستانی فیمیلیز نظر آئیں۔

ہم نے بھی یہاں حلال چکن، بیف اور ہری مرچ سے تیار کردہ سی فوڈ کی ڈشز سے انصاف کیا اور رات گئے گھر لوٹ گئے۔

صبح بیدار ہوئے، رخصتی ناشتہ کیا۔ گاڑی میں بیٹھے اور جواد کے بتائے ہوئے ایسے راستے پر سفر اختیار کیا جس پر ٹریفک جام نہ ہو اور 8 گھنٹے میں ڈبلن پہنچ گئے۔

☆.....☆

آج دوپہر ڈبلن سے بارٹ میں بیٹھ کر ڈاؤن ٹاؤن گیا اور امبارکوڈ ریو اسٹیشن اتر گیا۔ یہ اسٹیشن دو منزل زپر زمین ہے پہلی منزل پر میونی ریل میٹرو چلتی ہے۔ یہ ٹرین زیادہ تر زمین کے پرانے ٹریک پر چلتی ہے اور صرف سان فرانسسکو شہر کو کور کرتی ہے۔ میں نے N ٹرین پکڑی جو امبارکوڈ پرو سے باہر نکل کر ساحل کے ساتھ چلتی رہی۔ اس علاقے میں فٹس ہاربر اور مختلف علاقوں میں جانے والی فیریوں کے اسٹیشن گیٹ اور ساحلی بلڈنگیں ہیں۔ چند چھوٹے چھوٹے اسٹاپس کے بعد کالٹرین اسٹیشن بلڈنگ آگئی۔ کالٹرین سان فرانسسکو کا ونٹی کے ساتھ میں 100 سالہ پرانی لائنوں، ٹریک پر سفر کرتی ہے اور جنوبی شہروں کے مسافروں کو سہولت مہیا کرتی ہے۔ یہ دو منزلہ نہایت آرام دہ، تیز رفتار اور خوب صورت ٹرین ہے۔ میں نے ساڑھے آٹھ ڈالر کا ڈے پاس مشین سے لیا اور ٹرین میں بیٹھ گیا۔ سان فرانسسکو کے مشرقی ساحلی علاقوں پر پچھی ہوئی ریلوے لائنوں پر سفر کرتی ہوئی یہ ٹرین جنوب کے چھوٹے چھوٹے شہروں اسٹیشنوں سے گزرتی ہوئی سان ہوزے تک جاتی ہے۔ اوپر کی منزل پر بیٹھ کر سفر کرنے سے سارے شہر سڑکوں گلیوں اور بازاروں کا دور تک نظارہ ہوتا رہا کیوں کہ یہ ٹرین کہیں شہروں کے کنارے کہیں پہاڑوں کے دامن میں اور کہیں شہروں کے بیچوں بیچ سفر کرتی ہے میں نے اس سفر میں San, Matio, Barlin game, San Bruno, Palu Alto, Red Wood City, Bellmont اور Mount View کے شہر دیکھے جو تقریباً 120 میل کا علاقہ کور کرتے ہیں۔ مجھے گوروں

پر بنی آبادیاں نظر آتی ہیں۔ ان کو چھوتی ہوئی بل کھاتی اوپر چڑھتی نیچے گرتی ہوئی سڑکیں نظر آتی ہیں۔ ڈاؤن ٹاؤن کے بازار نظر آتے ہیں، غرض ایک پھولا پھلا گلشن نظر آتا ہے۔ اس گلشن سے ہم گھر کی جانب چل پڑے۔

☆.....☆

آج ہم بالبو پارک گئے۔ سن یاگو کے پارکوں میں یہ اپنی نوعیت کا سب سے بڑا سب سے خوب صورت پارک ہے جس میں میلوں گھاس کے تختے، ہریالی پھول پودے اور لاکھوں درخت ہیں۔ اس پارک کی دیکھ بھال اور اس کی نوک پلک درست رکھنے کے لیے بے شمار افراد کام کرتے ہیں۔ پارک کے داخلے پر چہار طرفہ بڑے بڑے سنگین ستونوں والے گیٹ بنائے گئے ہیں، ان پر مینا کاری اور ڈیزائن اتنی خوب صورتی سے بنائے گئے ہیں کہ 100 سو سالہ وکٹورین تہذیب سامنے آگئی۔ دروازوں کے ساتھ ساتھ محرابوں اور ستونوں والی راہداریاں دور تک چلی گئی ہیں۔ یہ پارک کا اثر نہیں بلکہ کسی آرٹسٹ کا بڑا سا کیسوس معلوم ہوتا ہے۔ راہداریوں کے پیچھے بڑے بڑے ہال، سجے ہوئے فرنیچر سے آراستہ کمرے، اتنے زیادہ کہ وقت کم پڑ جائے۔ ٹانگیں اور آنکھیں جواب دے جائیں۔ کہیں جاپانی طرز کا کافی ہاؤس ہے کہیں Cafeteria ہے۔ کوئی کانفرنس ہال ہے اور کسی حصے میں آرٹ گیلری ہے، کہیں Biological Museum ہے، کہیں بڑے بڑے فوارے چل رہے ہیں۔ کہیں سوئیر کی دکانیں ہیں۔ سارے جہاں کے سیاح مسافر فیملیوں کے ہمراہ ان راہداریوں میں گھوم رہے ہیں اور حیران ہیں کہ باغ میں یہ سیکڑوں کمرے، راہداریاں اور ستون سو، سو سو سال پہلے کس لیے بنائے گئے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ کچھ آرہا ہے کہ ان چیزوں کے بنانے کا یہی مقصد تھا کہ ساری دنیا کے لوگ ہمیشہ یہاں آتے اور سردھنتے رہیں کہ کتنا اچھا بنایا ہے۔

اس چہل قدمی میں وقت بھی لگا اور کچھ حکم بھی محسوس ہونے لگی۔ ہم لوگوں نے کافی بی، فوٹو گرافی کی اور واپس آگئے۔ شام جواد مجھے، نجمہ، فیصل، فاریہ، راحت، فائزہ کو لے کر باہر نکلے۔ ہم ناتھ کی جانب پھر ہرے بھرے پہاڑوں، اونچی نیچی سڑکوں پر سفر کر کے ڈیڑھ گھنٹے میں Anahim پہنچ گئے۔

اناہیم لاس اینجلس کا ونٹی کا چھوٹا سا خوب صورت سا شہر ہے جس میں قدیم علاقے کو بھی محفوظ رکھا گیا ہے اور جدید

کے بسائے ہوئے نیل مونٹ اور Mount View شہر بہت پسند آئے۔

نیل مونٹ شہر میں خاموشی، صفائی، سلیقہ، قرینہ جوں کا توں قائم ہے جیسے یہ شہر اپنے بنانے والوں کے انتظار میں ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہری بھری پہاڑی کے دامن میں 100 سال سے اس شہر کے ماحول، موسم اور طرز زندگی میں تبدیلی نہیں آئی۔

نیل مونٹ اسٹیشن شہر کے کنارے واقع کھلا صاف ستھرا اسٹیشن ہے۔ اسٹیشن پر چھوٹی چھوٹی تختیاں لگی ہیں جن پر Bellmount لکھا ہے اور ہدایات درج ہیں۔ جب تک سنگٹل گرین نہ ہو ریلوے لائن پار نہیں کی جاسکتی۔ تھوڑی تھوڑی دور پر پتھریں پتھریں ہیں جن پر شیڈ ہیں۔ ٹکٹ کی مشینیں لگی ہیں۔ ریلوے ٹریک، پلیٹ فارم، صفائی اور سادگی ایسی کہ پلیٹ فارم پر ہی رہنے کو جی چاہے۔ اسٹیشن سے ملا ہوائی پاتھ اور بس اسٹاپ ہے۔ سڑک کے اس پار ڈاؤن ٹاؤن، بازار اور رہائشی مکانات شروع ہو جاتے ہیں۔ یعنی گھر کی کھڑکی سے یادگان سے پاراہ چلتے ہوئے دیکھا کہ ٹرین آرہی ہے۔ بھاگ کر اسٹیشن گئے اور ریل میں بیٹھ گئے۔ ٹرین ہر گھنٹے بعد آتی اور جاتی ہے۔ سان فرانسسکو سے نیچے کی طرف سفر کرتے ہوئے چھوٹی چھوٹی جھیلوں باغات اور انڈسٹریل علاقوں، بڑے بڑے کارخانوں، دیر ہاؤسز، گاڑیوں کے بڑے بڑے Scrap Junks اور کچرے کے بڑے بڑے ڈھیر بھی نظر آئے۔ Recycling Plants، پانی کے جوہڑ، تالاب، پرانے اور شکستہ مکانات بھی نظر آئے۔ غرض اس ٹرین میں سانس فرانسسکو شہر کو شمال سے جنوب تک خوب دیکھا۔ ماؤنٹ ویو سے دوبارہ ٹرین پر بیٹھا اور اسٹیشنوں کے، شہروں کے، پارکوں کے، محلوں بازاروں کے، سڑکوں گلیوں، ہائی ویز، فری ویز کے، اسکائی اسکرپرز کے نظارے کرتا ہوا مل برائے اسٹیشن پر اتر گیا۔ یہاں سے بلو لائن پکڑی اور ڈبلن پلیزینٹن اتر گیا۔ فیصل راحت آ کر مجھے لے گئے۔ میں 250 میل کا سفر کر کے 6 گھنٹے بعد گھر آ کر لیٹ گیا۔ ساڑھے سات بجے راحت آئی کہ تیار ہو جائیں آج ڈنر کا پروگرام شالی مار میں ہے۔ عشق کی ٹیبلٹی بھی آرہی ہے۔ میں نے مزید چندرہ منٹ آرام کیا۔ اٹھا، فریش ہوا اور ان کے ہمراہ فری مونٹ شالی مار کے لیے روانہ ہو گیا۔ شالی مار ایک پاکستانی ریسٹورنٹ ہے جس نے عرصہ میں سال سے پاکستانی خالص روایتی ذائقوں کی ڈشز روشناس کرائی ہیں اور دھوم مچا دی

جائیداد Property

فارسی لفظ بمعنی ملکیت، مال اسباب جاگیر، اثاث البیت، پیداوار۔ اقتصادیات اور معاشیات میں وہ تمام چیزیں کسی شخص کی جائیداد کہلائی گی جنہیں وہ حصول دولت کے لیے استعمال کرتا ہے۔ جائیداد دو طرح کی ہوتی ہے منقولہ اور غیر منقولہ۔ تمام ایسی چیزیں جو ایک جگہ سے دوسری جگہ نہ لے جانی جاسکیں جائیداد غیر منقولہ کہلاتی ہیں۔ زمین، مکانات، زمین سکنی، زمین مزروعہ وغیرہ جائیداد منقولہ کے ضمن میں آتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں جائیداد منقولہ مثلاً مال اسباب، غلہ، زیور، نقدی وغیرہ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاسکتے ہیں۔

مرسلہ: فہیم خان اچکزئی۔ ڈی آئی خان

ہے۔ پہلے یہ ریسٹورنٹ صرف ڈاؤن میں تھا۔ اب فری مونٹ میں بھی شاخ کھل گئی ہے۔ یہاں سیخ کباب، چکن ککا، نہاری، بکرے کے پائے، جگر بوٹی، سیخ بوٹی اور بریانی تو رومہ کھانے کے لیے دور دور سے پاکستانی اور ہندوستانی گھنچے چلے آتے ہیں۔ اب ان روایتی ذائقوں میں افغانی، چینی اور گورے بھی گرفتار ہو رہے ہیں۔ ریسٹورنٹ کے ریسپشن پر لائیں لگی ہوتی ہیں۔ آدھے یون گھنٹے سے پہلے ٹیبل نہیں ملتی ہے۔ فیصل اور عشق کے ان لوگوں سے دوستانہ تعلقات ہیں جلد میز مل گئی۔ عشق، سعدیہ، معین، نجمہ، راحت، فیصل، شکی اور میں نے جی بھر کے کھانا کھایا، کھیر کھائی، چائے پی، گاڑیوں میں بیٹھے، اندھیری پہاڑیوں سے ہوتے ہوئے ڈبلن پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر بیٹھے واپسی کا پروگرام بناتے رہے۔ میں اوپر آیا تھکن تھی نیندا آگئی۔

☆.....☆

امریکا میں اپنے لوگوں کا عام تاثر یہ ہوتا ہے کہ یہ ملک یہاں کارہن سہن، طور طریقے بہت مختلف ہیں لہذا ان لوگوں سے میل جول بات چیت میں احتیاط رکھنی چاہیے جب کہ میں سمجھتا ہوں کہ انسان کسی بڑا عظیم کا ہو کسی ملک کا ہو کسی قوم کا ہو بنیادی اور فطری نیچر میں یکساں ہوتا ہے۔ غلط ہر جگہ غلط ہے صحیح کو سب قبول کرتے ہیں اور ضرورت کے تحت لچک بھی 'انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ میں عموماً اکیلا ہی امریکا میں گھومتا رہتا تھا اور مجھے مختلف لوگوں سے ملنے اور نئے تجربات سے

گزرنے کا شوق بھی ہے۔
مجھے بذریعہ کالٹریں San Jose جانا تھا۔ لہذا میں حسب معمول ڈبلن سے بارت میں بیٹھا اور سان فرانسسکو کے Embarcadero اسٹیشن اتر گیا۔ وہاں سے Metro مینی ٹرین کے ذریعے کالٹریں کے سینٹرل اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ یہ بڑا اسٹیشن ہے اور اس کی بلڈنگ شاندار ہے، یہاں سے جنوب کی جانب بہت سارے اسٹیشنوں پر Caltrain سفر کرتی ہسان ہوزے پہنچتی ہے۔ ٹکٹ مشین پر سان ہوزے کا کرایہ چھانچ ڈالر درج تھا۔ لہذا میں نے مشین سے واپسی سمیت دو ٹکٹ دس ڈالر میں نکلوا لیے اور سان ہوزے کے لیے روانہ ہو گیا۔ راستہ میں ٹکٹ چیکر آیا۔ میں نے ایک ٹکٹ اسے دیا۔ اس نے نشان لگا کر واپس کر دیا۔ ٹکٹ پر تحریر عبارت پڑھنے پر معلوم ہوا کہ آج کا ٹکٹ ڈے پاس ہے یعنی ایک ٹکٹ پر صبح سے رات نو بجے تک جتنا چاہو سفر کر لو۔ شام کو میں اسی ٹکٹ سے سان ہوزے سے واپس آ گیا۔ چھ بج رہے تھے۔ اسٹیشن پر ساڑھے چھ بجے والی گاڑی لے ٹکٹ لینے والوں کی مشین پر لائن لگی ہوئی تھی۔ میں نے ایک صاحب سے کہا کہ میرے پاس ڈے پاس ہے آپ لے لیں۔ وہ آگے بڑھ گئے۔ ان کے پیچھے ایک محترمہ جلدی میں جس میں نے کہا میڈم مجھے پیسے نہیں چاہئیں آپ اس ٹکٹ کو استعمال کر لیں۔ انہوں نے ڈے پاس کو دیکھا اور کہنے لگیں میں فری نہیں لوں گی۔ بڑھ کھولا اس میں کھلے چارڈالر تھے وہ میرے ہاتھ میں تھمائے اور تیزی سے گاڑی کی جانب دوڑیں جو پلٹی شروع ہو گئی تھی۔ اب میرے پاس ایک فریش ڈے پاس بچا تھا لیکن یہ بھی نو بجے رات ختم ہو رہا تھا۔ میں اسٹیشن پر دس منٹ ٹہل کر مشین کے پاس آ گیا اب سات بجے والی گاڑی کے ٹکٹ کے لیے کچھ لوگ مشین پر کھڑے تھے میں نے ایک محترمہ سے یہی کہا کہ ٹکٹ فریش ہے مجھے جانا نہیں ہے مجھے پیسے نہیں چاہئیں آپ استعمال کر لیں تو ضائع ہونے سے بچ جائے گا۔ محترمہ نے ٹکٹ الٹ پلٹ کر دیکھا۔ بڑے میں سے دس ڈالر کا نوٹ نکالا اور مجھ سے باقی پیسے مانگے میں نے پانچ ڈالر دے دیے وہ بھاگ کر ٹرین میں سوار ہوئیں اور میں نیا تجربہ لے کر گھر آ گیا۔ بچے بولے ابو آپ نے سان فرانسسکو کو کراچی بنا دیا ہے۔

☆.....☆

آج چھٹی ہے موسم شاندار ہے۔ فیصل، میں، نجمہ، راحت گاڑی میں سوار ہوئے۔ پہاڑوں کے درمیان سے

ہوتے ہوئے Los gatos اور Scot Valley جیسے چھوٹے چھوٹے Cities سے گزر کر ہم پہاڑی سڑکوں سے باہر آئے تو سانٹا کروز میں داخل ہو گئے۔ یہ جنوب مغربی ساحلی تفریح گاہ ہے۔ یہاں پانی کے کنارے ریت ہے اور پہاڑی پر دور تک دیوار چھٹی ہوئی ہے۔ دیوار کے ساتھ ساتھ دور تک چھل قدمی کے لیے۔ پانی کی لہروں کا نظارہ کرنے کے لیے پلیٹ فارم بنا ہوا ہے جس کے کنارے بڑے بڑے خوب صورت اور خطرناک جھولے لگے ہوئے ہیں۔ فوٹو شاپس ہیں چھوٹا سا سینما ہے کافی شاپس ہیں، آکس کریم کی دکانیں ہیں۔ سووینیر کی بڑی بڑی دکانیں ہیں۔ مختلف ویڈیو گیمز اور اسپورٹس کی دکانیں ہیں اور تفریح کا بہت سا سامان موجود ہے۔ سووینیر کی دکانوں میں پلاسٹک کی ٹرانسپیرنٹ ڈبیوں میں سنہری ڈلیاں دیکھیں پتا چلا یہ گولڈرش کی یادگار ہیں۔ دو سو سال پہلے سان فرانسسکو کے ساحل پر لہروں کے ہمراہ سونے کی ڈلیاں آتی تھیں۔ یہ واقعات اتنے عام ہوئے کہ ان ساحلوں پر لوگ پتلی پکڑنے کی طرح چھولے پارک جال اور چھلنیاں لیے بیٹھے رہتے تھے اور جب انہیں یہ ڈلیاں مل جاتی تھیں تو ہارٹ پاتھ پر بیٹھ کر خوانچہ سجا کر سونے کی ڈلیاں بیچا کرتے تھے۔ وہ دور بھی عجیب دور تھا۔ جنوبی امریکا ہے یورپ سے لوگ خاص طور سے سونا حاصل کرنے سان فرانسسکو کے ساحلوں پر آتے تھے۔ یورپ کے لوگ یہاں سے بے انداز سونا لے کر گئے۔ وہ گولڈرش کا دور کہلاتا ہے۔

یہاں سمندر کی شفاف لہریں جو اب بھانا دکھاتی شور مچاتی ہوئی آتی ہیں اور پہاڑی کے دامن میں پچھی ریت پر دم توڑ دیتی ہیں۔ نہانے کے شوقین ریت میں اتر جاتے ہیں۔ چھل قدمی کرتے ہیں اور سن باتھ لیتے ہیں۔ یہ بہت ہی بارونق تفریح گاہ ہے لہذا یہاں ہمہ وقت ٹورسٹوں کا جھکھا لگا رہتا ہے۔ پہاڑی کے دوسری طرف سڑک کے ساتھ ہی دکانیں ہیں۔ دکانوں کے پیچھے خوب صورت ہٹس، خوب صورت فلیٹس اور خوب صورت بنگلے بنے ہوئے ہیں جو ہر وقت کرایہ پر دستیاب ہوتے ہیں۔ دور دراز سے لوگ یہاں فیملیوں خاص طور سے بچوں کے ہمراہ آتے ہیں۔ ان ہٹوں، فلیٹوں کو کرایہ پر لیتے ہیں۔ اپنی چھتیاں، یہاں کا موسم، پانی کا کنارہ انجوائے کرتے ہیں، اپنی عمریں بڑھاتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ ہم نے بھی کچھ وقت گزارا اور گاڑی ڈبلن کی جانب رواں دواں ہو گئی۔

جاری ہے

For next episode visit
Paksociety.com

اکتوبر 2015ء

156

ماہنامہ سرگزشت
READING
Section

تاریخِ عالم

منظرِ امام

یہ عالم رنگ و بو لفظ کُن سے خلق ہوا، سائنسدانوں نے کہا یہ تو بگ بینگ سے وجود میں آیا۔ اس کرٹھ ارض کے وجود میں آتے ہی زندگی نے انگڑائی لی۔ آدمی کا وجود سامنے آیا۔ آدمی نے ہی اس کرلا ارض کی رنگینی میں اضافہ کیا۔ اس میں ترقی کا اسپ تیز رفتار دوڑایا۔ یہ دنیا ترقی یافتہ دنیا، رنگینیوں، آسائشوں سے بھری دنیا کوئی ایک دن کی کہانی نہیں۔ ہزاروں سال پر محیط کہانی ہے جسے نہایت مختصر مگر جامع انداز میں احاطہ تحریر میں لایا گیا۔



خوشی اس بات کی ہے کہ تاریخِ عہد بہ عہد کے سلسلے کو پسند کیا جا رہا ہے۔ میرے پاس خطوط آرہے ہیں۔ خطوط کے علاوہ ذالی طور پر بھی لوگوں نے ملاقاتیں کی ہیں اور بتایا ہے کہ اس سلسلے کو پڑھنے کے بعد ان کی معلومات میں اضافہ ہوا ہے۔

یہ اچھی بات ہے۔ خدا کرے کہ لوگوں میں پڑھنے کا شوق اسی طرح برقرار رہے۔ بہر حال اس تمہید کے بعد ہم آتے ہیں اصل موضوع کی طرف۔

اکتوبر 2015ء

157

ماہنامہ سرگزشت

READING
Section

کے بعد وہ اپنی ضروریات زندگی خود پیدا کرنے لگا۔
پاکستان کے علاقوں میں اب تک چار دیہی یا زرعی
تہذیبیں دریافت ہوئی ہیں۔

- 1۔ وسطی بلوچستان۔
- 2۔ وسطی بلوچستان اور بالائی سندھ۔
- 3۔ جنوبی بلوچستان۔
- 4۔ شمالی بلوچستان۔

سندھ اور بلوچستان کے آثار قدیمہ سے پتا چلتا ہے
کہ اس خطے کے لوگ موئن جو دڑو اور ہڑپہ تہذیب کے
عروج سے بھی پیشتر بہت ترقی یافتہ تھے۔

موئن جو دڑو، ہڑپہ کی تہذیب جس کو وادی سندھ کی
تہذیب کہتے ہیں۔ اس وقت کا کسی کے دور کا نقطہ عروج
تھا۔ یہ تہذیب کوہ ہمالیہ کے دامن سے لے کر کاشیاواڑ تک
اور کوئٹہ سے راجستھان تک پھیلی ہوئی تھی۔

یہ تہذیب تقریباً ایک ہزار برس، ڈھائی ہزار قبل مسیح
سے پندرہ سو قبل مسیح تک بڑی آن بان کے ساتھ زندہ رہی۔
موئن جو دڑو تجارتی بندرگاہ بھی تھا۔

ہندوستان کی تہذیب و تمدن میں ایک بہت بڑی
تبدیلی آریاؤں کی آمد کے بعد شروع ہوئی۔ یہ آریہ اپنے
ساتھ اپنی زبان، اپنا کلمہ اور اپنے دیوی دیوتا لے کر آئے۔
یہ چونکہ زیادہ ترقی یافتہ اور منظم تھے۔ اس لیے یہاں کے
باشندوں نے ان کی پیروی شروع کر دی اور دیکھتے دیکھتے ہر
طرف آریاؤں کا تسلط ہو گیا۔

آریہ قبائل وسطی ایشیا کے رہنے والے تھے۔ یہ کابل
اور بلہند کی وادیوں سے ہوتے ہوئے کوہستان سلیمان کے
دروں سے پنجاب میں داخل ہوئے۔

پنجاب میں ان کی آمد کا زمانہ پندرہ سو قبل مسیح سے
بارہ سو قبل مسیح تک بتایا گیا ہے۔

یہاں میں ایک بار پھر واضح کردوں کہ ہندوستان
(پاکستان) کی تاریخ کا یہ جائزہ پندرہ سو قبل مسیح تک کا
ہے۔ اس لیے وہ بہت سے کردار اس جائزے میں سامنے
نہیں آئیں گے جنہوں نے تاریخ عالم پر گہرے اثرات
مرتب کیے تھے۔

دوسری قسط میں یا اس کے بعد والی اقساط میں پندرہ
سو قبل مسیح سے ایک قبل مسیح تک کا جائزہ لیا جائے گا۔

ابھی ہم ہندوستان (یا بھارت) کی تاریخ کا جائزہ
پندرہ سو قبل مسیح تک لے رہے ہیں کیوں کہ تاریخ نے

تاریخ عالم کا جائزہ لیتے ہوئے ہم پندرہویں صدی
قبل مسیح تک آچکے ہیں۔ یہ وہ دور ہے جب انسانی ترقی کی
رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔

اس نے زندگی کے ہر شعبے میں اپنا ہنر دکھانا شروع
کر دیا ہے۔ تعمیرات، زراعت، سادہ مشینوں اور اوزاروں
کا استعمال شروع ہو چکا ہے۔ ستارہ شناسی، طب، فلسفہ،
حساب میں کمال حاصل ہو چکا ہے۔ بحری اور بری افواج کی
تشکیل ہونے لگی ہے۔ غرض یہ کہ ہر شعبہ ترقی کر رہا ہے۔

مذہبیات میں بھی انقلابی تبدیلیاں آرہی ہیں۔ دیوی
دیوتاؤں کے فرسودہ زمانے کی جگہ اب خدا کے نبیوں اور
نیک لوگوں کی تعلیمات کی گونج سنائی دے رہی ہے۔

ہم نے پندرہویں صدی قبل مسیح تک کی تاریخ میں
ایران کا جائزہ لے لیا ہے۔ اب ہم آتے ہیں ہندوستان کی
طرف۔

ہندوستان (پاکستان) کی تہذیبوں اور یہاں کی
تاریخ کا تذکرہ ہم ذرا تفصیل سے کرنا چاہیں گے۔ کیونکہ
ہمارا تعلق اسی سرزمین سے ہے۔

پورے ہندوستان کی مجموعی تاریخ اور تہذیب کے
حوالے سے ہم سب سے پہلے موجودہ پاکستان کی سرزمین کو
دیکھتے ہیں کہ یہاں مختلف عہد میں کیا کیا ہوتا رہا۔

ویسے ہم سرسری طور پر اس سرزمین کا تذکرہ کر چکے
ہیں۔ پھر بھی تجدید مطالعہ کے لیے ہم مختصر طور پر یہاں کی
تاریخ اور تہذیب کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں تاکہ
ہمارے پڑھنے والوں کے ذہنوں میں یہ مراحل تازہ رہیں۔
سب سے پہلے آجائیں موجودہ پاکستان کی قدیم
تاریخ کی طرف۔

حجری (پتھروں) کے دور کے بعد ہمارے یہاں
سوانی تہذیب یا سوانی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ یہ تہذیب
راوی و سوان (پوٹھوہار) کی تھی۔

اس دور کے لوگ کلہاڑیوں وغیرہ کے استعمال سے
واقف تھے۔ وہ ابھی بھی چھوٹے چھوٹے گروہوں میں
درختوں پر یا غاروں میں رہتے تھے۔ ہزارہ، پشاور اور
مردان کے اضلاع میں ایسے کئی غاروں کی دریافت ہو چکی ہیں۔
پاکستان کا دوسرا حجری دور کھیتی باڑی کے فن سے
شروع ہوتا ہے۔

دراصل کھیتی باڑی ہی وہ فن ہے جس کی بدولت
انسان، انسان کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔ زراعت کا فن سیکھنے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

میننگمری برنارڈ لاء

(1887ء-1976ء)

برطانوی فوجی افسر۔ 1908ء میں وردک سائز رجمنٹ میں شامل ہوئے۔ پہلی جنگ عظیم میں فرانس کے محاذ پر خدمات انجام دیں۔ دوسری جنگ عظیم میں شمالی افریقا میں اتحادیوں کی آٹھویں فوج کی کمان سنبھالی اور اکتوبر 1942ء میں العالمین کے محاذ پر جرمن فوجوں کو شکست فاش دی۔ 1944ء میں نارمنڈی (شمالی مغربی فرانس) پر حملہ کرنے والی اتحادی افواج کے کمانڈر مقرر ہوئے۔ 1945ء میں ہالینڈ میں "سیلم" ڈیمارک کے بعد شمالی جرمنی کا علاقہ فتح کر لیا، اسی سال فیڈریشن کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 1946ء میں وائی کاؤنٹ بنائے گئے۔ 1948ء میں مغربی یورپ کی دفاعی کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ 1951ء تا 1958ء نیٹو کی افواج کے ڈپٹی سپریم کمانڈر رہے۔

ایرانی دیو مالا میں جس و پاک (سجھاک) کا بڑا گھناؤنا کردار پیش کیا گیا ہے۔ وہ داسیو قوم ہی کا کوئی سردار ہوگا جس سے آریاؤں کا سابقہ پڑا ہو۔

اس کے شانوں پر سے سانپوں کے ابھرنے کی روایت سے بھی اس قیاس کو تقویت ملتی ہے کیوں کہ یہاں کی پرانی قوموں میں ناگ کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔

رگ وید داسیوں کے بارے میں لکھتا ہے۔ "ان کی ناک چھٹی اور رنگ کالا ہے اور وہ مہنگ (سانپ) کی پوجا کرتے ہیں۔"

آریوں کے نزدیک وہ لامہذب لوگ تھے اور کوئی مذہبی رسم ادا نہیں کرتے تھے۔ داسیوں کے اپنے راجن یا سردار ہوتے تھے۔ جن کو آریوں کے جنگی ہیرو اندرانے جن جن کر مارا تھا۔ البتہ شاید بعض راجنوں نے بلا غیرے اعانت قبول کر لی اور اپنی گدی بچالی۔

رگ وید میں لکھا ہے کہ دو داسیو (سرداروں) پلجو تا اور تر کسانے ایک برہمن رشی و شا کو سواونٹ دان دیے۔

داسیو یا داس کا لفظ غلام کے معنی میں اس وقت رائج ہوا جب آریوں نے داسیوں پر غلبہ پا کر ان کو اپنا غلام بنا لیا۔

آسوروں میں دو اونچے طبقے ہوتے تھے۔ ایک ووتر اور دوسرے پانٹری یا دانی۔ ووتر پر وہت طبقہ تھا۔ اس کو پسا کے سب آسن آتے تھے اور وہ جادو ٹونے کا بھی ماہر تھا۔

کروٹ بدلنا شروع کر دی تھی۔

آریہ قبائل نے جنوبی پنجاب میں اپنی مستقل نوآبادی قائم کی اور اس خطے کو تبرک سمجھنے لگے۔ اس خطے کا نام انہوں نے آریہ ورت رکھا۔

مہا بھارت میں لکھا ہے کہ آریہ قبائل جب پہلے پہل پنجاب میں داخل ہوئے تو خانہ بدوش قبائل کی صورت میں آئے تھے۔

قبیلوں کے سردار راجے کہلاتے تھے۔ اس زمانے میں مبارزت یعنی دو دو بہادروں کی لڑائیوں کا طریقہ رائج تھا۔

آریاؤں کی آمد کے بعد معاشرے کا اپنا سسٹم قائم ہو گیا تھا۔ باقاعدہ حکومتی نظام تھا۔ راجاؤں کے میٹوں اور کشتری سرداروں کی جنگی تربیت دینے کے لیے فوجی اسکول قائم کر دیے گئے تھے۔

راجے اور کشتری گوشت کھاتے تھے۔ دیوتاؤں کے لیے جانوروں کی قربانیاں دی جاتی تھیں۔ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے یا چار پانچ بھائیوں کی ایک ہی بیوی کے خاوند بننے کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔

آریاؤں نے یہاں کے مقامی باشندوں پر بڑی حکمت عملی سے غلبہ حاصل کیا تھا۔ انہیں ذہنی طور پر اتنا مرعوب کر دیا تھا کہ آریا جس سمت اشارہ کرتے مقامی باشندے سدھائے ہوئے بھیڑوں کی طرح اس سمت چل پڑتے تھے۔

باذوق قارئین کی تاریخ سے دل چسپی کے لیے اگر آریاؤں کے نظام کو سمجھنے کی کچھ اور کوشش کی جائے تو بہت بہتر ہو سکتا ہے۔

وید کے لٹریچر کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ اب سے ساڑھے تین ہزار برس پہلے سندھ میں دو قومیں یا دونسلوں کے لوگ جگہ جگہ آباد تھے۔

ایک داسیو اور دوسرے آسور (آشور)، داسیو غالباً وہ قبیلے تھے جو آریوں کی یلغار سے پہلے بحر اسود سے پنجاب تک پھیلے ہوئے تھے۔

پارسیوں کی مقدس کتاب "آدستا" میں ان کو دیاؤ، داکھو اور واپلو کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

وید (گاؤں) اور دیہاتی کی اصطلاح میں داسیو ہی سے متعلق ہیں اور شاید پنجاب کی ڈاہا قوم داسیوں کی اولاد ہے۔

رگ وید سے پتا چلتا ہے کہ آریوں نے یہاں کے پرانے زرعی نظام کو نہیں بدلا۔ بلکہ زمین بدستور گاؤں یا قبیلے کے مشترکہ تصرف میں رہی۔ چنانچہ رگ وید میں زمین کے بٹوارے یا خرید و فروخت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

آریوں نے مقامی لوگوں کو غلام (داس) بنا کر ایک نئے سماجی نظام کی بنیاد ڈالی۔ (عالمی طبقاتی نظام اور چھوٹے چھوٹے ہندوستان میں اسی دور سے شروع ہوئی ہے)۔

ریاستوں کی تشکیل اس طرح ہوتی رہی کہ ہر قبیلہ اپنی اپنی تعداد کے مطابق زمینوں پر قابض ہوتا چلا گیا۔

”راشٹر“ بننے چلے گئے۔ آریا ریاست کو راشٹر کہا کرتے تھے۔ جو آج بھی استعمال میں آتا ہے جیسے سوراشر، مہاراشٹر وغیرہ۔

ریاست کے والی (مرکز) کو راجن کہا جاتا تھا۔ جیسے راجن پورہ جو دریائے سندھ کے مغربی کنارے کا شہر ہے۔ ہندوستان کی تہذیب اور تاریخ کی اب تک جو صورت حال سامنے آئی ہے وہ کچھ یوں ہے۔

آریاؤں کی آمد سے پہلے اس سرزمین پر دراوڑوں یا آسور آباد تھے۔

ان کے یہاں مادری نظام رائج تھا۔ یعنی عورت کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔

یہ لوگ شہر بنا کر رہا کرتے۔ سونے جو ڈوڑا اور ہڑپہ اس کی مثالیں ہیں۔ آسور لوگ جسم ہی کو اصل شے مانتے تھے۔ روح، دیوتا اور دوسری دنیا کے قائل نہ تھے۔ یعنی وہ مادہ پرست ہوتے تھے۔

پھر آریاؤں کی آمد شروع ہوئی۔

یہ آریہ اپنا نظام زندگی ساتھ لائے تھے۔ یہ خانہ بدوش ہوتے تھے لیکن ذہنی طور پر مقامی لوگوں سے برتر بھی تھے اور ان میں جنگی صلاحیتیں بھی تھیں۔

آریاؤں نے اپنے لائے ہوئے دیوی اور دیوتا متعارف کروائے اور ہندوستان بھر میں ایک نئی تہذیب جنم لینے لگی۔

آگے چل کر ویدانت تصنیف ہوئے۔ مہا بھارت اور کجنا کی تخلیق ہوئی۔ بڑی بڑی ریاستیں وجود میں آئیں۔

ہندوستان کے ان حالات کا تفصیلی ذکر آئندہ قسط میں ہوگا کیوں کہ ہم پندرہ سو قبل مسیح سے ایک قبل مسیح تک کا جائزہ لیں گے۔

جاری ہے

سلسلہ میں آریہ کے معنی اونچی ذات، شریف اور آزاد کے ہیں۔ گھوڑا ان کی سواری کا جانور تھا جس کو وہ رتھ میں جوتے تھے۔ پوشاک اونچی ہوتی۔ عورت اور مرد دونوں پگڑی باندھتے تھے۔ البتہ عورتیں چوٹیاں رکھتی تھیں۔ گوشت ان کی مرغوب غذا تھی۔ شورا ان کا دل پسند مشروب، سوم رس مذہبی رسومات کے وقت پیا جاتا تھا۔

آریوں کا معاشرہ قبیلہ داری تھا مگر وادی سندھ کے برعکس قبیلہ اور خاندان دونوں کے سربراہ مرد ہوا کرتے تھے۔

گھرانے کے سب لوگ ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ ہر گھر میں آگن شالہ ہوتا تھا۔ گھر کے مالک کو رم پتی کہتے تھے۔ عورت کا درجہ مرد سے کم تھا۔ عام طور پر ایک مرد اور ایک عورت کا رواج تھا۔

آریوں کے بڑے دیوتا سب مرد تھے۔ دیویاں گنتی کی ہوا کرتیں اور وہ بھی دیوتاؤں کی بیویاں نہ تھیں بلکہ داشتائیں تھیں۔

وادی سندھ میں آریہ قبیلوں کی آمد دو ہزار قبل مسیح میں شروع ہوئی اور یہ سلسلہ تقریباً پانچ سو سال تک جاری رہا۔ آریہ قافلے درہ خیبر یا درہ بولان کی راہ سے داخل ہوتے۔ مقامی باشندوں کو زیر کرتے۔ ان کی زمینوں اور مویشیوں پر قبضہ کر کے ان کو غلام بنا لیتے تھے۔ رفتہ رفتہ انہوں نے پورے ملک پر اپنا تسلط جما لیا۔ البتہ جب وادی سندھ میں گنجائش نہ رہی تو ایک ہزار قبل مسیح کے قریب ان کے کئی قبیلوں نے وادی گنگ و جمن کا رخ کیا اور پورے شمالی ہندوستان میں پھیل گئے۔

یہاں سے ہندوستان کی تاریخ کا وہ دور شروع ہوتا ہے۔ جب آریوں اور مقامی لوگوں کے اشتراک سے ایک نئی تہذیب سامنے آئی۔

ویدانت تخلیق کیے گئے۔ رجواڑے بنے، ہندو فلاسفہ سامنے آیا۔

بہت سے محققین کا یہ خیال ہے کہ دنیا کی سب سے پرانی کتاب رگ وید سندھ میں تخلیق ہوئی تھی۔ رگ وید یوں تو ایک ہزار سے زائد بھجوں کا مجموعہ ہے لیکن ان میں جا بجا ایسے واقعات کا ذکر بھی آتا ہے جن میں آریاؤں کی تہذیب کے خدوخال صاف دکھائی دیتے ہیں۔

رگ وید کا عہد تصنیف 1500 تا 1200 قبل مسیح ہے۔ پھر تین اور وید ہیں۔ سام وید، یجر وید اور اتھرو وید۔



ڈاٹ کام

سراب

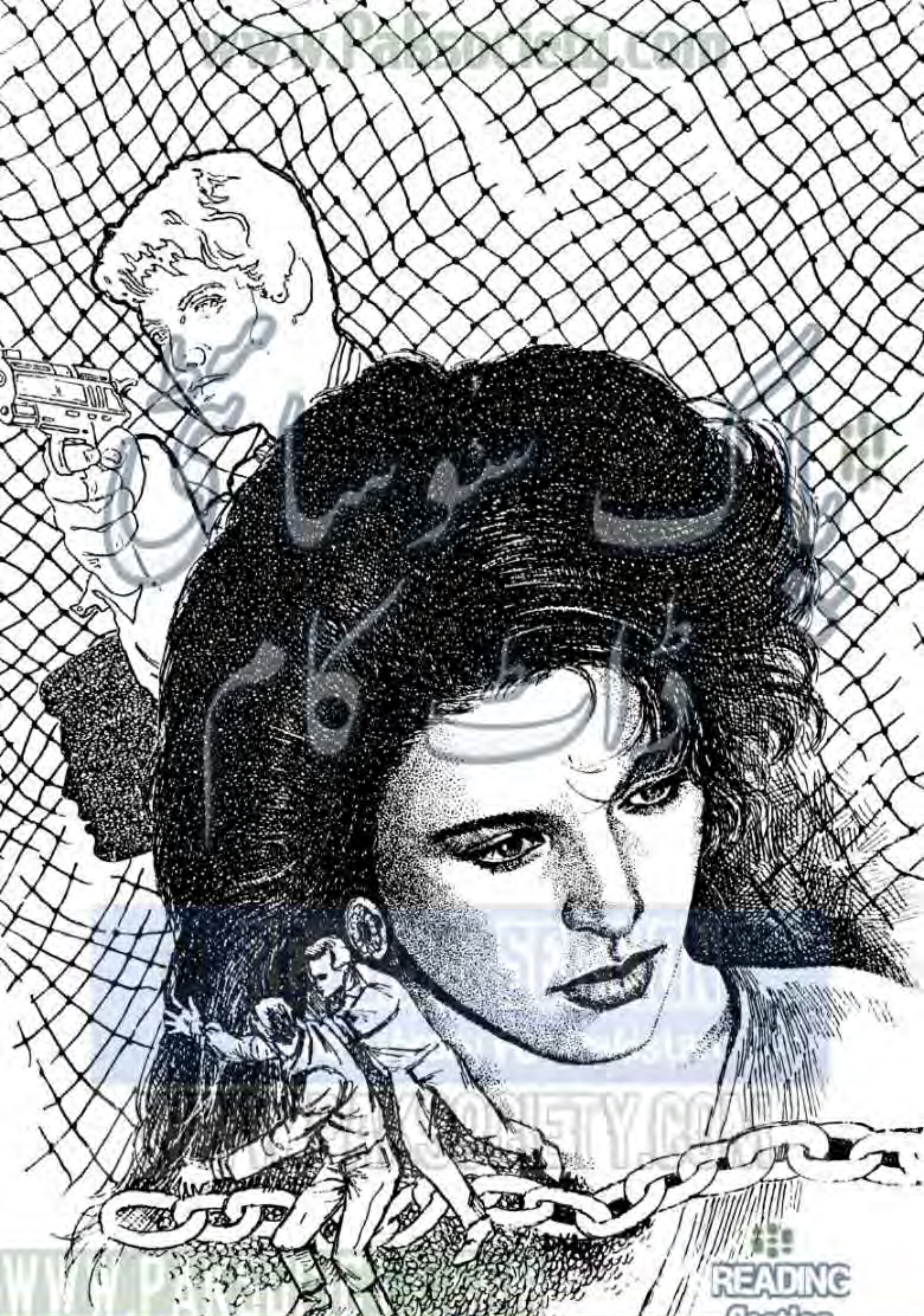
راوی : شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

قسط نمبر: 102

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کئی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب۔ ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن و دل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سراپوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی



READING
Section

میری محبت سویرا، میرے بھائی کا مقدر بنا دی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران میں نادر علی سے ٹکراؤ ہوا، اور یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شاہی جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ فتح خان نے مجھے مجبور کر دیا کہ مجھے ڈیوڈ شاہی کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کر دیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کی تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیب تک پہنچا ہی تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ میں نے کرنل زرو کی کو زخمی کر کے بساط اپنے حق میں کر لی۔ میں دوستوں کے درمیان آ کر کرنی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ ہم ماسکو پہنچے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہر بھی۔ وہ ہمیں بریف گیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زرو کی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پتہ چھانڈتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کر رہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھاگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زرو کی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کر دیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپا دیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پایا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کرنل جینس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کر دی اور میں نے ان کے ساتھ جا کر بریف کیس حاصل کر لیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کونٹی پر آ گئے۔ سفیر کو وہی بھیجنا تھا اسے ائر پورٹ سے ہی آف کر کے آرہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست دان کی بیٹی کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کونٹی میں لے آئی۔ وہاں جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کتور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ سہ ماہی مجھ پر راضی ہو گیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑ لیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ بانو بھی اغوا ہو کر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ اس گاڑی میں بٹھا کر۔ آگے بڑھے تھے کہ ہماری گاڑی کو دو طرف سے گھیر لیا گیا۔ فتح خان تھا، اس نے ڈیوڈ شاہی کے اشارے پر مجھے گھیرا تھا۔ میں اس کے ساتھ ڈیوڈ شاہی کے پاس پہنچا۔ ڈیوڈ نے پراسرار ادوی میں چلنے کی بات کی۔ اس نے ہر کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ سعدیہ کو کتور پولیس سے آزاد کرانے کی بات بھی ہوئی اور اس نے بھر پور مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہماری خدمت کے لیے پوجا نامی نوکرانی کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تھی کہ اس کے ماسکرو فون سے منشی دل جی کی آواز سنائی دی "شامی، شہباز ملک کسی عورت کو چھڑانے آیا ہے۔" ڈیوڈ شاہی کا جواب سن نہیں پایا کیونکہ پوجا نے مانگ بند کر دیا تھا۔ اس دن کے بعد سے پوجا کی ڈیوٹی کہیں اور لگا دی گئی۔ میں ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر موبائل پر باتیں کر رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے وار کر کے بے ہوش کر دیا اور نکل میں پہنچا دیا۔ مجھے پتا تھا ہر جگہ ڈیکالٹون لگا ہوا ہے۔ کبھی فائرنگ شروع ہوئی اور میں نے چیخ کر کہا "کتور ہوشیار" سادی کو لے کر چیمبر....." مگر جملہ ادھورارہ گیا اور سادی کی چیخ سنائی دی پھر منشی دل نظر آیا۔ اس کے آدمیوں نے بڑے کتور کے وفاداروں کو ختم کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں اس سے نمٹ رہا تھا کہ فتح خان نے آکر مجھے اور سادی کو نشانے پر لے لیا۔ کتور آ گیا۔ اس نے گولی چلائی جو بیٹو کی گردن میں لگی۔ میں نے غصے میں پورا پستول راج کتور پر خالی کر دیا بیٹو مر چکا تھا۔ اس کی لاش کو ہم نے چتا کے حوالے کیا اور ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعہ سرحد تک پہنچے۔ وہاں سے اپنے شہر۔ وہاں پہنچا ہی تھا کہ ڈیوڈ کی کال آئی اس نے تعذیر کرانے کی بات کی اور کال کٹ گئی۔ ہم جنگل میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ گیس پھینک کر ہمیں بے ہوش کر دیا گیا اور جب ہوش آیا تو میں قید میں تھا۔ شاکی قید میں شانے مجھے کہا کہ میں قاضی کی مدد کروں کیونکہ میرے ہاتھوں میں ایک ایسا کڑا پھندا دیا گیا تھا جو قاضی سے 500 میٹر دور جاتے ہی زہر انجیکٹ کر دیتا، میں حکم ماننے پر تیار ہو گیا قاضی نے مرشد کی جعلی خانقاہ پر حملے کا پروگرام بنایا۔ ہم نے قاضی کے آدمیوں کے ساتھ مل کر حملہ کیا۔ حملہ کامیاب رہا قاضی مارا گیا اور مجھے سانپ نے ڈس لیا مگر سانپ کا زہر مجھ پر کارگر نہ ہوا۔ قاضی نے جو کڑا مجھے پہنایا تھا اس کا الٹا اثر ہوا اور وہ خود کڑے میں مجھے ساجینا پیڈز ہر سے مارا گیا۔ میں مرشد کی خانقاہ سے نکل کر دوستوں کے پاس پہنچا پھر راجا صاحب سے ملنے جیب کے ذریعے ان کے علاقے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں وہ علاقہ بھی تھا جہاں برٹ شانے ہیرے چھپائے تھے۔ میں اسے تلاش کرنے کے لیے بیڑ پر چڑھا تھا کہ فائر ہوا اور میں پھسل کر نیچے گرا ہی تھا کہ فتح خان کی آواز آئی کہ تم ٹھیک تو ہے پھر وہ مجھے قید کر کے لے چلا۔ راستے میں اس کے ساتھیوں نے غداری کی مگر میری مدد سے فتح خان فتح یاب ہو گیا۔ مگر آگے جا کر میں نے فتح خان کو گولی مار دی اور واپس وہاں آیا جہاں گاڑی کر کے گیا تھا۔ وہ لاش پڑی تھی۔ ابھی میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ پولیس والے آگئے اور مجھے تھانے لے آئے۔ وہاں سے رشوت دے کر چھوٹا پھر راجا صاحب کے محل پہنچا مگر وہاں کے حالات بدل چکے تھے۔ میں واپس ہو گیا کہ راستے میں ایک عورت اور دو نوجوانوں نے مجھے گھیر لیا اور میرے سر پر کسی چیز سے وار ہوا۔ میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ ہوش آیا تو میں شیر خان کی قید میں تھا۔ وہ لوگ مجھے افغانستان کے راستے بھارت لے آئے تب پتا چلا کہ وہ لڑکی ڈیوڈ کی کارندہ ہے لیکن اس نے ڈیوڈ شاہی کے گلے لگ کر کہا "پاپا" تو میں حیران رہ گیا۔ میں نے خواب میں بھی ایسا نہیں سوچا تھا ڈیوڈ نے اوشا کی بھی وہیں قید کر رکھا تھا۔ وہیں میری ملاقات ایک خپالی سے ہوئی جو انہیں کا کارندہ تھا اس نے مجھے ایک موبائل فون دیا جس سے میں نے ایمن

سے باتیں کیں مگر اس کا راز کھل گیا اور شانے اسے قتل کر دیا۔ دو دن کے بعد تاریک وادی کا سفر شروع ہو گیا۔ ہم آگے چلے جا رہے تھے کہ باسوکا پھر پھسلا اور وہ ایک کھڈ میں گرنے لگا۔ ہم سب برف پوش پہاڑوں پر چڑھنے کے لیے ایک ہی رسی میں خود کو باندھے ہوئے تھے اس لیے میرا توازن بگڑا اور میں آگے کی سمت گھٹا تھا کہ زینبی نے سنبھال لیا۔ کرنل نے باسوکو رسی پھینک کر بچالیا۔ ہمارا سفر جاری رہا۔ ایک جگہ برفانی آدمیوں کے ایک غول نے گھیر لیا۔ ان سے بچ کر نکلا تو راستہ بھٹک گیا اور ایک سرنگ میں پہنچ گیا جو برف والے آدمی کی تھی۔ برف والے سے ملاقات ہوئی برف والے نے کپٹی دبا کر بے ہوش کر دیا جب ہوش آیا تو میرے سر پر تیر کمان سے لیس کچھ سپاہی کھڑے تھے انہوں نے مجھے گرفتار کر کے وادی کے حکمران ریٹاٹ کی قید میں پہنچا دیا، وہاں ایک ہمدرد گیرٹ نے مجھے فرار میں مدد دی اور میں برف والے کے کہنے کے مطابق سامیرا کی فوج کی مدد کرنے کے لیے اس کے علاقے میں پہنچ گیا۔ میں نے فوج کو از سر نو تیاری کرانا شروع کر دی تھی کہ ریٹاٹ کے قلعہ آرگون کی طرف سے قرنا پھونکے جانے کی آواز بلند ہوئی سامیرا کا چہرہ زرد ہو گیا اور اس نے زپر لب کہا "اعلان جنگ" میں نے فوراً ہی سامیرا کی فوج کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ فوج کو رسد کی اشد ضرورت رہتی ہے۔ رسد کے لیے مناسب انتظام کیا۔ ایک روز معائنہ کے بعد واپس لوٹ رہا تھا کہ ایک بچے کے منہ سے برف والے کا پیغام ملا کہ رات سے پہلے ٹھکانے پر لوٹ آیا کرو۔ رات باہر نہ گزارنا۔ میں روہیر کے ساتھ علاقے کو دیکھنے کے لیے نکلا تو پہاڑیوں کے درمیان مجھے کچھ ایسے گول پتھر نظر آئے جنہیں اسلحہ کے طور پر استعمال کر سکتا تھا۔ ابھی میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ خونخوار اسار نے گھیر لیا اور میں روہیر کے ساتھ ایک پہاڑی غار میں گھس گیا۔ پھر اسار اور بندر نما جانور کے علاوہ ہارن سے بھی ڈبھیر رہی مگر اگلی صبح ہم بخیریت واپس سامیرا کے پاس آ گئے۔ سامیرا نے کہا کہ یہ بہت برا ہوا ہے۔ سبھی سومرو چند سپاہیوں کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہو اور مجھے جکڑ لیا۔

(اب آگے پڑھیں)

کھا کر اس کی ہمت جواب دے گئی۔ ایک تیر نے اس کے گلے کی مرکزی شریان کاٹ دی تھی اور یہی اس کے لیے باعث مرگ ثابت ہوئی تھی۔ چوتھا اسار فرار میں کامیاب رہا تھا مگر وہ بھی اتنا زخمی تھا کہ اس کا پلٹ کر آنا محال لگ رہا تھا۔ مشکل سے ایک منٹ پہلے اسار جاوی تھے اور میں زندگی و موت کی سرحد پر تھا اور اچانک ہی بازی پلٹی۔ موت اساروں کے حصے میں آئی اور زندگی نے مجھے چن لیا۔ میدان صاف ہوتے ہی درختوں کے پیچھے سے ربیک اور روہیر پانچ دوسرے افراد کے ساتھ نکلے تھے۔ ربیک آگے آیا اور گرم جوشی سے میرے سینے سے لگا۔

"آپ نے کمال کر دیا۔ میں نے آج تک کسی کو اس طرح سے اسار کا مقابلہ کر کے اسے ختم کرتے نہیں دیکھا۔"

"کمال تو تم نے کیا ہے۔ بالکل موقع پر آنے۔"

میں نے کہا تو روہیر نے ترجمہ کیا۔ میں نے روہیر کی طرف دیکھا اور حنفی سے پوچھا۔

"تم ٹیلے سے کیوں اتری تھیں؟"

وہ خفیہ ہو گئی۔ "میں نے ان لوگوں کو آتے دیکھ لیا تھا اور جب اسار بٹے تو میں انہیں خبردار کرنے گئی تھی۔"

"تب تو تم نے ٹھیک کیا۔ میں حیران تھا کہ سپاہیوں اور اساروں کی آوازیں سننے کے بعد بھی تم نے نیچے اترنے کی حماقت کیوں کی؟"

"اس نے بہترین کام کیا ورنہ ہم بے خبری میں اساروں کے سامنے آجاتے اور ہمارا بھی وہی انجام ہوتا جو آرگون کے سپاہیوں کا ہوا ہوگا۔"

میں چونکا۔ "تم ان کے بارے میں جانتے ہو؟"

جب سے عام زندگی چھوڑ کر جدوجہد کے مراحل سے گزر رہا تھا۔ میں نے کبھی موت کے آگے ہتھیار ڈالنے کا نہیں سوچا تھا۔ کبھی موت کو سامنے دیکھ کر آنکھیں بند نہیں کیں۔ چاہے وہ کتنی ہی یقینی کیوں نہ نظر آ رہی ہو۔ اس وقت بھی اساروں کی صورت میں سامنے یقینی موت تھی اور ان میں سے ایک اڑتی ہوئی میری طرف آ رہی تھی۔ مگر میں نے آنکھیں بند نہیں کی تھیں اور میری نظر اس پر مرکوز تھی۔ آخری دم تک کوشش کرتے رہنا اور پھر امید رہنا میرا شیوہ رہا ہے اور شاید اس وجہ سے بھی بہت سے مواقعوں پر اوپر والے نے مجھے محفوظ رکھا۔ ابھی اسار راستے میں تھا کہ میں نے بائیں طرف چھلانگ لگائی۔ میں زمین پر گر اور فوراً ہی اچھل کر کھڑا ہوا تھا کیونکہ اسار پہلی ناکامی کے بعد دوسرا حملہ کرنے میں تاخیر نہیں کرتا۔ گرنے کے دوران میں وہ سنسناتی آوازیں نہیں سن سکا تھا مگر اسار کی خوفناک غراہٹ سن لی تھی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ جہاں چٹان سے ٹکرایا تھا وہیں گر گیا تھا اور اس کی وجہ چٹان سے ٹکر نہیں تھی۔ اسار کے جسم میں کم سے کم نصف درجن تیر اترے ہوئے تھے اور ان میں سے ایک اس کی کھوپڑی کے آر پار ہو گیا تھا۔ یہی اس کی فوری موت کی وجہ بنا تھا۔ ابھی میں حیران ہو رہا تھا کہ اتنے تیر کس نے چلائے ہیں کہ تیروں کی دوسری بو چھاڑ آئی اور اس بار نشانہ بچ جانے والے دو اسار تھے۔ تیر کھا کر وہ غرائے اور افراتفری میں فرار کے لیے پیچھے ہٹے مگر ان میں سے ایک کی قضا آگئی تھی۔ چند سیکنڈ کے وقفے سے تیر دوبارہ اترے اور سب کے سب اس کے جسم میں اتر گئے۔ اتنے تیر

جاگتے رہنا ضروری تھا ورنہ اگر یہ جگہ دشمن کی نظر میں ہوتی تو ہم رات بڑی آسانی سے مارے جاتے یا اس کے قبضے میں آجاتے۔ میں صبح اٹھا تب بھی سب سو رہے تھے اور مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ کسی کو پہرے پر لگانا چاہیے تھا۔ مجھے بیدار پا کر روبیر اندر سے نکل آئی۔ وہ بھی جاگ گئی تھی۔ اس کی حالت پہلے کے مقابلے میں بہت بہتر ہو گئی تھی۔ اس کے ہاتھ پیروں کی خراشیں مدھم پڑ گئی تھیں اور چہرے کی اصل رنگت بحال ہو گئی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

”آپ نے ان لوگوں کو سرنگ والے راستے کا کیوں نہیں بتایا؟ کیا ان لوگوں پر شک ہے؟“

”بتاؤں گا لیکن اچھی نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے شک نہیں ہے اور نہ میں بلا وجہ شک کرنے کا عادی ہوں۔ لیکن بعض اوقات احتیاط بہتر ہوتی ہے۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”یہ لوگ برتن بھی لائے ہیں میں کھانا بنا لیتی ہوں۔“

وہ راشن کے ساتھ سبزیاں اور دوسری چیزیں بھی لائے تھے۔ روشنی ہونے سے پہلے ہی اس نے ناشتے کی تیاری شروع کر دی۔ کچھ دیر میں ربیک جاگ گیا تھا۔ اسے جلدی روانہ ہونا تھا اس لیے وہ جلد اٹھ گیا۔ اس کے ساتھی لمبی تان کر سو رہے تھے۔ میں نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو پرسوں والے سفر اور اس سے حاصل ہونے والی معلومات اور چیزوں کے بارے میں نہیں بتایا تھا مگر میں خود آرگون کے سپاہی کی وردی میں تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا اور ناشتے کے دوران اس نے وردی کے بارے میں پوچھا۔ ”یہ کہاں سے ہاتھ لگی؟“

”ان سپاہیوں سے جن کی تلاش میں کل والا دستہ آیا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں اور روبیر جنگل میں ذرا آگے گئے تھے کہ وہ سامنے آگئے اور ان سے مقابلہ کرنا پڑا۔“

”شہباز نے تینوں کو ٹھکانے لگا دیا۔“ روبیر نے یوں فخر سے کہا جیسے خود اس نے یہ کارنامہ انجام دیا ہو۔ ”وہ بھی صرف نیزے کی مدد سے۔“

ربیک نے حیرت سے کہا۔ ”تم سپاہیوں کو نیزے کی مدد سے۔“

”نہیں اس میں سے ایک کو روبیر نے تیر سے نشانہ بنایا تھا۔“ میں نے سچ بیانی سے کام لیا۔ ”باقی دو سے مقابلہ کیا تھا۔“

”آرگون کے سپاہی بہت تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔“

”وہ تربیت یافتہ ہوں گے۔“ میں نے تردید کی۔

کے بستر بھی تھے۔ انہوں نے اپنے بستر بچھائے اور لیٹ گئے۔ ٹیلے پر اس کے لیے خاصی جگہ تھی۔ میں نے ربیک کو کیبن میں بلایا اور اس سے پوچھا کہ کیا ان نوجوانوں کی کمی محسوس نہیں ہوگی کیونکہ یہ باقاعدہ فوج میں شامل تھے۔ اس نے کہا۔ ”انہیں سامیرا نے خصوصی کام کے لیے قلعوں سے باہر بھیجا ہے۔ باقی سب اتنا ہی جانتے ہیں۔“

میں فکر مند ہو گیا۔ میرے دشمن جانتے تھے کہ سامیرا ابھی بھی میری مدد کر رہی ہے۔ اس لیے ان نوجوانوں کی روانگی ان کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہی ہوگی۔ میں نے پوچھا۔ ”تم لوگوں کا پوچھا تو نہیں کیا گیا؟“

”میں نے اس کا بہت خیال رکھا۔“ ربیک نے کہا۔ ”کیونکہ سامیرا نے مجھے خبردار کیا تھا کہ قلعوں میں موجود آرگون کے جاسوس ہمارا پوچھا کر سکتے ہیں۔ مگر کوئی پوچھے نہیں آیا۔“

”پوچھا کرنے والے چھپ کر کرتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن دیکھا جائے گا۔ اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟“

”صبح ہوتے ہی واپس جاؤں گا۔“ اس نے کہا۔ ”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آرگون کی طرف سے کوئی جنگی کارروائی شروع ہوتے ہی مجھے علم ہو جائے۔“

”آپ کو علم لازمی ہوگا کیونکہ جنگ کے لیے قرنا بجایا جائے گا۔ آپ اس کی آواز پہلے بھی سن چکے ہیں۔“

”ٹھیک ہے اس صورت میں تم فوراً میرے پاس آؤ گے اور ہو سکتے تو مزید اعتماد کے سپاہی لے آنا۔“

وہ ہچکچایا اور پھر پوچھا۔ ”کیا آپ کا کچھ کرنے کا ارادہ ہے۔“

”بالکل، یہ جگہ میری بھی ہے۔ قطع نظر اس کے کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ میں اب بھی سامیرا اور تم لوگوں کے ساتھ ہوں۔“

وہ مہر جوش ہو گیا۔ ”تب یہ جگہ ہم جیتیں گے۔ برف والے نے کہا آپ جس کے ساتھ ہوں گے جنگ وہی جیتے گا۔“

میں حیران ہوا کیونکہ یہ بات سامیرا تک محدود تھی۔ لیکن اب ایسا لگ رہا تھا کہ اس نے کسی مقصد کے تحت سب میں پھیلا دی تھی۔ ربیک نے تصدیق کی کہ نامعلوم ذریعے سے یہ خبر تینوں قلعوں کے عام افراد تک پہنچ رہی تھی۔ عام فرد کی برف والے کے ساتھ عقیدت غیر متزلزل ہے اس لیے

لازمی دوسروں پر اس کا اثر پڑا تھا۔ رات کا دوسرا پہر تھا جب ہم سونے کے لیے لیٹے اور کیونکہ سب کا ہی حکم سے برا حال تھا اس لیے سب ہی سو گئے۔ یہ غلطی تھی ہم میں سے ایک کا

کے تھے میں سامیرا کو باقاعدگی سے ان کی رپورٹ کرتا رہا تھا اور اسے ایک ایک چیز بتاتا تھا۔ اس لیے اب وہ میرے بنائے پروگرام کو اسی طرح کامیابی سے چلا رہی تھی جیسے میں چلا رہا تھا۔ دیکھا جائے تو دشمنوں کی سازش اس لحاظ سے ناکام رہی تھی کہ وہ مجھے سامیرا سے جدا کرنے میں ناکام رہے تھے اور قلعوں کا دفاع مضبوط ہو رہا تھا۔ دوسری طرف مجھے عمومی ذمے داریوں سے نجات مل گئی تھی اور میں اب وہ کر رہا تھا جس کے لیے برف والے نے مجھے یہاں بھیجا تھا۔ ریک زیادہ دیر نہیں رکھا تھا۔ وہ چند گھنٹوں بعد چلا گیا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا اور ابھی شام ہونے میں کئی گھنٹے باقی تھے۔ وہ دشمنی میں ہی واپس قلعوں تک پہنچ جاتا۔

جس وقت میں ٹیلے اور اس پر رہنے والے انسانوں کے دفاع کو مضبوط بنانے کا سوچ رہا تھا تو جانوروں سے نمٹنے کے لیے میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی تھی۔ اس ترکیب کو نظر رکھتے ہوئے میں نے اپنے آدمیوں کے ہمراہ جنگل سے بڑی مقدار میں دو شاخہ ہونے والی بڑی لکڑیاں تلاش کی تھیں اور پھر انہیں خشک ہونے کے لیے ٹیلے پر پھیلا دیا تھا ان میں سے بہت سی پہلے ہی خشک تھیں۔ ان کے دو اور سہ شاخوں پر خشک گھاس کے پولے باندھے گئے تھے۔ ریک کے جانے کے بعد میں نے سب کو تیار کرنا حکم دیا۔ روبیر کو بھی۔ وہ سب تیار ہونے لگے اور کچھ ہی دیر میں تقریباً سب آرگون کی سپاہ کے چلے میں آچکے تھے۔ حد یہ کہ روبیر نے سرخ لباس پہنا ہوا تھا حالانکہ آرگون کی فوج میں عورتیں نہیں ہوتی ہیں۔ سب نے ہتھیار لیے اور پھر سب نے دو عدد دو شاخہ لکڑیاں اٹھائیں۔ روانگی سے پہلے میں نے انہیں بریف کیا۔

”ساتھیوں آج ہمارا پہلا امتحان ہے۔ ہمیں آرگون کے سپاہیوں کے کسی گھسٹے پر یوں چھپ کر حملہ کرنا ہے کہ انہیں بھاگنے یا جوابی حملہ کرنے کا موقع نہ ملے۔ کم سے کم فرار سے لازمی روکنا ہے۔ تاکہ آرگون والے ہماری موجودگی سے واقف نہ ہو سکیں۔ ہمیں بہت احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ جب تک میں حکم نہ دوں حملہ نہیں کرنا ہوگا اور نہ ہی دشمن کو متوجہ کرنے والا اور کوئی کام کرنا ہوگا۔ اپنی حفاظت اور رازداری سب سے اہم ہوگی۔ میری بات سمجھ آگئی ہے ورنہ تم لوگ سوال کر سکتے ہو۔“

روبیر میری تقریر کا ترجمہ کر رہی تھی اور اسی کے توسط سے ان سب نے سوالات کیے۔ میں جواب دیتے ہوئے ان کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا کہ وہ ہر بات پوچھیں تاکہ

صاف ذہن کے ساتھ یہاں سے روانہ ہوں۔ آگے چل کر ان سے کوئی غلطی نہ ہو۔ جب وہ مطمئن ہو گئے تو ہم ٹیلے سے نیچے آئے۔ لکڑی کی سیڑھی کو ممکنہ حد تک بیلوں سے چھپا دیا تھا۔ روانگی سے پہلے میں نے کچھ ایسی نشانیاں لگائیں۔ اگر کوئی یہاں آتا اور ٹیلے پر جاتا تو مجھے علم ہو جاتا۔ ہمارا رخ میدان کے ساتھ ساتھ پھیلے جنگل میں آرگون کی طرف تھا۔ ایک گھنٹے بعد ہم آرگون کے کھیتوں اور باغات تک پہنچ گئے تھے۔ درمیان میں صرف گھاس کا کوئی تین چار سو گز چوڑا میدان تھا۔ اس میدان کو باقاعدہ جھاڑیوں اور درختوں سے صاف رکھا جاتا تھا تاکہ جنگل اور کھیتوں کے درمیان حد فاضل رہے اور اگر کوئی جانور جنگل سے نکل کر آئے تو دور سے نظر آجائے۔ ان جانوروں سے نمٹنے کے لیے یہاں آرگون کی سپاہ کے دستوں کی موجودگی لازمی تھی۔

ہم ایک جگہ رکنے۔ روبیر نے پوچھا۔ ”اب کیا کرنا ہے؟“

”انتظار۔“ میں نے کہا۔ ”ہم کھیتوں و باغات کی طرف جائیں گے تو بہت سی نظروں میں آسکتے ہیں۔ یہاں یقیناً نگرانی کی جا رہی ہوگی۔ خاص طور سے گیارہ سپاہیوں کی گم شدگی کے بعد سے وہ لوگ بہت چوکنا ہوں گے۔ ایسے میں ہمارا اس طرف جانا مناسب نہیں ہوگا۔ ہمیں کسی دستے کے باہر آنے کا انتظار کرنا چاہیے۔“

”اگر اس طرف سے کوئی نکلا تو؟“

”تب ہم انہیں متوجہ کر کے اس طرف بلائیں گے۔“

روبیر مسکرانے لگی۔ ”اور جب وہ یہاں آئیں گے تو ان کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔“

میں نے حکمت عملی مزید واضح کی۔ ”بالکل مگر کوشش کرنی چاہیے کہ ان میں سے کوئی زندہ بھی ہاتھ آئے۔ اس سے ہمیں آرگون کے اندر کی صورت حال کا علم ہو سکتا ہے۔“

روبیر سوچ رہی تھی۔ ”اگر سپاہی آئے تو انہیں کیسے یہاں متوجہ کیا جائے گا۔“

”ہم نے آرگون کے سپاہیوں کی وردی پہنی ہوئی ہے۔ وہ ہمیں اپنا آدمی سمجھیں گے۔“

ابھی ہم گفتگو کر رہے تھے کہ آٹھ یا نو سپاہیوں پر مشتمل ایک دستہ باغ سے برآمد ہوا۔ وہ آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے اور ان کا انداز انجوائے منٹ والا تھا۔ شاید ان کی ڈیوٹی ختم ہو گئی تھی اور وہ اس وقت چھٹکن اتار رہے تھے۔ وہ باہر نکل کر گھاس پر دراز ہو گئے۔ ان کے پاس ہتھیار تھے جو انہوں نے جسموں سے اتار کر پاس رکھ لیے۔ ان میں سے اکثر لیٹ گئے تھے اور کچھ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ اپنے

سکتا تھا۔ میں نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے لیکن پہلے ہمیں جنگل کے اندر کوئی ایسی جگہ دیکھنی ہوگی جہاں ان کو اس طرح گھیرا جائے کہ کوئی بچ کر نہ نکلنے پائے۔“

ہم پیچھے درختوں میں آئے۔ تقریباً پچاس گز اندر ہمیں ایک کسی قدر کھلی جگہ ملی جس کے چاروں طرف کھنی شاخوں اور پتوں والے درخت تھے اور گھات لگانے کے لیے یہ جگہ نہایت موزوں تھی۔ وہ پانچوں درخت پر چڑھنا چاہ رہے تھے مگر میں نے ایرٹ کو روک لیا۔ ”تم میرے ساتھ رہو گے۔ یہ بتاؤ کہ اگر ان لوگوں کو بتانا ہو کہ آرگون والے اس طرف آرہے ہیں تو کیسے اشارہ دیا جاسکتا ہے؟“

”میں ایک پرندے کی آواز نکال سکتا ہوں جو یہاں پایا جاتا ہے۔“ ایرٹ نے کہا اور آواز نکال کر دکھائی۔ آواز میں مصنوعی پن نہیں تھا۔ میں نے اسے اوکے کر دیا۔

”ٹھیک جب تم ایک بار آواز نکالو گے تو مطلب ہو گا کہ دشمن ہماری چال میں آگیا ہے۔ دو بار یہ آواز نکالو گے تو اس کا مطلب ہو گا دشمن اس طرف آرہا ہے اور تین بار آواز نکالنے کا مطلب ہو گا دشمن بالکل نزدیک آگیا ہے سب تیار رہیں۔“

روبیر نے سب کو بتایا تو وہ سمجھ گئے۔ مزید تسلی کے لیے کچھ سوال جواب کے بعد میں نے کہا۔ ”حملے کا اشارہ میں کروں گا اور جب میں چلا کر کہوں ٹوٹ پڑو تو حملہ کرنا ہے۔“

روبیر نے ان کو بتایا تو سب نے جلدی سے ”ٹوٹ پڑو“ کی گردان کی اور اسے ذہن نشین کر لیا۔ شاٹ، ایمار، رائٹون اور مارٹ میرے منتخب کیے درختوں پر چڑھ گئے۔ اس کے بعد ہم واپس آئے اور میں نے دو درخت اور منتخب کیے۔ یہ کھلے میدان سے ذرا ہی اندر تھے۔ ایرٹ اور روبیر نے ان پر اپنا سامان چڑھا دیا۔ اب یہ وقت ضرورت صرف ان کو اوپر چڑھنا پڑتا۔ جب سب ہو گیا تو میرا دھیان اصل مسئلے کی طرف گیا۔ روبیر نے بھی جنگلی وردی پہن رکھی تھی۔ وردی میں موجود کرتہ نہ تو زیادہ کھلا تھا اور نہ ہی یہ طویل تھا۔ یہ مشکل گھنٹوں تک آتا تھا۔ اگر روبیر اسی وردی میں آرگون کے سپاہیوں کے سامنے جاتی تو انہیں شک ہو جاتا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ ہم اور کوئی لباس ساتھ نہیں لائے تھے۔ اس وقت اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی مگر اب میں سوچ رہا تھا کہ ہمیں ایک سادہ لباس لانا چاہیے تھا تا کہ روبیر عام عورت ہونے کا تاثر دے سکتی۔ وہ وردی میں ہوتی تو آرگون والے ویسے ہی چوکنہ ہو جاتے

پینے کا سامان ساتھ لائے تھے مگر یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ جو پی رہے تھے وہ سادہ پانی تھا، کوئی قوت بخش مشروب یا مقامی شراب تھی۔ ہم انہیں دیکھ رہے تھے۔ ایمار اور ایرٹ میرے پاس تھے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ یہ دونوں نوجوان ذہن کا استعمال کرتے تھے اس لیے میں ان سے بات کرتا تھا اور ان سے مشورہ لیتا تھا۔ اس وقت بھی میں نے پوچھا۔ ”کیا خیال ہے انہیں کیسے قابو کیا جاسکتا ہے؟“

”انہیں متوجہ کر کے یہاں بلا کر۔“ ایمار نے کہا۔

”میرا خیال ہے ہم سب درختوں پر چڑھ جاتے ہیں۔“ ایرٹ نے اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”جب وہ یہاں آئیں تو انہیں تیروں سے نشانہ بنائیں۔“

”دشمن اس میں خطرہ ہے۔“ روبیر نے کہا۔ حسب معمول گفتگو اسی کے توسط سے ہو رہی تھی۔ ”ہو سکتا ہے وہ سب نہ آئیں اور ہو سکتا ہے کہ جس وقت ہم انہیں نشانہ بنا رہے ہوں۔ اندر سے مزید سپاہی نکل آئیں۔ اس صورت میں ہم خطرے میں پڑ جائیں۔“

میں نے روبیر کی تائید کی۔ ”خطرے کا سامنا نہیں کرنا ہے کیونکہ یہ کام ہم شق کے طور پر کر رہے ہیں۔“

”تب تم کیا کہتی ہو؟“ ایرٹ نے کسی قدر طنز یہ انداز میں پوچھا۔

روبیر نے میری طرف دیکھا۔ ”ربان والے واقعے سے اندازہ ہو گیا ہے کہ آرگون کے سپاہی آج کل بے قابو ہو رہے ہیں۔ اگر انہیں کوئی عورت نظر آئے تو کیا یہ اس کی طرف نہیں آئیں گے۔“

روبیر کی تجویز نے مجھے متاثر کیا۔ ”وہ بالکل آسکتے ہیں۔“

”اب ہم درختوں کے ذرا اندر ان کے لیے جال بچھاتے ہیں۔ ایرٹ کی تجویز کے مطابق یہ سب درختوں پر ہوں گے۔ میں اور آپ نیچے ہوں گے۔ ہم ہی انہیں متوجہ کریں گے۔“

”وہ کیسے؟“ ایمار نے پوچھا۔

روبیر کا چہرہ سرخ ہوا تھا۔ ”میں مظلوم لڑکی بنوں گی۔ میں درختوں سے یوں نکلوں گی جیسے آپ سے بچ کر بھاگ رہی ہوں اور آپ پیچھے سے آکر مجھے پکڑ لیں گے۔ اس دوران میں میں چیخ چلا کر ان کو متوجہ کر لوں گی اور پھر آپ مجھے زبردستی درختوں میں لے جائیں گے۔ وہ دیکھ لیں گے کہ ان کا ہی ایک ساتھی ہے تو وہ لازمی یہاں آئیں گے۔“

روبیر کا بیان اچھا تھا۔ سادہ اور موثر۔ اگر اس پر اچھے طریقے سے عمل کیا جاتا تو یقیناً یہ کامیاب ہو

اور پھر مشکل سے ہی ہمارے جال میں آتے۔ میں نے روبیر سے کہا۔

”یہ تو مسئلہ ہو گیا تمہارے لباس سے سارا تاثر ہی بدل جائے گا۔“

وہ بھی پریشان ہو گئی۔ ”یہ تو ہے۔“

”تب ہمیں پلان بدلنا ہو گا یا ترک کرنا ہو گا۔“

روبیر سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے کہا۔ ”نہیں پلان تبدیل نہیں ہو گا۔“

”وہ کیسے؟“ میں نے پوچھا تو اس نے ایرٹ کی طرف دیکھا۔

”تم درخت پر جاؤ۔“

ایرٹ جانتا تھا کہ روبیر کا درجہ میرے بعد آتا تھا اور اس کا حکم ماننا بھی لازمی تھا اس لیے وہ خاموشی سے درخت

پر چڑھ گیا۔ روبیر میرے ساتھ آگے آئی اور اس نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ ”میں لباس اتار دوں گی۔“

میں دنگ رہ گیا پھر میں نے ہڑبڑا کر کہا۔ ”کیا مطلب لباس اتار دوں گی؟“

”میں یہ وردی اتار دوں گی۔“ اس نے وضاحت کی۔ ”پھر ان لوگوں کو شک نہیں ہو گا اور وہ اسے بالکل سچ سمجھیں گے۔“

میں اس کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”تب تم کیا پہنوں گی یہاں کوئی اور لباس نہیں ہے۔“

اس کا سرخ چہرہ مزید سرخ ہو گیا۔ ”کچھ..... بھی نہیں۔“

میرا چہرہ بھی سرخ ہوا تھا مگر غصے سے۔ ”میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں نے آج تک اپنے مقصد کے لیے کسی عورت کو یوں استعمال نہیں کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ اس کی توہین ہے۔“

”مجھے..... بس آپ ہی دیکھیں گے۔“ اس نے انک کر کہا۔ ”آرگون والے بہت دور ہیں۔“

”میرے سامنے بھی تم ایسا نہیں کرو گی میں کوئی الگ سے نہیں ہوں۔“

”میں آپ کو جانتی ہوں۔ میں خود یہ کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ آدمی کو بزدلوں کی طرح خودکشی کرنے کی بجائے بہادروں کی طرح لڑ کر جان دینی چاہیے۔ تو اب میں ان لوگوں سے لڑنے کو تیار ہوں جنہوں نے شامین کو قید کیا ہوا ہے اور جو پوری وادی کو قید خانہ بنا چاہتے ہیں۔“

خانہ بنا چاہتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”میں خود یہ کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ آدمی کو بزدلوں کی طرح خودکشی کرنے کی بجائے بہادروں کی طرح لڑ کر جان دینی چاہیے۔ تو اب میں ان لوگوں سے لڑنے کو تیار ہوں جنہوں نے شامین کو قید کیا ہوا ہے اور جو پوری وادی کو قید خانہ بنا چاہتے ہیں۔“

خانہ بنا چاہتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے مگر میں تمہیں یوں استعمال نہیں کر سکتا۔“

اس نے میرے ہاتھ تھام لیے۔ ”شہباز یہ میری التجا ہے۔ انسان جان اور مال کے ساتھ عزت بھی تو قربان کرتا ہے اگر مقصد بڑا ہو تو جو ہم کر رہے ہیں اس سے بڑا مقصد

اور کیا ہو سکتا ہے۔ میرے لیے یہ معمولی سی قربانی ہے۔ بے لباسی کی ذلت میں نے سہی تھی۔ بے شک وہاں چند ہی افراد تھے مجھے قلعے سے دور لا کر لباس اتارنے کو کہا تھا۔ اس وقت میں مجبور تھی اور اب میں اپنی مرضی سے یہ کام کرنے کو تیار ہوں۔“

وہ رفتہ رفتہ مجھے قائل کر رہی تھی۔ میں نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ ”روبیر یہ مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔“

”اگر آپ دیکھیں تو میں اصل میں آپ کے سامنے ہی بے لباس ہوں گی اور آپ کی نظروں کا مجھے علم ہے میں چاہے لباس میں ہوں یا بے لباس آپ مجھے ایک ہی انداز میں دیکھیں گے۔ اب یہ مت کہیے گا کہ آپ الگ سے نہیں ہیں۔ آپ میرے لیے سب سے الگ ہیں۔ رہے آرگون والے تو وہ اتنی دور ہیں کہ انہیں میری جھلک ہی نظر آئے گی اس سے پہلے کہ وہ نزدیک آئیں میں پھر سے لباس پہن لوں گی۔“

اس کی دلیلوں میں وزن تھا مگر میرا دل کسی صورت ماننے کو تیار نہیں تھا۔ یہ زندگی و موت کا مسئلہ تھا جس کے لیے میں روبیر سے اتنی بڑی قربانی لیتا اور شاید اس نے بھی میرے تاثرات سے بھانپ لیا تھا کہ میں اسے کسی صورت اجازت نہیں دوں گا۔ اس لیے اس نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ ہم درختوں کے آخری سرے تک تھے اور یہاں سے آرگون کے سپاہی صاف نظر آرہے تھے۔ انہوں نے شاید واپسی کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ وہ گھاس سے اٹھ گئے تھے اور اپنا اسلحہ سمیٹ رہے تھے۔ ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا کہ اب روبیر کی تجویز پر عمل نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے سکون کا سانس لیتے ہوئے سوچا اور پلٹا تھا کہ بھونچکا رہ گیا کیونکہ روبیر وردی اتار چکی تھی اور پھر وہ تیزی سے کھلے میدان کی طرف بھاگی۔ اس نے بہت زور سے چیخ ماری تھی۔ اس نے اپنی من مانی کر لی تھی اور اب اس کے پیچھے جانا اور منصوبے کے باقی حصے پر عمل کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ میں چند لمحوں کے وقفے سے اس کے پیچھے لپکا تو مجھے آتے دیکھ کر وہ جان بوجھ کر گری اور اس نے چلا کر کہا۔

”میرے پاس مت آنا۔“

چاہتا تو میں بھی یہی تھا کہ اس کے پاس نہ جاؤں مگر

اگر آپ دیکھیں تو میں اصل میں آپ کے سامنے ہی بے لباس ہوں گی اور آپ کی نظروں کا مجھے علم ہے میں چاہے لباس میں ہوں یا بے لباس آپ مجھے ایک ہی انداز میں دیکھیں گے۔ اب یہ مت کہیے گا کہ آپ الگ سے نہیں ہیں۔ آپ میرے لیے سب سے الگ ہیں۔ رہے آرگون والے تو وہ اتنی دور ہیں کہ انہیں میری جھلک ہی نظر آئے گی اس سے پہلے کہ وہ نزدیک آئیں میں پھر سے لباس پہن لوں گی۔“

اس کی دلیلوں میں وزن تھا مگر میرا دل کسی صورت ماننے کو تیار نہیں تھا۔ یہ زندگی و موت کا مسئلہ تھا جس کے لیے میں روبیر سے اتنی بڑی قربانی لیتا اور شاید اس نے بھی میرے تاثرات سے بھانپ لیا تھا کہ میں اسے کسی صورت اجازت نہیں دوں گا۔ اس لیے اس نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ ہم درختوں کے آخری سرے تک تھے اور یہاں سے آرگون کے سپاہی صاف نظر آرہے تھے۔ انہوں نے شاید واپسی کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ وہ گھاس سے اٹھ گئے تھے اور اپنا اسلحہ سمیٹ رہے تھے۔ ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا کہ اب روبیر کی تجویز پر عمل نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے سکون کا سانس لیتے ہوئے سوچا اور پلٹا تھا کہ بھونچکا رہ گیا کیونکہ روبیر وردی اتار چکی تھی اور پھر وہ تیزی سے کھلے میدان کی طرف بھاگی۔ اس نے بہت زور سے چیخ ماری تھی۔ اس نے اپنی من مانی کر لی تھی اور اب اس کے پیچھے جانا اور منصوبے کے باقی حصے پر عمل کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ میں چند لمحوں کے وقفے سے اس کے پیچھے لپکا تو مجھے آتے دیکھ کر وہ جان بوجھ کر گری اور اس نے چلا کر کہا۔

”میرے پاس مت آنا۔“

چاہتا تو میں بھی یہی تھا کہ اس کے پاس نہ جاؤں مگر

اگر آپ دیکھیں تو میں اصل میں آپ کے سامنے ہی بے لباس ہوں گی اور آپ کی نظروں کا مجھے علم ہے میں چاہے لباس میں ہوں یا بے لباس آپ مجھے ایک ہی انداز میں دیکھیں گے۔ اب یہ مت کہیے گا کہ آپ الگ سے نہیں ہیں۔ آپ میرے لیے سب سے الگ ہیں۔ رہے آرگون والے تو وہ اتنی دور ہیں کہ انہیں میری جھلک ہی نظر آئے گی اس سے پہلے کہ وہ نزدیک آئیں میں پھر سے لباس پہن لوں گی۔“

اس کی دلیلوں میں وزن تھا مگر میرا دل کسی صورت ماننے کو تیار نہیں تھا۔ یہ زندگی و موت کا مسئلہ تھا جس کے لیے میں روبیر سے اتنی بڑی قربانی لیتا اور شاید اس نے بھی میرے تاثرات سے بھانپ لیا تھا کہ میں اسے کسی صورت اجازت نہیں دوں گا۔ اس لیے اس نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ ہم درختوں کے آخری سرے تک تھے اور یہاں سے آرگون کے سپاہی صاف نظر آرہے تھے۔ انہوں نے شاید واپسی کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ وہ گھاس سے اٹھ گئے تھے اور اپنا اسلحہ سمیٹ رہے تھے۔ ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا کہ اب روبیر کی تجویز پر عمل نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے سکون کا سانس لیتے ہوئے سوچا اور پلٹا تھا کہ بھونچکا رہ گیا کیونکہ روبیر وردی اتار چکی تھی اور پھر وہ تیزی سے کھلے میدان کی طرف بھاگی۔ اس نے بہت زور سے چیخ ماری تھی۔ اس نے اپنی من مانی کر لی تھی اور اب اس کے پیچھے جانا اور منصوبے کے باقی حصے پر عمل کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ میں چند لمحوں کے وقفے سے اس کے پیچھے لپکا تو مجھے آتے دیکھ کر وہ جان بوجھ کر گری اور اس نے چلا کر کہا۔

”میرے پاس مت آنا۔“

چاہتا تو میں بھی یہی تھا کہ اس کے پاس نہ جاؤں مگر

اگر آپ دیکھیں تو میں اصل میں آپ کے سامنے ہی بے لباس ہوں گی اور آپ کی نظروں کا مجھے علم ہے میں چاہے لباس میں ہوں یا بے لباس آپ مجھے ایک ہی انداز میں دیکھیں گے۔ اب یہ مت کہیے گا کہ آپ الگ سے نہیں ہیں۔ آپ میرے لیے سب سے الگ ہیں۔ رہے آرگون والے تو وہ اتنی دور ہیں کہ انہیں میری جھلک ہی نظر آئے گی اس سے پہلے کہ وہ نزدیک آئیں میں پھر سے لباس پہن لوں گی۔“

اس کی دلیلوں میں وزن تھا مگر میرا دل کسی صورت ماننے کو تیار نہیں تھا۔ یہ زندگی و موت کا مسئلہ تھا جس کے لیے میں روبیر سے اتنی بڑی قربانی لیتا اور شاید اس نے بھی میرے تاثرات سے بھانپ لیا تھا کہ میں اسے کسی صورت اجازت نہیں دوں گا۔ اس لیے اس نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ ہم درختوں کے آخری سرے تک تھے اور یہاں سے آرگون کے سپاہی صاف نظر آرہے تھے۔ انہوں نے شاید واپسی کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ وہ گھاس سے اٹھ گئے تھے اور اپنا اسلحہ سمیٹ رہے تھے۔ ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا کہ اب روبیر کی تجویز پر عمل نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے سکون کا سانس لیتے ہوئے سوچا اور پلٹا تھا کہ بھونچکا رہ گیا کیونکہ روبیر وردی اتار چکی تھی اور پھر وہ تیزی سے کھلے میدان کی طرف بھاگی۔ اس نے بہت زور سے چیخ ماری تھی۔ اس نے اپنی من مانی کر لی تھی اور اب اس کے پیچھے جانا اور منصوبے کے باقی حصے پر عمل کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ میں چند لمحوں کے وقفے سے اس کے پیچھے لپکا تو مجھے آتے دیکھ کر وہ جان بوجھ کر گری اور اس نے چلا کر کہا۔

”میرے پاس مت آنا۔“

چاہتا تو میں بھی یہی تھا کہ اس کے پاس نہ جاؤں مگر

پھیلے ہوئے تھے اور ان میں سے گھات والی جگہ پانچ سپاہی تھے باقی ذرا فاصلے پر تھے۔ میں نے تیر کمان نکالا اور اپنے سب سے موجود نزدیک سپاہی کا نشانہ لینے لگا۔ وہ مجھ سے کوئی بیس گز کے فاصلے پر تھا اور اتنے فاصلے سے نشانہ لینا آسان نہیں تھا مگر میں نے اللہ کا نام لے کر تیر چھوڑ دیا۔ میں نے سینے کا نشانہ لیا تھا مگر تیر اس کی گردن میں اتر گیا۔ یہ بہتر ہوا تھا۔ اس کی آواز نہیں نکلی اور اس کے گھات والی جگہ موجود پانچ ساٹھی بے خبر رہے تھے۔ وہ ڈگماتے ہوئے اپنی گردن سے تیر نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر تیر اس طرح گھسا تھا کہ نکل نہیں رہا تھا۔ اسے نشانہ بناتے ہی میں نے دھاڑ کر کہا۔ ”ٹوٹ پڑو۔“

فوراً ہی سنسناتی آوازیں آئیں اور سپاہیوں کی چیخیں بلند ہوئیں جن میں موت کا کرب رچا ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ان چاروں نے اپنے شکاروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہوگا۔ میں نے جسے نشانہ بنایا تھا اس کے نزدیک ایک سپاہی اور تھا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا اور نیزہ لے کر میری طرف لپکا۔ تیر استعمال کرنے کا وقت نہیں تھا۔ اس لیے میں نے کمان پھینک کر نیزہ سنبھال لیا۔ سپاہی وحشتانہ انداز میں دھاڑتا ہوا آیا تھا۔ وہ خاصا نومند تھا اور اس کا انداز خوف زدہ کرنے والا تھا مگر میں پہلے بھی بارہا ایسے لوگوں کا سامنا کر چکا تھا۔ اس لیے جب اس نے ہوا میں اچھل کر نیزہ میرے جسم میں اتارنے کی کوشش کی تو میں آسانی سے درخت کی اوٹ لے کر بچ گیا۔ نیزہ درخت پر لگا اور ٹوٹ گیا۔ میں گھوم کر دوسری طرف سے نمودار ہوا تو سپاہی نے نیزے کی ڈنڈی مجھ پر پھینچ ماری اور اپنے پٹکے سے لگے ہوئے دو عدد دستکی چاقو نکال لیے۔

یہ کوئی چھانچ لے پھل والے چاقو تھے جن کا دستہ بھی دستکی تھا اور انہیں ایک ہی پتھر سے تراش کر بنایا گیا تھا۔ میرے پاس نیزہ تھا اور میں دور سے اس پر وار کر سکتا تھا مگر مجھے اچھا نہیں لگا کہ اب نیزے سے مقابلہ کروں اس لیے میں نے بھی نیزہ پھینک کر چاقو نکال لیے۔ مجھے چاقو نکاتے دیکھ کر وہ سفاک انداز میں مسکرایا اور اس نے بیک وقت دونوں چاقو لہراتے ہوئے مجھ پر حملہ کر دیا۔ اس میں شبہ نہیں تھا کہ وہ چاقو کے استعمال کا ماہر تھا۔ اس نے پیٹ کا دھوکا دے کر اٹھنے ہاتھ والا چاقو میری گردن میں اتارنے کی کوشش کی تھی اور اگر میں پوری طرح چوکس نہ ہوتا تو وہ کامیاب بھی ہو جاتا۔ میں نے بروقت کلائی اس کے ہاتھ پر ماری اور اسے روک لیا۔ یہ اس کا فطری ہاتھ تھا کم سے کم

اس نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔ میں اس کے پاس آیا اور اس سے نظریں چراتے ہوئے اسے پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ آرگون کے سپاہی ہماری طرف متوجہ ہو گئے اور ان کو دکھانے کے لیے میں نے روہیر کو ہلکا سا پھٹ مارا مگر ان کو لگا جیسے میں نے بہت زور سے مارا ہے اور پھر میں اسے زبردستی تھپتھپ کر درختوں میں لے جانے لگا اور روہیر نام نہاد مزاحمت کرنے لگی اور اس دوران میں اس نے کئی بلند چیخیں ماری تھیں۔ اب اس ڈرامے میں حقیقت کا رنگ پوری طرح بھر گیا تھا۔ میرا رخ دوسری طرف تھا کہ میں اسے نہیں دیکھنا چاہتا تھا اس لیے میں سپاہیوں کو آتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکا۔ مگر روہیر پیچھے دیکھ رہی تھی۔ درختوں میں آتے ہی اس نے کہا۔ ”وہ آرہے ہیں۔“

”لباس پہنو۔“ میں نے غرا کر کہا اور تیزی سے ایرٹ والے درخت کے پاس آیا۔ ”ایرٹ۔“ اس نے اوپر سے جھانکا تو میں نے اسے اشارے سے سمجھایا آرگون کے سپاہی آنے والے ہیں۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس دوران میں روہیر بہت تیزی سے لباس پہن چکی تھی اور وہ اس درخت پر چڑھنے لگی جس پر اس کے ہتھیار تھے۔ میں نے جھانک کر دیکھا تو مجھے اطمینان ہوا کہ پورا دستہ درختوں کی طرف دوڑا آ رہا تھا۔ میں نے روہیر سے کہا۔ ”ایک دو چیخیں اور مارو جیسے تمہارے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔“

اس نے میری ہدایت پر عمل کیا اور ان چیخوں کے نتیجے میں آنے والے سپاہیوں کی رفتار میں خاطر خواہ تیزی آئی تھی۔ روہیر نے صرف منصوبہ نہیں بنایا تھا مجھے اس پر عمل کرنے پر بھی مجبور کر دیا تھا۔ مجھے غصہ تو آ رہا تھا مگر یہ وقت غصہ دکھانے کا نہیں عمل کا تھا۔ اب میں تیزی سے پیچھے ہٹ رہا تھا۔ سپاہیوں کے اندر آنے سے پہلے میں ان کے لیے بنائے ہوئے جال والے مقام تک پہنچ گیا تھا۔ اس دوران میں ایرٹ نے ایک بار پرندے کی آواز نکال کر باقیوں کو ہوشیار کر دیا تھا۔ جب سپاہی اس کے پاس سے گزرے تو اس نے دوسری بار آواز نکالی۔ میں اس جگہ سے بھی پیچھے ہٹ گیا اور درختوں کے درمیان جا کر میں نے مردانہ غراہٹ کی آواز نکالی اور پھر تالی بجائی جس سے تاثر ہوا کہ کسی کو تھپڑ مارا گیا ہے۔ آنے والے سپاہی مجھے نظر نہیں آرہے تھے۔ مگر جب ایرٹ نے تیسری بار پرندے کی آواز نکالی تو میں نے جھانک کر دیکھا۔

سپاہی بے وقوف نہیں تھے کہ وہ ایک جگہ ہوتے وہ

طاقت اور نپے تلے وار سے ایسا ہی لگ رہا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ میرے پیٹ اور سینے سے کچھ دور تھا۔ اس نے اب پیٹ پر وار کیا۔ جو میں نے بائیں ہاتھ سے روکا۔

اگر اس کا دایاں ہاتھ فطری ہوتا تو وہ شاید کامیاب ہو جاتا۔ میں نے دونوں ہاتھ روک کر اس کے پاؤں پر ٹھوکر ماری۔ چوٹ کھا کر وہ پیچھے گیا اور دوبارہ آگے آیا۔ اس بار اس نے دونوں چاقو سامنے رکھے اور میرے جسم کو نشانہ بنانے کی کوشش کی۔ یہ مہلک وار نہیں تھے اس کی کوشش تھی کہ مجھے زخم لگا کر کمزور کر دے اور وہ کسی حد تک کامیاب بھی رہا۔ ایک چاقو میری بائیں کلائی پر خراش ڈالتا ہوا نکل گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ صرف چاقو بازی سے اسے روکنا محال تھا وہ مجھ سے زیادہ ماہر تھا۔ میں نے پھر پاؤں استعمال کیا اور اسے پیچھے دھکیل دیا۔ اس کے بعد میں نے ایک چاقو بھی پھینک دیا اب میرے پاس صرف ایک چاقو تھا میں نے چاقو زنی کے بجائے کرائے والا انداز اپنایا اور جیسے ہی وہ آگے آیا میں نے نیچے بیٹھتے ہوئے سوپ لگ ماری۔ اس کے لیے یہ وار غیر متوقع تھا اور وہ دھڑام سے نیچے گرا تھا۔

مگر وہ عام آدمی نہیں پیشہ ور سپاہی تھا۔ اس نے گرتے ہی میری طرف والا ہاتھ چلایا اور چاقو کی نوک اس بار میری پٹلی کو چھو گئی۔ میں نے تڑپ کر پاؤں پیچھے کیا اور اس کا گھومنا ہوا ہاتھ قابو میں کرتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ میں نے دوسرا ہاتھ اس کی کہنی کے نیچے رکھا تھا اور وہ کہنی ٹوٹنے سے بچانے کے لیے از خود کھڑا ہونے لگا مگر میری اٹھنے کی رفتار کہیں تیز تھی۔ دباؤ زیادہ آیا تو اس کی کہنی جوڑے نکل گئی۔ خشک ہنسی ٹوٹنے جیسی آواز کے ساتھ اس کے حلق سے دھاڑ نکلی تھی۔ میں نے اس کا بازو چھوڑ کر عقب سے اس کی گردن جکڑی اور اس کا دوسرا ہاتھ قابو کر لیا۔ اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی تو میں نے اس کے بائیں گھٹنے پر پیچھے سے پاؤں مار کر اسے نیچے گرایا اور گردن پر دباؤ بڑھانے لگا۔

اس دوران میں درختوں پر موجود میرے ساتھی اتر آئے تھے۔ ان میں سے ایک نے آگے آ کر اس کا دوسرا چاقو چھین لیا۔ وہ ویسے ہی بے دم ہو رہا تھا۔ میں اسے مارنا نہیں بے ہوش کرنا چاہتا تھا۔ مگر مجھ سے اندازے کی غلطی ہوئی اور میں نے بہت سختی سے اس کی گردن دبا لی تھی۔ چاقو سے محروم ہونے کے بعد اس کا رہا سہا دم بھی جلد نکل گیا۔ اس کے ساکت ہونے پر میں نے اسے چھوڑ کر اس کی نبض چیک کی تو مجھے افسوس ہوا۔ نبض ساکت تھی اور وہ مر چکا تھا۔ میں نے ان لوگوں کی طرف دیکھا۔ ان سے پوچھنا

بیکار تھا میری بات ان کی سمجھ میں کہاں آتی۔ میں گھات والی جگہ آیا تو وہاں چھ لاشیں پڑی تھیں۔ دو میں نے مارے تھے۔ مگر میرا خیال تھا کہ وہ نوتھے تو ایک کہاں تھا۔ میں نے چلا کر روپیر کو آواز دی۔ ”ایک بھاگ گیا ہے اسے روکو۔“ باقی میرے انداز سے سمجھ گئے کہ کوئی مسئلہ ہے۔ میں میدان کی طرف بھاگا تو وہ بھی میرے پیچھے آئے۔ ایرٹ اور روپیر درختوں سے اتر آئے تھے۔ میں نے ان کو اسی وجہ سے یہاں لگایا تھا کہ اگر کوئی بچ کر واپس بھاگے تو وہ اسے جانے نہ دیں۔ میں نے روپیر سے کہا۔ ”ان سے کہو ایک بچ گیا ہے اسے تلاش کریں۔“

روپیر نے میری بات کا ترجمہ کیا اور وہ فوری آس پاس پھیل گئے۔ روپیر نے کہا۔ ”یہاں سے کوئی نہیں گزرا ہے۔“

”وہ چالاک ہے شاید اس نے محسوس کر لیا کہ یہاں بھی گھات ہے تو وہ کہیں اور سے نکلے گا۔“ میں کہتے ہوئے روپیر کے ساتھ کھلے میدان میں نکل آیا۔ مگر دائیں بائیں کوئی نظر نہیں آیا۔ فرار ہونے والا اتنی جلدی یہ میدان عبور نہیں کر سکتا تھا۔ ویسے تو پورے میدان میں گھاس تھی مگر کہیں کہیں زیادہ گھاس ہو گئی تھی اور اس میں کوئی آدمی لیٹ جاتا تو دور سے نظر نہیں آتا۔ درختوں میں ایرٹ اور اس کے ساتھی بھاگنے والے کو تلاش کر رہے تھے۔ میں نے روپیر سے کہا۔ ”بڑھی ہوئی گھاس میں دیکھنا ہوگا ممکن ہے وہ اس میں چھپ گیا ہو۔“

”میں الگ دیکھتی ہوں آپ.....“

”نہیں تم میرے ساتھ رہو گی اکیلا پا کر وہ التام بریا مجھ پر حملہ کر سکتا ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”اب خاموش رہنا اور دبے قدموں چلنا، کوئی بات کہنی ہو تو اشارے سے کہنا۔“

روپیر نے سر ہلایا اور ہم نے اسے تیر کمانوں پر چڑھا لیے اور اونچی گھاس والی جگہوں کو کھنگالنے لگے۔ میدان میں ایسی جگہیں بہت ساری تھیں مگر اس جگہ سے نزدیک چند ایک ہی تھیں اور وہ ان میں سے ہی کسی میں چھپ سکتا تھا۔ ہم نے جہاں دیکھا وہاں کوئی نہیں تھا۔ میدان کے تقریباً وسط میں اونچی گھاس تھی۔ میں اور روپیر دبے قدموں خاموشی سے اس کے نزدیک پہنچے تھے کہ ایک سرخ لباس والا سپاہی تڑپ کر اس میں سے نکلا اور باغوں کی طرف دوڑا۔ میں نے بے ساختہ تیر چلایا جو اس سے خاصے فاصلے سے گزر گیا۔ مگر روپیر نے فوری تیر نہیں چلایا۔ اس نے تیر کا رخ اس

کی طرف کیا اور پھر بتدریج اسے اوپر کرنے لگی۔ البتہ سمت اس نے وہی رکھی تھی۔ سپاہی دوڑنے کے ساتھ اب چلا بھی رہا تھا۔ ”مدد..... مدد..... جملہ ہوا ہے۔“

میں نے اضطراب سے کہا۔ ”رو بیر اسے روکو۔“

وہ پورے انہماک سے نشانہ لے رہی تھی اور جب اسے یقین ہو گیا کہ سپاہی نشانے پر آ گیا ہے تو اس نے پوری طرح کھینچی کمان کی تانت چھوڑ دی۔ کمان کھینچنے کے دوران اس کا جسم خود کڑی کمان بن گیا تھا۔ تیر ہوا میں بلند ہوا تو دونوں کمانیں نرم بڑھ گئیں۔ میری نظر تیر اور دوڑتے سپاہی پر بیک وقت لگی ہوئی تھی۔ وہ باغوں کے خاصا پاس پہنچ گیا تھا مگر جب دو چار ہاتھ لب بام رہ گئے تو اس کی امید کی گند ٹوٹ گئی۔ تیر عقب سے اس کی گدی میں داخل ہوا اور دوسری طرف نکل گیا۔ وہ نیچے گرا اور ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے دم توڑنے لگا۔ ایک بار وہ کھڑا ہوا اور لڑکھڑاتا ہوا چند قدم درختوں کی طرف چلا مگر پھر گر پڑا اور دوبارہ نہیں اٹھا۔ میں اور رو بیر بیک وقت اس کی طرف بھاگے۔ اس دوران میں ایرٹ اور اس کے ساتھی بھی میدان میں نکل آئے تھے۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں درختوں میں جانے کو کہا اور انہوں نے حکم کی تعمیل کی۔ ہم سپاہی کی لاش کے پاس رکے اور رو بیر نے پوچھا۔

”اس کا کیا کرنا ہے؟“

”اسے بھی واپس لے جانا ہے۔“ میں نے کہا اور

اس کی دونوں ٹانگیں پکڑیں۔ رو بیر نے تیر کھینچ لیا اور اسے زمین پر صاف کر کے ترکش میں لگا لیا۔ مگر اس سے پہلے کہ میں اسے واپس کے لیے کھینچتا تقریباً دو سو گز دائیں طرف باغات کی طرف سے تیز بولنے کی آواز آئی اور میں نے پھرتی سے سپاہی کی لاش کھینچی اور درختوں میں داخل ہو گیا۔ رو بیر میرے ساتھ تھی۔ شام دھندلا گئی تھی اور کچھ ہی دیر میں تاریکی ہونے والی تھی۔ یہاں کیونجیسے درخت لگے تھے جو نیچے سے بھی گھنی شاخوں والے ہوتے ہیں۔ میں نے لاش ایک درخت کے اندر کی اور رو بیر کو دوسرے میں جانے کا اشارہ کر کے واپس آیا۔ زمین پر سپاہی کا لہو پھیلا ہوا تھا اور یہ اچھا خاصا تالاب جیسا بن گیا تھا۔ خون والی جگہ مجھ سے صرف دو گز دور کھلے میں تھی مگر میں اس حد تک آتا تو ان لوگوں کی نظروں میں آجاتا تو اب باہر نکل کر غالباً مدد کے لیے پکارنے والے کو تلاش کر رہے تھے۔ یقیناً مرنے والے سپاہی کی چیخ و پکار اندر سن لی گئی تھی اور یہ لوگ اسی پر آئے تھے۔

ان کی تعداد ایک درجن کے لگ بھگ تھی اور ان میں نو یا دس سپاہی تھے باقی عام لباس میں تھے۔ وہ پھیل کر دائیں بائیں دیکھ رہے تھے اور ان میں سے کچھ ہماری طرف آرہے تھے۔ میں نے سوچا اور اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے مٹی اٹھا کر خون پر پھینکنے لگا۔ میں زیادہ مقدار میں نہیں پھینک رہا تھا جو آنے والوں کو متوجہ کر لیتی۔ مٹی گرنے سے رفتہ رفتہ لہو کی سرخی غائب ہونے لگی۔ ایک منٹ میں خون بالکل غائب ہو گیا تھا اور اب کوئی آکر یہاں مٹی کریدتا تب ہی اسے خون دکھائی دیتا۔ سپاہی کو کھینچنے سے جو گھاس دبی تھی وہ دوبارہ سیدھی ہو رہی تھی۔ باقی ایسا کوئی نشان نہیں تھا جو آنے والوں کی توجہ کھینچتا۔ میں واپس آیا تو رو بیر خود کو ایک درخت میں اچھی طرح چھپا چکی تھی۔ میں نے اس سے مخالف سمت میں دوسرے درخت کا انتخاب کیا اور اندر گھس کر خود کو پوشیدہ کر لیا۔ پانچ منٹ بعد تلاش کرنے والے وہاں آ گئے تھے اور انہوں نے باغ کے اندر بھی جھانکا تھا۔ مگر کسی کو درختوں میں دیکھنے کا خیال نہیں آیا۔ کوئی بولا۔

”کسی نے مذاق کیا ہوگا۔“

”اگر یہ مذاق ہے تو بہت ہی بھونڈا مذاق

ہے۔“ دوسرے نے کہا وہ لاش والے درخت کے پاس کھڑا ہوا تھا اور ذرا سا شاخیں ہٹا کر دیکھتا تو اسے بھونڈا مذاق کرنے والا فوراً نظر آ جاتا۔

”سوال ہے کہ مذاق کرنے والا بھی تو کوئی ہوگا۔ وہ

مذاق کر کے کہاں غائب ہو گیا۔“ پہلے والے نے کہا۔

”یہاں موجود دستہ کہاں گیا؟“

”میرا تو خیال ہے وہ حرام خور پہلے ہی شہر کی طرف جا

چکے ہیں جب کہ انہیں یہاں کام کرنے والوں کے ساتھ جانا تھا۔“

وہ دونوں عام لباس میں تھے اور ان کی باتوں سے

لگ رہا تھا کہ وہ سپاہیوں سے خوش نہیں ہیں۔ وہ باتیں کرتے ہوئے آگے نکل گئے۔ ان کے دور جانے کے بعد میں درخت سے باہر آیا اور رو بیر اپنی جگہ رہنے کا کہہ کر میں باغ کے کنارے تک آیا۔ باہر جھانکنے پر مجھے میدان میں پھیلے سپاہی نظر آئے مگر وہ جنگل کی طرف جانے سے گریز کر رہے تھے۔ البتہ چلا چلا کر ان لوگوں کو آوازیں دے رہے تھے جو اب ان کی کسی آواز کا جواب نہیں دے سکتے تھے۔ تاریکی بہت تیزی سے بڑھ رہی تھی اور کچھ ہی دیر جاتی تھی کہ تاریکی مکمل ہو جاتی۔ مجھے اور رو بیر کو اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے یہاں سے نکلنا تھا۔ البتہ میں لاش کے

بارے میں متذبذب تھا کہ اسے یہاں چھوڑ کر جاؤں یا لے جاؤں۔ ایک بار لاش مل جاتی تو وہ لوگ ہوشیار ہو جاتے اور اس کے بعد ہمارے لیے کوئی کارروائی مشکل ہوتی۔

لاش یا لاشیں نہ ملنے کی صورت میں وہ بہت کچھ سوچ سکتے تھے۔ جیسے انہیں جانور کھا گئے یا پھر وہ فرار ہو کر سامیرا سے جا ملے۔ ایک شک کی کیفیت رہتی اور وہ اس کیفیت میں دس مفروضے قائم کرتے مگر کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پاتے اور ہم ان کی اسی کیفیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بعد میں بھی اپنی چھاپہ مار کارروائیاں جاری رکھتے۔ کسی قدر سوچ بچار کے بعد میں نے لاش لے جانے کا فیصلہ کیا اور روبیر سے کہا۔ ”سنو تم تاریکی چھاتے ہی یہاں سے نکل جاؤ گی۔“

”اور آپ؟“

”میں لاش لے کر آؤں گا۔ تم اس کے ہتھیار لے جاؤ گی۔“

روبیر تیار نہیں تھی مگر میرے حکم کے آگے مجبور ہو گئی۔ اس نے سپاہی کے ہتھیار جو اسی کے پاس تھے۔ سنبھال لیے اور جیسے ہی تاریکی مکمل ہوئی اور تلاش کرنے والے سب کچھ باغوں کی طرف آئے وہ تیزی سے نکلی اور جنگل کی طرف روانہ ہو گئی۔ آسمان پر ابھی تک دھند تھی اور اگر تارے نکل آئے تھے تو ان کی روشنی نیچے نہیں آسکتی تھی۔ دھند کچھ دیر بعد ختم ہوئی۔ میں نظر جما کر دیکھ رہا تھا۔ روبیر کوئی پچاس گز تک نظر آتی رہی اور اس کے بعد نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ گویا حد نظر پچاس گز ہی اگر میں اس حد سے نکل جاتا تو ان لوگوں کی نظروں سے بچ نکلتا۔ میں نے لاش درخت سے نکالی اور اسے اٹھا کر شانے پر لا دلیا۔ وہ متوسط جسامت کا بلکے وزن والا آدمی تھا۔ پھر خون نکل جانے سے بھی اس کا وزن کم ہوا تھا۔ میں نے با آسانی اسے اٹھالیا اور اللہ کا نام لے کر باغ سے نکل آیا۔ میں نے تیز رفتاری دکھائی مگر اتنی نہیں کہ ٹھوکر کھاؤں تو سنبھل نہ سکوں گی اور اسی وجہ سے شاید میں کسی کی نظر میں آیا۔ کوئی دائیں طرف سے چلایا۔

”وہ کون ہے؟“

”کہاں؟..... کس طرف؟“ مختلف آوازیں

آئیں۔ میں ذرا جھکا اور لاش سمیت نیچے گر گیا۔ پھر لیٹے لیٹے آگے سرکنے لگا۔ لاش میری پشت پر تھی اور بار بار پھسل رہی تھی اور اسے قائم رکھنا دشوار ہو رہا تھا۔ مگر میں نے کسی نہ کسی طرح اسے برقرار رکھا۔ اس دوران میں عقب سے آوازوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ابھی کسی دوسرے فرد نے مجھے

دیکھنے کا دعویٰ نہیں کیا تھا کیونکہ میں بروقت زمین پر لیٹ گیا تھا۔ اگر ایک دو افراد اور مجھے دیکھ لیتے تو لازمی میری تلاش شروع ہو جاتی۔ مگر اس وقت اس شخص کا مذاق اڑایا جا رہا تھا اور اسے وہم کا مریض کہا جا رہا تھا۔ بلکہ کسی نے موقع کی مناسبت سے چٹکلے سنانے شروع کر دیئے تھے۔ اس طنز و مزاح کا فائدہ مجھے ہوا اور میں کوئی پچاس گز دور نکل آیا۔ زمین پر رینگنے سے میرا لباس خراب ہوا تھا اور ہاتھ پیروں پر خراشیں آئی تھیں مگر دشمنوں کی نظروں سے بچ گیا تھا۔ پچاس گز سے زیادہ دور آ کر میں نے ایک بار پھر لاش شانے پر لادی اور آگے بڑھنے لگا۔

جنگل کے درختوں کا دیوار نما ہولہ میری رہنمائی کر رہا تھا۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ میں اسی طرف جا رہا تھا جہاں میرے ساتھی تھے یا میں بھٹک کر کسی اور طرف نکل رہا تھا۔ شاید میں نکل بھی جاتا تھا مگر اس وقت روبیر کی ذہانت کام آئی۔ درختوں میں داخل ہوتے ہی مجھے پرندے کی آواز سنائی دی جو یقیناً ایرٹ نکال رہا تھا۔ اس طرح وہ مجھے اپنے جائے وقوع سے آگاہ کر رہا تھا۔ میں سنبھل کر اس طرف بڑھنے لگا اور کوئی دس منٹ بعد میں ان کے پاس تھا۔ انہوں نے عقل مندی کرتے ہوئے اب تک روشنی نہیں کی تھی۔ کیونکہ اگر وہ روشنی کرتے تو امکان تھا کہ باغوں کے باہر موجود دشمن دیکھ لیتا۔ وہ چاہتے تھے کہ پہلے میں آ جاؤں۔ اس دوران میں انہوں نے باقی تمام لاشوں کی وردیاں اور سامان اتار لیا تھا۔ روبیر کے توسط سے ایرٹ نے پوچھا۔ ”ان لاشوں کا کیا کرنا ہے؟“

لاشوں کی خاطر دور جانا خطرہ مول لینے کے مترادف تھا اور یہ کام بہت دشوار ثابت ہوتا۔ ہم اس امید میں بھی لاشیں یہاں چھوڑ کر نہیں جاسکتے تھے کہ انہیں اسار یا دوسرے جانور تناول فرمائیں گے۔ اس لیے ایک ترکیب پہلے ہی میرے ذہن میں موجود تھی۔ میں نے کہا۔ ”انہیں درختوں پر چڑھا کر شاخوں سے باندھ دو۔“

یہ کام نسبتاً آسان تھا۔ ہم نے چند درخت منتخب کیے اور دو دو آدمی ایک درخت پر چڑھ گئے۔ لاشوں کو رسیوں کی مدد سے اوپر کھینچا جانے لگا اور پھر انہیں رسیوں کی مدد سے ہی یوں باندھ دیا گیا کہ وہ نیچے نہ گریں۔ روشنی کے لیے ہم نے دو مشعلیں جلائی تھیں اور کام کر رہے تھے۔ لاشیں اوپر لے جانے اور باندھنے کا کام ان پانچوں نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔ میں اور روبیر انہیں نیچے سے لاشیں دے رہے تھے۔ آدھے گھنٹے میں یہ کام منٹ گیا۔ اس کے بعد زیادہ مشعلیں

مچھلیاں ہاتھ لگی تھیں، شاید ندی میں ان کی تعداد کم ہو گئی تھی یا پھر وہ بھانپ گئی تھیں کہ ندی میں اس جگہ ان کے لیے خطرہ ہے۔ بہر حال یہ تمہیں بھی ہمارے لیے کافی تھیں۔

صبح بیدار ہونے کے بعد سے میری روبیر سے بات نہیں ہوئی تھی۔ میرے اندر اس کے خلاف ابھی بھی غصہ تھا۔ مجھے اس کا خود کو بے لباس کرنا بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔ اس نے بے شک خلوص نیت سے یہ کام کیا تھا اور اسی کی وجہ سے ہمیں یہ کامیابی ملی تھی۔ اس کے باوجود مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔ شاید اس نے بھی محسوس کیا کہ میں اس سے خفا ہوں۔ اس لیے جب باقی سب ایک ایک کر کے ٹیلے پر جانے لگے تو وہ نیچے اتر آئی اس وقت وہاں صرف ایما رہا تھا۔ میری خصوصی توجہ اور ان پانچوں کی طرف سے حکم بجالانے پر اب روبیر ان پر پوری طرح حاوی ہو گئی اور بہت حکمانہ انداز میں بات کرتی تھی۔ اس وقت بھی اس نے ایما سے کہا۔ ”یہاں سے جاؤ۔“

اس بے چارے نے بنا چوں چرا کے قہقہے کی اور میں بھی یہ سمجھ کر جانے لگا کہ شاید اسے ندی پر کوئی کام ہے۔ اس نے سامنے آ کر مجھے روک لیا۔ ”میں نے آپ سے نہیں کہا ہے۔“

”میں جہاز یوں کے اس طرف ہوں۔“ میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”تم ندی میں نہالو۔“

”میں نہالوں گی مگر اس وقت میں آپ سے بات کرنے آئی ہوں۔“

”کہو میں سن رہا ہوں۔“

”آپ مجھ سے ناراض ہیں۔“

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”نہیں ہیں۔“ وہ اصرار کر کے بولی۔ ”میں نے آپ کی بات نہیں مانی تھی اور اپنی من مانی کی تھی۔“

”جب تم جانتی ہو تو پھر پوچھ کیوں رہی ہو۔“

میرا لہجہ سخت تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”میں نے صرف اپنے لوگوں اور آپ کی خاطر یہ کیا ہے۔ مجھے کسی نے نہیں دیکھا سوائے آپ کے۔“

”تمہیں یوں دیکھنے کا حق مجھے بھی نہیں ہے۔“

”سمجھ لیں مجھ پر یہی تھی جیسی اس وقت تھی جب میں بھگتی ہوئی آپ کے پاس آئی تھی تب بھی تو لباس نہیں تھا میرے جسم پر۔“

مرد کا ذہن اللہ نے کچھ اس طرح کا بتایا ہے کہ وہ از خود عورت کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اس کی جھلک، اس کی

جلا کر باقی رہ جانے والے آثار مٹائے گئے اور جو رہ گیا اسے تقدیر پر چھوڑ کر ہم واپس ٹیلے کی طرف روانہ ہو گئے۔ اب ہر فرد کے پاس ایک مشعل تھی اور ہم اس طرح چل رہے تھے کہ آس پاس بھی نظر رکھی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی ہم ان جگہوں سے دوری سے گزر رہے تھے جہاں کوئی جانور گھات لگا کر بے خبری میں ہم پر حملہ کر سکتا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ جانوروں سے واسطہ پڑے گا اور ایسا ہی ہوا۔ یہ تین عدد گوزر تھے جو اچانک سامنے آئے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی میں نے حکم دیا۔

Downloaded from paksociety.com

”دو شاخے جلاؤ۔“

سب نے اپنے اپنے پاس موجود دو شاخے جلا لیے اور چند لمحے میں روشنی بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ گوزر جو پہلے ہی ہماری اتنی بڑی تعداد کی وجہ سے حملہ کرنے سے گریزاں تھے۔ روشنی ہوئی تو وہ گھبرا کر پسا ہونے لگے۔ مگر ہم سے دور نہیں گئے تھے۔ اب روبیر اور دوسروں کو پتا چلا کہ میں نے یہ دو شاخے کیوں تیار کرائے تھے۔ دو شاخوں کی وجہ سے مشعل بہت بڑا اور مہیب لگ رہا تھا اور جانور ویسے ہی آگ سے گھبراتے ہیں۔ ہم جارحانہ انداز میں گوزر کی طرف بڑھے تو وہ اس بار بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ چند دو شاخے چھوڑ کر باقی بجھا دیئے کہ آگے کام آئیں گے۔ مگر اس بار ضرورت نہیں پڑی اور ہم یہ خیریت ٹیلے تک پہنچ گئے۔ سب کا تھکن اور بھوک سے برا حال تھا۔ ہم جتنے جیسے خشک چنے ساتھ لے گئے تھے اور راستے میں اسے کھا کر بھوک کا مداوا کیا تھا۔ روبیر بھی تھکی ہوئی تھی اس لیے میں نے اسے چولہا جلانے سے روک دیا۔ ”آج سب اسی سے گزارا کریں گے۔“

چنے برے نہیں تھے بس ذرا ہرے سے تھے۔ ہمارے چنوں کی طرح بالکل پیلے اور ذائقے والے نہیں تھے۔ کھاپی کر سب اپنی اپنی جگہوں پر لیٹ گئے تھے۔ مگر میں نے آج احتیاطاً پہرے کا بندوبست کیا تھا اور سب سے پہلے میں جاگتا رہا۔ دو گھنٹے بعد میں نے ایرٹ اور شاٹ کو اٹھا دیا۔ اب وہ پہرہ دیتے اور میں سو گیا۔ ان کے بعد دوسرے پہرہ دیتے رہے حتیٰ کہ صبح کی روشنی نمودار ہو گئی۔ میں اٹھا تو روبیر ناشتا بنا رہی تھی۔ آج ناشتے میں دلیہ نما کھیر کے ساتھ شہد اور پنیر بھی تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر ہم نیچے آئے اور ندی پر گزشتہ روز کی حاصل کی ہوئی وردیاں اور دوسرا سامان دھویا جو خراب اور خون آلود ہو رہا تھا۔ خود بھی نہائے دھوئے اور آخر میں مچھلیاں پکڑیں۔ آج صرف تین

آواز بس اور خوشبو از خود اپنے اندر محفوظ کر لیتا ہے۔ اور کسی پھولشن میں فوراً سامنے پیش بھی کر دیتا ہے۔ میں نے اسے جس طرح دیکھا اور محسوس کیا وہ سب میرے ذہن میں موجود تھا مگر میں اسے یاد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ جب روپیر نے مجھ سے بات کی تو میرا ذہن مجھے جھلکیاں دکھانے لگا۔ اس لیے مجھے اس موضوع سے الجھن ہو رہی تھی اور اسے ختم کرنے کا واحد طریقہ مجھے یہی سمجھ میں آیا کہ بات ختم کر دوں۔ ”ٹھیک ہے، مگر اب تم میری مرضی کے خلاف ایسی کوئی حرکت نہیں کرو گی۔“

”آپ مجھ سے ناراض نہیں ہیں؟“

”نہیں۔“ میں نے کہا۔

”جی۔“ اس نے کہا اور اچک کر میرا رخسار چوم لیا۔ وہ بالکل سامنے اور پاس تھی مجھے موقع ہی نہیں ملا کہ اس سے بچتا۔ میں جھینپ گیا۔ ”یہ کیا حرکت ہے؟“

”شکرے کا اظہار۔“ اس نے سادگی سے کہا۔

میں نے اسے نرمی سے سمجھایا۔ ”روپیر ہمارے ہاں عورتیں یا لڑکیاں اس طرح شکر یہ ادا نہیں کرتی ہیں۔“

”اچھا آئندہ خیال رکھوں گی۔“ اس نے جلدی سے وعدہ کر لیا۔

میں نے ان لوگوں سے کہا تھا کہ ایک آدھ سپاہی کو زندہ گرفتار کرنے کی کوشش کرنی تھی مگر انہوں نے سب کو ہی مار دیا تھا۔ جس کو میں زندہ بچا سکتا تھا وہ میری عقلمندی سے مر گیا۔ روپیر اور دوسروں کا کہنا تھا کہ وہ سب خطرناک سپاہی تھے اور انہیں موقع مل جاتا تو وہ الٹا لینے کے دینے پڑ سکتے تھے۔ اس لیے مجبوراً انہیں کاری وار کرنے پڑے جو سب کے سب درست بیٹھے اور وہ سارے ہی مارے گئے۔ اس طرح فرار ہونے والے کو ہم نے خود ہلاک کر دیا تھا ورنہ بھانڈا پھوٹ سکتا تھا۔ میں نے حساب لگایا کہ اب تک آرگون کے انیس سپاہی ہمارے ہاتھوں یا ہماری وجہ سے مارے جا چکے تھے۔ اگرچہ ریٹائٹ کے پاس ہزاروں کی تعداد میں فوجی تھے لیکن یہ نقصان کم نہیں تھا جب کہ اسے جنگ کے لیے مزید سپاہیوں کی ضرورت تھی۔ اگر ہم جنگ سے پہلے اسی طرح کی چند اور چھاپے مار کارروائیاں کر گزرتے تو ریٹائٹ کی فوج میں خوف پھیل جاتا۔ وہ جنگ میں اس کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر پاتے جو ایک بے خوف اور پریقین فوج کر سکتی ہے۔

جدید دنیا میں اسی لیے اصل جنگ سے پہلے حریف ملکوں میں افراتفری کا ماحول پیدا کر کے اس کی فوج اور عوام

کو ڈی مولرا نزا کیا جاتا ہے جیسا کہ آج کل وطن عزیز میں ہو رہا ہے۔ عالمی طاقتیں جس میں ہمارا پڑوسی بھی شامل ہے پاکستان کو ایک منظم منصوبے کے تحت انتشار کی نذر کر رہے ہیں۔ ان کے اہداف میں ایک ڈاکٹر، پروفیسر اور پروفیشنل سے لے کر بڑے فوجی اڈے اور اسٹریٹجک نوعیت کی جگہیں شامل ہیں۔ مسلسل ٹارگٹ کلنگ سے عوام میں خوف بھرا جاتا ہے۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اہم افسران کی ٹارگٹ کلنگ سے ان اداروں کو ڈی مولرا نزا کیا جاتا ہے اور فوجی تنصیبات پر حملے کر کے فوج کو بیک فٹ پر جانے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ ایسا کرنے والے چاہے کسی بھی نام اور گیٹ اپ کے ساتھ آتے ہوں وہ اصل میں پاکستان اور اسلام کے دشمنوں کے ہاتھ میں کھیل رہے ہیں۔ ان کو اسلحہ اور پیسے کے ساتھ ساتھ تربیت اور گائیڈ لائن بھی ہمارے عالمی دشمنوں کی طرف سے فراہم کی جا رہی ہے۔

دنیا کے بہت سے ملکوں نے اس سے زیادہ خوفناک حالات دیکھے جب ان کی بقا کو شدید خطرات لاحق ہو گئے تھے۔ امریکا کو سول وار کی صورت میں ٹوٹ جانے کے خطرے کا سامنا ہوا۔ دوسری جنگ عظیم میں سوویت یونین کو جرمنی سے خطرہ ہوا تھا۔ مگر دونوں ملکوں کے حکمرانوں نے عوام کی طاقت سے ان خطرات کو ٹال دیا۔ انسانوں اور قوموں کی زندگی میں مشکلات انہیں مضبوط بنانے کے لیے آتی ہیں۔ اگر وہ ان مشکلات کا ہمت اور حوصلے سے مقابلہ کرتے ہیں۔ اپنی سمجھ بوجھ اور ذرائع استعمال کرتے ہیں تو وہ پہلے سے زیادہ طاقتور ہو کر ابھرتے ہیں۔ اگر ہم بھی ایسا ہی کریں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ چند سال بعد ہمارا ملک بھی ان مشکلات کے بھنور سے نکل آئے۔ شرط یہ ہے کہ حکمران اور عوام ملک سے اخلاص اور محبت کا ثبوت دیں۔ مشکلات پر رونے دھونے کے بجائے استقامت، حوصلے اور عقل سے ان کا مقابلہ کریں۔

یہاں مزاحمت کاروں کو سامیرا کی صورت میں ایک بہترین اور مخلص رہنما میسر تھی جو بے لوث ہو کر ان کی آزادی کے لیے لڑ رہی تھی۔ اس نے اپنے لوگوں کو حوصلہ دیا تھا اور خود ان کے معیار کے برابر آ کر مساوات کی عملی وضاحت کر دی تھی۔ مزاحمت کار جانتے تھے کہ کامیابی میں ان کی بقا تھی، اگر ریٹائٹ کامیاب ہوا تو ہمیشہ کی نہ سہی لیکن ایک طویل مدت کی غلامی ان کے مقدر میں لکھ دی جائے گی۔ ان کے پاس ذرائع کی کمی تھی مگر وہ حوصلہ مند ضرور تھے۔ انہیں اپنے گھروں اور اپنے خاندانوں کا دفاع کرنا

رہتا۔ اس طرح دوسری، تیسری پوزیشن کا فیصلہ ہو جاتا اور باقی لوگ شکست خوردہ تصور کیے جاتے تھے۔ دیکھا جائے تو یہ زور آزمائی کا کھیل تھا۔ جیسے ہمارے ہاں کبڈی ہوتی ہے۔ سب سے پہلے شاٹ جیتا اور نعرہ مار کر ایک طرف ہو گیا۔ میں اور روبیر اوپر سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے تالی بجائی تو شاٹ جھک کر آداب بجالایا۔ روبیر نے کہا۔

”یہ سب آپ کے شیدائی ہو گئے ہیں آپ کی بہت تعریف کر رہے تھے۔“

میں مسکرا دیا اور بولا۔ ”شیدائی ہونا بھی کافی سے زیادہ ہے۔ میں تو اس پر راضی ہوں کہ یہ میرے مخالف اور دشمن نہیں ہیں، میری بات مانتے ہیں۔“

”جو شخص بھی کچھ دن آپ کے ساتھ رہے وہ آپ سے محبت کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

میں ہنسا۔ ”میں بہت بہت دنوں تک دشمنوں کی قید میں اور ان کے ساتھ رہا مگر انہیں مجھ سے ذرا بھی محبت نہیں ہوئی۔“

”تب ان لوگوں میں انسانوں والی کوئی بات نہیں ہوگی۔ وہ جانور ہوں گے کیونکہ جانور بھی نہیں بدلتے اور انسان دوسرے کے سلوک کے مطابق بدل جاتا ہے۔“

”ہاں میرے دشمن کچھ ایسے ہی جانور فطرت لوگ ہیں۔“ میں نے تسلیم کیا۔

”آپ سے محبت کرنے والے زیادہ ہوں گے۔“

”ہاں یہ اوپر والے کا احسان ہے۔“

”بہت سی لڑکیاں بھی آپ سے محبت کرتی ہوں گی۔“ اس نے کہا تو میں نے چونک کر اسے دیکھا اس نے آج تک اس بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ میرا ذاتی تجربہ ہے جب کوئی لڑکی کسی آدمی سے یہ سوال کرتی ہے تو درحقیقت وہ جاننا چاہتی ہے کہ وہ آدمی کسی اور لڑکی سے تو محبت نہیں کرتا یا کوئی لڑکی اسے تو نہیں چاہتی۔ پوچھنے والی کے دل میں لازمی اس آدمی کے لیے پسند کا جذبہ ہوتا ہے۔ مگر میں روبیر کو ایسا سمجھنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ خود شامین سے محبت کرتی تھی اور محبت بھی کیسی کہ وہ اس کے لیے میری جان لینے سے لے کر اپنی آبرو تک سب قربان کرنے کو تیار ہو گئی تھی۔ میں نے جواب دیا۔

”ہاں کئی ہیں۔“

”آپ بھی ان کو پسند کرتے ہیں؟“

”سب کو نہیں۔“

”کسی ایک کو کرتے ہوں گے۔“ اس نے اصرار کیا۔

تھا۔ اس کے لیے وہ جان بھی دینے کو تیار تھے۔ برف والے کی حمایت نے بھی ان کا حوصلہ بلند کیا تھا۔ وہ یہاں ایک اعلیٰ ترین، معزز ترین اور ماورائی حیثیت رکھنے والا شخص تھا جس سے برتر کوئی بھی نہیں تھا۔ مزاحمت کاروں کے لیے اس کا ساتھ بہت زیادہ تقویت کا باعث تھا۔ اب قلعے والے پہلے سے کہیں زیادہ پر عزم اور پریقین تھے کہ کامیابی ان کے قدم چومے گی۔ یہ تصویر ایرٹ اور اس کے ساتھیوں سے گفتگو کے نتیجے میں میرے سامنے آئی تھی۔

قلعے میں قیام کے دوران میرا عوام سے بس اتنا رابطہ تھا کہ وہ میرے حکم کی تعمیل کرتے تھے۔ وہ کیا سوچتے تھے اور ان کے مزاحمت کے حوالے سے کیا جذبات و احساسات تھے۔ اس کا اندازہ مجھے ان لوگوں سے گفتگو کر کے ہوا۔ سامیرا ان کے لیے ایسی ہستی تھی جس کے ایک اشارے پر وہ اپنی جان قربان کرنے کو تیار رہتے تھے۔ وہ اور ان کے اہل خانہ یہاں تنگی ترشی میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ اگرچہ ان کو فقر و فاقے کا سامنا بھی نہیں تھا مگر ان کے پاس کھلا سامان بھی نہیں تھا۔ وہ تنگ اور کم جگہ والے گھروں میں رہتے تھے۔ بہت سی نعمتیں جن سے آرگون والے لطف اندوز ہوتے تھے وہ ان کے پاس نہیں تھیں۔ مگر انہیں آزادی کی نعمت میسر تھی جس سے آرگون کے شہری قطعی ناواقف تھے اور وہ ریٹاٹ کے آمریت کے ساتھ نظام کا جبر بھی برداشت کر رہے تھے۔ مزاحمت کار اب اس آزادی سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھے جس سے سامیرا نے انہیں روشناس کرایا تھا۔ وہ اپنی آزادی کے دفاع کے لیے کسی بھی حد کو جانے کے لیے تیار تھے۔ وہ دشمن کی جان لے سکتے تھے اور اپنی جان دے سکتے تھے۔

ایرٹ اور اس کے ساتھی گزشتہ روز کے مشن سے بہت خوش تھے اور ان کی خواہش تھی کہ میں مزید مشن ترتیب دوں۔ مگر فی الحال میں نے اس بارے میں بات نہیں کی اور انہیں آج کے دن چھٹی دی کہ وہ آرام یا تفریح کریں۔ اس لیے وہ دوپہر کے کھانے کے بعد ٹیلے سے نیچے اتر گئے اور کوئی کھیل کھیلنے لگے۔ ان کا کھیل کچھ انوکھا تھا۔ اس میں ہر فرد کے پاس ایک گول لکڑی ہوتی تھی اور ایک اضافی لکڑی ہوا میں اچھالی جاتی اور پھر سب اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے جو حاصل کر لیتا وہ تین بار ”میں نے پالیا“ کی گردان کرتا تو وہ فوج ہوتا اگر تین بار کہنے سے پہلے لکڑی اس سے چھن جاتی تو کھیل جاری رہتا۔ کامیاب ہو جانے والا ایک طرف ہو جاتا اور باقیوں کے درمیان مقابلہ جاری

”ہاں ایک ہے۔“ میں نے تسلیم کیا تو بہت دنوں کے بعد سویرا میرے ذہن کے پردے پر آئی تھی۔ یاد تو اس کی کبھی نہیں جاتی تھی مگر میں نے اسے فرصت سے نہیں سوچا تھا۔ روبیر نے شاید دوسری بار پوچھا تو میں چونکا۔ ”کیا پوچھا تم نے؟“

وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ ”میں پوچھ رہی ہوں کہ وہ کون ہے؟“

”وہ کون ہے؟“ میں نے روبیر کا سوال دہرایا اور پھر اس کی طرف دیکھا۔ ”وہ میرا سب کچھ ہے۔ میرے لیے دنیا کی پہلی اور آخری عورت ہے۔“

میرا جواب بہت واضح تھا۔ روبیر کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی اور پھر گہری سانس لے کر بولی۔ ”آپ جیسا آدمی ایسا ہی سوچ سکتا ہے۔“

”میں نہیں ہر جہت کرنے والا ایسا ہی سوچتا ہے۔“
”شاید۔“ اس نے کہا۔ وہ اداس نظر آنے لگی تھی۔
”شامین کے لیے تم ایسی ہی ہو گی۔ وہ تم سے سچی محبت کرتا ہے تو کسی اور کے بارے میں سوچے گا نہیں۔“

اس نے پھر میری طرف دیکھا۔ ”وہ شامین ہے اور ہر شخص شہباز نہیں ہوتا۔“

روبیر نے اگرچہ تجسس یا کسی اور مقصد کے تحت پوچھا تھا مگر اس کی باتوں سے مجھے میرے اپنے یاد آنے لگے۔

میری گم شدگی کو مہینا ہونے والا تھا یا ہو چکا تھا۔ وہیم، سفیر اور عبداللہ آرام سے نہیں بیٹھے ہوں گے۔ مجھے شبہ تھا کہ وہ میری تلاش میں چل پڑے ہوں گے اور وادی تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہوں گے۔ راجا عمر دراز پتا نہیں کہاں تھا۔

زندہ بھی تھا یا نہیں اور اوشا کے بارے میں مجھے اطمینان تھا کہ وہ برف والے کی حفاظتی تحویل میں تھی۔ اسے وہاں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ میرے دشمن ڈیوڈ شائینڈ کہنی نیچے پہنچ گئے

تھے اور وہ اس وقت ریٹائٹ کے مہمان تھے۔ ڈیوڈ شائینڈ یقیناً کوئی چکر چلایا تھا۔ دوسری قوموں میں مفاد پرست غدار

تلاش کرنے میں انگریز اپنا ثانی نہیں رکھتے ہیں۔ یہ جہاں گئے انہوں نے اسی طرح سے غلبہ حاصل کیا اور پورے

پورے ملکوں اور قوموں کو غلام بنا لیا۔ خاص طور سے برصغیر پر ان کا قبضہ ان کی مکارانہ سیاست کی مثال ہے۔

ڈیوڈ شاکا خیال آتے ہی میں بے چین ہو گیا تھا۔ وہ ریٹائٹ کے ساتھ تھا اور اس کی مدد سے ریٹائٹ کی طاقت

دوگنی ہو گئی تھی۔ ڈیوڈ شاکا آتشیں اسلحہ ساتھ لایا تھا اور اس کا مقابلہ سامیرا کی سپاہ نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے ان ہتھیاروں کا

خیال آیا جو راجا عمر دراز لایا تھا اور وہ اس وقت برف والے کے پاس تھے پھر میں نے برف والے کے پاس دوسرے آتشیں ہتھیار بھی دیکھے تھے۔ اگر وہ مجھے مل جاتے تو میں کہیں بہتر انداز میں ڈیوڈ شاکا اور ریٹائٹ کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ اب تک مجھے ان ہتھیاروں کا خیال نہیں آیا تھا۔ ورنہ میں کسی طرح سے برف والے تک اپنی بات پہنچا سکتا تھا۔ اب خیال آیا تو مجھے ریک کا خیال بھی آیا۔ اسی کے توسط سے سامیرا تک اور سامیرا سے برف والے تک اپنی بات پہنچا سکتا تھا۔ جنگ سے پہلے مجھے یہ ہتھیار مل جاتے تو میری طاقت میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا۔ وادی کے روایتی ہتھیاروں کے ساتھ میری طاقت بہت کم تھی۔

ریک ایک دن پہلے ہی گیا تھا اور اب وہ پرسوں آتا۔ میں نے سوچا کہ درمیان میں ایک دن جو تھا اس

میں ہم مزید کوئی مہم سر کر سکتے تھے۔ شام ہوتے ہی وہ سب اوپر آگئے تھے۔ کھیل کے بعد وہ ندی کی طرف چلے گئے اور

وہاں نہاتے دھوتے رہے تھے جب وہ میچے ہوتے تو اپنے ہتھیار پاس رکھتے تھے اور پوری طرح چوکنا رہتے تھے

اگرچہ اس دن مار کھا کر اساروں نے دوبارہ یہاں کا رخ نہیں کیا تھا مگر ان کا یا دوسرے خطرناک جانوروں کا خطرہ

بہر حال موجود رہتا تھا۔ رات گمانے کے بعد میں نے میٹنگ کی اور اگلے روز کی مہم کے بارے میں بات کی تو وہ

سب پُر جوش ہو گئے تھے۔ یہ لوگ چھاپہ مار جنگ سے لاعلم تھے اور سیدھی جنگ سے واقف تھے جس میں دونوں طرف

سے پوری قوت سامنے لائی جاتی تھی اور پھر لڑ کر فیصلہ کر لیا جاتا تھا۔ ایک نسل پہلے وہ سرے سے جنگ سے ہی نا آشنا

تھے اور ان کی ساری جدوجہد فطرت اور وحشی جانوروں کے خلاف ہوتی تھی کیونکہ وہی ان کے لیے سب سے بڑا خطرہ

تھے۔ اب وادی کے انسان ایک دوسرے کے مد مقابل آگئے تھے۔ پہلی بار انہیں آپس میں لڑنا پڑ رہا تھا۔

مقابلہ آرائی انسان کی فطرت ہے۔ چیزوں اور زمین کے پیچھے انسان ابتدائی دور سے لڑتا آ رہا ہے۔ زن سے

شروع ہونے والی لڑائی پھر زمین اور اب زر تک پھیل گئی تھی۔ ان سب کے پس پشت جذبہ حکمرانی کارفرما تھا۔ ان

نوجوانوں کے لیے یہ بہت تھمرل والا کام تھا۔ جنگ کا خطرہ تھا مگر انہیں اب تک اس کا براہ راست تجربہ نہیں ہوا تھا۔ یہ

پہلا موقع تھا جب انہوں نے آرگون کی سپاہ سے پنجہ آزمائی کی تھی اور اس میں کامیابی بھی حاصل کی تھی۔ اس کامیابی

نے ان کا حوصلہ اتنا بڑھا دیا تھا کہ وہ براہ راست دھاوے کا

بھی سوچ رہے تھے۔ ایرٹ نے ان کی طرف سے تجویز پیش کی کہ ہمیں اب باغوں میں گھس کر وہاں موجود سپاہیوں پر حملہ کرنا چاہیے۔ انہیں یقین تھا کہ آرگون والے ان کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ باغ کے سپاہیوں پر حملہ کرتا ہوں۔“

ایرٹ حیران ہوا۔ ”تب آپ کا کیا مقصد ہے اور کل والا حملہ کیوں کیا تھا؟“

”کل والا حملہ اور جو حملہ ہم کل کرنے کی کوشش کریں گے یہ سب آنے والے بڑے مقصد کی تیاری ہے۔“

”بڑا مقصد؟“

میں نے سر ہلایا۔ ”ہم براہ راست جنگ میں شامل نہیں ہوں گے بلکہ جس وقت آرگون والے قلعے سے نکل کر ہمارے قلعوں پر حملہ آور ہوں گے ہمیں آرگون میں گھس کر وہاں قبضہ کرنا ہوگا۔“

یہ بات ان کے لیے ناقابل یقین تھی۔ ”آرگون پر قبضہ اور ہم سات آٹھ افراد کریں گے؟“

”قبضے سے مراد شہر پر قبضہ نہیں ہے بلکہ ہمیں ان تمام لوگوں کا خاتمہ کرنا ہے جو اس فتنے کے پیچھے ہیں۔ ان میں ریٹات اور اس کے ساتھی سرفہرست ہیں۔“

ایمار چکچکیا۔ ”اب مجھ والے بھی اس کے ساتھ ہیں۔“

”شاید تم کہنا چاہ رہے ہو کہ ہمیں مہا پجاری اور دوسرے پجاریوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔“ میں نے نرمی سے کہا۔ ”اس کے لیے انہوں نے ہی ہمیں مجبور کیا ہے۔ وہ غیر جانبدار رہتے تو ہم بھی غیر جانبدار رہتے مگر اب یہ ممکن نہیں ہے۔ بہر حال ہمارا اصل نشانہ ریٹات اور اس کے ساتھی ہیں۔ ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو باہر سے آئے ہیں اور میرے اصل دشمن وہی لوگ ہیں۔“

بات رفتہ رفتہ ان کی سمجھ میں آنے لگی اور جب میں نے اصل مہم ان کے سامنے رکھی تو ان کا جوش و جذبہ ذرا ماند پڑا تھا اور وہ سنجیدہ ہونے کے ساتھ کسی قدر خوفزدہ بھی نظر آنے لگے اور یہ اچھی بات تھی۔ وہ معاملے کی سنگینی کو محسوس کر رہے تھے۔ اگر وہ اسے پروائی سے لیتے تو لازمی بات تھی وہ اس کے لیے ویسی تیاری نہ کرتے۔ ایرٹ نے بھی وہی بات کی۔ ”اس کا مطلب ہے ہمیں پہلے سے زیادہ تیاری کرنی ہے۔ اتنی تیاری جو ہمیں کامیابی دلا سکے؟“

”بالکل، تیاری کے دوران ہم جتنے مشکل مراحل سے گزریں گے آگے ہمیں اتنی مشکل نہیں ہوگی۔“

”ہمارے پاس افراد کم ہیں۔“ ایمار بولا۔ ”یہ اتنے یا

اور اتنے ہی لوگوں کے بس کی بات نہیں ہے۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو ہمیں مزید افرادی قوت کی ضرورت ہے مگر مجھے ایک ایک بندہ تم لوگوں کی طرح چننا ہوا چاہیے۔ کوئی کمزور یا خدار ہمارے درمیان آ گیا تو وہ پوری مہم کی ناکامی کا باعث بن سکتا ہے۔“

”ریٹک اس معاملے میں بہت سخت کر رہا ہے۔“ ایرٹ نے کہا۔ ”اسی نے ہمیں چنا اور ہم سے بات کی۔ پھر سامیرا سے ملاقات کرائی اور تب ہمیں آپ کے پاس آنے کا موقع ملا۔ وہ اس کام کے لیے اور نوجوان بھی جن رہا ہے۔“

”درحقیقت ہمارے پاس وقت نہیں ہے کیونکہ آرگون والے کسی وقت بھی حملہ کر سکتے ہیں۔“

”اگر انہوں نے کل حملہ کر دیا تو؟“ ایمار نے پوچھا۔

”تب ہمیں فوری آرگون کا رخ کرنا ہوگا۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”ہم مزید لوگوں کے آنے کا انتظار نہیں کر سکتے ہیں۔“

”مگر ہم آرگون میں داخل کیسے ہوں گے؟“

ایرٹ کے اس سوال کا جواب میں نے ٹالنے والا دیا۔ ”یہ میں تمہیں عملی طور پر دکھاؤں گا۔“

جب وہ سب سونے کے لیے لیٹے تو متفکر تھے۔ ان کا کھنڈرا پن مفقود ہو گیا تھا۔ یہ ضروری تھا کیونکہ جوانی کے جوش کے ساتھ اگر ہوش شامل ہو جائے تو مقصد میں کامیابی کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ روبیر زیادہ تر ترجمہ کرتی رہی تھی اور اس نے گفتگو میں حصہ نہیں لیا تھا مگر مجھے لگ رہا تھا کہ وہ مجھ سے بات کرنے کے لیے بیتاب تھی۔ ایسا ہی ہوا جب سونے کے لیے لیٹ گئے تو وہ کیبن سے باہر آئی اور مجھ سے کہا۔ ”آپ سے بات کرنی ہے۔“

میں سمجھ گیا تھا۔ وہ مجھے کیبن میں لے جانا چاہتی تھی مگر میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ یوں سب کے ہوتے صرف اس کے ساتھ کیبن میں چلا جاؤں۔ پہلے ہی اس کے حوالے سے مجھ پر سنگین الزام لگ چکا تھا۔ اگرچہ یہ نوجوان مجھے پر یقین کر رہے تھے مگر انسان کا ذہن ذرا سی بات سے بھٹک جاتا ہے اور میں انہیں اس ذرا سی بات کا موقع ہی نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس لیے روبیر کے ساتھ ٹیلے کے میٹرگی والے حصے تک آیا۔ نوجوان اس جگہ سے کسی قدر فاصلے پر تھے اور وہ ہماری گفتگو نہیں سن سکتے تھے، مگر وہ ہمیں دیکھ رہے تھے اور ہم ان کی نظروں کے سامنے تھے۔ روبیر نے چھوٹے ہی پوچھا۔ ”آپ آرگون میں داخل ہوں گے؟“

”یہ بات تو تمہیں معلوم ہے میرا اصل مقصد ہی شہر

کے اندر خاص حصے تک رسائی حاصل کرنا ہے۔
”تو کیا میں ساتھ چلوں گی۔“

یہ سب اشارہ کر رہے تھے اور مجھے سمجھا رہے تھے۔ بہر حال میرے لیے یہ نئی بات نہیں تھی اس سے پہلے بھی میرے نزدیک آنے والی کئی لڑکیاں میرے طرز عمل سے غلط فہمی کا شکار ہوئیں یا پھر انہوں نے اسے اپنا استحقاق سمجھا۔ انہوں نے سمجھا کہ میں ان کی پیش قدمی کے آگے ہتھیار ڈال دوں گا۔ جیسا کہ مرد حضرات کا شیوہ ہے۔

مجھے دعویٰ پارسائی کبھی نہیں رہا۔ مگر میں صنف نازک میں ایک خاص حد سے زیادہ دل چسپی کا قائل نہیں ہوں۔ مجھے بھی وجود زن کا آس پاس ہونا اچھا لگتا ہے مگر ساتھ ہی میں ان سے ایسے محتاط رہتا ہوں جیسے گلاب کی خوشبو اور تازگی سے لطف اندوز ہونے والا اس کے کانٹوں سے ہوشیار رہتا ہے۔ جو گلاب توڑتے ہیں انہیں کانٹے بھی برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ اس لیے جن جن خواتین نے پیش قدمی کی بالآخر انہوں نے جان لیا کہ میں اس فطرت کا آدمی نہیں ہوں۔ آدمی ایک عورت سے ہی محبت کرتا ہے۔ ممکن ہے بعض دو تین بار بھی محبت کر لیتے ہوں۔ مشتاق احمد یوسفی نے شادی کے حوالے سے کیا خوب کہا ہے کہ ایک شادی ضرورت، دوسری عیاشی اور اس کے بعد نری بد معاشی ہوتی ہے۔ محبت کے بارے میں میرا تقریباً یہی خیال ہے۔

ضروری نہیں تھا کہ روبیر کے بارے میں میرا خیال درست ہوتا۔ وہ مجھ سے کسی اور انداز میں متاثر ہو سکتی تھی۔ اس کے باوجود میں نے محتاط رہنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے ٹیلے پر گھاس والا حصہ اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا اور بستر آگئے تو میں اس پر بستر بچھا کر لیٹ جاتا تھا۔ آج بھی پہرے کے لیے میں ہی جاگ رہا تھا۔ اندازے سے نصف رات کے قریب میں نے ایرٹ اور شاٹ کواٹھا دیا۔ ان سے کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ انہوں نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور مستعد ہو گئے۔ میں سونے کے لیے لیٹ گیا۔ صبح میری آنکھ روبیر کے ہلانے سے کھلی۔ وہ میرے شانے کو سہلا رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ ”اٹھ جائیں ناشا تیار ہے۔“

میں نے اس کا ہاتھ نہیں ہٹایا مگر یوں اٹھا کہ اس کا ہاتھ خود ہٹ گیا تھا۔ وہ صرف سہلا نہیں رہی تھی۔ اپنی ہتھیلی کی نرمی اور گرمی میرے شانے میں جذب کر رہی تھی۔ وہ گھٹنوں کے بل اتنے نزدیک ہی بیٹھی تھی کہ میں اس کے وجود سے اٹھتی مہک محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے دیکھا ان پانچوں میں سے وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ سب نیچے جا چکے تھے۔ میں نے ان کا پوچھا۔ ”انہوں نے ناشا کر لیا ہے۔“
”ہاں انہوں نے کر لیا ہے۔“ وہ اٹھتے ہوئے

ہم ٹیلے کے کنارے پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے اور یہاں مشعل کی ہلکی سی روشنی آرہی تھی۔ روبیر کے اس سوال سے واضح ہو گیا کہ وہ مجھ سے کیا بات کرنا چاہ رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور نرمی سے کہا۔ ”مجھے شامین کا خیال ہے لیکن پہلے ہمیں ان لوگوں سے نمٹنا ہے جنہوں نے شامین اور اس جیسے بہت سے بے گناہوں کو قید کیا ہوا ہے۔ وہ ہمارے قابو میں آگئے تو شامین اور دوسرے خود آزاد ہو جائیں گے لیکن اگر ہم نے پہلے قیدیوں کو آزاد کرانے کی کوشش کی اور دشمن ہوشیار ہو گیا تو ہمارا پورا منصوبہ ناکام ہو جائے گا۔“

روبیر نے میرا جواب سمجھ لیا تھا، اس کی آنکھیں چمکنے لگیں مگر اس نے سر ہلایا۔ ”میں سمجھ رہی ہوں اور میں آپ سے متفق ہوں۔“
”میں تم سے وعدہ کر چکا ہوں کہ شامین کو آزاد کرانے کی پوری کوشش کروں گا۔ یہ میرے مقاصد میں شامل ہے۔“
”مجھے یقین ہے آپ ایسا ہی کریں گے۔“

واپس آنے کے بعد اس نے جنگلی وردی اتار کر اپنا سفید لباس پہن لیا تھا۔ مگر اس کے نیچے اس نے پاجامہ وردی والا ہی پہنا ہوا تھا۔ اس پر جنگلی لباس بھی سج گیا تھا مگر وہ سفید کرتے میں ہی زیادہ اچھی لگتی تھی۔ اس نے اچانک نزدیک ہو کر مجھ سے لگتے ہوئے میرے شانے پر سر رکھ دیا اور آہستہ سے بولی۔ ”مجھے آپ کا ہی سہارا ہے۔“
میں خفیف ہوا تھا کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے۔ اگرچہ ہماری طرف متوجہ نہ تھے۔ رد عمل میں میں نے اس کا سر تھپتھپایا۔ ”تم بھی سو جاؤ کل شاید ایک اور سخت دن ہمارا منظر ہے۔“

وہ چند لمحوں کی طرح لگی رہی پھر الگ ہو کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے جانے کے بعد بھی میں ٹیلے کے کنارے بیٹھا رہا اور روبیر کے گزشتہ چوبیس گھنٹے کے طرز عمل پر غور کرتا رہا۔ اس کے انداز میں تبدیلی آئی تھی مگر یہ اتنی خفیف تھی کہ مگر اس میں غیر معمولی حساسیت نہ ہوتا تو شاید مجھے پتا بھی نہ چلتا مگر میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ میرے لیے روبیر کے اندر جذبات میں تبدیلی آئی تھی اور اس کی جسمانی حرکات اسی تبدیلی کے زیر اثر تھیں۔ وہ جس طرح بار بار میرے نزدیک آرہی تھی۔ اپنے وجود کے حوالے سے میرے سامنے بے پرواہ ہو رہی تھی۔ لفظوں سے مجھ سے قربت جتا رہی تھی۔

بولی۔ ”آپ بھی کر لیں۔“

پہلے میں نیچے آیا ضروریات سے فارغ ہو کر ندی کے سرد پانی سے خود کو تروتازہ کیا اور پھر ناشتے کے لیے اوپر آیا۔ ایرٹ اور اس کے ساتھی نیچے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ویسے وہ پوری طرح تیار ہو گئے تھے۔ جب میں ناشتا کر رہا تھا تو انہوں نے ٹیلے کے اوپر پانی پہنچایا۔ نچھیلوں کا شکار بھی انہوں نے کر لیا تھا تیل کی خشک ڈوریوں میں پروئی ہوئی کئی مچھلیاں ٹیلے پر کیبن سے لٹکی ہوئی تھیں۔ روبیر نے انہیں صاف کرنا شروع کیا اور پھر مجھ سے کہا۔ ”مجھے نہانا ہے۔“

”ٹیلے پر نہالو خاصا پانی ہے۔“

”نہیں۔“ اس نے چل کر کہا۔ ”مجھے ندی میں نہانا ہے۔ آپ میرے ساتھ چلیں۔“

”وہ لوگ بھی نیچے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”مجھے صرف آپ پر اعتبار ہے۔ آپ وہاں موجود ہوں گے تو میں نہاؤں گی ورنہ نہیں نہاؤں گی۔“ اس نے منہ پھلا کر کہا اور میری تشویش بڑھ گئی کیونکہ یہ اندازہ مجھ کو ہی تھا۔ ”تب ایسا کرتا ہوں ان لوگوں کو ٹیلے پر بلا لیتا ہوں۔“

”اور اگر وہاں کوئی جا تو آ گیا تو.....؟“

مجبوراً مجھے بھی نیچے آنا پڑا۔ اس نے ندی کی طرف جانے سے پہلے کہا۔ ”آپ جھاڑیوں کے اس طرف رہے گا کوئی ندی کی طرف نہ آئے۔“

”کوئی نہیں آئے گا۔“ میں نے اسے یقین دلایا۔

روبیر ندی کی طرف چلی گئی۔ ایرٹ اور اس کے ساتھی رسی اور لکڑی کی سیڑھی کی مدد سے ٹیلے پر تیزی سے چڑھنے اور اترنے کا مقابلہ کر رہے تھے۔ میں انہیں دیکھنے لگا۔ اچانک روبیر کی چیخ سنائی دی۔ چیخ میں خوف تھا مگر میں نے جھاڑیوں کے دوسری طرف جانے سے گریز کیا اور یہیں سے پوچھا۔ ”کیا ہوا ہے؟“

”شہباز آپ ادھر آئیں کوئی اور نہ آئے، جلدی۔“

روبیر کی چیخ ان لوگوں نے بھی سن لی تھی اور پھر اس نے دوسروں کو آنے سے منع کرتے ہوئے صرف مجھے بلایا تھا تو یہ بھی انہوں نے سنا اور جو آگے بڑھ رہے تھے وہیں رک گئے۔ میں جھاڑیوں کے دوسری طرف آتا تو روبیر سامنے والے حصے کو کرتے سے ڈھانپنے ہوئے ندی کے کنارے بچوں کے بل بیٹھی ہوئی تھی مگر اس نے کرہ پہنا ہوا نہیں تھا صرف سامنے کیا ہوا تھا۔ اس کے بال اور جسم گیلیا تھا۔ پہ نظر وہ ٹھک لگ رہی تھی۔ ”کیا ہوا ہے؟“

”شہباز دیکھیں میری پشت پر کیا چپک گیا ہے مجھے

بہت تکلیف ہو رہی ہے۔“

اس کی پشت لباس سے خالی تھی۔ جیسے ہی میں اس کی پشت پر آیا اس کی شفاف کمر پر چپکی ہوئی سیاہی مائل سبز چیز نظر آ گئی۔ وہ جس طرح چپکی ہوئی تھی۔ مجھے لگا کہ یہ جو تک کی کوئی قسم ہے مگر جو تک لگے تو تکلیف نہیں ہوتی ہے اور اکثر اوقات آدمی کو ہتا بھی نہیں چلتا ہے، کیونکہ جو تک چپکتے ہی جلد اور گوشت کو سن کرنے والا زہرا جگٹ کرتی ہے تاکہ جاندار کو ہتانہ چلے اور وہ تادیر اس کا خون پی سکے۔ میں نے ناخن سے اسے جلد سے الگ کرنے کی کوشش کی مگر وہ اتنی مضبوطی سے چپکی ہوئی تھی کہ شاید روبیر کی کھال کے ساتھ ہی الگ ہوتی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”کہیں اور تکلیف تو نہیں ہے؟“

”نہیں۔“ وہ رو دینے والے انداز میں بولی۔ ”بس

یہیں ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟“

”کوئی کیرا ہے جو سختی سے تمہاری کھال سے چپک گیا ہے۔ تم ندی سے ذرا آگے جاؤ ویسے یہ پانی میں ہی لگا تھا؟“

”ہاں میں نہا رہی تھی کہ کمر میں تکلیف ہوئی میں نے ہاتھ لگا کر دیکھا اور پھر اسے الگ کرنے کی کوشش کی مگر یہ الگ نہیں ہوئی۔ تب میں ندی سے باہر آئی اور آپ کو پکارا۔“

میں نے دیکھا جو تک نما کیڑے کا سائز بڑھ رہا تھا یعنی وہ خون پی کر بڑھ رہی تھی۔ میں نے سوچا اور روبیر کے توسط سے ایرٹ سے کہا۔ ”اوپر چوہے کے انگاروں سے ایک چاقو تیز گرم کر کے لے کر آؤ۔ جلدی چاہیے۔“

روبیر کی بات سن کر ایرٹ مستعدی سے اوپر چڑھ گیا۔ روبیر اسی طرح بیٹھی ہوئی تھی اور کرتے سے اپنا جسم ڈھانپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اسے کہا۔ ”میں دوسری طرف جا رہا ہوں تم پا جامہ اور کرہ پہن لو۔“

”اور یہ.....“ اس نے ہراساں انداز میں اپنی کمر سے چپکی جو تک کی طرف اشارہ کیا۔

”اسے بھی نکالتا ہوں۔“ میں نے کہا اور دوسری طرف آ گیا۔ دو منٹ بعد ایرٹ اوپر سے چاقو لیے نمودار ہوا اور میں نے اس سے چاقو لیتے ہوئے روبیر سے پوچھا۔ ”آ جاؤں۔“

”جی۔“ اس نے کہا تو میں ندی کی طرف آیا۔ روبیر نے پا جامہ اور کرہ پہن لیا تھا مگر عقب سے کرتا اٹھایا ہوا تھا۔

میں نے اس سے کرہ پکڑنے کو کہا اور دکھتا ہوا سنگی چاقو کیڑے کو لگا دیا۔ چڑھاہٹ کی آواز کے ساتھ ہی اس نے بل کھا کر روبیر کی کمر کو چھوڑنا شروع کر دیا۔ میں چاقو اس کے جسم میں اتار رہا تھا اور ساتھ ہی کوشش کر رہا تھا کہ روبیر کو

چاقو نہ لگے۔ مگر جب جو تک اس کا جسم چھوڑ رہی تھی تب بھی اسے تکلیف ہوئی۔ وہ کراہنے لگی۔ ایک منٹ میں کیڑا اس حد تک الگ ہوا کہ میں نے کسی قدر ٹھنڈے ہو جانے والے چاقو سے کام لیتے ہوئے اسے اکھاڑ دیا۔ جہاں سے اسے زبردستی الگ کیا تھا وہاں روہیر کو زخم آیا اور اس نے چیخ ماری تھی۔ زخم سے خون چھلک آیا تھا۔ میں نے پہلے کیڑے کو نیچے گرا کر اسے جوتے سے مسل دیا۔ اس میں بھرا ہوا روہیر کا خون مٹی پر بکھر گیا تھا۔

”ہٹ گیا؟“ روہیر نے پوچھا۔

”ہاں لیکن زخم ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”اوپر چلو اس پر دوا لگاتے ہیں۔“

ریک اس بار دواؤں کا ایک تھیلا بھی لایا تھا اور اس نے مجھے بتایا تھا کہ کس قسم کی تکلیف یا بیماری میں کون سی دوا دینی ہوگی۔ یہ دوائیں سامیرا نے بھجوائی تھیں۔ میرے زخم ویسے تو تیزی سے بھر جاتے ہیں مگر پرسوں ہونے والے مقابلے میں لگنے والے زخموں پر میں نے یہ مرہم لگایا تھا اور اس وقت میرے ہاتھ اور پاؤں سے لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہاں کوئی زخم بھی لگا ہے۔ اوپر لا کر میں نے ریک کے زخم پر وہی مرہم لگایا تو اسے تکلیف میں فوراً آرام آ گیا۔ اس سے فارغ ہو کر میں نے ایرٹ اور اس کے ساتھیوں سے کہا کہ وہ اب ندی کی طرف جاتے اور وہاں نہاتے ہوئے محتاط رہیں۔ انہوں نے بھی مراہوا کیڑا دیکھا تھا۔ ایرٹ نے مجھ سے کہا۔ ”یہ بہت خطرناک ہوتا ہے آدمی کو ایک بار چپک جائے تو بہت مشکل سے چھوڑتا ہے۔“

”اسے چھڑانے کی واحد ترکیب یہی ہے کہ اسے گرم چیز لگاؤ۔ اسے تکلیف ہوگی تو یہ آدمی کو چھوڑ دے گا۔“

”اس کے چپکنے سے تکلیف بھی بہت ہوتی ہے کیونکہ یہ کانٹے نما پنچے کھال میں اتار دیتا ہے۔“

”بس تو اب محتاط رہنا۔“

”روہیر کو کچھ دوائیاں بھی لینا ہوں گی کیونکہ اس کا زہر طبیعت خراب کرتا ہے۔“

ایرٹ کا کہنا درست ثابت ہوا۔ ہم اوپر آئے تو روہیر بخار جیسی کیفیت میں تھی۔ اسے سانس لینے میں بھی دشواری ہو رہی تھی۔ ایرٹ نے دواؤں کے تھیلے میں سے دیکھ کر بتایا کہ اسے کون سی دوائیاں دینی ہیں اور میں نے روہیر کو وہ دوائیاں دے دیں۔ وہ ٹھہر حال ہی ہو کر لیٹ گئی۔ میں سوچ رہا تھا کہ آج کی ہم ملتوی کر دوں کیونکہ روہیر کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور میں اسے چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر ایرٹ

اور اس کے ساتھی بیتاب تھے۔ ایرٹ نے کہا۔ ”جناب ہم شام کے قریب چلیں گے اور زیادہ دیر نہیں لگا میں گے۔“ میں نے انکار کیا۔ ”آرگون کی طرف جانے اور آنے میں بہت وقت لگ جاتا ہے اور میں روہیر کو اتنی دیر کے لیے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔“

”اگر ہم قلعوں کی طرف جائیں اور وہاں آرگون کے باغات کا حصہ لگتا ہے۔ ہم وہاں کارروائی کر سکتے ہیں۔“ ایرٹ کا اصرار جاری رہا۔ ”اس میں آدھا وقت لگے گا۔“

خلاف توقع روہیر نے اس کی تائید کی۔ ”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے اس طرف آنے جانے میں اتنا وقت نہیں لگتا ہے۔ آپ چلے جائیں، مجھے کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ میں آرام کرتی رہوں گی۔“

سامیرا کے قلعوں کی طرف جاتے ہوئے راستے میں پہلے آرگون کے باغ اور کھیت آتے تھے۔ یہ جگہ یہاں سے مشکل سے آدھے گھنٹے کی مسافت پر تھی۔ ان سے بچ کر قلعوں کی طرف جاتے ہوئے ہمیں جنوب کی طرف سے گھوم کر جانا ہوتا تھا۔ میں نے غور کیا اور راضی ہو گیا۔ روہیر سے کہا۔ ”تم آرام کرو، ہم جلد واپس آنے کی کوشش کریں گے۔“

”بس رہ لوں گی۔“ اس نے یقین سے کہا تو میں نے ایرٹ کی طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا۔ وہ خوش ہو گیا۔ اس دن دوپہر کا کھانا ہم مردوں نے تیار کیا۔ روہیر نے کھانے سے انکار کیا تھا۔ کھاپی کر کچھ آرام کیا اور شام ہوتے میں تیار کرنے لگا۔ روہیر آرام کرتی رہی تھی اور پھر اسے دوا بھی مل گئی تھی اس لیے اس کی حالت بہت بہتر ہو گئی تھی۔ کچھ دیر میں ہم چھ افراد پوری طرح مسلح اور تیار ہو کر ٹیلے سے نیچے اترے۔ ایرٹ اور اس کے ساتھی جان گئے تھے کہ ان کی کہی بات میں براہ راست سمجھ لیتا تھا مگر اپنی بات ان تک پہنچانے کے لیے مجھے روہیر کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ روہیر ساتھ نہیں تھی اس لیے اب مجھے اپنی بات اشاروں سے سمجھانی تھی۔ روہیر کی مدد سے میں نے پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ میں کون سا اشارہ... کر دوں تو اس کا کیا مطلب ہوگا۔ دس بارہ اشارے مخصوص کر لیے تھے اور ان کی مدد سے میں ان سے اپنی بات کہہ سکتا تھا۔ اس کے باوجود مجھے ان سے بات کرنے میں کچھ نہ کچھ دشواری پیش آتی۔ ہم جنگل سے باہر آئے اور جھاڑیوں سے بھرے میدان سے ہوتے ہوئے آرگون کی زمینوں کی طرف جانے لگے۔

اس طرف جاتے ہوئے ہمیں محتاط رہنا تھا کیونکہ یہاں آرگون اور سامیرا کے قلعوں اور دونوں طرف کی

والے افراد آج آئے ہی نہیں تھے اور جب وہ نہیں آئے تھے تو ان کی حفاظت کرنے والے بھی نہیں آئے تھے۔ میں نے پورا باغ گھوم کر دیکھ لیا۔

آرگون سے دور باغات کی پوزیشن کچھ یوں تھی کہ باغ تھا پھر کچھ حصہ کھیت پر مشتمل تھا اور پھر باغ تھا۔ یہ اصل میں چوکور ساخت کے قطعے تھے جو شطرنج کی بساط کے خانوں کی طرح بنے ہوئے تھے۔ اوپر سے دیکھا جاتا تو شاید یہ بساط ہی نظر آتی۔ میں نے پہلے آکر ایرٹ کو خبردار کیا کہ میں آگے جا رہا ہوں۔ وہ اس باغ میں آگئے جس میں کوئی نہیں تھا۔ پھر میں اگلے باغ کی طرف بڑھا۔ کھیت جس سے میں گزر رہا تھا وہاں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اگلا باغ بھی ویران ثابت ہوا۔ میں یہاں سے آگے جانا چاہتا تھا اس لیے میں نے واپس آکر پھر ان لوگوں کو بتایا اور وہ اس باغ تک آئے۔ میں چاہتا کہ ہم میں اتنا فاصلہ نہ رہے کہ ایک پر کچھ گزر جائے اور دوسرے کو علم نہ ہو۔ وہ دوسرے باغ میں رکنے تو میں آگے گیا۔

میرا اندازہ تھا کہ ہر باغ اور کھیت کا سائز ایک ہی میٹر تھا۔ یعنی سو میٹر لمبا اور اتنا ہی چوڑا۔ چوتھے باغ میں بھی جب کسی کو نہیں پایا تو مجھے یقین ہو گیا کہ آج کوئی آرگون سے نہیں نکلا ہے۔ یہ امر ہر طرح سے تشویشناک تھا۔ اول یہ کہ ریٹاٹ کی فوج عنقریب حرکت میں آنے والی تھی اور اس لیے اب غیر عسکری افراد کو قلعے سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ دوسرے مسلسل تین فوجی دستوں کی گم شدگی نے انہیں چوکنا کر دیا تھا اور وہ اپنی سپاہ کی مزید گم شدگی نہیں چاہتے تھے اس لیے انہوں نے اپنے لوگوں کو قلعے سے باہر آنے سے روک دیا تھا۔ غور کرنے پر بھی ان میں سے کوئی وجہ حتمی طور پر میرے دل کو نہیں لگی تھی۔ میں واپس آیا اور اشاروں میں اپنے ساتھیوں کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ ایرٹ نے کہا۔ ”ہم اگر باغوں کے ساتھ ساتھ آرگون کے سامنے والے حصے تک سز کر کے دیکھیں تو صورتِ حال کا بہتر اندازہ ہو جائے گا۔“

”لیکن سامیرا کے آدمیوں سے سامنا ہو گیا تو؟“ میں نے اشاروں میں پوچھا۔

”ہم ان کی حد سے دور رہیں گے۔“

میں نے سوچا اور ایرٹ کی تجویز پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہم آگے روانہ ہوئے۔ ابھی ہمیں ایک گھنٹا بھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ ہم دو سے ڈھائی گھنٹے میں واپس آجائیں گے۔ اس وقت تک تاریکی بھی چھانے لگے گی یا

زمینیں آپس میں مل رہی تھیں۔ آرگون والے میرے دشمن تھے مگر سامیرا کے سپاہی بھی اب میرے دشمن تھے۔ سومرو نے مجھے قلعے سے نکالتے ہوئے بتایا تھا کہ اگر میں قلعے کے سپاہیوں کو نظر آیا تو وہ مجھے گرفتار کر لیں گے اور اس بار عدالت سے مجھے سزائے موت سنائی جائے گی۔ ایرٹ اور اس کے ساتھی بھی جانتے تھے اس لیے وہ آگے تھے اور مجھے پیچھے رکھا تھا۔ حالانکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا اگر ان کا سامنا سامیرا کے سپاہیوں سے ہوتا تو ہماری وردیوں کی وجہ سے وہ ہمیں دشمن ہی سمجھتے اور اگر ہم وضاحت کی کوشش کرتے تو یہ وضاحت الٹا ہمارے گلے پڑ جاتی۔ آدھے گھنٹے بعد ہم باغات کے نزدیک تھے۔ یہاں باغ کم تھے اور کھیت زیادہ تھے جن میں اب گندم نما پودے کی فصل پانچ فٹ سے اوپر جا چکی تھی۔ اب اس میں روپوش ہونا زیادہ مشکل نہیں تھا۔

مگر ہمارا مقصد آرگون کے سپاہیوں کے خلاف چھاپہ مار کارروائی کرنا تھا۔ سپاہی باغوں میں ہی موجود ہو سکتے تھے۔ کیمپوں میں گھسنے کی کوئی تک نہیں تھی۔ ہمیں باغوں میں آرگون کے سپاہیوں کو تلاش کرنا تھا۔ یہاں گھاس کے میدان نہیں تھے کیونکہ یہاں خطرناک جانوروں کی آمدورفت بہت کم تھی۔ اس لیے میدان صاف کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی گئی تھی اور یہاں جا بجا جھانپاں تھیں۔ ان کی آڑ لیتے ہوئے ہم ایک باغ کے نزدیک جانے لگے۔ فی الحال یہاں نہ تو کوئی سپاہی نظر آ رہا تھا اور نہ ہی باغ میں کام کرنے والے۔ یہ چیز مجھے کھلکی تھی کیونکہ کچھ نہ کچھ لوگ تو ہونے چاہیے تھے۔ جب ہم باغ کے بالکل نزدیک آگئے تب بھی وہاں زندگی کا احساس مفقود تھا۔ ان لوگوں نے بھی اس بات کو محسوس کر لیا۔ ایما نے مجھ سے کہا۔ ”ایسا لگ رہا ہے جیسے یہاں کوئی نہیں ہے۔“

میں نے سر ہلا کر اس کی تائید کی اور پھر انہیں وہیں رکنے کا اشارہ کر کے میں خود آگے بڑھا۔ درختوں کے درمیان آیا۔ یہاں تمام درخت منظم انداز میں لگائے گئے تھے۔ یعنی قطاروں میں اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام قطاریں بالکل سیدھ میں تھیں اس لیے یہ جاننا زیادہ مشکل نہیں تھا کہ وہاں کوئی ہے یا نہیں۔ اب تک کوئی نظر نہیں آیا تھا اس لیے میں پوری بے فکری سے باغ میں گھوم رہا تھا۔ میرے جسم پر آرگون کی جنگی وردی تھی اگر کوئی مجھے دیکھ لیتا تو اپنا ہی آدمی سمجھتا۔ مگر وہاں دیکھنے کے لیے کوئی نہیں تھا۔ میں نے چند منٹ میں پورا باغ دیکھ لیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس باغ اور اس طرف کھیتوں میں کام کرنے

تھا۔ دراصل میری چھٹی حس اشارہ کر رہی تھی۔ ٹیلے کے نزدیک آتے ہی صورتِ حال واضح ہو گئی۔ آگ اوپر کیبن میں لگی تھی۔

میرے ساتھ ایرٹ تھا میں نے اسے اشارے سے نیچے رکنے کو کہا اور خود لکڑی کی سیڑھی سے اوپر چڑھا۔ میں محتاط تھا اس کے باوجود سیڑھی کے چرچرانے سے آوازیں پیدا ہو رہی تھیں۔ ایرٹ اور اس کے ساتھیوں نے تیرکمان سنبھال لیے تھے اور پوری طرح تیار تھے۔ میں اوپر آیا۔ آگ کیبن میں ہی لگی تھی۔ کسی کو نہ پا کر تیزی سے آگے بڑھا۔ روپیر کو آواز دی اور اس کی طرف سے جواب نہیں آیا۔ ایک منٹ سے بھی پہلے میں نے پورا ٹیلہ دیکھ لیا تھا۔ وہاں تباہی اور بربادی پھیلی ہوئی تھی جو صرف انسانی ہاتھوں کی مرہون منت تھی۔ تمام چیزیں توڑ پھوڑ کر برباد کر دی گئی تھیں۔ کیبن کو آگ لگا دی تھی اور روپیر غائب تھی۔ اس ٹیلے پر وہ صرف ایک جگہ ہو سکتی تھی یعنی چلتے کیبن کے اندر۔ مگر اس صورت میں وہاں گوشت جلنے کی بدبو ہوتی جب کہ وہاں ایسی کوئی بو نہیں تھی۔

چلتے کیبن کی روشنی اتنی تیز تھی کہ مشعل کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میں دہاں کا جائزہ لیتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اگر یہ آرگون والوں کی کارروائی کئی تو ان کے دستے کی آس پاس موجودگی ممکن تھی۔ اس بات کا تاناوے فیصد امکان تھا کہ ٹیلے پر حملہ آرگون کی سپاہ نے کیا تھا۔ انہوں نے کسی طرح اس جگہ کا پتا چلا لیا اور جب ہم یہاں نہیں تھے تب وہ یہاں آئے اور ہماری پناہ گاہ کو ہنس نہیں کر دیا۔ مگر خطرہ اب بھی موجود تھا۔ میں تیزی سے کنارے تک آیا اور اشارے سے ایرٹ اور دوسروں کو اوپر بلا لیا۔ وہ ایک ایک کر کے اوپر آئے اور چلتے کیبن اور برباد سامان کو دیکھنے لگے۔ پہلے ان کے چہرے اتر گئے اور پھر وہ غضب ناک نظر آنے لگے۔ میں نے اشارے سے کہا۔ ”یہ آرگون والوں کی کارروائی ہے اور ہم خطرے میں ہیں۔“

ایرٹ نے پوچھا۔ ”روپیر کہاں ہے؟“
میں نے گہری سانس لی اور پھر ہاتھوں کی زبان استعمال کی۔ ”میرا خیال ہے وہ اسے لے گئے ہیں۔ اگر وہ زندہ ہے تب بھی اس کی زندگی کی زیادہ امید نہیں کی جاسکتی ہے۔ میں دیکھ چکا ہوں آرگون والے عورت کے معاملے میں اور زیادہ سفاک ہیں۔“

ایرٹ کیبن کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”اسے آگ لگے زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے۔“

چھا چکی ہوگی۔ بہر حال ہمیں بہت زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ ہم آرگون کی زمین کے ساتھ ساتھ جھاڑیوں میں چل رہے تھے۔ تقریباً پون گھنٹے بعد ہم سامیرا کے قلعوں کی حدود کے پاس پہنچ گئے۔ یہاں ان کے کھیت اور باغات تھے اور ان میں کام کرتے افراد دور سے نظر آ رہے تھے۔ دوسری طرف آرگون کے کھیتوں اور باغات میں اب تک ایک تنفس بھی نظر نہیں آیا تھا۔ صورتِ حال بہت واضح اور سنگین تھی۔ ریٹاٹ نے سب کو قلعہ بند کر لیا تھا اور اس کی طرف سے بہت جلد جنگی کارروائی ہوتی نظر آ رہی تھی۔ دوسری طرف مجھے سامیرا کے لوگ معمول کے مطابق کام کرتے نظر آئے تھے حالانکہ انہیں صورتِ حال کا اندازہ کر کے اس کے مطابق رد عمل دینا چاہیے تھا۔

ریٹک کے آنے کا پتا نہیں تھا مگر میں نے فیصلہ کیا کہ ایرٹ کو فوری قلعے کی طرف روانہ کروں گا مگر اس سے پہلے اسے بریف کرنا لازمی تھا اور بریفنگ کے لیے روپیر کا ہونا لازمی تھا۔ اگر وہ ساتھ ہوتی تو میں یہیں سے ایرٹ کو سامیرا کے لیے پیغام دے کر روانہ کر دیتا۔ مگر اتفاق اور قسمت کی خرابی کہ اسے بھی آج ہی جو تک لگنا تھی۔ اتنے دن سے اتنے لوگ ندی میں نہا رہے تھے اور کسی کو جو تک نہیں لگی۔ وہ بھی روپیر کو لگی تھی۔ میں نے واپسی کا اشارہ کیا اور ہم واپس چل پڑے۔ آرگون کے قلعے کے سامنے تک آنے کے چکر میں ہم خاصے آگے نکل آئے تھے اور میرا اندازہ تھا کہ واپسی میں ہمیں رات ہو جائے گی اور ایسا ہی ہوا۔ ابھی ہم جنگل سے دور تھے کہ تاریکی چھانے لگی۔ ہم نے مشعلیں جلا لیں اور جانوروں سے بچاؤ کے لیے دو شاخے ہمارے پاس تھے مگر ابھی انہیں آگ دکھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ جب ضرورت پڑتی تو ایک لمحے میں انہیں جلا سکتے تھے۔

جنگل میں داخل ہونے سے پہلے تاریکی مکمل ہو گئی تھی اور اسی وجہ سے ٹیلے کے اوپر کی غیر معمولی روشنی ہمیں دور سے نظر آ گئی۔ میں چونکا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ٹیلے کے اوپر کسی نے بڑا سا الاؤ جلا یا ہوا ہے اور یہ معمول کی بات نہیں تھی۔ کیا کوئی خطرہ تھا اور روپیر اس طرح سے آگ جلا کر ہمیں اس سے خبردار کر رہی تھی۔ یا وہاں کوئی حادثہ پیش آچکا تھا۔ میں نے جلدی سے اپنی مشعل بجھا دی اور دوسروں نے بھی یہی کیا۔ میں نے اشاروں سے انہیں پھیل کر اور چھپ کر آگے بڑھنے کو کہا اور ہم ایک دوسرے سے فاصلہ رکھتے ہوئے ٹیلے کی طرف بڑھنے لگے۔ آگے آتے ہوئے میرا دل اس خدشے سے دھڑک رہا تھا کہ کوئی حادثہ پیش آچکا

”وہ باغ میں ہوں گے۔“ میں نے اشارے سے کہا اور مشعل بجھا دی۔ ہم اب تاروں کی چھاؤں میں آگے بڑھنے لگے۔ روشنی کم ہونے کی وجہ سے رفتار بھی کم تھی۔ سچی بات ہے کہ میں باغات کے نزدیک آنے تک پُر امید رہا تھا کہ ہم روبیر کو لے جانے والوں کو جالیں گے مگر جب مجھے یہاں تک ان کا نشان نہیں ملا تو میں اندر سے مایوس ہونے لگا کہ شاید ہم غلط سمت میں سفر کرتے رہے تھے اور روبیر کو لے جانے والے اے کسی اور راستے سے لے گئے تھے۔ سمت میں ذرا سی تبدیلی سے بہت زیادہ فرق پڑ سکتا تھا۔ کیونکہ باغات اور کھیتوں کا یہ سلسلہ مشرق سے مغرب کی طرف آتے ہوئے شمال کی طرف گھوم رہا تھا اور اس کی لمبائی دس میل سے بھی زیادہ تھی۔ وہ کسی بھی جگہ سے اندر جا سکتے تھے اور ایک بار وہ باغات کے اندر چلے جاتے تو ان سب جگہوں کو دیکھنے کے لیے ہم چھ افراد کیا ہزاروں کی فوج بھی ناکافی ثابت ہوتی۔

باغ کے پاس پہنچ کر میں نے سب کو دس دس گز کے فاصلے سے پھیل کر آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اس طرح ہم تقریباً پورا باغ کور کر سکتے تھے۔ میں درمیان میں تھا اور ہم آگے بڑھنے لگے۔ خلاف توقع یہ باغ چوکور کے بجائے مستطیل ثابت ہوا اور اس کی لمبائی خاصی زیادہ تھی۔ ہم وسط تک پہنچے ہوں گے کہ کسی کا بدست ہتھکڑیاں سنائی دیا۔ اس قبقبہ نے میرے اندر دم توڑتی امید کو پھر سے زندہ کر دیا تھا۔ قبقبہ کچھ دور درختوں کی طرف سے آیا تھا۔ اب میں نے غور کیا تو درختوں کے اوپری سروں پر روشنی بھی جھلک رہی تھی۔ وہاں آگ روشن تھی۔ کیونکہ درخت نیچے سے اتنے پھلے ہوئے تھے کہ ان کی شاخیں زمین سے جا لگی تھیں۔ اس لیے ان کے نیچے سے روشنی نہیں جھلک رہی تھی۔ ایرٹ اور دوسروں نے بھی قبقبہ سن لیا تھا اور اب وہ بھی سمت کر اسی طرف آرہے تھے۔ ہم سب ہی ہوشیار اور دبے قدموں آگے جا رہے تھے تاکہ ان لوگوں کو خبر نہ ہو۔ کسی بھی ناگہانی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ہم نے اپنے ہتھیار سنبھال لیے تھے۔

اب اس طرف سے کئی افراد کے بولنے کی آواز آرہی تھی اور وہ جو باتیں کر رہے تھے انہیں ایک انسان کی ذہنی گند ہی قرار دیا جاسکتا تھا جو وہ منہ کے راستے خارج کر رہے تھے۔ وہ کسی عورت کے بارے میں آپس میں محو گفتگو تھے۔ آگے بڑھتے ہوئے ہم سب اتنے نزدیک تھے کہ ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے اور سب نے تیرکمان سنبھال لیے تھے۔ دبے قدموں ہم ان کے بالکل نزدیک جا پہنچے اور

میں نے بھی کیبن کو دیکھا اور تسلیم کیا۔ شاید آدھا گھنٹا پہلے اسے آگ لگائی گئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ روبیر کو لے جانے والے زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔ میں نے اشارے سے یہ بات واضح کی تو ایرٹ پُر جوش لہجے میں بولا۔ ”ہم ان کے پیچھے جا سکتے ہیں۔ روبیر قیدی ہے اس کی وجہ سے وہ زیادہ تیز رفتاری سے سفر نہیں کر سکیں گے اور اگر ہم تیزی سے چلیں تو انہیں راستے میں روک سکتے ہیں۔“

مجھے افسوس ہوا کہ یہ خیال میرے ذہن میں کیوں نہیں آیا۔ مگر میں نے افسوس میں زیادہ وقت ضائع نہیں کیا اور ہم فوری روانہ ہو گئے۔ میں نے ذہن میں وہ مختصر ترین راستہ سوچا جو یہاں سے آرگون کی طرف جاتا تھا اور ہم اسی پر دوڑنے لگے۔ روشنی کے لیے ایک مشعل جلائی تھی تاکہ ہمیں راستہ دکھائی دیتا رہے اور آگے روبیر کو لے جانے والا دشمن زیادہ روشنی دیکھ کر ہوشیار نہ ہو۔ ہم درمیانی سے ذرا زیادہ رفتار سے دوڑ رہے تھے۔ یوں سمجھ لیں کہ ہمارا انداز طویل مراٹھوں میں حصہ لینے والے ایتھلیٹ کا سا تھا۔ جو کسی قدر کم رفتار مگر مستقل مزاجی سے بھاگتا ہے۔ ایرٹ کی بات درست تھی روبیر کو قیدی بنا کر لے جانے کی صورت میں وہ زیادہ تیزی سے سفر نہیں کر سکتے تھے۔ چاہے اور اسے پیدل لے جا رہے ہوں یا کسی نے اسے اٹھا رکھا ہو۔ دونوں صورتوں میں ان کی رفتار پیدل چلنے سے زیادہ نہیں ہوگی۔

جب میں نے تباہ شدہ ٹیلہ دیکھا تو مجھے شاک لگا تھا اور مجھے روبیر کی زندگی سے مایوسی ہوئی تھی۔ عورتوں کے ساتھ آرگون کے سپاہیوں کا رویہ میں دیکھ چکا تھا اور روبیر بہت حسین اور نوجوان تھی۔ اس کی زندگی کے ساتھ آبدی بھی خطرے میں تھی۔ اگر وہ فی الحال بچی ہوئی تھی تو یہ بچت زیادہ دیر کے لیے نہیں تھی۔ جنگل میں سپاہی رکنے کا خطرہ مول لے نہیں سکتے تھے اور شاید وہ واپس اپنے باغات تک پہنچنا چاہ رہے ہوں جہاں وہ کسی قدر محفوظ تھے اور پھر وہ روبیر کے ساتھ اپنی من مانی کر سکتے تھے۔ مگر انہیں اپنے باغات تک پہنچنے میں کم سے کم ایک گھنٹا لگتا۔ وہ یقیناً اس طرف نہیں گئے تھے جس طرف سے ہم آئے تھے۔ بلکہ انہوں نے اس طرف کا رخ کیا ہوگا جہاں ہم نے جال بچھا کر آرگون کے نو سپاہیوں کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔ ایک گھنٹے کا یہ فاصلہ ہم نے تیز رفتاری سے آدھے گھنٹے میں طے کر لیا مگر جب گھاس والے میدان میں نکلے تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ ایما نے یہی بات مایوسی سے کی۔

”یہاں تو کوئی نہیں ہے۔“

ماہنامہ سرگزشت

چکے تھے اور دو قریب المرگ تھے۔ مارٹ نے انہیں سگی چاقو سے مارنا چاہا مگر میں نے روک دیا اور روبیر کی طرف بڑھا۔ اس سارے ہنگامے میں وہ پہلے کی طرح ساکت پڑی رہی تھی۔ وہ یقیناً بے ہوش تھی۔ میں نے اسے سیدھا کیا اور چونک گیا۔ وہ روبیر نہیں تھی۔

”یہ روبیر نہیں ہے۔“ ایما نے مضطرب لہجے میں کہا۔ یہ بھی جوان لڑکی تھی اور خاصی دلکش تھی جسامت تقریباً روبیر جیسی تھی اس لیے ہم اسے روبیر ہی سمجھے تھے اس نے لباس بھی ویسا ہی سفید پہن رکھا تھا اور اس سے پہلے کسی نے توجہ نہیں دی کہ اس کا پاجامہ بھی سفید تھا جب کہ روبیر نے سرخ پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ چند لمحے پہلے روبیر کو پا لینے اور ٹیلے کی تباہی کے ذمے داروں کو سزا دینے کی جو خوشی تھی وہ روبیر کو نہ پا کر ماند پڑ گئی۔ شاید یہ وہ لوگ نہیں تھے جنہوں نے ٹیلے پر حملہ کیا تھا۔ لڑکی بے ہوش تھی اور اس کی سانس بھی بند تھی۔ میں کچھ دیر کے لیے ساکت رہ گیا۔ روبیر کہاں تھی؟ میں ایک نئے خیال کے ساتھ دلچسپی سے دم توڑتے سپاہیوں کے پاس آیا اور اشارے سے ایما سے کہا۔ ”ان سے روبیر کا پوچھو۔“

ایما نے ان سے روبیر کا پوچھا مگر وہ کہہ سکتے رہے اور کوئی جواب دینے سے گریز کیا۔ اس پر ایما نے ایک کے پیٹ میں اتر ہوا تیر پکڑ کر ہلایا تو وہ چلا اٹھا تھا۔ ایما نے اپنا سوال دہرایا تو وہ ٹوٹے الفاظ میں بولا۔ ”میں..... روبیر..... کو نہیں..... جانتا۔“

”وہ جسے جنگل والے ٹیلے سے لایا گیا ہے ایسی ہی لڑکی ہے۔“ ایما نے بے ہوش لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ اسے..... آرگون..... لے..... گئے۔“ اس نے یہ مشکل کہا۔

”کون؟“ ایما نے اسے جھنجھوڑا مگر وہ جواب دینے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس نے جھرجھری لی اور دم توڑ دیا۔ دوسرا ویسے ہی ہوش سے بیگانہ تھا۔ ایک منٹ سے پہلے اس نے بھی دم توڑ دیا۔ بہر حال سپاہی کے جواب نے واضح کر دیا تھا کہ یہی دستہ ٹیلے پر حملے اور روبیر کے اغوا میں ملوث تھا۔ یقیناً وہ زیادہ تھے۔ کچھ یہاں اس لڑکی کے ساتھ رکب گئے اور باقی روبیر کو لے کر آرگون چلے گئے تھے۔ یہ تو واضح تھا کہ لڑکی آرگون کی تھی اور شاید اسے پہلے ہی سپاہی عیاشی کے لیے اغوا کر کے لے آئے تھے۔ انہوں نے سوچا ہوگا کہ جب ایک مہم پر جا رہے ہیں تو واپسی میں موج میلہ کر لیں گے۔ ویسے تو ان کو باہر نکلنے سے منع کر دیا گیا ہوگا اور شہر

شاخوں کی اوٹ سے دیکھا کہ ایک کسی کھلی جگہ گھاس پر سات سپاہی موجود تھے۔ ان کے درمیان میں الاؤ جل رہا تھا اور وہ جو چیز پی رہے تھے اسے ام النجاشٹ کہتے ہیں کیونکہ اس کا فتور ان کے لہجوں سے چھلکا پڑ رہا تھا۔ ان سے کچھ فاصلے پر روبیر بندھی حالت میں زمین پر کروٹ کے بل پڑی ہوئی تھی۔ اس کا لباس دست درازی کی وجہ سے بے ترتیب ہوا تھا مگر اس کے جسم پر سلامت تھا۔ اس کا رخ دوسری طرف تھا۔ میں نے سکون کا سانس لیا کہ اس کی جان اور آبرو محفوظ تھی۔ میں نے پلٹ کر ایرٹ کو اشارے سے بلایا اور ایک سپاہی کی طرف اشارہ کیا۔

وہ سمجھ گیا اور اپنی پوزیشن پر چلا گیا۔ اسی طرح میں نے ہر ساتھی کو بلا کر اس کا شکار واضح کیا تا کہ ہم سب الگ الگ کو نشانہ بنائیں۔ میں نے ان میں سے سب سے گرانڈیل شخص کو منتخب کیا تھا جو چلے اور انداز سے ان سب کا سردار لگ رہا تھا۔ میں نے اس کی گردن کا نشانہ لیا اور تیر چلا دیا۔ مگر نشانہ کسی قدر خطا گیا اور تیر اس کی گردن کے وسط میں اترنے کے بجائے سائیڈ پر آ رہا ہو گیا اور وہ خرخراتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ باقی پانچ افراد کے چونکنے سے پہلے ہی تیر ان کے جسموں میں اتر گئے تھے اور وہاں صرف ایک شخص بچا تھا جو صحیح سلامت تھا۔ اس نے چھلانگ لگائی اور کسی چھلانگ سے کی طرح الاؤ کو پھلانگتے ہوئے روبیر کے دوسری طرف جا گیا۔ اسی وجہ سے وہ بچ بھی گیا کیونکہ روبیر کی وجہ سے سب نے ہی ہاتھ روک لیے تھے۔ پھر سب ہی ان کو مزید نشانہ بنا رہے تھے جن کو پہلے تیر مار چکے تھے تا کہ وہ مزاحمت کے قابل نہیں رہیں۔ وہ زخم کھا کر پیچھے دھاڑ مچا رہے تھے اور آنے والے تیروں سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہاں کہیں جائے پناہ نہیں تھی۔

میں نے بھی گرانڈیل کو دوسری بار نشانہ بنایا اور اس بار تیر اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر اتر گیا اور وہ کھڑا ہوا ڈگر گار ہا تھا پھر تیر کھا کر اوندھے منہ الاؤ پر گرا اور اس نے نصف سے زیادہ الاؤ بچھا دیا۔ روشنی یک دم ہی بہت کم ہوئی تھی اور روبیر کو پھلانگتے والا اس کا بھی فائدہ اٹھاتے ہوئے وہاں سے غائب ہو گیا۔ میں نے اشارے سے ایرٹ اور دوسروں کو اس کے پیچھے جانے کو کہا مگر وہ پہلے ہی حرکت میں آ گئے تھے۔ ایرٹ، شاٹ اور رائٹون اس کے پیچھے گئے۔ ایما اور مارٹ میرے ساتھ تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے گرانڈیل کی لاش الاؤ سے دور کی جو کسی قدر جل چکی تھی اور اس سے بدبو اور دھواں اٹھ رہا تھا۔ میں ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا ان میں سے تین مر

میں اس قسم کے کام ڈرا دھوا رہا ہوتا تھا۔ اگرچہ وہاں بھی انہیں روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ ریٹائرمنٹ نے اپنی فوج کو کھلی چھوٹ دے دی تھی۔ اسی اثنا میں ایرٹ اور دوسرے آگئے۔ ایرٹ نے معذرت بھرے انداز میں کہا۔
 ”وہ نکل گیا۔ ہم اس کا پیچھا نہیں کر سکتے۔“

میں سمجھ رہا تھا اس میں ان لوگوں کا قصور نہیں تھا۔ ان باغات میں کسی کا پیچھا کرنا یا اسے تلاش کرنا وہ بھی تاریکی میں بہت مشکل کام تھا۔ میں نے سپاہیوں کے ہتھیاروں اور دوسرے سامان کی طرف اشارہ کیا۔ ”انہیں سمیٹو۔“
 ایرٹ کو چھوڑ کر باقی سب اس کام میں لگ گئے تھے۔ ایرٹ نے لڑکی کا پوچھا۔ ”اس کا کیا کرنا ہے؟“

”ساتھ لے جانا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ لڑکی کو اٹھانے کی ذمہ داری ایرٹ کو سونپ دی اور اس نے خوشی خوشی یہ خوشگوار بوجھ اٹھا لیا۔ مرتے سپاہی کے آخری جواب سے واضح تھا کہ دوسرے سپاہی جو شاید ٹیلے پر ہونے والے حملے میں شامل تھے وہی روہیر کو آرگن لے گئے تھے۔ مگر یہ لڑکی کہاں سے آئی اس کا جواب یہ خود دے سکتی تھی۔ یہ ظاہر اس کے ساتھ زیادتی نہیں ہوئی تھی کیونکہ اس کا لباس سلامت اور جسم صاف سہرا تھا۔ نہ جانے وہ کسی ضرب کی وجہ سے بے ہوش تھی۔ اسے کوئی دوا دی گئی تھی یا وہ ایسے ہی ہوش کھو بیٹھی تھی۔ کچھ دیر بعد ہم بارغ سے نکل آئے وہیں سے مشعلیں جلائی تھیں۔ بچتے والا آرگن یا کسی اور نزدیکی دے کی طرف گیا ہوگا اور اسے مدد لے کر آنے میں یقیناً کچھ دیر لگتی۔ اتنی دیر میں ہم یہاں سے خاصی دور نکل سکتے تھے۔

مگر واپسی میں ہماری رفتار پیدل سے زیادہ نہیں تھی اور اگر ہمارے تعاقب کرنے والے اس رفتار سے آتے جس رفتار سے ہم ان باغات تک آئے تھے تو وہ بھی ہمیں راستے میں پکڑ سکتے تھے۔ جنگل میں داخل ہونے کے بعد ہم کچھ دیر کے اور عقب کا جائزہ لیا۔ اگر کوئی تعاقب میں آ رہا تھا تو وہ ہمیں نظر آتا مگر کوئی نظر میں نہیں آیا تو ہم آگے روانہ ہو گئے۔ خوش قسمتی سے آتے ہوئے ہمیں کسی جانور سے واسطہ نہیں پڑا تھا اسی طرح واپس جاتے ہوئے بھی کوئی خطرناک جانور نہیں ٹکرایا۔ چند ایک چھوٹے موٹے جانور ملے جنہوں نے ہمیں دیکھتے ہی فرار کی راہ اختیار کر لی۔ ایک گھنٹے بعد ہم ٹیلے کے پاس تھے۔ اس پوری وادی میں آرگن اور سامیرا کے قلعوں کے بعد ایک یہی جگہ تھی جہاں ہم جانوروں کے خطرے سے بے فکر ہو کر رہ سکتے تھے۔

اگرچہ یہ جگہ آرگن کی فوج کی نظر میں آچکی تھی اور وہ

اسے تباہ بھی کر چکے تھے۔ مگر فی الوقت یہاں قیام ہماری مجبوری تھی۔ صبح ہم گھبراہٹ سے جاگتے تھے۔ جب ہم ٹیلے کے اوپر آئے تو کیمپن خاکستر ہو گیا تھا اور... اب اس کے بلے میں انکارے سلگ رہے تھے۔ صبح تک یہ بھی بجھ جاتے۔ انسان کچھ دن جس گھر اور جگہ قیام کرتا ہے اسے خود بہ خود اس گھر اور جگہ سے انسیت ہو جاتی ہے اور وہ تباہ ہو جائے تو انسان دکھ محسوس کرتا ہے جیسا کہ میں کر رہا تھا۔ آگ نے کیمپن کے آس پاس موجود جھاڑیوں اور پودوں کو بھی جلا ڈالا تھا۔ مگر جو پودے دور تھے وہ محفوظ رہے تھے۔ لان کی گھاس بھی بچ گئی تھی۔ البتہ گرمی نے اسے مرجھا دیا تھا۔ تباہ ہونے والی چیزوں میں ہمارا پانی اور اسے ذخیرہ کرنے والی چیزیں بھی شامل تھیں۔ مگر ہمیں آرگن کے سپاہیوں کے پاس سے بہترین قسم کی چھانکلیں اور مشکلیں ملی تھیں۔ اس کے علاوہ کھانے پینے کا سامان بھی وافر مقدار میں تھا۔

اس لیے اس حد تک نقصان کا ازالہ ہو گیا تھا مگر روہیر ہمارے ہاتھ سے نکل گئی تھی اور یہ جگہ دشمن کی نظروں میں آگئی تھی۔ یہ نقصان ناقابل تلافی تھے۔ کیمپن کی آگ نے پورے ٹیلے کو گرما دیا تھا اور اس گرمائش سے سب پسینے پسینے ہو رہے تھے۔ مگر مجبوری تھی کوئی اس وقت نیچے نہیں جا سکتا تھا۔ گرمی کی وجہ سے سب بار بار پانی پی رہے تھے اور آتے ہی وہ لوگ کھانے کی چیزوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔ سامان میں خشک کیا ہوا گوشت بھی تھا اور وہ اسے کیمپن کے انکاروں پر بھون کر کھانے لگے۔ ایرٹ نے مجھے بھی پیشکش کی تھی مگر میں نے انکار کرتے ہوئے دلے اور پھلوں کو ترجیح دی تھی۔ ظاہر ہے یہ گوشت میرے لیے حلال نہیں تھا۔ کھاپی کر سب کی جان میں جان آئی کیونکہ اس طویل مراعاتوں نے سب کے پیٹ اور حوصلے کے ٹینک خالی کر دیئے تھے۔ اس لیے کھاپی کر وہ سستانے لگے تھے۔

لڑکی بدستور بے ہوش تھی۔ میں نے اس کی نبض دیکھی تھی جو ست تھی۔ مگر اس کی جان کو بہ ظاہر کوئی خطرہ نہیں تھا۔ میں نے اسے گھاس پر ڈلوایا تھا جو ٹیلے پر واحد ٹھنڈی جگہ تھی۔ کھاپی کر میں اس کے پاس آیا۔ ایرٹ نے ایک مشعل جلائی تھی جس کی روشنی کافی تھی۔ پہلے میں نے غور نہیں کیا تھا مگر اب دیکھا تو مجھے دل میں تسلیم کرنا پڑا کہ وہ روہیر سے زیادہ نہیں تو کم حسین بھی نہیں تھی۔ درحقیقت اس وادی میں حسن کا معیار عام تھا اور بیشتر خواتین و حضرات اس معیار پر پورا اترتے تھے۔ یہ لڑکی بھی بے پناہ حسن کی مالک

وہ ایرٹ کو گھور رہی تھی۔ ”تم لوگ مجھے شہر کے قید خانے سے لائے ہو اور مجھ سے ہی پوچھ رہے ہو۔“
ایرٹ نے عقل مندی سے کہا۔ ”تم ہمارے قبضے میں ہو اور ہمیں تم سے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم چاہیں تو تمہیں قتل کر دیں یا تمہارے ساتھ جو چاہیں کریں کیا تم ہمیں روک سکتی ہو؟“
وہ سہم گئی۔ ”نہیں۔“

”تب ہماری بات تسلیم کرو۔“ ایرٹ نے کہا۔ ”اپنے آس پاس دیکھو ہم آرگون سے بہت دور جنگل میں ہیں۔“
لڑکی کے حواس بجا ہوئے تھے تو خود اس نے بھی محسوس کیا تھا کہ ہماری نظروں اور انداز میں اس کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہ کسی قدر مطمئن ہو گئی اور اٹھ بیٹھی۔
اس نے کہا۔ ”مجھے پیاس لگی ہے۔“

میں نے چھاگل اس کی طرف بڑھادی۔ اس نے ایک لمبا گھونٹ لیا اور چھاگل مجھے واپس کر دی۔ ایرٹ نے اسے گوشت کا ایک ٹکڑا دیا جو اس نے بے مہربانی سے کھایا۔ البتہ دوسرا ٹکڑا اس نے رک کر اور آرام سے چبا کر کھایا ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کئی وقت کی بھوک تھی۔ ایرٹ نے سوالات جاری رکھے۔ ”کیا ان لوگوں نے تمہیں اغوا کیا ہے۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں پہلے سے ان کی قید میں تھی۔ مجھے یہ قید خانے سے نکال کر لائے تھے۔“
”تمہیں کیوں قید کیا گیا اور تم اپنے بابا کے بارے میں کہہ رہی تھیں کہ اسے مت مارو، کیا تمہارے بابا کو مار دیا گیا ہے؟“

اس کا ہاتھ رک گیا اور آنکھوں میں نمی جھلملانے لگی تھی۔ اس نے سر ہلایا۔ ”ان لوگوں نے بابا کو مار دیا۔“
”کیوں؟“

”ان پر الزام تھا کہ انہوں نے سامیرا کی مدد کی ہے اور ایک آدمی کو قید سے فرار کر دیا جسے سزائے موت ہو چکی تھی۔“
میں مضطرب ہو گیا اور اشارے سے ایرٹ سے کہا۔ ”اس کے باپ کا نام پوچھو۔“

ایرٹ نے پوچھا تو اس نے کہا۔ ”میرے بابا کا نام کیرٹ ہے وہ مہا پجاری کے نائب تھے۔“
باقی سب حیران تھے لیکن میں ششدر رہ گیا۔ وہ کیرٹ کی بیٹی سا شامی۔ جب کیرٹ نے اس کا ذکر کیا تو میں سمجھا کہ وہ کوئی نو عمر زیادہ سے زیادہ گیارہ بارہ سال کی لڑکی ہوگی۔ مگر یہ میں نے نہیں سوچا تھا کہ خود جوان نظر آنے والے کیرٹ کی طفل نوجوان لڑکی ہوگی۔ میں نے بے ساختہ

تھی اور اس کی عمر۔ ظاہر انیس میں سے زیادہ نہیں تھی۔ ڈھیلے لباس میں بھی اس کا جسمانی حسن نمایاں تھا۔ میں نے اس کے منہ میں تھوڑا پانی ڈالا جو اس نے پی لیا۔ پھر تھوڑا تھوڑا کر کے اسی طرح خاصا پانی اس کے منہ میں ڈال دیا۔ آخر میں اس کے منہ پر چھینٹے مارے تو وہ ہوش میں آنے لگی اور فوراً ہی اس نے رونے کے انداز میں کراہنا اور کہنا شروع کر دیا۔

”مجھے چھوڑ دو..... میرے بابا کو مت مارو.....“
میرے بابا کو مت مارو۔“

ایسا لگ رہا تھا کہ وہ خواب میں کچھ دیکھ اور رو رہی ہے۔ میں نے تری سے اسے ہلایا اور پھر مستقل ہلاتا رہا حتیٰ کہ وہ چونک کر بیدار ہو گئی۔ مگر اس کے منہ سے سسکیاں بدستور نکل رہی تھیں۔ جب اس کے حواس بحال ہوئے تو مجھے آرگون کی فوجی وردی میں پاس پا کر اس کے منہ سے چیخیں نکلنے لگی تھیں۔ وہ بہت زیادہ خوفزدہ تھی۔ میں نے کچھ کہنے کے بجائے پیچھے ہٹنا زیادہ مناسب سمجھا اور اشارے سے ایرٹ سے کہا۔ ”اسے سمجھاؤ..... ہمارا تعلق آرگون سے نہیں ہے۔“
ایرٹ اور اس کے ساتھی ذرا فاصلے پر تھے۔ ایرٹ نے تری سے کہا۔ ”ڈرو مت ہمارا تعلق آرگون سے نہیں ہے۔ ہم سامیرا کے لوگ ہیں۔“

مگر لڑکی کی آنکھوں میں شک تھا کہ یہ ہم آرگون کی فوجی وردی میں تھے۔ اس نے یقین سے کہا۔ ”تم جھوٹ کہہ رہے ہو تم لوگ آرگون کے درندہ صفت سپاہی ہو۔ تم لوگوں نے میرے بابا کو مارا ہے اور اب مجھے بھی مار دو گے۔“
”غور سے دیکھو ہم وہ لوگ نہیں ہیں۔“ ایرٹ نے اپنے اور ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ لوگ اور تھے جنہوں نے تمہیں باندھ کر رکھا ہوا تھا۔ ہم نے انہیں مار دیا ہے اور تمہیں ان کی قید سے آزاد کرالائے ہیں۔ تم اس وقت بے ہوش تھیں۔“

”تم لوگ دوسرے ہو مجھے تمہارے حوالے کر دیا ہے۔“ لڑکی ماننے کو تیار نہیں تھی اور پوری جرات سے بات کر رہی تھی۔ مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ وہ حوصلے والی تھی۔ اس کی جگہ کوئی دوسری لڑکی ہوتی تو اتنے مردوں کے درمیان ڈر کے مارے اس کی آواز ہی نہ نکلتی۔ میں نے ایرٹ کو اشارے سے اس سے روہیر کے بارے میں پوچھنے کو کہا۔ ایرٹ نے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں کسی روہیر نامی لڑکی کو نہیں جانتی اور نہ ہی میں نے اسے دیکھا ہے۔“
”تب تم کہاں سے ان کے ہاتھ لگیں۔“

کہا۔ ”ساشا۔“ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”تم میرا نام جانتے ہو؟“

میں نے سر ہلایا اور ایرٹ کے توسط سے اسے جواب دیا۔ ”میں ہی وہ شخص ہوں جسے فرار کرانے کی پاداش میں تمہارے باپ کو سزائے موت ہوئی تھی۔“

یہ سنتے ہی اس کی آنکھیں ساٹ ہو گئیں اور اس نے کہا۔ ”تو میرے باپ کے اصل قاتل تم ہی ہو؟“

ایرٹ کی مدد سے اس سے گفتگو کرنا اور خاص طور سے بحث کرنا آسان نہیں تھا اس لیے میں نے یہ کام ایرٹ پر چھوڑ دیا اور خود اٹھ کر ٹیلے کے کنارے تک آیا۔ کیمبن کے بھتے انگاروں سے اب تک پیش اٹھ رہی تھی۔ ایرٹ اس سے کہہ رہا تھا۔ ”تم غلط مت سمجھو، تمہارے باپ نے ایک اچھے مقصد کے لیے جان دی۔ کیا تم اپنے باپ کو غلط سمجھ رہی ہو۔“

ساشا کا چہرہ متغیر ہوا۔ ”نہیں لیکن میرے باپ کو اس شخص کی وجہ سے موت کا سامنا کرنا پڑا۔“

”اب تم احمقانہ بات کر رہی ہو۔“ ایرٹ کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ”کیا اس نے تمہارے باپ سے درخواست کی تھی کہ اس کی مدد کرے۔ تمہارے باپ نے اس کی مدد کی اور وہ اپنے مقصد کے لیے کی، اس وادی میں بسنے والے لوگوں کے لیے کی، جن سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ کیونکہ یہ باہر سے آیا ہے۔“

ساشا نے سر جھکا لیا تھا۔ میں ان کی گفتگو سن رہا تھا اور مجھے لگا کہ یہ لڑکی اپنے خیالات میں پختہ تھی اور اتنی آسانی سے خیال بدلنے والوں میں سے نہیں تھی۔ مجھے اس کے خیالات کی تبدیلی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں تو چاہتا تھا کہ وہ آرگون کے بارے میں معلومات فراہم کرے اور ہو سکے تو ہماری رہنمائی کرے۔ میں واپس آیا اور ایرٹ سے اشاروں میں تبادلہ خیال کیا کہ وہ اس سے اس سلسلے میں بات کرے۔ ایرٹ کسی حد تک میری بات سمجھ گیا اور اس نے ساشا سے آرگون کے بارے میں پوچھنا شروع کیا۔ مگر اس انداز میں کہ ساشا کو محسوس نہ ہو کہ وہ اس سے پوچھ گچھ کر رہا ہے۔ ساشا کے پاس واقعی اہم معلومات تھیں۔ اس نے بتایا کہ شہر کی حفاظتی دستے اور فوج کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔

ایک حصہ جو جنگ لڑنے والے سپاہیوں پر مشتمل تھا وہ اس وقت فیصل کے آس پاس مشقوں میں مصروف تھا۔ باغ اور کھیت میں کام کرنے والے افراد کی حفاظت پر

معمور افراد میں سے بہت بڑی تعداد باقاعدہ فوج میں شامل کر لی گئی تھی اور وہ بھی جنگی مشقیں کر رہے تھے۔ دوسرا حصہ جو زیادہ تربیت یافتہ اور اہل افراد پر مشتمل تھا وہ شاہی محلات اور سرکاری دفاتر کی حفاظت کے لیے تعینات تھا۔ اس وقت آرگون میں کرفیو کی سی کیفیت تھی اور عوام کو بہت کم نقل و حرکت کی اجازت دی جا رہی تھی۔ ان کاراشن اور دوسرا سامان جو پہلے انہیں ملتا تھا اب اچانک نصف کر دیا گیا تھا۔ شہر کی بعض اہم سڑکیں عوام کے لیے بند کر دی گئی تھیں اور لوگ ان شاہراہوں پر قدم بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔ ساشا صرف سوال کرنے پر جواب دیتی تھی۔ جب ایرٹ نے اسے شہر کے اندر پانچ گروپوں کے بارے میں پوچھا تو اس نے معصومیت سے نفی میں سر ہلایا۔

”میں ان کے بارے میں نہیں جانتی۔“ ایرٹ نے میرا سوال آگے کیا۔ ”کیا کیرٹ نے تمہیں اس بارے میں کچھ نہیں بتایا؟“

اس نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں تو، بابا مجھ سے ایسی باتیں نہیں کرتے تھے۔“

”تب تمہیں فوج کے بارے میں معلومات کہاں سے ملیں؟“

”یہ تو میں نے خود دیکھا اور قید خانے کے سپاہی اس بارے میں بات کرتے تھے تو میں سن لیتی تھی۔“

”تمہیں کیوں قید کیا گیا؟“

”کیونکہ میں نے مہا پجاری سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔“

میں دنگ رہ گیا۔ اس بڑھے شرابی فیرون کی نظر اپنے ہی ساتھی کی بیٹی پر تھی۔ مگر ان لوگوں کے نزدیک اخلاقیات فضول اور بیکار چیز تھی۔ وہ صرف اپنے مفاد پر نظر رکھتے تھے۔ ساشا جیسی حسین لڑکی سے وہ کیسے دست بردار ہوتا۔ بلکہ مجھے حیرت تھی کہ اس نے اسے قید کیوں کیا۔ وہ چاہتا تو زبردستی بھی اس سے شادی کر سکتا تھا۔ اتفاق سے ایرٹ نے اس سے یہی سوال کیا۔ ساشا نے اس سوال کا جواب دیا کہ اس کی شادی اس کے باپ کے مرضی سے ہو سکتی تھی اگرچہ ہونی کسی پجاری سے ہی تھی۔ باپ کے مرنے کے بعد پجاری کی بیٹی کی حیثیت سے یہ اختیار اب اس کے پاس آ گیا تھا۔ اس نے فیرون سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا اور قانون کے تحت اسے مجبور نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ فیرون سے شادی کرے۔

اس کے انکار پر ریٹاٹ نے اسے کیرٹ کی سازش

میں شامل ہونے کا الزام لگا کر جیل میں ڈال دیا اور اس پر واضح کیا کہ اسے اسی وقت معافی ملے گی جب وہ فیرون سے شادی پر آمادہ ہو جائے گی۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ اگر اسے اس وجہ سے قید کیا گیا تھا تو اس کی حیثیت ایک معزز قیدی کی سی تھی اور اسے یوں ادباً سپاہیوں کے حوالے کر دینا سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ خاص طور سے اس صورت میں جب کہ مہا پجاری فیرون کی اس پر نظر تھی۔ اسے کسی صورت یہ سزا نہیں دی جاسکتی تھی۔ اس نے انکار کیا تھا مگر اسے قید ہوئے اتنا وقت بھی نہیں ہوا تھا کہ فیرون یا ریٹائرڈ مایوس ہو کر اس قسم کا کوئی قدم اٹھاتے۔ میں نے ایرٹ کے توسط سے یہ سوال کیا تو ساشا نے بھی لاعلمی ظاہر کی کہ اسے نہیں معلوم کہ اسے کیوں ان سپاہیوں کے حوالے کیا گیا تھا جو اسے آرگون سے نکال کر باغات میں لے آئے تھے۔ میں نے پوچھا۔

”تمہیں کس وقت وہاں سے نکالا گیا؟“

”دن کی آخری روشنی میں۔“ اس نے جواب دیا۔

”تم بے ہوش کیسے ہوئیں؟“ میں نے سوال کیا تو اس پر وہ ابھمن میں نظر آئی۔ پھر اس نے جواب دیا۔

”مجھے نہیں یاد ہے۔ بس اتنا یاد ہے کہ قید خانے سے نکال کر مجھے ایک عمارت میں لے جایا گیا تھا اور پھر مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔“

”جب تمہیں ہوش آیا تو تم بہت ڈری سہی ہوئی تھیں جیسے تمہیں خطرہ ہو کہ تمہارے ساتھ برا سلوک ہوگا۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”مجھے لگا کہ جیسے میں وحشیوں کے نرے میں ہوں اور وہ میرے ساتھ برا سلوک کرنے والے ہیں۔“

اس کی کہانی کا یہ والا حصہ مجھے ابھمن میں ڈال رہا تھا۔ جب وہ قید خانے سے نکل کر کسی عمارت تک گئی اور اس کے بعد اسے کچھ یاد نہیں تو اسے ہوش میں آنے پر یوں کیوں لگا جیسے اس کے ساتھ برا سلوک ہونے والا ہے۔ جب کہ اسے عمارت میں جانے کے بعد اس پر کیا گزری اسے بالکل یاد نہیں تھا۔ گفتگو کے دوران وہ گوشت کے کئی ٹکڑے اور پھر تازہ پھل کھا گئی تھی۔ پیٹ بھرنے کا شمار اس کی آنکھوں سے جھلکنے لگا تھا۔ ایرٹ نے اس سے کہا۔ ”اب تم سو جاؤ یہاں تم بالکل محفوظ ہو۔ کل تمہیں سامیرا کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔“

یہ بات ایرٹ نے اپنی طرف سے کہی تھی اس لیے جب ساشا سونے کے لیے لیٹ گئی تو میں نے ایرٹ کو ایک طرف بلایا اور اسے کہا۔ ”یہ ہمارے ساتھ رہے گی۔ ہمیں اس کی ضرورت ہے۔“

اس نے ساشا کی طرف دیکھا۔ ”یہ کمزور لڑکی ہماری

کیا مدد کرے گی؟ اسے روپیہ کی طرح ہتھیار استعمال کرنا بھی نہیں آتے۔“

”یہ آرگون سے اچھی طرح واقف ہے اور ہمیں آرگون میں اس کی مدد کی ضرورت پڑے گی۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”جیسے آپ کہیں۔“

”صبح ہم یہاں سے نکلیں گے اور قلعوں کی طرف جائیں گے پھر تم میں سے ایک دو اندر جا کر ریبک کو لے کر آئیں گے۔ تم ساشا کو بھی لے جاؤ گے اور سامیرا تک میرا ایک پیغام پہنچاؤ گے۔“

ایرٹ جو بات سمجھ جاتا تھا اسے الفاظ میں دوہرا کر مجھ سے پوچھتا تھا اگر بات درست ہوتی تو میں سر ہلاتا ورنہ اشاروں کی مزید مشق کرتا تھا مگر رفتہ رفتہ وہ تقریباً پوری بات سمجھ جاتا تھا۔ کیمین کے انکارے بھی اب سمجھنے والے تھے اور رات کی خلتی نے ٹیلے کی پیش بھی زائل کرنا شروع کر دی تھی اور اب ہم بہتر محسوس کر رہے تھے۔ سب کا سونا مناسب نہیں تھا اس لیے دو دو جاگ کر باری باری پہرہ دیتے رہے۔ میں نے حسب معمول پہلی باری میں پہرہ دیا اور پھر سو گیا تھا۔ صبح آنکھ کھلی تو روشنی ہونے والی تھی کیونکہ اوپر آسمان غائب ہو گیا تھا اور دھند اتر رہی تھی۔ مال غنیمت سے ناشتا کیا گیا اور اس کے بعد ہم وہاں سے روانہ ہوئے۔ ٹیلے سے اتر کر ہم نے پہلے جنوب کا رخ کیا اور پھر مشرق کی طرف مڑ گئے۔ اس طرح ہم آرگون اور سامیرا کے لوگوں کی زمین سے دور تھے۔ ساشا نے خود کو ہمارے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ جو ہم کہتے تھے وہ وہی کرتی تھی۔ روانہ ہونے سے پہلے میں نے ایرٹ کے توسط سے ساشا سے پوچھا۔

”تم شراب یا کوئی نشے والی چیز استعمال کرتی ہو؟“

”میں نے کبھی ایسی کوئی چیز استعمال نہیں کی۔“ اس نے جواب دیا۔

میں نے راستے میں ایرٹ کو سمجھایا کہ اسے جا کر سامیرا سے کیا کہنا تھا اور ساتھ ہی وہ ریبک اور دوسرے تیار ہونے والے نوجوانوں کو لیتا آئے۔ سامیرا کو ہوشیار کرنا تھا کہ قلعوں میں معمولات پر عمل ترک کر دیا جائے اور کسی بھی لمحے آرگون کی طرف سے حملے کے لیے تیار رہا جائے۔ ایرٹ، ساشا، شاٹ اور رائٹوں ہم سے ایک جگہ الگ ہو گئے۔ یہاں سے تینوں قلعوں کی پشت دکھائی دے رہی تھی۔ وہ سامیرا والے قلعے کی طرف روانہ ہوئے اور ہم ایک بلند چٹان پر چڑھ گئے جس پر کسی جانور کے چڑھنے کا امکان کم تھا۔ میں نے ایرٹ کے ہاتھ سامیرا کو اس محلول کا

پیغام بھی بھیجا تھا جسے میں نے سے خطرناک جانور پاس نہیں آتے تھے۔ کیمین میں آتش زدگی کے بعد وہ بھی تباہ ہو گیا تھا یا آرگون کے سپاہی اس کی بوتل لے گئے تھے۔ چنانچہ خالص پتھر کی تھی اور اس پر ذرا بھی مٹی یا نباتات نہیں تھے۔ کیونکہ کرنے کے لیے اور کچھ نہیں تھا اس لیے ہم تینوں ایک مناسب جگہ دیکھ کر آرام کرنے لگے۔

مجھے غور و فکر کا موقع ملا تو گزشتہ روز ہونے والے واقعات مجھے کچھ عجیب سے اور معمول سے ہٹ کر لگے تھے۔ اول آرگون کی طرف سے تمام ہی افراد کو قلعے میں روک لینا۔ مگر دوسری طرف ان کا کوئی دستہ تلاش کرتا ہوا بالآخر ہماری پناہ گاہ تک پہنچ گیا اور اس نے نہ صرف اسے تباہ کر دیا بلکہ روہ کو بھی ساتھ لے گئے۔ اس کے بعد ہم نے ان کا تعاقب شروع کیا اور باغات میں انہیں جا لیا مگر جب ہم نے ان پر حملہ کیا اور سب کو ختم کر دیا تو پتا چلا کہ جسے ہم روہ سمجھ رہے تھے وہ دوسری لڑکی نکلی اور روہ کو سپاہی آرگون لے جا چکے تھے۔ پھر دوسری لڑکی نائب مہا پجاری کیرٹ کی بیٹی ساشا نکلی اور اس کا رویہ بھی عجیب تھا۔ اس نے چھوٹے ہی مجھے اپنے باپ کا قاتل قرار دے دیا اور اب بھی اس کے رویے سے لگ رہا تھا کہ اس نے اپنے خیال میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔

سوال یہ تھا کہ سپاہی اسے کس کی اجازت سے قید خانے سے نکال کر آرگون سے باہر لائے تھے؟ اور قلعے سے باہر لانے سے پہلے اسے کسی اور جگہ لے گئے تھے وہاں ساشا پر کیا گزری تھی؟ اس سارے قصے میں یہی بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ لڑکی نے خود کو ساشا قرار دیا تھا۔ کیا واقعی وہ ساشا تھی یا کوئی اور لڑکی جو خود کو ساشا کے روپ میں پیش کر رہی تھی۔ آرگون میں بیٹھے مکاروں سے کچھ بعید نہیں تھا جن میں مہا مکار ڈیوڈ ساشا بھی موجود تھا۔ وہ اس قسم کے منصوبے بنانے کا ماہر تھا۔ بہر حال اس لڑکی کی حقیقت زیادہ دیر چھپی نہیں رہتی اور میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر یہ کوئی سازش بھی ثابت ہوئی تو میں اس لڑکی کو استعمال کروں گا۔ اس دشت کی سیاحتی میں مجھے بھی اس قسم کی سازشوں کا جواب دینا آ گیا تھا۔ اب مجھے سامیرا کے جواب کا انتظار تھا۔ میں نے ایرٹ سے کہا تھا کہ کوئی جلدی نہیں ہے وہ اپنا کام نمٹا کر ہی واپس آئے یعنی جو جو کام میں نے اس کے ذمے لگائے تھے انہیں بہر صورت انجام دے۔ اب میرے پاس سوائے آرام اور انتظار کرنے کے کوئی کام نہیں تھا۔

دوپہر کو چنوں سے لپیٹ پوجا کی تھی اور اب شام کے

لیے ہمارے پاس زیادہ چیزیں نہیں رہی تھیں لیکن اگر ایرٹ یا ربیک نہ آتے تب بھی گزارا ہو جاتا۔ ہم پانی کے کئی مشکینز لے آئے تھے اس لیے پانی کی کوئی کمی نہیں تھی۔ یہ کئی دن کے لیے بھی کافی ہو سکتا تھا۔ ایما اور مارٹ آپس میں گپ شپ کر رہے تھے اور میں ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ مارٹ کہہ رہا تھا کہ اگر وہ اس جنگ میں زندہ رہا تو پھر اس کی شادی ہو جائے گی۔ اس نے لڑکی پسند کر لی تھی۔ ایما کو شادی کا خاص شوق نہیں تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ فوج میں اوپر جائے اور اعلیٰ عہدہ حاصل کرے۔ شادی اور گھر بسانے جیسے معاملے بعد میں بھی دیکھے جاسکتے تھے۔ مزے کی بات تھی کہ مارٹ جس لڑکی کو پسند کرتا تھا وہ ایما کی بہن تھی۔

مگر بہن کے ہاں اس معاملے میں جذباتی ہونے کا رواج نہیں تھا۔ وہ اسے ایک فطری چیز سمجھتے تھے کہ کوئی ان کی بہن یا بیٹی کو پسند کرے یا وہ کسی کو پسند کرے۔ اسے یہاں غیرت کا مسئلہ نہیں بنایا جاتا تھا مگر ساتھ ہی وہ مرد اور عورت کے غیر قانونی تعلق کے بارے میں بہت حساس تھے۔ اس کا اندازہ میرے کیس سے لگایا جاسکتا تھا کہ میں ان کے لیے کتنا ضروری تھا مگر انہوں نے مجھے سزا سنا کر بلا تکلف اس پر عمل درآمد بھی کر دیا۔ اعلیٰ طبقہ جس میں سکمران اور پجاری شامل تھے۔ وہ بھی صرف اپنے حرم اور مخصوص کی ہوئی عورتوں سے جسمانی تعلق قائم کر سکتے تھے۔ یہاں ایک مرد کو ایک شادی کی اجازت تھی۔ جب تک اس کی پہلی بیوی زندہ رہتی یا ان کے درمیان علیحدگی نہیں ہو جاتی مرد دوسری شادی نہیں کر سکتا تھا۔ حرم کے لیے عورتیں حاصل کرنے کا ایک طریقہ کار تھا اور کسی سے زبردستی نہیں کی جاتی تھی مگر کچھ عرصے سے اس قانون پر عمل نہیں ہو رہا تھا۔ ہمارے سامنے مثالیں تھیں کہ آرگون میں سپاہ اور اوپری طبقے کو کھلی چھوٹ دے دی گئی تھی۔

سامیرا کے قلعوں میں ان قوانین پر جو مرد و عورت کے تعلق کو واضح کرتے تھے بہت سختی سے عمل کیا جاتا تھا۔ دیکھا جائے تو یہ اچھی بات تھی۔ ورنہ یہ مختصر سا معاشرہ بے راہ روی کے ہاتھوں آسانی سے تباہ ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ ہماری دنیا میں بعض افریقی ملک ہو رہے ہیں۔ جہاں بیس فیصد سے بھی زیادہ آبادی ایڈز جیسے مہلک اور جان لیوا مرض کا شکار ہو چکی ہے اور اس کی وجہ بے راہ روی ہی ہے۔ آرام اور سوچ بچار میں شام ہوئی اور پھر رات آگئی۔ ہم نے ایک مشعل جلائی تھی مگر اس کی روشنی کو اس طرح محدود کیا

کہ وہ دور سے نظر نہ آئے اور ہم تاریکی میں نہ رہیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ایرٹ کو دیر ہو رہی تھی اور شاید وہ اب صبح ہی آتا۔ ہم تینوں نے ہچی ہچی اشیا سے ڈنر کیا۔ پیٹ تو نہیں بھرا مگر گزارا ہو گیا تھا۔ میں نے ایما سے کہا۔ ”رات کو پہرہ دینا ہے کوئی ایک فرد جاگتا رہے۔“

”پہلے میں جاگتا ہوں۔“ ایما نے پیش کش کی تو میں اور مارٹ لیٹ گئے۔ سخت چٹان کے باوجود مجھے نیند آگئی تھی۔ کچھ عرصے سے سخت جگہوں پر سونے کی عادت پڑ گئی تھی۔ ایما کے بعد مارٹ نے پہرہ دیا اور صبح کے قریب اس نے مجھے جگا دیا۔ ابھی آسمان پر ستارے تھے اور دور کہیں چاند بھی تھا مگر اس کی روشنی وادی تک رسائی سے قاصر تھی۔ مجھے حاجت ہو رہی تھی میں چٹان سے نیچے آیا اور فارغ ہو کر دوبارہ اوپر کا رخ کیا۔ میرا اندازہ تھا کہ میں چھ گھنٹے سویا تھا اور اتنی نیند کافی تھی میں خود کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ کسی قدر پانی سے میں نے منہ دھویا اور پھر ہلکی ایکسرسائز کرنے لگا۔ اسی دوران میں اور روشنی نمودار ہونے لگی تھی مگر یہ روشنی ابھی وادی سے دور تھی۔ مزید ایک گھنٹے بعد ستارے عائب ہونا شروع ہوئے یعنی اوپری حصے میں دھند چھا رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں صبح کے نزدیک تاریکی زیادہ ہو جاتی تھی اور جب اوپر سورج نکل آتا تب نیچے روشنی ہوتی تھی۔

میرے جاگنے کے تقریباً دو گھنٹے بعد جب کہ ماحول ابھی تاریک تھا قلعوں کی طرف سے مجھے کچھ ہلکی روشنیاں حرکت کرتی دکھائی دیں۔ تقریباً ڈیڑھ میل دور قلعوں کی روشنیاں تو صاف دکھائی دے رہی تھیں مگر ان کے آس پاس ابھی تاریکی تھی۔ وہ روشنیاں اسی تاریکی میں حرکت کر رہی تھیں۔ میں چوکس ہو گیا مگر ان دونوں کو نہیں اٹھایا۔ چندرہ میں منٹ بعد روشنیاں پاس آگئیں۔ یہ کوئی دس گیارہ افراد تھے۔ ان میں سے چار نے مشعلیں اٹھا رکھی تھیں اور باقیوں کے پاس دوسرا سامان تھا جو انہوں نے بڑے تھیلوں کی صورت میں اپنے شانے پر لاد رکھا تھا۔ جب ایرٹ اور دوسرے قلعوں کی طرف روانہ ہوئے تھے تو انہوں نے آرگون کے فوجی لباس اتار کر اپنے لباس پہن لیے تھے۔ آنے والوں میں ان چاروں کے علاوہ ربیک اور چھ دیگر نوجوان تھے۔ ان کے نزدیک آنے پر میں نیچے اتر آیا۔ ربیک گرم جوشی سے میرے سینے سے لگا اور بولا۔ ”اب میں آپ کی بات سمجھ سکتا ہوں۔“

”سامیرا نے تمہارے ساتھ بھی وہی عمل کیا؟“ میں

نے حیرت اور خوشی سے پوچھا۔

”صرف میرے ساتھ ہی نہیں ایرٹ اور ساشا کے ساتھ بھی کیا۔ اب ہم تینوں آپ کی زبان سمجھ سکتے ہیں۔“ ساشا ان کے ساتھ تھی اور ایک طرف خاموش کھڑی تھی۔ میں ربیک اور ایرٹ کو ایک طرف لے گیا اور دھیسے لہجے میں پوچھا۔ ”سامیرا اس کے بارے میں کیا کہتی ہے؟“

”یہی ساشا ہے۔“ ایرٹ نے جواب دیا۔

”لیکن سامیرا نے پیغام دیا ہے کہ آپ اس سے محتاط رہیں۔“ ربیک نے کہا۔

”آپ کے پیغامات سامیرا تک پہنچا دیئے ہیں اور انہوں نے کہا کہ آپ کی ہدایت پر پورا عمل ہوگا۔“ ایرٹ نے بتایا۔ ہم چٹان کے اوپر آئے۔ میں نے ایرٹ کے توسط سے جو پیغامات بھجوائے تھے۔ ان میں اس شخص کی تلاش بھی شامل تھی جو روبیر سے قید خانے میں لایا گیا اور اس نے اسے شامین کی دھمکی دے کر اقبال جرم کرنے اور اس میں مجھے ملوث کرنے کو کہا تھا۔ پہلے مجھے اس کا خیال نہیں آیا تھا کہ اس شخص کو تلاش کرانا چاہیے اگرچہ ربیک کی مدد سے سامیرا کو ساری کہانی بتا دی تھی کہ روبیر کو کس طرح مجبور کیا گیا۔ مگر روبیر کے عائب بلکہ اغوا ہونے کے بعد اس شخص کی تلاش لازم ہو گئی تھی۔ وہ ہماری رہنمائی کر سکتا تھا کہ روبیر کو کیوں اغوا کیا گیا ہے اور ساشا کو ہم تک پہنچانے کے پیچھے کیا کہانی ہو سکتی ہے؟ سب سے بڑھ کر اس سے ہمیں آرگون کے اندر کے راز معلوم ہو سکتے تھے۔

ربیک اور ایرٹ کے ہم زبان ہونے سے مجھے خوشی ہوئی تھی کہ ابلاغ کا بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ ورنہ انہیں اپنی بات سمجھانے کے لیے مجھے اچھی خاصی ورزش کرنا پڑتی تھی۔ وہ دونوں ہی ذہین نوجوان تھے۔ میں ان سے اپنی بات کر سکتا تھا۔ میں نے صرف ساشا کے لیے کہا تھا کہ سامیرا اسے میری بات سمجھنے کے قابل بنا دے مگر اس نے ایرٹ اور ربیک کو اس قابل بنا کر میرا کام بہت آسان کر دیا تھا۔ میں نے روبیر کے اغوا اور ساشا کے ملنے کے بارے میں انہیں اپنے تاثرات سے آگاہ کیا۔ وہ حیران ہوئے تھے۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ ایرٹ نے کہا۔ ”یہ بات میرے ذہن میں نہیں آتی۔“

”یہ آرگون کی اہم ترین قیدی تھی۔“ میں نے ذرا دور بیٹھی ساشا کی طرف دیکھا۔ ”لیکن سپاہی اسے کسی عام لڑکی کی طرح قید خانے سے نکال کر اپنے ساتھ شہر سے باہر لے آئے۔ کیا یہ بات منکوک نہیں ہے؟“

قوتِ حافظہ

میں کبھی قوی حافظے کا مالک نہیں رہا اور اب تو یہ عالم ہو گیا ہے کہ رات کو کیا چیز کھائی تھی۔ صبح کو یہ بھی یاد نہیں رہتا۔ کئی مہینے کی بات ہے کہ تاروں کی چھاؤں میں ٹہلنے لگلا۔ واپسی پر اپنے گھر کا راستہ بھول گیا۔ وہ تو ایک میرے ہم عمر ٹہلتے مل گئے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ یہیں کہیں برساتی نالے کے کنارے جو ایک گنبد والا مکان ہے کیا آپ اس کا راستہ بتا سکتے ہیں؟ انہوں نے کہا۔ ”کیا آپ جوش صاحب کے مکان جانا چاہتے ہیں؟“ میں نے کہا۔ ”جی ہاں۔“ اور ان نیک مرد نے مجھ کو میرے گھر تک پہنچا دیا اور رخصت ہوتے ہوئے انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”آج سے چالیس بیالیس برس پیسٹر میں نے جوش صاحب کو آگرے میں دیکھا تھا۔ میرا نام نصیر احمد ہے۔ جوش صاحب سے میرا سلام کہہ دیجیے گا۔“ اور میں نے فرط شرم سے یہ نہیں بتایا کہ میں ہی جوش ہوں اور تو اور آپ کو مشکل سے یقین آئے گا کہ ایک روز خط لکھنے کے بعد جب دستخط کی نوبت آئی تو اپنا تخلص بھول گیا۔ چند سیکنڈ تک مجھ پر عجیب کرب کی کیفیت طاری رہی۔ دل دھڑ دھڑ کرنے لگا اور اگر دو چار سیکنڈ کے اندر اپنا تخلص یاد نہ آجاتا تو یقین فرمائیے میرا دم نکل جاتا۔ میں نے یہ بات اسی واسطے لکھ دی ہے کہ اگر میری زندگی کے کسی واقعے میں کمی بیشی یا تغیر و تاخیر نظر آئے تو آپ اسے میرا ارادی فعل نہ سمجھیں اور میری حالت پر ترس کھا کر اسے معاف کر دیں۔

(جوش بیچ آبادی کی ”یادوں کی برات“ سے اقتباس)
مرسلہ: منشی محمد عزیز مئے۔ لڈن و ہاڑی

”بالکل مشکوک ہے۔“ ربیک نے کہا۔ ”مگر سامیرا نے تصدیق کی ہے یہی ساشا ہے کیرٹ کی بیٹی۔“
”اس میں مجھے بھی شبہ نہیں ہے مگر اس نے آتے ہی مجھے اپنے باپ کا قاتل قرار دیا۔ اس سے لگتا ہے کہ اس کے دل میں میرے خلاف کچھ نہ کچھ ہے۔“

”شہباز ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ ایرٹ بولا۔ ”میں نے اس سے جو گفتگو کی ہے مجھے بھی لگ رہا ہے یہ شہباز کے خلاف اپنے دل میں عناد چھپائے ہوئے ہے۔“
ربیک فکر مند ہو گیا۔ ”اس صورت میں اسے اپنے ساتھ رکھنا خطرناک ہو سکتا ہے۔“
”ہم اسے قلعے میں چھوڑ سکتے ہیں۔“ ایرٹ نے تجویز پیش کی۔

”نہیں ہم اسے اپنے ساتھ رکھیں گے۔“ میں نے انکار کیا۔ ”میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ میرے دشمن اسے کس طرح میرے خلاف استعمال کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ میں ان کی چالیں اپنی ہی پرالٹ دوں۔“
”وہ کیسے جناب؟“ ربیک نے پوچھا۔

”یہ آنے والا وقت بتائے گا۔“ میں نے روشنی تیز ہوتے دیکھی تو کھڑا ہو گیا۔ ”ہمیں یہاں سے جانا ہوگا۔ باقی باتیں راستے میں ہوں گی۔“

ہم نیلے سے اترے اور وادی کے مغربی حصے کی طرف روانہ ہو گئے۔ نیلے کی طرف جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر ساشا نہ نکلتی تو میں روہیر کی گم شدگی اور ہمارے ٹھکانے کی تباہی کو اتفاق سمجھتا مگر اب وہاں کا رخ کرنا دشمن کے کسی جال میں پھنسنے کے مترادف بھی ہو سکتا تھا۔ ہمیں اس سے ہٹ کر کوئی اور ٹھکانہ تلاش کرنا تھا۔ میرے ذہن میں ایک جگہ تھی۔ روشنی تیز ہوئی تو ہم نے ایک جگہ رک کر ناشا کیا۔ ربیک اپنے ساتھ وافر مقدار میں کھانے پینے کا سامان لایا تھا۔ سامیرا نے اس کے ہاتھ اس مخلول کی خاصی مقدار بھیجی تھی جس کی بو جانوروں کو ہم سے دور رکھتی تھی۔ دو گھنٹے بعد ہم نیلے کے عقب سے ہوتے ہوئے اندر جنگل میں جانے لگے۔ میں نے کوشش کی تھی کہ نیلے سے دور سے گزروں مگر ساتھ ہی وہ نظر میں بھی رہے کیونکہ اسی کی مدد سے میں اس جگہ پہنچتا۔ جنگل میں آتے ہی سب نے ہتھیار سنبھال لیے تھے۔

ربیک جن سپاہیوں کو ساتھ لایا۔ وہ سب مضبوط صحت مند اور تومند نوجوان تھے۔ ان کے سخت ابھرے ہوئے مسلز ان کی سخت جانی کی گواہی دے رہے تھے۔ ان میں سے دو

میرا خیال تھا کہ میری کوشش ناکام نہیں رہے گی۔ ایک بار کوئی ایک فرد بھی اوپر پہنچ جاتا تو باقیوں کے لیے کام آسان ہو جاتا کیونکہ ہم کام آسان کرنے والی چیز یعنی رسی اور لکڑی سے بنی ہوئی سٹرھیاں ساتھ لائے تھے۔ چٹان کوئی سترفٹ بلند اور اس کا گھیرا کوئی سو سے ڈیڑھ سو گز بیضوی قطر کا تھا۔ میں نے ربیک سے کہا۔

”ہمیں اس پر چڑھنا ہے۔“

ایرٹ نے کہا۔ ”میں یہ کام کر لوں گا۔“

اس نے اپنا سامان اتارا اور رسی کا ایک لپھالے کر چٹان پر چڑھنے کے لیے مناسب جگہ تلاش کرنے لگا۔ چٹان تقریباً سیدھی اور اس کی دیواریں مسطح تھیں۔ ان میں رخنے بہت کم تھے مگر ربیک نے ایک جگہ تلاش کر لی جہاں سے وہ اوپر چڑھ سکتا تھا اور اس نے چڑھنا شروع کر دیا۔ وہ خالی ہاتھ اور پاؤں استعمال کر رہا تھا اس نے اپنا چرمی جوتا بھی اتار دیا تھا۔ تقریباً پچاس فٹ کے بعد ایک جگہ ہاتھ یا پاؤں جھانسنے کے لیے کوئی جگہ نظر نہیں آئی۔ سوائے بالکل ٹاپ کے ایک پتھرے ہوئے پتھر کے اور ربیک اپنا جسم ٹٹولنے لگا۔ میں، ایرٹ اور دوسرے نیچے موجودا سے دیکھ رہے تھے۔ ہم تیار تھے کہ وہ لرے تو زمین کے بجائے وہ ہمارے ہاتھوں میں آئے اور شدید چوٹ سے محفوظ رہے۔ مجھے یہ خطرناک لگا تھا اور میں نے نیچے سے کہا۔ ”ربیک احتیاط سے۔“

مگر اس نے کوشش کی جہاں اس کے پاؤں جھے ہوئے تھے اس نے وہاں سے خود کو پوری قوت سے اوپر اچھالا اور اس کا ہاتھ پتھر تک پہنچا مگر اس پر جم نہ سکا۔ ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ وہ نیچے آیا اور ہم سب تیار تھے ہمارے ہاتھ ایک دائرے کی صورت میں پھیلے تھے اور وہ اس دائرے پر گرا۔ جھٹکے سے سب کے ہاتھ نیچے گئے اور ربیک پھر زمین پر گرا۔ مگر ہاتھوں نے اس کی گرنے کی رفتار کو اتنا کم کر دیا تھا کہ وہ زمین پر گرا تو کوئی خاص چوٹ نہیں آئی اور وہ کپڑے جھاڑتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ اسے معمولی سی چوٹیں آئی تھیں۔ البتہ ہم سب اپنے ہاتھ سہلا رہے تھے جن کو جھٹکا آیا تھا۔ ربیک نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”میں ناکام رہا۔“

”کوئی بات نہیں تم نے کوشش پوری کی اور اوپر تک پہنچ بھی گئے تھے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ اسی لمحے ایرٹ نے حیرت سے کہا۔

”ارے اسے دیکھنا۔“

تب ہم نے دیکھا کہ ساشا چٹان پر چڑھ رہی تھی۔

پتھر کے بھاری ہتھوڑے ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا جانتے تھے۔ ایک رسی کے سرے پر بندھا بھاری پتھر گھما کر مارنے کا ماہر تھے اور باقی تین عام لڑاکے تھے مگر وہ بھی تیر اندازی اور نیزے بازی کے ماہر تھے۔ اب ہم سب مل کر تیرہ جنگجو تھے اور ساشا آخری فرد بھی مگر وہ لڑتا نہیں جانتی تھی۔ نیلے کے پیچھے سے ہو کر ہم گھنے جنگل میں داخل ہوئے تو میں شمال کی طرف مڑ گیا۔ یہاں درخت اتنے اونچے اور گھنے تھے کہ روشنی بہ مشکل ہی نیچے تک آرہی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ یہاں سبزے میں ہونے والا فوٹوسین تھیس کا عمل بہت اعلیٰ درجے کا ہوگا ورنہ بنا دھوپ کے اتنا زیادہ سبزہ ہونا ممکن نہیں تھا۔

یورپ اور کینیڈا کے وہ خطے جہاں سال کے بیشتر وقت آسمان پر بادل رہتے ہیں۔ ان خطوں میں پائی جانی والی نباتات کو بھی اعلیٰ درجے کے فوٹوسین تھیس کے عمل سے کام لینا پڑتا ہے۔ مگر باقی دنیا میں پائے جانے والے پودوں اور درختوں کو پھر بھی سورج کی روشنی ملتی ہے مگر ان پودوں اور درختوں کو یہ روشنی بالکل نہیں ملتی تھی۔ اس کے باوجود یہاں سبزے کی بجائے نیلے سبز رنگ کا ہر شے یہاں موجود تھا۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ جنگل میں سفر بالکل خاموشی سے ہونا ہے۔ اس لیے سب خاموشی سے سفر کر رہے تھے اور کوئی آپس میں بات نہیں کر رہا تھا۔ ساشا اور میان میں بھی اور وہ صبح سے اب تک یوں لالچ بنی ہوئی تھی جیسے ہماری قیدی ہو اور مجبوراً ہمارے ساتھ آئی ہو۔ اس نے مجھ سے یا کسی سے بھی بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ہم میں سے بھی کسی نے اسے مخاطب نہیں کیا تھا اور جب سے میں نے مخاطب رہنے کو کہا تھا تو ربیک اور ایرٹ بھی اس سے دور تھے۔ مجھے یہ بات درست نہیں لگی۔

یہاں چپ رہنے کی مجبوری تھی مگر میں نے سوچ لیا کہ جب ہم محفوظ جگہ پہنچ جائیں گے تو میں ایرٹ اور ربیک کی ڈیوٹی لگا دوں گا کہ وہ اس سے بات کریں اور اسے بات کرنے پر مجبور کریں۔ آدمی کے اندر کیا ہوتا ہے۔ اس کا پتا اس کے عمل یا زبان سے چلتا ہے۔ عمل سے پتا چلنے کی صورت میں دیر ہو چکی ہے۔ زبان سے آدمی قبل از وقت بھی ہوشیار ہو سکتا ہے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم اس چٹان تک پہنچ گئے جو پہ ظاہر چڑھائی کے قابل نہیں تھی اور اس کے ساتھ ہی وہ بڑا سا کھائی نما کٹواں تھا جس کی گہرائی نامعلوم تھی۔ میں نے یہ سفر رات میں کیا تھا اور چٹان بھی رات میں دیکھی تھی۔ پھر اس پر چڑھنے کی کوشش روہر نے کی تھی اور ناکام رہی تھی

اس نے ایک اور راستہ اختیار کیا تھا۔ یہ زیادہ مشکل تھا کیونکہ اس میں ہاتھ پاؤں جمانے کی جگہیں نہیں تھیں مگر اس کی دیوار کسی قدر کھردری اور زیادہ تر چھٹی تھی۔ ساشا کسی چھپکلی کی طرح اس پر چاروں ہاتھوں پاؤں جھاتی اور جا رہی تھی۔ اسے چھریوں سے جسم اور ہلکے وزن کا فائدہ بھی تھا۔ اس جگہ کا پہلا چالیس فٹ کا مرحلہ دشوار تھا اس کے بعد یہ اوپری حصے میں زیادہ ڈھلان ہو جاتی اور اس ترکیب سے اس پر چڑھنا آسان ہو جاتا۔ اب ہم سب اس جگہ کے نیچے جمع تھے کہ ساشا کے کرنے کی صورت میں اسے بچا سکیں۔ مگر وہ نہایت مہارت سے منٹوں میں چٹان کے آخری حصے میں پہنچ گئی اور اب وہاں چٹان سے بالکل چپک کر سست روی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ ہماری نظریں اس پر مرکوز تھیں۔ ڈھیلے اور مشکل لباس میں اس نے یہ کام اس طرح کیا تھا جیسے وہ اس کی عادی ہو۔

پھر اس نے یہ آخری مرحلہ بھی عبور کر لیا اور چٹان کے اوپر چڑھ گئی۔ چند لمحوں بعد اس نے رسی نیچے پھینکی۔ رسی کے سہارے اوپر گیا اور اس نے رسی اور لکڑی سے بنی ہوئی رسی نیچے پھینکی۔ ہم ایک ایک کر کے سامان سمیت اوپر جانے لگے اور چندرہ منٹ بعد سب ہی چٹان کے اوپر تھے۔ چٹان اوپر سے نہ صرف ہموار تھی بلکہ بعض جگہوں سے کنارے ابھرے ہوئے تھے۔ اس کے وسط میں پیالہ نما نشیب تھا جس میں گزشتہ بارش کا کافی زدہ پانی جما ہوا تھا۔ مگر چٹان پر کہیں بھی سبزہ نہیں تھا یہ مکمل سنگی چٹان تھی اور اوپر سے ہموار ہونے کے باوجود اس پر نہ تو مٹی جھی اور نہ ہی سبزے نے جڑ پکڑی تھی۔ اصل میں یہ چٹان چٹانوں کے سلسلے کا آغاز تھی اور یہاں نباتات اور مٹی نہ ہونے کے برابر تھی اسی وجہ سے چٹان مٹی اور پودوں سے محروم تھی۔ اس کا ایک حصہ گہرے کنویں کے بالکل ساتھ لگتا تھا اور ساشا اس وقت اسی کنویں میں جھانک رہی تھی۔ میں اس کے پاس چلا آیا۔

”تم نے کمال کر دیا۔“

اس نے سرسری سے انداز میں میری طرف دیکھا۔ ”مجھے بچپن سے شوق تھا، میں بابا کے ساتھ آرگون سے باہر جاتی تھی اور چٹانوں پر چڑھتی تھی۔“

میں نے بھی سرسری سے انداز میں پوچھا۔ ”تمہیں ہتھیار چلانا آتے ہیں۔“

اس نے عجیب لہجے میں جواب دیا۔ ”اگر انسان کسی کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لے تو ضروری نہیں ہے اسے ہتھیار چلانے آتے ہوں۔“

میں نے اپنا لہجہ بدستور سرسری رکھا۔ ”ایک ایسا شخص جسے ہتھیار چلانے نہیں آتے اگر وہ کسی کے قتل کا فیصلہ کرتا ہے تو لازمی اس کے پیچھے کوئی بہت بڑی وجہ ہونی چاہیے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے آدمی کس وجہ سے کسی کو قتل کر سکتا ہے؟“

”اگر دوسرے نے آپ کے کسی عزیز کو قتل کیا ہو یا خود آپ کی جان کے لیے خطرہ بن گیا ہو۔“

وہ جب مجھے دیکھتی اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا سپاٹ پن آ جاتا تھا۔ اس وقت بھی اس کی آنکھیں سپاٹ تھیں۔ وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی پھر جھٹکے سے مڑ کر وہاں سے چلی گئی۔ میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ یہ لڑکی وہ نہیں تھی جو بہ ظاہر نظر آتی تھی۔ سوچتے ہوئے میں نے کنویں میں جھانکا۔ اس وقت دو پہر تھی اور سورج کو وادی کے عین اوپر ہونا چاہیے تھا۔ وادی میں سب سے زیادہ روشنی اسی وقت ہوتی ہے مگر یہ روشنی بھی کنویں کی تہ تک پہنچنے سے قاصر تھی۔ چٹان پر کچھ پتھر پڑے تھے میں نے ایک پتھر اٹھا کر کنویں میں اتار دیا اور میں حیران رہ گیا جب مجھے اس کے گرنے کی آواز بھی نہیں آئی۔ کنواں... اتنا گہرا تھا کہ اس میں اتنی بلندی سے گرنے والے پتھر کی آواز تک باہر نہیں آ سکتی۔ حالانکہ کئی کلوگرام وزنی پتھر حصے دھماکے سے تہ سے ٹکرایا ہوگا۔ مگر فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ آواز اسے طے کر کے یہاں ہماری سماعتوں تک نہیں آ سکتی تھی۔

”میں نے یہاں ہمارے قلعوں سے بہت فاصلے پر ہے۔“

”مگر ہمیں جس جگہ جانا ہے اس سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔“

”ہمیں کہاں جانا ہے؟“

”جلد میں بتاؤں گا مگر فی الحال اس کے بارے میں مت پوچھو۔“

”مجھے روہر کا خیال آ رہا ہے اسے لے جانے والے درندے لوگ ہیں اور وہ اس کے ساتھ بدترین سلوک کر سکتے ہیں۔“

”ہمیں ذہنی طور پر اس کے لیے تیار رہنا چاہیے۔“

میں نے جیسے لہجے میں کہا۔ ”صرف روہر نہیں اس وقت آرگون کے بے شمار لوگ اور خاص طور سے عورتیں ان کے ظلم کا شکار ہیں۔ ہم روہر کے لیے کچھ نہیں کر سکتے مگر ان تمام مظلوم لوگوں کے لیے یقیناً کر سکتے ہیں جو ریٹاٹ اور اس کے گرووں کے چنگل میں پھنسے ہوئے ہیں۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

اکتوبر 2015ء

197

ماہنامہ سرگزشت

READING
Section

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

ہمیں صرف ایک روپہ کی بجائے ان تمام لوگوں کا سوچنا چاہیے۔“

”ان لوگوں کے بارے میں بتاؤ کیا تمہیں ان پر مکمل اعتماد ہے؟“ میں نے نئے آنے والوں کی طرف اشارہ کیا۔
”انہیں سامیرا نے چنا ہے اور انہوں نے ان کے ساتھ کچھ کیا بھی تھا۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے کہا کہ اب میں ان پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کر سکتا ہوں۔“

ریبک نے بتایا کہ سامیرا ہر نوجوان کو کچھ دیر سامنے بٹھا کر اس کی دونوں کنپٹیوں پر اپنے ہاتھ جما کر اور آنکھیں بند کر کے بیٹھی رہی تھی۔ شاید وہ ان کے ذہنوں کو جانچ رہی تھی۔ میں نے اسے یاد دلایا۔ ”لیکن ساشا سے محتاط رہنے کو کہا ہے۔“

”اب مجھے لگ رہا ہے سامیرا نے ٹھیک کہا ہے۔ ہم اسے عام سی لڑکی سمجھ رہے تھے اور یہ کئی آسانی سے چٹان پر چڑھ گئی۔“

”ممکن ہے یہ ہتھیار استعمال کرنا جانتی ہو اس لیے سب اپنے ہتھیاروں کے معاملے میں محتاط رہیں۔“
”میں سب سے کہہ دوں گا۔“ ریبک بولا۔

لکڑی کی سیڑھی سے چٹان پر چڑھنا اور اترنا بہت آسان ہو گیا تھا۔ یہ خاص طور سے اور بہت صفائی سے تیار کی ہوئی سیڑھیاں تھیں۔ ہمارے پاس ان کی تعداد تین تھی اور ہر سیڑھی کی لمبائی سو فٹ کے لگ بھگ تھی۔ مگر فی الحال ریبک نے ایک ہی سیڑھی لگائی تھی۔ یہ وقت ضرورت ہم مزید لگا سکتے تھے۔ کھانا کھا کر میں نیچے آیا۔ یہاں پانی کا منبع نظر نہیں آ رہا تھا اور ہمیں جلد یا بدیر پانی کی ضرورت پڑ جانی۔ اس وقت تو ہمارے پاس خاصی مقدار میں موجود تھا۔ میں چٹان کے دوسری طرف بڑھا۔ مجھے یاد تھا کہ یہاں اوپر وادی کی دیوار سے آبشار گر رہی تھی اور اس کا پانی یقیناً یہاں کسی جمیل یا ندی کی صورت میں رواں ہوتا۔ مگر سامنے بلند چٹانیں ہونے کی وجہ سے اب وہ آبشار نظر نہیں آ رہی تھی جو فاصلے سے بالکل صاف دکھائی دیتی تھی۔ میں چٹان سے دور ہوا تو مجھے بلند چٹانوں کے عقب میں اڑتا ہوا پانی کا بھاپ نما بادل دکھائی دیا تھا۔

یہ جگہ ہماری چٹان سے کوئی نصف کلومیٹر کے فاصلے پر تھی اور میں اتنی دور اکیلے نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے ایرٹ اور ایمار کو نیچے بلا یا اور ہم اس طرف روانہ ہوئے۔ سبزے نے پانی کی موجودگی کا اشارہ کیا اور بالآخر ہم اس چھوٹے سے دریا نما ندی تک پہنچے میں کامیاب

رہے۔ اس میں پانی بہت شوریدہ اور جھاگ والا تھا۔ اس کی قوت اتنی تھی کہ اس میں تیراکی یا نہانے کا سوچا نہیں جاسکتا تھا۔ اس لیے ہم نے اپنے کرتے اتار کر کنارے سے پانی لے کر خود کو دھویا اور صاف کیا۔ ایک دوسرے کی موجودگی میں ہم پا جاسکتے تھے ورنہ غسل مکمل کر لیتے۔ بہر حال اب... طبیعت بہت تازہ ہو گئی تھی۔ پانی بہت سرد تھا مگر اس میں زندگی تھی۔ یہ جگہ دور تھی مگر بہت دور بھی نہیں تھی۔ نہادھو کر ہم خوش خوش واپسی کے لیے روانہ ہوئے۔

میں نے خالی ہونے والے مشکیزے منگوا لیے تھے ہم نے وہ بھی بھر لیے اور چٹان کے پاس پہنچے تھے کہ اوپر سے ریبک نمودار ہوا اور اشارے سے ہمیں تیزی سے اوپر آنے کو کہا۔ ساتھ ہی اس نے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ میں نے ایرٹ اور ایمار کو اوپر جانے کو کہا اور جب تک وہ چڑھتے رہے میں آس پاس کا جائزہ لیتا رہا مگر مجھے کوئی خطرہ نظر نہیں آیا تھا۔ مگر ریبک اور دوسرے لوگ اوپر تھے اور وہ دور تک دیکھ سکتے تھے۔ انہوں نے یقیناً کسی خطرے کو اس طرف آتے دیکھ لیا تھا۔ جیسے ہی سب سے آگے جانے والے ایرٹ نے چٹان پر قدم رکھا میں بھی چڑھنے لگا۔ سیڑھی دو افراد کا بوجھ آسانی سے برداشت کر سکتی تھی مگر تین افراد کا بوجھ بالکل مناسب نہیں تھا۔ میں درمیان میں تھا کہ ایمار بھی اوپر پہنچ گیا اور ایک منٹ بعد میں بھی اوپر آ گیا۔ میرے پوچھنے سے پہلے ریبک نے دور شمال مشرقی جنگل کی طرف اشارہ کیا۔

”وہ دیکھیں کچھ ہارن اسی طرف آرہے ہیں۔“
میں نے دیکھا تو آنے والے ہارن ابھی دور تھے اور ان کی تعداد بھی واضح نہیں تھی مگر وہ کم سے کم نصف درجن ضرور تھے۔ وہ تقریباً چلنے کی رفتار سے اسی طرف آرہے تھے۔ لیکن ان کی چہل قدمی کی رفتار بھی خاصی تیز ہوتی ہے۔ انہیں دیکھ کر میرے جسم میں سنسنی کی لہری دوڑ گئی۔ کیا ہارن نے ہماری پناہ گاہ جان لی تھی؟ اگرچہ یہاں ہم محفوظ تھے۔ کیونکہ وہ اس پر کسی صورت نہیں چڑھ سکتے تھے۔ مگر اس چٹان پر محصور ہونے کی صورت میں جلد یا بدیر ہمیں خوراک اور پانی کی قلت کا سامنا کرنا پڑتا۔ ایرٹ نے میرے اوپر آنے کے بعد سیڑھی بھی کھینچ لی تھی اور میری ہدایت پر سب سے کہہ دیا تھا کہ وہ چٹان کے کنارے جانے سے گریز کریں اور کوئی آواز نہ نکالیں جس سے ہارن کو یہاں ہماری موجودگی کا پتا چلے۔ پھر اس نے مجھ سے کہا۔ ”آپ بروقت آئے اگر کچھ دیر اور ہو جاتی تو آپ اوپر نہیں آسکتے تھے۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا کیونکہ ہارن بے شک معمولی رفتار سے آرہے تھے مگر یہ رفتار پھر بھی خاصی تھی اور اب وہ چٹان سے کوئی نصف کلومیٹر دور تھے۔ اتنے فاصلے سے ان کے لیے ہمیں دیکھ لینا مسئلہ نہیں تھا۔ میں چٹان کے کنارے لینا ہوا تھا اور ایرٹ میرے برابر میں تھا۔ ربیک ذرا فاصلے پر تھا۔ ہم تینوں ہی آنے والے ہارن کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی تعداد چھ تھی۔ اس سے پہلے میں نے صرف دو ہارن دیکھے تھے۔ ایک جو معبد کے کنویں میں قید تھا اور جس کے آگے مجھے پھینکا گیا تھا۔ مگر اوپر والے کو میری زندگی منظور تھی اس لیے میں بچ گیا تھا۔ پھر دوسری بار ہارن سے سامیرا کے قلعے کے عقب میں واسطہ پڑا اور اس بار بھی میں بچ نکلا۔ مگر دونوں مواقعوں پر میں نے ایک ہی ہارن دیکھا تھا۔ پہلا موقع تھا جو میں اس مخلوق کا پورا ریورڈ دیکھ رہا تھا۔

کچھ ہی دیر میں وہ چٹان کے پاس تھے۔ مگر انہوں نے چٹان کے اوپری حصے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ اس کے بجائے وہ غراہٹ بھرے انداز میں شاید آپس میں محو گفتگو تھے۔ میری توجہ ایک بہت کمزور اور لاغر ہے ہارن کی طرف گئی تھی۔ اس کی کھال ہڈیوں پر جھول رہی تھی اور اس کے سر اور ایال کے بال سفید ہو رہے تھے۔ ایک موقع پر اس نے منہ اوپر کیا تو اسے چہرے پر بہت بوڑھے ہو جانے والے انسانوں کی طرح جھریاں بھی نظر آئی تھیں۔ اس کی گدلی آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں۔ ہارن کے آپس کے تبادلہ خیال میں وہ شامل نہیں تھا اور ایک طرف خاموشی سے کھڑا تھا۔ یہ ہارن یا تو بیمار تھا یا پھر بہت زیادہ بوڑھا ہو گیا تھا۔ باقی تمام ہارن تنومند اور پوری طرح صحت مند نظر آرہے تھے۔ وہی آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ ایرٹ نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ”یہ کس لیے یہاں آئے ہیں۔“

”ہاں نہیں مگر مجھے نہیں لگ رہا کہ یہ ہمارے چکر میں یہاں آئے ہیں۔ اگر انہیں ہماری موجودگی کا پتا ہوتا تو یہ ایک بار سر اٹھا کر اوپر تو دیکھتے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ ایرٹ نے گویا سکون کا سانس لیا۔ ”یہ یہاں ہماری موجودگی سے واقف نہیں ہیں۔ اب یہ جتنی جلد یہاں سے چلے جائیں اتنا اچھا ہے۔“

”مگر یہ کسی نہ کسی کام سے یہاں آئے ہیں۔“

میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”اگر یہ جانور ہے لیکن بعض اوقات یہ مجھے انسانوں سے ملتے جلتے بھی لگتے ہیں تم دیکھ رہے ہو یا آپس میں جیسے بات کر رہے ہیں۔“

ایرٹ نے غور کیا اور سر ہلایا۔ ”ہاں واقعی یہ تو جیسے آپس میں بات کر رہے ہیں۔“

لاغر ہارن کو چھوڑ کر باقی پانچ ہارن ایک دوسرے کی طرف منہ کیے تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ اور سروں کی جنبش سے ایسا ہی لگ رہا تھا کہ وہ آپس میں بات کر رہے ہیں مگر ہمیں جو سنائی دے رہا تھا وہ صرف غراہٹیں تھیں۔ کس غراہٹ میں کیا مفہوم پوشیدہ ہے یہ صرف ہارن جان سکتے تھے۔ ماہرین کہتے ہیں کہ جانوروں کے علاوہ نباتات بھی آپس میں بات کرتے ہیں مگر ان کی زبان صوتی تاثر سے عاری ہوتی ہے۔ سمندری مخلوق ڈولفن اور بڑی وہیل مچھلیاں بھی آپس میں گفتگو کرتی ہیں اور ان کی زبان میں خاصے الفاظ ہوتے ہیں۔ اگر کوئی چھلی شکار دیکھ لے یا کسی مشکل میں گرفتار ہو تو وہ مخصوص الفاظ کے ذریعے اپنی ساتھیوں کو آگاہ کرتی ہے۔ تجربات سے ثابت ہوا ہے کہ دوسری چھلی اس پر فوراً ردعمل ظاہر کرتی ہے۔ وہیل کا شکار کرنے والے بعض بڑے فٹنگ ٹرالرز پانی میں ان ہی ریکارڈ شدہ آوازوں کا شبہ چلا کر وہیل مچھلیوں کو اپنی طرف بلاتے ہیں اور پھر ان کا شکار کرتے ہیں۔

یہاں ہارن بھی جس طرح آوازوں کے ساتھ جسمانی ردعمل دے رہے تھے اس سے لگ رہا تھا کہ وہ باقاعدہ گفتگو یا بحث کر رہے ہیں اور میری چھٹی حس نے اطلاع دی کہ یہ گفتگو یا بحث کا موضوع وہی کمزور اور بوڑھا ہو جانے والا ہارن تھا۔ جواب رحم طلب نظروں سے اپنے ساتھیوں کو دیکھ رہا تھا۔ مگر یہ مخلوق جس طرح انسانوں کے لیے رحم سے عاری تھی اسی طرح اپنے ہم جنسوں کے لیے بھی بے رحم تھی۔ ان کی بے رحمی کچھ ہی دیر میں کھل کر سامنے آگئی۔ جب انہوں نے متفقہ فیصلے پر پہنچنے کے بعد لاغر اور بوڑھے ہارن سے کچھ کہا اور وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر نحیف آواز میں غرانے لگا۔ وہ شاید ان سے التجا کر رہا تھا مگر وہ اس کی التجا سننے کے نہیں بلکہ اپنے فیصلے پر عمل کرانے کے موڈ میں تھے۔ انہوں نے اسے ٹھیرے میں لے لیا اور ایک طرف دھکیلنے لگے۔ پہلے تو ہم سمجھے نہیں کہ وہ اسے کس طرف لے جا رہے ہیں مگر کچھ دیر میں واضح ہو گیا۔ ربیک نے بے ساختہ کہا۔

”یہ اسے کنویں کی طرف لے جا رہے ہیں۔“

واقعی وہ اسے دھکیل کر کنویں کی طرف لے جا رہے تھے اور لاغر ہارن مزاحمت کی کوشش کر رہا تھا مگر ان پانچ تنومند اور طاقتور ہارن کے سامنے اس کی کوشش سیلاب پر

رہے تھے۔ شاید ان کی نظر اتنی تیز ہو کہ تاریکی میں بھی نیچے دور تک دیکھ سکتی ہو۔ وہ اپنے ساتھی کا انجام دیکھ رہے ہوں۔ چند لمحے بعد وہ پیچھے ہٹنے لگے۔ وہ یہاں سے جا رہے تھے اور کچھ دیر بعد ہم ان کے خوف سے آزاد ہو جاتے۔ مگر ابھی وہ چٹان کے ساتھ ہی پیچھے ہٹ رہے تھے کہ ہمارے عقب سے چھینک کی آواز آئی۔ یہ آواز اتنی نمایاں تھی کہ تمام ہی ہارن چونک گئے اور انہوں نے اوپر دیکھا۔ ہم چاروں تیزی سے پیچھے ہٹے تھے مگر اتنی تیزی سے نہیں ہٹ سکے کہ ان کی نظروں سے بچ پاتے۔ فوراً ہی ان کی دھاڑ نما غراہٹ بلند ہوئی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو ساشا اپنے منہ پر ہاتھ رکھے ہوئے تھی اور اس کی آنکھوں میں خوف تھا۔ چھینک اسی نے ماری تھی۔ اگرچہ چھینک مارنے میں اس کا قصور نہیں تھا۔ مگر اس وجہ سے ہارن اس چٹان پر انسانوں کی موجودگی سے واقف ہو گئے تھے۔ وہ گھوڑوں کی طرح دوڑتے ہوئے چٹان کے چاروں طرف گھوم رہے تھے اور شاید کوئی راستہ تلاش کر رہے تھے جس سے وہ اوپر آسکیں۔ مگر یہاں ایسا کوئی راستہ نہیں تھا اور ہارن سے ہمیں فوری کوئی خطرہ نہیں تھا۔ میں نے باقیوں کو پیچھے رہنے کو کہا اور خود چٹان کے سامنے والے حصے کی طرف آیا۔ جہاں ہارن موجود تھے اور اوپر ہی دیکھ رہے تھے۔ وہ غرارہ ہے تھے اور ہنکار رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ان کا جوش و خروش بڑھ گیا تھا۔ ایک تو باقاعدہ لکار دے رہا تھا کہ نیچے آتھے دیکھتے ہیں۔ مگر میرا اس کی لکار قبول کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ انہوں نے بھی چند منٹ کی بھاگ دوڑ کے بعد جان لیا کہ اس بلند چٹان پر چڑھنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ مگر انہیں معلوم تھا کہ ہم کبھی نہ کبھی چٹان سے ضرور اتریں گے اور وہ اسی خیال سے چٹان کے آس پاس کھڑے ہو گئے۔ ربیک اور ایرٹ میرے پاس چلے آئے تھے۔ ربیک نے تشویش سے کہا۔

”یہ جانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔“

”اس کینہ پرور جانور کو میں نے جتنا دیکھا ہے یہ انسان کو دیکھ لینے کے بعد اسے مارنے کی انتہائی کوشش کرتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ اتنی آسانی سے جان نہیں چھوڑیں گے۔“

ابھی الفاظ میرے منہ میں تھے کہ کہیں دور سے ایک آواز بلند ہوئی اور مجھے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے یہ آراگون کے مخصوص قرنے کی آواز تھی جو جنگ یا کسی ہنگامی موقع پر بجایا جاتا تھا۔

(جاری ہے)

بہنے والے سٹکے کی مدافعت سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ اب رونے والے انداز میں غرارہ ہاتھ اور خود کو روک رہا تھا مگر ہر دھکے پر جو اسے کسی ہارن کی طرف سے دیا جاتا تھا وہ کنویں کے نزدیک ہوتا جا رہا تھا۔ انہوں نے اسے یوں گھیر رکھا تھا کہ اس کے فرار کی راہ بھی مسدود کر دی تھی۔ اگر وہ کسی سے بچ کر واپس آنے کی کوشش کرتا تو دوسرے کو اپنی راہ میں حائل پاتا۔ یونہی دھکلتے ہوئے وہ اسے کنویں کے کنارے لے آئے۔ اس منظر کو واضح دیکھنے کے لیے ہم بھی چٹان پر ان کے ساتھ ساتھ گھوم رہے تھے۔ اب لاغر ہارن کنویں کے بالکل کنارے کھڑا تھا اور باقی ہارن نے اسے دھکیلنا بند کر دیا تھا مگر ساتھ ہی وہ اس کے سامنے کسی سنگی دیوار کی طرح جھے ہوئے تھے۔ میں نے ایرٹ، ایمار اور ربیک سے کہا۔

”یہ اسے کنویں میں کودنے کا کہہ رہے ہیں۔“

”مگر کیوں؟“ ایرٹ بولا۔

”شاید یہ بہت بوڑھا اور کمزور ہو گیا ہے یا پھر اس سے کوئی ایسی حرکت ہوئی ہے جس کی سزا میں یہ اسے نیچے پھینکنا چاہتے ہیں۔“

”ان کا انداز بتا رہا ہے کہ یہ اس سے خود کو جانے کی توقع کر رہے ہیں۔“ ایرٹ بولا۔

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ میں نے کہا۔ ہارن ہمارے بالکل نیچے کوئی سو فٹ کے فاصلے پر تھے۔ ان کے خیال سے ہم بہت ہی دھیمی آواز میں بات کر رہے تھے۔ اگر وہ آپس میں محو نہ ہوتے تو شاید ہماری آواز سن لیتے۔ مگر اس وقت انہیں اس کام کی پڑی تھی جس کے لیے وہ یہاں آئے تھے اور اب اس کی تکمیل چاہتے تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ لاغر ہارن کودنے پر آمادہ نہیں ہے تو ایک دیوار کی طرح دباؤ ڈالنے کے لیے اس کی طرف بڑھے۔ اس کے قدم لڑکھڑانے لگے اور وہ کنارے پر جھے رہنے کی اپنی کوشش میں ناکام ہو رہا تھا۔ اچانک ایک ہارن نے اس کی گردن پر زور سے ہاتھ مارا۔ اس وار میں اتنی قوت تھی کہ لاغر ہارن کوشش کے باوجود خود کو نیچے جانے سے نہ روک سکا۔ اس کے منہ سے ایک عجیب سی آواز نکلی اور اس کا جسم کنویں میں گرنے لگا۔

چند ہی لمحوں میں وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ میں منتظر تھا کہ اتنے وزنی جانور کے گرنے کی آواز تو آئے گی مگر اس کی آواز بھی نہیں آئی تھی۔ پتا نہیں یہ کنواں بہت زیادہ گہرا تھا یا اس کی تہ میں پانی تھا جس میں گرنے کی وجہ سے آواز اوپر تک نہیں آتی تھی۔ باقی ہارن ذرا جھک کر دیکھ

(نادیہ اصفہانی کا جواب)

عبدالجبار رومی..... لاہور

کوچہ دل میں بلایا تھا تمہیں چاہت سے
کیوں وطن بے وطنی شکوہ کناں ہے مجھ سے

انیس احمد خان..... لاہور

کون ابھرا سر کنار یقیں
کون وہم و گماں میں ڈوب گیا
نسیم نیازی..... سرگودھا

کب کا رخصت ہوا نظارہ صحرا افروز
اب بھی رنگ آنکھوں میں لہرائے چلے جاتے ہیں
(نیلو فر شاہین اسلام آباد کا جواب)

غشی محمد عزیز مئے..... لڈن وہاڑی

اس نے جب پلکوں کو جنبش دی عدم
رائیگاں سب گھنگو کے فن گئے
عرشہ نیلو فر..... منظر گڑھ

اک ہی پر رکھتے ہیں سب نام تیری بزم میں
اک ہی ہیں مورد الزام تیری بزم میں
عارف حسن..... شہزاد کوٹ

اپنی دنیا میں ہمیں پتہ اب اندھیروں کا گزر
دن جو چھپتا ہے تو آنکھوں میں چمک جاتے ہیں خواب
(منظر علی خان لاہور کا جواب)

اعجاز عباس..... فیصل آباد

یاس کا دھواں اٹھا ہر نوائے خستہ سے
آہ کی صدا نکلی بربطہ شکستہ سے
عدیم مرزا..... اسلام آباد

کہاں گیا وہ غم عشق کا مریض حسین
تھی ہے دیر سے نورائے وقت کا آغوش
(سید امتیاز حسین بخاری سرگودھا کا جواب)

کہتے باری..... جھنگ صدر

یوں کی سا پتا دیتا ہے احساس قیام
جیسے گھر سے کہیں مسائے چلے جاتے ہیں

نثار..... ملتان

یہ تنہا ہی اکیلا پن مجھے ہر دم پرلاتا ہے
تکٹھن ہے زندگی میری اسے آسان تو کر دے
(زاہد سلطانی کراچی کا جواب)

عرشہ سید..... سیالکوٹ

زندگی کی سنگ باری سے نہ گھبرا جاؤں میں
زخم کھاتا جاؤں پھر بھی مسکراتا جاؤں میں
عطیہ عباسی..... لاڑکانہ

زہراب زمانہ پی پی کر جواہل جنوں تھے راہ لگے
شاعر کو شورا ک زلف دو تا غم دے نہ سکی الجھا ہی گئی
رعنا رضوی..... ماچسٹریو کے

ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا
ورنہ جو ہم کو دکھ تھے بہت لا دوا نہ تھے
عباس ندا حسین..... کراچی

ہو گیا جسم اگر خاک تو کیا
روشنی ہے مری زندہ مجھ میں
اشفاق انصاری..... حیدرآباد

ہزاروں دیپ جلا کر جو آپ بچھ جائے
ہم اس چراغ کے بجھنے کا غم نہیں کرتے
ارشد محمود..... کراچی

ہائے جن گلیوں میں برباد ہوا میرا شباب
ان سے اب اٹھتی ہے ماتم کی صدا میرے بعد
(نسرین مشتاق کا جواب)

فہیم الدین صدیقی..... کراچی

یہ مرے خون کی ہڈت ہے ورنہ اے واعظ
نشہ شراب میں ہوتا تو ناچتی بوتل
بی اے رحمان..... کوٹ ادو

تھیں سوچ کر وہ کھڑکی سے جھانک لے شاید
نگلی میں کھیلتے بچے لڑا دیے میں نے

خرم علی راؤ..... کراچی
یہ دنیا ہے یہاں امتحاں در امتحاں
نصرت خداوندی کے بنا کامیابی کا نہیں امکان
افروز حسن..... رحیم یار خان
یوں چونک اٹھے وہ سن کر میرا شکوہ
جیسے انہیں بھی کوئی گلہ یاد آگیا
(محمد احمد رضا انصاری کوٹ ادو کا جواب)

ارباب علی..... حیدرآباد
ازل نافتا پذیرِ آخر
ابیر جاوداں میں ڈوب گیا
نصرت جاوید..... ملتان
اچھی گزر رہی ہے میری آپ کے
وعدوں کے درمیان بہانوں کے درمیان
ناہید افروز..... چنیوٹ
اپنی اپنی راحتوں سے جب کبھی فرصت ملے
دوسروں کا درد بھی دل میں جگا کر دیکھیے
(غشی عزیز مٹھن کا جواب)

حسن سجاد..... شادی پور
یہ سمجھ لیتا کوئی مشکل نہ تھا میرے لیے
درد کی پہچان کا رشتہ ہے کیا میرے لیے
عنایت خان..... دہلی (یو اے ای)
یہ دو آنکھیں تو آخر کتنے منظر دیکھ پائیں گی
کسے معلوم دنیا میں ابھی تو اور کیا کیا ہو
(ارم سلطانہ سکھر کا جواب)

سرت..... سکھر
یوں لٹا خانہ دل یاس کے ہاتھوں ہمدم
کوئی حسرت نہ رہی کوئی بھی ارمان نہ رہا
ابرار محمد..... ساہیوال
یاد میں تیری جاگی رات بھر تنہا
اور آنسو تھے میرے ساتھ تنہا
(نسیم زہرہ لاہور کا جواب)

ہادیہ ایمان ماہا ایمان..... ہارون آباد
وحشتِ دل کے تکلف کی ضرورت کے لیے
آج اس شوخ نے زلفوں میں سجائے پتھر
مریم کاشف..... حیدرآباد

ہادیہ ایمان، ماہا ایمان..... ہارون آباد
نہ گل کھلے ہیں نہ ان سے ملے نہ سے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے
مونس فرید پراچہ..... کراچی
نغمہ در نغمہ مرے ہونٹوں پہ رکتی ہوئی آہ
جلوہ در جلوہ تری کم تنگہی آج کی رات
اشفاق محسن..... راولپنڈی
نہیں فرصت یقیں مانو ہمیں کچھ اور کرنے کی
تری یادیں تری باتیں بہت مصروف رکھتی ہیں
(مانی احمد کا جواب)

وقت ایسا بھی کبھی آتا ہے
آدی خود کو بھی برا لگتا ہے
نیاز سومرو..... سکھر
وابستہ کیا ہم سے نصیر اس نے کسی کو
خمیازہ مگر ہم ہی یہاں جمیل رہے ہیں
(ارم حارث کراچی کا جواب)

منظر علی خان..... لاہور
ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی
آ بھی جاؤ اب تو خلوت ہو گئی

فلک شیر نلک..... شاہ گڑھ
ویران ہے سے کدہ خم و ساغر اداس ہے
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے
عرشیا احمد..... منڈی بہاؤ الدین
وہ رات دن مرے دستِ طلب میں ہے لیکن
قبول ہوتی ہیں کب تک دعائیں دیکھتے ہیں
(نوازش علی سید کا جواب)

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی
لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس
اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے
جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

سید امتیاز حسین بخاری..... سرگودھا
اجنبی لوگ سہی یاد تو آتے ہیں مجھے
حسن والے تھے جدا ہو کے رلاتے ہیں مجھے
احمد حسن توفیق..... ملتان
اس قدر نازک ہے دل میرا کہ فضلی ڈر یہ ہے
زندگی کی سگباری سے نہ گھبرا جاؤں میں



میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام۔

۔۔۔۔۔

نام:

پتا:

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی سائنس پاکیزہ سرگزشت بھجوا یا جائے کسی ایک پر کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 اکتوبر 2015ء تک علمی آزمائش 119 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

اگر آپ کو

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ،
ماہنامہ سائنس ڈائجسٹ،
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

کے حصول میں دقت پیش آرہی ہے یا آپ کو اپنے علاقے کے بک اسٹال سے کوئی شکایت ہے اور آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو

شکایت فیکس کریں

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

شمر عباس 0301-2454188

سرکولیشن مینجر 35802552-35386783-35804200

فیکس نمبر 35802551

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
C-63 نیئر 11 ایکسپریس ڈینس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

مقابلہ بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ ”بیت بازی“ شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کر سکتے ہیں۔

نام:

پتا:

محترم! محترمہ!..... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شامل اشاعت کر لیں (شعرا لگ کاغذ پر ہے) **79**

مقابلہ بیت بازی

پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

علمی آزمائش 119

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی طے

علمی آزمائش کے اس مفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری "یک صلی سرگزشت" کے عنوان تلے مفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 اکتوبر 2015ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

1911ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم امین آباد ہائی اسکول لکھنؤ سے اور ایف اے سینٹ جانسن کالج آگرہ سے کیا اور بی اے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے۔ پھر وہ لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے کرنے لگے مگر کرنہ پائے۔ غضب کی شاعری کرتے تھے۔ قیام پاکستان سے قبل کے ماحول میں بھی وہ لڑکیوں کے پسندیدہ شاعر کہلاتے تھے۔ انہوں نے پاکستان کے لیے قیام پاکستان سے قبل ترانہ لکھا تھا۔ 5 دسمبر 1955ء کو انتقال کر گئے۔

علمی آزمائش 117 کا جواب

حضرت موہانی 1298ء ہجری بمطابق 1875ء کو لکھنؤ اور کانپور کے درمیان واقع قصبہ موہان میں پیدا ہوئے اور 13 مئی 1951ء میں وفات پانگے۔ اردو کے بڑے شعرا میں شمار ہوتا ہے۔ انگریز حکومت سے انتہا درجے کی نفرت کرتے تھے۔ زندگی کا بڑا حصہ جدوجہد آزادی میں بسر کیا۔ جیل کی صعوبت بھی برداشت کی۔ ایام اسیری میں بھی مشق سخن جاری رکھا مگر پاکستان نہ آئے اور بھارت میں ہی انتقال فرما گئے۔

انعام یافتگان

1- علی اکبر راجپوت، کراچی 2- عابدہ سلطانہ، سکمر 3- نصرت علی اعوان، فیصل آباد

4- محمد علی زیدی، چنیوٹ 5- نگار سلطانہ، لاہور

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے فرزانہ پروین، رفیق عباس، خالد سلطان، ایثار حسین، ظہور علی خان، نعمتہ تنول زیدی، اصغر عباس، اصغر علی، فراز واصف، ندیم اکبر، لیاقت حسین، رفیق خانزادہ، اصغر حسین، رانا لیاقت، افضل خان، زاہد حسین زاہد، نادر پرویز،

اکتوبر 2015ء

204

ماہنامہ سرگزشت

READING
Section

خادم حسین صدیقی، ناصر افروز ملک، فیصل ندیم، احمد خان، نگار سلطانہ، ندیم علی، فیض حسن بھٹی، ملک اعجاز حسین، افشاں بھٹی، خالد پراچہ، فیض سلطان، شہباز جوکیو، زویب رند، ممتاز علی بھوجانی، فہیم الدین، کوثر خان، اشفاق حسین سید، فرحت اللہ نیازی، افشین جونجو، وہاب علی خان۔ لاہور سے منظر علی خان، اسلم ملک، عبدالجبار رومی انصاری، نادر احمد نوشاہی، نور احمد نور، عدیل الرحمن، معراج علی سید، امجد فاروق حسن فاروقی، نیاز اختر، زریاب علی خان، جعفر علی خان، عابد علی جعفری، ملک شہباز، زاہد چیمہ، فہد علی بخاری، راؤ ستار ایوب۔ ملتان سے راحیل اشرف، فاروق خان، زاہد علی چنگیزی، ندیم بیگ، احمد خان، خورشید حیات، ناصر بیگ، عباس بھٹ، رونق افروز، عباس حیدرزیدی، اشفاق پراچہ، نعمان ربانی، سید رونق علی رضوی، خادم حسین ملک، فرارز واصف، نگار افروز، سلطان خان۔ اسلام آباد سے سیف الرحمن خان، خالد بخش، اصغر حسین سید، ملک عباس، رفیق خانانی، راحیل عثمانی، فاروق عباس نورانی، سید محمد علی زیدی، انٹخار الاسلام، ملک نوروز۔ راولپنڈی سے استراج خان، ملک فصیح الحسن، نشاط فاطمہ عباسی شجاع الدولہ، ایس ایم تقی، خضر عباس پیاسا، ممتاز احسن، ناہید مشرف۔ پارا چنار کرم ایجنسی سے غلام عباس طوری۔ جہلم سے اریٹھ امتیاز، سعید حسن، نادر اسلام، نکہت ملک نواز، سلطان زین، فصیح ملک۔ سکھر سے فراست انصاری، اصغر حسنین، علی احمد ضیائی، عباس جوکیو، تصدق پراچہ۔ گجرات سے احمد نصیر، انعام لاہوری، فاروق اطہر۔ گوٹھ غلام شاہ سے سید ایس ڈی ساغر، ڈاکٹر ایم رمضان۔ سرگودھا سے سید امتیاز حسین بخاری، نذر حسین شاہ، ضیاء الحسن فاروقی، فیصل بخش میو۔ ٹنڈو جان محمد سے تمہری انمولکھ۔ ہارون آباد سے سلیم کامریڈ۔ ساہیوال سے محمد افضل (فرید ناؤن)، رشید اشرف۔ چکوال سے محمد جہانگیر، طارق اکبر، فردوس علی۔ حیدرآباد سے خوشنود حسن صدیقی (لطیف آباد)، حیات کاشف، بخش اصغر، بابر زمان، خان بھائی، معتمد علی، فرقان حیدرزیدی، ممتاز احسن، دردانہ بھٹو، گل شیخ، سانول شیخ۔ ڈیرہ غازی خان سے رفیق احمد ناز، ارباز نیازی، فضل کریم خان، خلیل الرحمن۔ پشاور سے شیر نواز گل، زہرہ بخش، عابد علی طوری، انعام خواجہ، زاہد علی خان۔ مردان سے م انور (باڑی چم ہوتی)۔ ملتان سے عنبرین چشتی، حسن اکبر، نیاز عباس، منصور حیدر، چشتی غلام عباس، نیاز احمد قدوسی، عاصم اکبر، سید توقیر علی زیدی، انعام اشرف۔ بھکر سے محمد عارف قریشی۔ جامشور سے نازنین (کوٹری)، احمد زریاب، اشفاق مومن، عین الرضا۔ شاہ گڑھ سے فلک شیر ملک (ترنڈہ سرائے خان)۔ ٹنڈو آدم سے سونیا جونجو۔ حیدرآباد سے: زریاب فرحان، اتر مظاہر۔ لطیف آباد حیدرآباد سے: طلحہ یاسین، نسرین رانا، توقیر جمالی، نزہت پروین، مسکان بھٹو۔ پشاور سے: محمد شہزاد اعظم، کشمالہ مفتی، گلہاڑ خان، مفتی اکبر خان، عمران وردگ، نسیم اتمان زئی، ڈاکٹر نعمان شہزاد خان۔ لاہور سے: امروز اسلم ملک، عاقب سجاد محمد عاقب جنید، سید محمد احسن نواز، عبدالخالق چوہدری، عبدالقادر، یاسین ملک، فرزاد مصطفیٰ کائنات، مرزا شاہینہ اسلم چوہدری، روایت خان، کلثوم شہزاد، سرفراز اکرم خان، عنبرین شاہد، محمد اسلم۔ لالہ موٹی سے: بشریٰ اصغر، صفدر ملک، ارشد محمد ولی، صبیحہ نواز۔ کھاریاں سے: شعیب اقبالی۔ طاہر پورہ، بہاولپور سے: شاہ رخ ہاشمی۔ کوٹلی، آزاد کشمیر سے: لیاقت علی۔ رحیم یار خان سے: ساجدہ عندلیب، فاخر حسین، مصباح الرضا۔ ننکانہ صاحب سے: جمیل چیمہ۔ واہ کینٹ سے: نور افضل خان، تنک، مجید الرحمن، ثانیہ فرید، مسز سمین نصیر۔ تونسہ شریف سے: میاں محمد نوید۔ جب سے: شاہینہ رضوان۔ ملتان سے: علی محمد۔ خیر پور سے: گل باز خان، خالد آفریدی، ذکیہ ممتاز، عامر جمیل قریشی، محمد علی، صنوبر جوکیو، صفحہ بلوچ، ملک سرفراز۔ منڈی بہاؤ الدین سے: جویریہ حلیم، محمد سلیم، حافظ محمد اقبال، مرزا الطاف حسین، نفیسہ جمال، صفراں بیگم، نواز علی، مہوش خان، اطہر احمد قریشی۔ مظفر گڑھ سے: رانا محمد سجاد (شاہ جمال)، ظفر خان (کوٹ ادو)، مومن اجمل (شہر سلطان)۔ جھنگ سے کمال اختر، نادر انصاری، نادرہ خورشید۔ چنیوٹ سے اسد اللہ شیرازی، اکمل کمال، سعد فاروقی، نادر خان۔ حملہ گنگ سے ناہید بٹ، خان بیلہ سے اشرف خان گل پڑی۔ میانوالی سے نوروز حسن، کیف علی خان، زاہد خاکوانی، احمد شیراز۔ جھنگ فیصل آباد سے تفصیل بٹ، صدیق لغاری، عنایت اللہ شہباز۔ رحیم یار خان سے احمد دین، عباس علی، نوشین ملک، فصاحت عباس۔ کوئٹہ سے ناصر چنگیزی، فرحت اللہ، صادق علی، نعمت اللہ خان، انور اللہ راؤ، نکہت، حسن عباس کاکھی، صولت چنگیزی۔ سرگودھا سے اشرف ممتاز، نادر شاہ، اشرف بیہانی، تقی حیدر۔ خانیوال سے زہرہ سید، بابو بھائی، حسن ضیائی۔ حاصل پور سے نعمان ادیس۔ بہاولپور سے کوبک واسطی، شذرہ محمد، عنایت سحیح، خالدہ کنول، قیصر حسن، شادقار، منہال زیدی، سردار علی مینگل، شہ نواز، اطہر شاہ۔ بیرون ملک سے عباس فاروق (عمان سعودیہ)، نوید اسلم (فرنگفرٹ)، ضیاء عباس (مانچسٹر یو کے)، ارباز خان (شارجہ) فاروق علی انصاری البہندی (سلطنت اومان)۔

نظامِ جہالت

محترمہ عذرا رسول

سلام مسنون

میں ایک ریٹائرڈ اسکول ٹیچر ہوں اور پہلی بار ایک روداد لکھی ہے۔ یہ میری اپنی روداد ہے۔ اسے آپ بیٹی بھی کہہ سکتے ہیں۔ میں نے جو تجربہ حاصل کیا یہ اس کا نچوڑ ہے۔ اس کہانی سے اگر کسی نے سبق حاصل کر لیا تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت وصول ہو گئی۔

اسد اللہ

(لاہور)

کے آس پاس دیہات ہوتے تھے مگر اب یہاں جدید اسکیمیں بن رہی تھیں۔ جب میں نے اسکول میں ملازمت کی تو اس وقت یہاں کا وہی ماحول کسی قدر برقرار تھا مگر اب یہ اتنا ہی ماڈرن علاقہ بن گیا ہے جتنا کہ باقی لاہور ہے۔ شروع میں یہاں ہر طبقے کے بچے پڑھنے آتے تھے۔ دیے تو یہاں صرف دولت مندوں کے بچے ہی داخل ہو سکتے تھے کیونکہ اس وقت بھی یہاں کی فیس ہزاروں میں تھی۔ مگر ایک پالیسی کے تحت دس فیصد داخلے بالکل مفت دیئے جاتے تھے اور شرط صرف ذہانت کی ہوتی تھی۔ ایسے بچوں کے تمام اخراجات اسکول کے ذمے تھے۔

حکومت کی طرف سے نجی اسکولوں پر پابندی ہے کہ وہ کچھ فیصد بچوں کو مفت میں تعلیم دیں گے مگر اس پابندی پر عمل کوئی نہیں کرتا ہے۔ میرا اسکول ان چند اسکولوں میں سے ہے جہاں اس کی پابندی کی جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہاں سے بہت سے غریب بچے جن کے والدین انہیں سرکاری اسکولوں میں پڑھانے کی کبھی حیثیت نہیں رکھتے تھے یہاں سے اچھی تعلیم حاصل کر کے اوپر گئے تھے۔ یہ سب ذہین بچے تھے۔ آج وہ اچھی پوسٹوں پر کام کر رہے

صرف سولہ سال کی عمر میں ٹیچر ٹریننگ کورس کر کے میں نے ایک سرکاری پرائمری اسکول میں ملازمت کی تھی۔ پھر دورانِ ملازمت تعلیم بھی جاری رکھی۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد بی اے کیا اور پھر بی ایڈ کیا۔ آخر میں ایم ایڈ کر کے ایڈوانس ایجوکیشن سسٹم کا کورس بھی کر لیا۔ اس وقت میں ایک سرکاری ہائی اسکول میں پرنسپل بن چکا تھا مگر وہاں کا جو معیار تعلیم تھا اسے میں اکیلے درست نہیں کر سکتا تھا۔ میرے ماتحت اساتذہ مجھ سے زیادہ طاقتور تھے کیونکہ معاشرے کے طاقتور ان کے پشت پناہ تھے۔ جاگیرداروں کے نکلے بچے ان کی ایک جنبش قلم سے پاس اور کلاس میں فرسٹ آجاتے تھے اس لیے انہیں ہی طاقتور ہونا تھا۔ اگر میں ان کا راستہ روکنے کی کوشش کرتا تو میں ہی کمزور ثابت ہوتا اور کئی بار ثابت بھی ہوا۔ اس لیے پہلے میں نے مداخلت کرنا چھوڑی اور پھر ملازمت ہی چھوڑ دی۔

مگر میں ایک دن بھی خالی نہیں بیٹھا تھا۔ ریٹائرمنٹ سے پہلے ہی مجھے ایک اعلیٰ درجے کے نجی اسکول میں نائب پرنسپل کی جاب مل گئی تھی۔ اگلے دن سے میں وہاں جانے لگا۔ یہ اسکول لاہور کے نواح میں تھا۔ کسی زمانے میں اس



ہیں۔ اپنے کیریئر میں، میں نے بچوں کو ریاضی پڑھائی تھی۔ اس لیے جب میں یہاں نائب پرنسپل بنا تو مجھ سے درخواست کی گئی کہ میں ضرورت پڑنے پر مختلف کلاسز کو ریاضی بھی پڑھا دیا کروں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ پڑھا کر مجھے خوشی ہوتی ہے۔ اب ہوتا یہ کہ ریاضی کا کوئی ٹیچر غیر حاضر ہوتا یا چھٹی ہو گیا ہوتا تو اس کی جگہ میں اس کی کلاس کو پڑھاتا تھا۔ اس میں درجے کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ میں دوسری تیسری کلاس سے لے کر انٹر کی کلاس تک کو پڑھاتا تھا۔

مجھے صرف پڑھانا پسند نہیں تھا بلکہ میں اپنے شاگردوں کو بھی چاہتا تھا کہ ان میں کیا قابلیت ہے اور وہ کس فطرت کے مالک ہیں اور آگے جا کر وہ کیا نکلیں گے؟ سرکاری اسکول میں، میں نے بہت سے لڑکوں کو جانچا اور ان کے مستقبل کے بارے میں پیش گوئی کی جو تقریباً پوری ہوئیں

کیونکہ جس طرح ماں باپ اولاد کو جانتے ہیں اسی طرح ایک استاد بھی اپنے شاگرد کو اندر تک سے جان جاتا ہے، یہ شرط کہ وہ شاگرد سے مخلص ہو۔ میرا یہ دعویٰ تو نہیں ہے کہ میں اپنے سارے شاگردوں سے مخلص تھا مگر کچھ مجھے متوجہ کرتے تھے اور میں ان پر غور کرتا تھا۔ ان میں بہت ذہین اور محنت سے پڑھنے والے بھی تھے۔ ایسے بھی تھے جو محنتی تھے مگر ذہین نہیں تھے اور وہ اوسط درجے میں آتے تھے۔ کچھ ایسے تھے جو ذہین تھے مگر ان کو تعلیم سے دل چسپی نہیں تھی۔ ایک چوتھی کیٹیگری ان بچوں کی تھی جو نہ تو ذہین تھے اور نہ ہی انہیں محنت کرنا پسند تھا۔

میں نے نوٹ کیا کہ بچوں میں دس فیصد ذہین اور محنتی تھے۔ بیس فیصد کم ذہین مگر محنتی تھے۔ اتنے ہی ذہین مگر محنت سے جی چرانے والے تھے۔ بد قسمتی سے چوتھی کیٹیگری والے سب سے زیادہ یعنی کل بچوں کا پچاس فیصد بنتے تھے۔ مگر یہ تناسب سرکاری اسکول کا تھا۔ نجی اسکول میں بیس فیصد بچے ذہین اور

محنتی تھے۔ بیس فیصد محنتی اور کم ذہین تھے۔ چالیس فیصد ذہین اور کم محنتی تھے جب کہ چوتھی کیٹیگری یہاں بیس فیصد تھی یعنی یہاں بھی اکثریت ان بچوں کی تھی جو رزلٹ کے معاملے میں پیچھے ہوتے تھے۔ سرکاری اور نجی اسکول میں ذہین اور اوسط درجے کے بچوں کے تناسب میں کوئی بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ آج بھی یہ فرق اسی طرح قائم ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس میں خاص فرق نہیں آیا۔ بلکہ عمومی ذہانت کے معیار میں بھی کمی آئی ہے۔ اس کی وجہ وہی ہمارا مجموعی معاشرتی زوال ہے جو ہر شعبے میں نمایاں ہے۔

جب میں نجی اسکول میں آیا اور یہاں بعض اوقات کلاسز کی ذمہ داری بھی دی گئی تو میں نے تیسری کلاس میں چار بچوں کو خاص طور سے نوٹ کیا۔ یہ چاروں ان کیٹیگریز سے تعلق رکھتے تھے جو میں نے اوپر بیان کی ہیں۔ سلمان علی ذہین اور محنتی تھا۔ وہ نہ صرف مشکل سوالات آسانی سے سمجھ جاتا اور اے عام طور سے دوسری بار بتانے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ وہ اپنا ہوم ورک مکمل اور

بہت صفائی سے کرنے کا عادی تھا۔ ان چاروں میں وہ سب سے کم عمر تھا اور ابھی آٹھ سال کا بھی نہیں تھا۔ گورے چٹے اور معصومانہ نقوش والے سلمان کا تعلق ایک پڑھے لکھے اور مہذب گھرانے سے تھا۔ اس کا باپ واپڈا میں انجینئر اور بہت اچھے عہدے پر تھا۔ اس کی ماں ایک این جی او چلار ہی تھی۔ جس کا مقصد لوگوں کو پیٹ کی بیماریوں کے بارے میں آگاہ کرنا تھا۔ وہ اپنے چار بہن بھائیوں میں دوسرے نمبر پر تھا۔

دوسری کیٹیگری میں راشد صاحب تھا۔ سیاہ بالوں اور کسی قدر موٹے مگر مناسب نقوش کے راشد کا تعلق ایک اوپری متوسط گھرانے سے تھا۔ باپ یعنی میں الیکٹریشن تھا اور وہاں سے کما کر بھیجتا تو یہاں سات افراد پر مشتمل کنبہ اچھی زندگی گزار پاتا تھا۔ راشد اپنے چھ بہن بھائیوں میں پانچویں نمبر پر تھا اور صرف وہی اس اسکول میں داخلہ لینے کا اہل قرار پایا تھا۔ راشد بھی ہوم ورک پورا اور صفائی سے کرتا۔ استاد جو پڑھاتے وہ سمجھنے کی پوری کوشش کرتا تھا۔ میں نے ہمیشہ اسے صاف ستھرا اور سلیقے والا بچہ پایا۔ وہ اسکول میں آکر خوش ہوتا تھا اس کا مطلب تھا کہ اسے گھر کی نسبت اسکول زیادہ اچھا لگتا تھا۔ وہ اساتذہ کا دیا ہوا سارا کام وقت پر کرتا تھا۔ ہر ٹیسٹ میں پاس ہوتا تھا۔ اسے شاید کبھی سزایا سرزش کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ مگر وہ ان بچوں میں سے نہیں تھا جو پوزیشن لیتے ہیں۔ ہاں وہ ہمیشہ اوسط سے زیادہ نمبر لیتا تھا۔ ریاضی اس کا پسندیدہ مضمون تھا اور وہ عام طور سے اس میں سو نمبر لیتا تھا۔

ریاضی فخر تیسری کیٹیگری میں آتا تھا۔ اس کی ذہانت آمیز چالاکی اس کے چہرے اور آنکھوں سے جھلکتی تھی۔ وہ کسی قدر سانولے رنگ مگر توجہ حاصل کرنے والے نقوش کے حامل ریاض نے تیسری کلاس میں ہی ٹیچرز اور کلاس فیلوز سے ایسے تعلقات قائم کر لیے تھے کہ اس کے بعد اسے تعلیم کے معاملے میں کبھی کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس کا ہوم ورک اس کے سامنے کر دیتے تھے۔ ٹیسٹ اور امتحانات میں وہ دوسروں کی نقل کر کے پاس ہوتا تھا اور کوئی اسے منع نہیں کرتا تھا۔ ریاض کا تعلق ایک جاگیردار گھرانے سے تھا۔ وہ صبح اسکول دین کے بجائے لگژری گاڑی میں آتا اور جب وردی پوش ڈرائیور اتر کے اس کے لیے دروازہ کھولتا تو دوسروں کے دل اور ذہن کے دروازے اس کے لیے خود بہ خود کھل جاتے تھے۔ ریاض جانتا تھا کہ وہ دولت

مند ہے مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ دولت سے فائدہ کیسے اٹھاتے ہیں۔ اسے کبھی پوزیشن حاصل کرنے کی فکر نہیں رہی۔ وہ بس پاس ہونا چاہتا تھا۔ وہ پیچھے رہنا نہیں چاہتا تھا۔

چوتھا بچہ اعظم شاد تھا۔ گھر درے نقوش، مضبوط جسم اور عجیب سی آنکھوں والے اس بچے کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ وہ اس اسکول میں کیسے داخل ہوا۔ یہاں داخلہ ٹیسٹ کے بغیر نہیں ہوتا تھا۔ مجھے بعد میں علم ہوا کہ اس کی ماں نے اسکول کے مالک کے پاؤں پکڑ لیے تھے کہ اس کے بیٹے کو اسکول میں داخل کر لیں کیونکہ وہ اسے پڑھانا نہیں سکتی ہے اور اس کی شدید خواہش ہے کہ اس کا بیٹا پڑھ لے۔ مالک انکار نہیں کر سکا۔ وہ خدا ترس آدمی ہے مگر دس فیصد بچوں کو فری میں داخلہ دیتا ہے۔ اعظم داخلہ ٹیسٹ میں کھل فیل ہو گیا تھا۔ پاس ہونا دور کی بات ہے وہ بہت ہی کم نمبر حاصل کر سکا تھا۔ وہ پہلے سال ہی فیل ہو گیا۔ اگلے سال وہ بہ مشکل پاس ہوا۔ مگر دوسری میں وہ پھر فیل ہو گیا۔ عام طور سے اگر کوئی بچہ دوسری بار فیل ہو تو اسے اسکول سے نکال دیا جاتا ہے مگر اعظم پڑھتا رہا۔ دوسری بار فیل ہونے پر جب اس کی رپورٹ مالک کے پاس گئی تو اس نے اپنے نوٹ کے ساتھ اسے واپس کر دیا۔ اس نے لکھا تھا۔ ”اگر یہ چالیس سال کی عمر تک بھی یہاں پڑھے تو اسے پڑھاؤ۔“

یہ خصوصی استثناء تھا جو کسی اور بچے کو کبھی نہیں دیا گیا۔ اعظم تیسری کلاس میں دس سال سے اوپر کا ہو چکا تھا اور کلاس میں سب سے زیادہ عمر والا لڑکا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں سوچا کہ وہ کبھی کچھ نہیں بن سکے گا۔ اس کا بہت زیادہ امکان تھا کہ وہ اسکول چھوڑ جائے گا اور محنت مزدوری کرے گا یا کوئی ٹھیلہ لگا لے گا۔ اس سے زیادہ کچھ کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے اس میں کوئی خوبی نہیں دیکھی تھی۔ وہ خاموش طبع تھا اور خود میں گمن رہتا تھا۔ ہاں میں نے ایک بات محسوس کی تھی کہ وہ خوفزدہ نہیں ہوتا تھا۔ ایک بار اسکول کے میدان میں سانپ نکل آیا اور تمام بچے چیخے چلاتے ہوئے عمارت میں گھس آئے۔ ایمر جنسی کا الارم بجا دیا گیا تھا۔ سانپ کا سن کر اسکول کے گارڈز جب میدان میں پہنچے تو وہاں اعظم موجود تھا اور ایک چھڑی سے سانپ سے کھیل رہا تھا۔ حالانکہ یہ کوئی تین فٹ لمبا اور خطرناک نظر آنے والا سانپ تھا۔ گارڈز نے بتایا کہ اعظم چھڑی سے اسے اشتعال دلاتا اور جب وہ حملہ کرنے کی کوشش کرتا تو چھڑی سے اسے ضرب

لگاتا۔ اس نے سانپ کو ادھ موا کر دیا تھا اور گاڑز کو اسے
ٹھکانے لگانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ مجھے پتا چلا تو
اسے بلایا۔ ”تمہیں سانپ سے ڈر نہیں لگا؟“
”نہیں جی۔“ اس نے سادگی سے کہا۔
”کیوں؟“

”کیا کرتا کاٹ ہی لیتا۔“

اس کے جواب سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اتنے
موٹے دماغ کا ہے کہ اسے اپنے نفع نقصان کا احساس ہی
نہیں ہے۔ یہ ظاہر اس میں متوجہ کرنے والی کوئی بات نہیں
تھی مگر میں اس کی طرف متوجہ ہوا اور اس کی پروگریس پر
خاص نظر رکھنے لگا۔ اس کی رائٹنگ بہت خراب تھی۔ تیسری
کلاس میں بھی اسے حروف چینی اور الفبا بیٹ کی صحیح پہچان نہیں
تھی اور وہ اکثر غلط لکھتا تھا۔ اس کے ٹیسٹ ایسے ہوتے تھے
کہ انہیں دیکھنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ سالانہ امتحانات میں وہ
نہ جانے کیسے پاس ہو جاتا تھا مگر یہ موقع عام طور سے دو سال
بعد ہی آتا تھا۔ تقریباً ہر کلاس میں وہ دو سال پڑھتا رہا۔ یہی
وجہ تھی کہ ہر سال اس کے اور اس کے کلاس فیروز کے درمیان
عمر کا فرق بڑھتا چلا گیا۔ جب اس نے چھٹی کلاس پاس کی تو
اس کے ساتھ کے طلبہ میٹرک کر کے فرسٹ ایئر میں جا چکے
تھے۔

اسکول بارہویں کلاس تک تھا اور طلبہ یہاں سے ہائی
اسکول پاس کر کے ہی نکلتے تھے۔ ہاں کسی کو اچھے کالج میں
داخلہ مل جائے تو وہ وہاں چلا جاتا تھا۔ مگر زیادہ تر یہیں سے
ہائی اسکول پڑھنے کو ترجیح دیتے تھے تاکہ وہ بہترین نمبرز
حاصل کر کے آگے پیشہ ورڈگری میں داخلہ لے سکیں۔ یہاں
نہ صرف معیارِ تعلیم بہت اچھا تھا بلکہ طلبہ کو پریکٹیکل بہت
اچھے کرائے جاتے تھے۔ اسکول کی ساکھ سے بھی اثر پڑتا تھا
اور یہاں سے انٹر، ایف ایس سی اور آئی کام کرنے والے
طلبہ بورڈ میں پوزیشن بھی حاصل کرتے تھے۔ میں سوچتا کہ
ایسے طلبہ کے درمیان اعظم کا وجود ایسا ہی تھا جیسے کسی خوش
رنگ اور خوب صورت پودوں والے باغ میں کوئی کائٹوں
والا بد صورت پودا۔ مجھے نہیں امید تھی کہ وہ بورڈ کے امتحان
کے مرحلے تک اسکول میں نکلے گا۔ اس کے بارے میں میرا
یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ وہ ساتویں میں تھا اور
انیس برس کا ہو چکا تھا۔ اب تو اس کی داڑھی موچھیں بھی نکل
آئی تھیں اور ہنوز اس کے میٹرک میں جانے کے کوئی
امکانات نظر نہیں آرہے تھے۔ اس نے بھی یہ بات محسوس کر

لی اور بالآخر اسکول کی جان چھوڑ دی۔

سلمان علی کے بارے میں میرا اندازہ تھا کہ وہ ان
سب سے آگے نکل جائے گا۔ وہ ذہین تھا اور اپنی ذہانت
استعمال کرنے کا عادی بھی تھا یعنی اسے محنت کرنے میں کوئی
عارضہ نہیں تھی۔ اس کے بارے میں بھی میرا اندازہ درست نکلا
جس سال اعظم نے اسکول چھوڑا اسی سال سلمان علی نے
بورڈ میں ساتویں پوزیشن کے ساتھ ایف ایس سی کر
لیا۔ سلمان نے چھٹی کلاس میں بھی پورے اسکول میں
ریکارڈ نمبر لیے تھے اور اسے آٹھویں کلاس میں پروموٹ کیا
گیا تھا۔ ایف ایس سی کے بعد اس نے انجینئرنگ یونیورسٹی
میں داخلہ لیا تھا۔ اپنے باپ کی طرح اس نے بھی الیکٹریکل
کا انتخاب کیا تھا۔ میں اس کے فیصلے سے کسی قدر مایوس ہوا
تھا۔ میرے خیال میں وہ اس سے کہیں آگے جاسکتا تھا۔ وہ
اس مشینری کو چلا سکتا تھا جس کا اب وہ ایک پرزہ بننے جا رہا
تھا۔ مگر یہ تو آغاز تھا ہو سکتا تھا کہ وہ آگے جا کر مزید تعلیم
حاصل کرتا اور مینجمنٹ لیول تک پہنچ جاتا۔ یہ حقیقت ہے کہ
ہمارے ملک میں ہنرمندوں کی وقعت نہیں ہے وہ ہمیشہ
فیصلوں کے لیے اوپر والوں کے محتاج رہتے تھے۔ ایک غلط
فیصلہ ان کی ساری محنت اور دیانت پر پانی پھیر دیتا ہے۔
گر پٹ افسران اپنے ہنرمند مائتھوں کو بھی کرپٹ بنا دیتے
ہیں۔ انہیں ان کی قابلیت اور دیانت کا صلہ الٹا ہی ملتا ہے
اور وطن عزیز سے ہنرمند ذہانت کے اتھلا کی سب سے بڑی
وجہ بنتی ہے۔

راشد سلمان سے ایک سال پیچھے تھا کیونکہ اس نے
پروموشن حاصل نہیں کی تھی اور ثابت قدمی سے ہر سال کلاس
پاس کرتا تھا۔ وہ سلمان کے ایک سال بعد ہائی اسکول پہنچا
اور اس نے یہاں کامرس کا انتخاب کیا۔ میں نے بتایا کہ
اسے ریاضی میں بہت زیادہ دل چسپی تھی اور وہ عام طور سے
اس میں ٹاپ کرتا تھا۔ اس لیے جب اس نے کامرس کا
انتخاب کیا تو مجھے قطعی حیرت نہیں ہوئی بلکہ یہ میری توقع کے
عین مطابق تھا۔ راشد نے کسی بھی سال پوزیشن حاصل نہیں
کی مگر وہ اوسط سے اوپر نمبر لیتا رہا اور آخری سالوں میں اس
نے زیادہ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ میٹرک میں اس نے
اے ون گریڈ لیا تھا جب کہ آئی کام میں اس نے اے گریڈ
حاصل کیا اور اس کی پرنسٹن تھری فیصد آئی تھی۔ ان نمبروں کے
ساتھ وہ بی بی اے میں داخلہ لے سکتا تھا اور میرا خیال تھا کہ
وہ ایسا ہی کرے گا۔ مگر یہاں اس نے میری توقع کے خلاف

چاہیں تو ساتھ لے لیں۔ سب کا تو میرے کمرے میں آنا دشوار ہوگا۔“

میرے ساتھ کالونی کے کچھ افراد سلمان علی کے کمرے میں آئے۔ اس نے ٹھنڈے کا کہا لیکن میں نے منع کر دیا۔ ”یہ اچھا نہیں لگے گا کہ بس ہم چند افراد پی لیں اور سب کو پلانا تمہارے ساتھ زیادتی ہوگی۔ اس لیے کام کی بات کر لی جائے۔“

غالباً اسے پہلے ہی اطلاع مل چکی تھی۔ اس نے کہا۔ ”پی ایم ٹی کا مسئلہ ہے؟“

”بالکل بلکہ ایک نہیں کم سے کم چھ پی ایم ٹی کا مسئلہ ہے۔“ میں نے کہا اور کیس فائل اس کے سامنے رکھ دی۔ ”تم خود دیکھ لو اتنی پی ایم ٹی لگیں تو مسئلہ حل ہوگا۔“

ہم اچھے طریقے سے اپنا کیس تیار کر کے لائے تھے جس میں باضی اور موجودہ صورت حال کے ساتھ ساتھ بجلی کے ترسیل کے نظام کا موازنہ بھی شامل تھا جو اب ڈیٹ ہونے سے رہ گیا تھا اور یہی مسئلے کی جڑ تھی۔ سلمان نے مکمل فائل دیکھی اور میرے منع کرنے کے باوجود اس نے چہرہ اسی کو بلوا کر سب کے لیے کولڈ ڈرنک منگوا لی تھی۔ اس نے فائل دیکھ کر سامنے رکھی اور بولا۔ ”مسئلہ واضح ہے۔“

”جب اسے حل کیا جائے۔“ میرے ساتھ آئے زاہد صاحب نے کہا۔ وہ کسی زمانے میں واپڈ میں ملازم تھے اور انہوں نے بھی اپنا سارا اثر و رسوخ استعمال کر لیا تھا۔

”اگر میرے بس میں ہوتا تو میں آج اور ابھی اسے حل کر دیتا۔ لیکن میں اتنا کر سکتا ہوں کہ آپ کے کیس پر اپنے رہنما کے لیے دوں۔“

”اس کے بعد؟“

”اس کے بعد آپ کو ہیڈ آفس جانا ہوگا اور وہاں یہ مسئلہ حل ہوگا۔“

”جناب آپ کوشش تو کریں۔“ زاہد صاحب نے اصرار کیا۔ ”دیکھیں آپ کے استاد آئے ہیں۔“

”میں ان ہی استاد کی دی ہوئی تعلیم پر عمل کر رہا ہوں۔“ سلمان علی نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔ ”خدا گواہ ہے اس سیٹ پر آنے کے بعد میں نے کبھی ایک روپیہ حرام کا نہیں کمایا اور کسی کا ناجائز کام نہیں کیا چاہے وہ میرا خونی رشتے دار کیوں نہ ہو اور نہ ہی کسی کا جائز کام روکا چاہے وہ میرا دشمن ہی کیوں نہ ہو۔“

”زاہد صاحب سلمان ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس کی سطح پر

کم تھی اس لیے ایک دو پی ایم ٹی بھی کافی تھیں مگر وقت گزرنے کے ساتھ آبادی میں اضافہ ہوا۔ اس لیے یہ پی ایم ٹی ٹیڑھا کافی ہو گئیں اور اب روز ہی لووٹیج اور ٹریپنگ کا مسئلہ رہنے لگا۔ فرٹیج اور اے سی جیسے بھاری آلات کام نہیں کرتے تھے۔ نازک الیکٹرانکس آلات آئے دن اڑ جاتے یا خرابی کا شکار رہتے تھے۔ ایک رات اور لوڈنگ کی وجہ سے پی ایم ٹی اڑی تو اس کی تاریخیں پہلے ملیں اور اس وجہ سے گھروں میں جو جو چیزیں بھی آن تھی وہ اڑ گئیں۔ خود میرا ٹی وی، نصف درجن انرجی سیور، تین ٹیبلٹس اور نصف درجن ہی چھوٹی ڈیوائسز بھی اڑ گئیں۔ فرٹیج اسٹریبلٹزر کی وجہ سے بیج گیا ورنہ وہ بھی اڑ جاتا۔ لوگوں کا اس سے زیادہ نقصان ہوا تھا۔ شروع میں اگاؤ کا لوگوں نے درخواست دی مگر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس پر کالونی والوں نے ایک میٹنگ کی اور فیصلہ کیا کہ مل کر بجلی والوں کے دفتر جائیں گے اور وہاں کسی بڑے افسر سے بات کریں گے۔

مسئلہ یہ تھا کہ دفاتر کام کے دنوں میں کھلتے تھے اور سب ہی کام والے تھے۔ سب کو ایک ساتھ چھٹی ملنا بھی مسئلہ تھا۔ اس لیے یہ پلان لٹا رہا۔ گرمیاں نزدیک تھیں اور ایک رات جب اور لوڈنگ کی وجہ سے پی ایم ٹی اڑ گئی تو لوگوں کے صبر کا پیمانہ لہریں ہو گیا اور انہوں نے اگلے دن چھٹی کی۔ تیس پینتیس کے قریب افراد مختلف گاڑیوں میں بھر کر بجلی کے مقامی دفتر پہنچے اور پی ایم ٹی کے مسئلے پر احتجاج کیا۔ اس پر وہاں عملے سے تلخ کلامی ہونے لگی۔ یہاں بیٹھنے والا انجینئر ابھی ڈیوٹی پر نہیں آیا تھا۔ وہ دس بجے آتا تھا اور ہم نو بجے ہی پہنچ گئے تھے۔ بہر حال دس بجے انجینئر آیا تو میں اسے دیکھ کر چونکا۔ اگرچہ وہ خاصا بدل گیا تھا۔ سامنے سے بال اڑ رہے تھے البتہ نقوش وہی تھے مگر اس سے پہلے کہ اسے کچھ کہتا وہ مجھے دیکھ کر چونکا۔ ”سراسر اللہ؟“

”تم سلمان علی ہو؟“

”جی سر۔“ اس نے گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ میں اسے پورے چودہ برس بعد دیکھ رہا تھا۔ ”کیسے ہیں آپ اور یہاں کیسے زحمت کی؟“

”تم لوگوں نے زحمت دی تو زحمت کی۔“ میں نے ہلکے سے کہا۔

دفتر کا عملہ اپنے انجینئر کا میرے ساتھ رویہ دیکھ کر الٹ ہو گیا۔ سلمان نے میرے ساتھ موجود افراد کو دیکھا اور بولا۔ ”میرے ساتھ آئیں اور ان میں کچھ لوگوں کو لینا

یہ کام نہیں ہو سکتا اور یہ بات آپ بھی جانتے ہیں۔“
وہ مایوس ہوئے۔ ”یعنی اب ہیڈ آفس بھی جانا پڑے گا۔“

”تب ہی تو کام ہوگا اور آپ فکر نہ کریں ہم آج ہی جائیں گے اور آج یہ کام وہاں منظور کرا کے آئیں گے۔“
میں نے انہیں تسلی دی اور پھر درخواست کی۔ ”آپ لوگ ذرا زحمت کریں اور باہر کچھ دیر انتظار کر لیں میں اپنے شاگرد سے کچھ بات کر کے آپ کے پاس آتا ہوں پھر ہم ہیڈ آفس چلیں گے۔“

اس دوران میں سلمان فائل میں اپنے ریمارکس دے رہا تھا۔ میرے ساتھی اٹھ کر چلے گئے۔ سلمان نے اپنے سائٹ کر کے اور مہر لگا کر فائل میری طرف بڑھائی۔ ”آپ دیکھ لیں سر۔“

میں نے اس کے ریمارکس دیکھے۔ اس نے ہمارے موقف کی مکمل تائید اور پُر زور سفارش کی تھی کہ ہماری درخواست مان کر اس پر فوری عمل کیا جائے۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا اس پر عمل بھی ہوگا؟“

”ٹیکنیکل سطح پر تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ہر جگہ آپ سے کوآپریٹ کیا جائے گا لیکن جہاں تک نان ٹیکنیکل افسران بالا کا تعلق ہے۔ ان کی اپنی منطق ہوں گی۔ مگر آپ لوگ اسی طرح جائیں گے تو امید ہے کام ہو جائے گا۔ ہمارے ہاں لوگ سب سے زیادہ ہجوم سے گھبراتے ہیں۔“

میں نے فائل بند کر دی۔ ”تم سناؤ، اسکول چھوڑنے کے بعد کیا کیا؟“

”جو کیا وہ آپ کے سامنے ہے۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”انجینئرنگ کے بعد دو سال مختلف جگہوں پر کام کیا پھر یہاں آ گیا۔ مگر چھ سال سے یہیں اٹکا ہوا ہوں۔ میرے ساتھ آنے والے آگے نکل گئے۔“

”تم ذہین تھے اور میرا خیال تھا کہ تم ٹیکو کرٹ کی سطح پر آ جاؤ گے۔ مگر تم بدستور اپنی فیلڈ میں ہو۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، کچھ میری سستی اور کچھ حالات تھے۔ والد صاحب خاصے پہلے انتقال کر گئے اور ان پر کچھ قرض رہ گیا تھا۔ میری بھی شادی ہو گئی اور میں گھرداری میں پھنس گیا۔ اس لیے آگے نہ پڑھ سکا۔ آپ یقین کریں کہ انجینئرنگ کے بعد مجھے جرمنی سے اسکالرشپ بھی مل رہی تھی مگر ان دنوں والد صاحب کی حالت بہت خراب تھی اور میں کسی صورت ان کو چھوڑ کر نہیں

جا سکتا تھا۔ بس اسی چکر میں آگے تعلیم کا سلسلہ رہ گیا۔ مگر اب میں یہاں کورس کر رہا ہوں اور اس کے بعد ایم بی اے کا ارادہ ہے۔“

”اللہ تمہیں کامیاب کرے۔“ میں نے کہا اور اسے اپنا کارڈ دیا۔ ”میری کسی بھی مدد کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔ آج کل اس اسکول میں پرنسپل ہوں اس حوالے سے بھی کوئی کام ہو تو مجھے بلا تکلف بتانا مجھے کر کے خوشی ہوگی۔“
”ضرور سر۔“ اس نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ ”سچ کہہ رہا ہوں میں آپ کو کبھی بھولا نہیں اور آج اتنے سالوں بعد آپ سے مل کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔“

میں باہر آیا جہاں میرے ساتھی بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے اور ہم گاڑیوں میں سوار ہو کر ہیڈ آفس پہنچ گئے۔ سلمان نے ٹھیک کہا تھا۔ ہم ہجوم کی صورت میں اور بہت جارحانہ انداز میں دفتر میں داخل ہوئے تو وہاں کھلبلی سی مچ گئی۔ دروازے پر گارڈز نے ہمیں روکنے کی کوشش کی مگر ہم ان کو دھکیل کر اندر آ گئے۔ ابھی ہم ریسپیشن پر بات کر رہے تھے کہ اندر سے ایک آدمی آیا اور اس نے اپنا تعارف ایڈمن آفسر کے طور پر کرایا۔ ”آپ کا کیا مسئلہ ہے پلیز یہاں آئیے۔“

وہ ہمیں لابی میں لے گیا۔ مگر میں نے اسے مسئلہ بتانے سے انکار کر دیا۔ ”اگر آپ مسئلہ حل کر سکتے ہیں تو میں بتا رہا ہوں لیکن یہ بھی واضح کر دوں کہ پھر آپ کی طرف سے انکار نہیں ہونا چاہیے کہ مسئلہ آپ کے بس کی بات نہیں ہے اس صورت میں ہم اس سے بات کرنا پسند کریں گے جو مسئلہ حل کر سکتا ہے۔“

وہ سمجھدار آدمی تھا اس نے فوراً اپنی آگے کی ہوئی ناک پیچھے کر لی اور بولا۔ ”میں تو معمولی سا افسر ہوں لیکن اگر مسئلے کی نوعیت کا علم ہو تو میں گائیڈ کر سکتا ہوں۔“

”اتنے لوگ آئے ہیں تو مسئلہ پورے علاقے کا ہونا اور ہمیں کسی ڈائریکٹریول کے آدمی سے ملنا ہے۔“ میں نے کہا۔

”ڈائریکٹر تو اس وقت کوئی نہیں ہے۔“

”کوئی بات نہیں ہم انتظار کرتے ہیں۔“ میں نے کہا اور پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ہم سب لابی میں داخلی دروازے کے آگے فرش پر یوں بیٹھ گئے کہ آنے جانے کا راستہ بند ہو گیا۔ اس کے بعد ہم نے مختلف ٹی وی چینلوں کو کالز شروع کر دیں اور ان کو بتانے لگے کہ ہم نے

اس وقت میڈیا والے نہیں آئے تھے اور اس کے تجمائل عارفانہ پر میرا خون کھولنے لگا تھا۔ وہ لازمی راستے میں بریفنگ لیتا ہوا آیا تھا اور اسے سب پتا تھا مگر وہ یہاں انجان بن رہا تھا۔ ”کچھ دیر رک جاؤ۔ میڈیا والے آنے والے ہیں میں ان کے سامنے ہی سب بتاؤں گا کہ ہمارا مسئلہ کیا ہے اور اب تک کیوں حل نہیں ہوا۔“

اس نے فوری صورت حال بھانپ لی اور جلدی سے لہجہ بدل کر بولا۔ ”سر میرے ہوتے ہوئے آپ یہ سب کیوں کر رہے ہیں کاش کہ آپ مجھے ایک کال کر دیتے۔“

”اگر مجھے پتا ہوتا تو میں ضرور کرتا۔“

”سر میرے ساتھ آئیں اور پلیز ان لوگوں سے کہیں کہ یہ اٹھ کر یہاں کرسیوں پر بیٹھیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔“

”میں اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ تمہارے ساتھ چل رہا ہوں۔ لیکن باقی اس وقت تک نہیں رہیں گے جب تک کہ ہمارے مسئلے پر احکام صادر نہیں ہو جاتے۔“

راشد صابر عجلت میں مجھے اور میرے چند ساتھیوں کو اپنے شاندار اور عالی شان حد تک سجے کمرے میں لے گیا جہاں اے سی اس کی آمد سے پہلے پورے زور و شور سے چل رہا تھا اس سے کمر اترتے بنایا ہوا تھا۔ میں نے راشد صابر کے سامنے قائل رکھی جس میں سلمان علی کے ریمارکس بھی تھے۔ یہ ریمارکس دیکھ کر اس کا چہرہ ایک لمحے کو بگڑا تھا مگر فوراً ہی وہ مسکرانے لگا۔ ”سر یہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“

”جب کوئی مسئلہ قابل حل ہوتے ہوئے بھی حل نہ ہو تو پھر اس صورت حال کو کیا کہیں گے؟“ میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ ”جو لوگ اس کے ذمے دار ہیں ان کے بارے کیا کہیں گے؟“

”سر میری بات تو سنیں۔ مسئلہ فنڈز کا بھی ہے۔ بجلی کا سسٹم ہمارے ہاں کس حد تک خراب ہو چکا ہے یہ آپ جانتے ہیں۔“

”خراب نہیں کر پٹ ہو گیا ہے۔“ میں نے صحیح کی۔ ”کوئی اسے ٹھیک نہیں کر رہا سب خراب کر رہے ہیں۔“

”مسئلہ فنڈز کی عدم دستیابی ہے۔“ اس نے گویا بحث کرنے سے گریز کیا۔ ”اس وجہ سے نہ صرف آپ کی کالونی بلکہ دوسرے بہت سے علاقوں میں سسٹم اپ گریڈ نہیں کیا جا سکا ہے۔“

بجلی کے محکمے کے ہیڈ آفس میں کھس کر دھرنا دیا ہوا ہے جب تک ہمارا مسئلہ حل نہیں ہو گا ہم یہاں سے نہیں اٹھیں گے۔ یہ سب وہاں موجود کارکنوں کے سامنے ہو رہا تھا اور وہ دیکھ رہے تھے کہ ہم میڈیا کو کال کر رہے ہیں۔ اس کا فوری رد عمل ہوا۔ وہی افسر اندر سے نمودار ہوا اور اس نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ ”پلیز ایسا نہ کریں۔ آپ سے ملاقات کے لیے ایک ڈائریکٹر آرہے ہیں۔“

”جب وہ آجائیں گے تو ہم یہاں سے اٹھ جائیں گے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اس سے پہلے ہمیں کوئی نہیں اٹھا سکتا۔ اگر زور زبردستی کی گئی تو اس کا نتیجہ بھی دیکھ لینا۔“

بہر حال ہماری پلاننگ کا نتیجہ یہ نکلا کہ آدھے گھنٹے بعد ہی وہ ڈائریکٹر صاحب آگئے اور میں انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا کیوں کہ وہ کوئی اور نہیں بلکہ راشد صابر تھا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ آج میرا تعلق کیا اپنے سابق شاگردوں سے ہی پڑے گا۔ شاگرد بھی وہ جنہیں میں خاص طور سے جج کرتا تھا۔ راشد صابر پہلے کے مقابلے میں بہت پالش ہو گیا تھا۔ اس کے سیاہ اور گھنے بال بہت اچھے اشاکل میں بنے اور سجھے ہوئے تھے۔ اس نے اعلیٰ درجے کا تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں قیمتی بریف کیس تھا۔ ایک تو وہ ڈائریکٹر تھا اور دوسرے اس کا انداز اور پری طبتے والا تھا لگ رہا تھا اس نے خاصی سے بھی زیادہ ترقی کر لی ہے۔ اس نے بے نیازی سے ہماری طرف دیکھا اور افسر سے پوچھا۔ ”یہ لوگ کون ہیں اور یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟“

”یہ سوال ہم سے کرو اور ہم سے پہلے خود سے کرو کہ ہمیں یہاں آنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟“ میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ”ویسے راشد صابر میں نے تمہارے بارے میں نہیں سوچا تھا کہ تم ایک دن اس لیول تک پہنچ جاؤ گے۔“

اپنے نام پر وہ چونکا۔ ”آپ کون ہیں؟“

”اب مجھے زیادہ افسوس ہو رہا ہے کہ تم میرے شاگرد رہے ہو اور مجھے ہی نہیں پہچان رہے۔ بہر حال مجھے کسی قدر اندازہ ہو رہا ہے کہ تم یہاں کس طرح پہنچے ہو۔“

”سر اسد اللہ؟“ اس نے بے یقینی سے کہا۔ ”یہ آپ ہیں۔“

”ہاں میں ہوں۔“

اس نے آس پاس دیکھا۔ ”سر یہ لوگ کون ہیں اور اس طرح کیوں بیٹھے ہیں۔“

اپنے نام پر وہ چونکا۔ ”آپ کون ہیں؟“

”اب مجھے زیادہ افسوس ہو رہا ہے کہ تم میرے شاگرد رہے ہو اور مجھے ہی نہیں پہچان رہے۔ بہر حال مجھے کسی قدر اندازہ ہو رہا ہے کہ تم یہاں کس طرح پہنچے ہو۔“

”سر اسد اللہ؟“ اس نے بے یقینی سے کہا۔ ”یہ آپ ہیں۔“

”ہاں میں ہوں۔“

اس نے آس پاس دیکھا۔ ”سر یہ لوگ کون ہیں اور اس طرح کیوں بیٹھے ہیں۔“

اپنے نام پر وہ چونکا۔ ”آپ کون ہیں؟“

”اب مجھے زیادہ افسوس ہو رہا ہے کہ تم میرے شاگرد رہے ہو اور مجھے ہی نہیں پہچان رہے۔ بہر حال مجھے کسی قدر اندازہ ہو رہا ہے کہ تم یہاں کس طرح پہنچے ہو۔“

ٹیز مشکل سے ایک تہائی لوڈ اٹھا رہی ہیں اس لیے مہربانی کر کے اے سی استعمال نہ کریں ورنہ پنکھوں سے بھی جائیں گے۔“

اس کی بات بھی درست تھی کہ لوگ اس بات کا خیال کیے بغیر کہ پی ایم ٹی اڑ جائے گی۔ اے سی چلاتے تھے اور یہاں تقریباً ہر گھر میں اے سی تھے۔ خود میرے گھر میں تین اے سی لگے تھے اگرچہ ہم بجلی کے بل کے خیال سے ایک ہی چلاتے تھے۔ مگر جو صاحب حیثیت تھے وہ سارے ہی اے سی چلاتے تھے اور اس وجہ سے پی ایم ٹی پر حد سے زیادہ لوڈ آجاتا تھا۔ انجینئر کی درخواست کے باوجود لوگوں نے اے سی چلانا جاری رکھے اور نتیجے میں ٹرپنگ کا مسئلہ ہوتا رہا۔ اگلے دن سے سرویسر نے اپنا کام شروع کر دیا وہ ہر گھر میں آکر لوڈ چیک کر رہا تھا کہ اسی لحاظ سے اگلی پی ایم ٹیز لگائی جائیں اور یہ مسئلہ حل ہو سکے۔ مگر ہمارا یہ اندازہ درست ثابت ہوا کہ مسئلہ ایک ہفتے میں حل ہونے والا نہیں تھا۔ سرویسر گیا اور اس کے بعد معاملہ ٹھنڈا ہو گیا۔ ایک ہفتے بعد میں نے چند افراد کے ساتھ جا کر راشد سے بات کی۔ وہ ملا مگر اس کا رویہ خاصا بدلا ہوا تھا اس نے کہا کہ وہ پوری کوشش کر رہا ہے کہ جلد از جلد پی ایم ٹیز کے فنڈز منظور ہو جائیں اور وہ پی ایم ٹیز لگوادے۔ جب میں نے اسے اس کے الفاظ یاد دلوائے کہ اس نے ایک ہفتے میں مسئلہ حل کرنے کا کہا تھا تو وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مگر اس ملک میں ہر کام کہاں اسی طرح ہوتا ہے جس طرح کہا جاتا ہے۔ بہر حال میں کوشش کر رہا ہوں۔“

واپسی پر ہمارا خیال تھا کہ مسئلہ ایک بار پھر اٹھکیاں ٹیز ہی کرنے سے ہی حل ہوگا۔ کالونی کے ممبران نے مینٹنگ کی اور مجھے راشد سے حتمی بات کرنے کو کہا۔ کیونکہ وہ باقیوں کو خاطر میں نہیں لارہا تھا۔ اس سلسلے میں میری اس سے دو تین بار بات ہوئی۔ پی ایم ٹیز کا مسئلہ تو چلتا رہا لیکن رفتہ رفتہ یہ عقد کھلا کہ راشد یہاں تک کیسے پہنچا تھا۔ اس نے بی کام میں داخلہ لیا تو اسی وقت اس کے ذہن میں سول سروس کا سودا سمایا ہوا تھا۔ اس نے گریجویشن کرتے ہی ایم کام میں داخلہ لیا اور اس کے ساتھ ساتھ سول سروس کے امتحان کی تیاری شروع کر دی۔ تختی وہ بہت تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اصل چابی انگریزی میں مہارت ہے اور اس نے بہت محنت کر کے اس میں مہارت حاصل کر لی۔ جیسے ہی ایم کام کے پیمپرز ہوئے اس نے سول سروس کے امتحان کے لیے درخواست

”ہماری کالونی سے صرف دو میل کے فاصلے پر کچھ امرا اور وزرا کے فارم ہاؤسز ہیں اور وہاں چھ عدد پی ایم ٹیز ابھی حال میں لگی ہیں ان کے لیے فنڈز کہاں سے آیا؟“

”سر آپ جانتے ہیں سرکاری کام الگ ہوتے ہیں اور عوامی کام الگ طریقے سے ہوتے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن آپ اطمینان رکھیں آپ کا کام ہوگا۔ اس میں کچھ وقت لگے گا مگر یہ ہوگا ضرور۔“

”کتنا وقت لگے گا اور ابھی تو ہماری مین پی ایم ٹی اڑ گئی ہے اس لیے اگلی پی ایم ٹی بھی بند ہے۔ اس گرمی میں بجلی بالکل نہیں ہے۔“

”یہ کام ابھی ہو جائے گا۔“ اس نے کہا اور فون اٹھاتے ہوئے کسی کو کال کی۔ ”غیاث میں راشد بات کر رہا ہوں۔ کالونی کی مین پی ایم ٹی اڑ گئی ہے..... ریجن کو بھول جاؤ، ابھی گاڑی اور سامان لے کر فوراً وہاں پہنچو اور دو گھنٹے کے اندر سب اوکے کر دو۔ اسٹازر جنٹ۔“ اس نے بات مکمل کرتے ہی کال کاٹ دی اور مجھ سے بولا۔ ”سر آپ کافی الجھال یہ کام ہو گیا ہے۔“

”اور دوسرا؟“

”کل ہمارا سروے ابھی سر آپ کی کالونی آئے گا۔ وہ لوڈ چیک کرے گا اور سروے مکمل کر کے دو دن میں رپورٹ کرے گا۔ جیسے ہی اس کی رپورٹ آئے گی میں اپر وول کے لیے خود اوپر لے جاؤں گا اور مشکل سے ایک ہفتے میں آپ کا مسئلہ حل ہو جائے۔“

ہم سب ہی سمجھ رہے تھے کہ ایک ہفتے میں حل ہونے والا مسئلہ نہیں ہے لیکن اگر یہ ایک مہینے میں بھی حل ہو جائے تو ہماری خوش قسمتی ہوگی۔ مگر اس وقت اس نے کسی حد تک ہمارا مسئلہ زبانی ہی سہی لیکن حل کر دیا تھا۔ ہماری مزید تسلی کے لیے اس نے سروے انجینئر کو بھی اسی وقت حکم جاری کر دیا تھا۔ کام ہو گیا تھا اس لیے ہم وہاں سے اٹھ آئے۔ لیکن میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ میں سلمان کی طرح راشد سے بھی بات کروں۔ مجھے لگ رہا تھا وہ اپنی محنت اور قابلیت سے اس مقام تک نہیں آیا تھا۔ اس نے لازمی کوئی دو نمبری کی تھی۔ یوں سمجھ لیں کہ وہ سلمان سے کئی گریڈ اوپر کا افسر تھا اور سلمان جیسے اس کے درجنوں ماتحت ہوں گے۔ ہم واپس پہنچے تو بجلی کی گاڑیاں آچکی تھیں اور کام جاری تھا۔ کام کی نگرانی کرنے والے انجینئر نے ہم سے کہا۔

”آپ لوگوں کو لوڈ بہت زیادہ ہے اور یہ دو پی ایم

دے دی۔ اس کا ٹیسٹ اور انٹرویو اچھا ہوا۔ پھر زبھی اچھے ہوئے تھے۔ جب نتیجہ آیا تو وہ سو پہلے امیدواروں میں شامل تھا۔ اس نے وزارتِ مواصلات اور توانائی کو منتخب کیا۔ چند سال وہ وزارت میں رہا اور پھر یہاں بجلی کے محکمے میں آ گیا۔ اس دوران میں اس نے بیوروکریسی کے طاقتور حلقوں سے تعلقات بنا لیے تھے اس لیے بہت جلد وہ پروموٹ ہوا اور اب یہاں ڈائریکٹر کے طور پر کام کر رہا تھا جب کہ اس کی عمر بہ مشکل اکتیس برس تھی۔ اس کے ساتھی کیا اس کے تمام ماتحت بھی اس سے عمر میں بڑے تھے۔ اس سے بچے اندازہ ہوا کہ اس نے کتنی تیزی سے ترقی کی تھی۔ ان چند ملاقاتوں میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اگر وہ چاہے تو ہمارا پی ایم ٹیز کا مسئلہ جلدی حل کر سکتا ہے مگر وہ زیادہ دل چسپی نہیں لے رہا تھا۔ اس لیے میں نے آخری ملاقات میں اس سے کہا۔

”میں خود یوں نہیں آیا کہ اگر تم میری لاج رکھتے ہوئے شروع میں یہ مسئلہ حل کر دیتے تو میں خود آتا مگر تم نے کچھ حساب کتاب کے بعد یہ کام کیا۔ بہر حال میں اور میری کالونی والے پھر بھی تمہارے شکر گزار ہیں۔“

یہ چھ سال پہلے کی بات تھی۔ وقت گزرتا رہا حکومتوں پر حکومتیں بدلتی رہیں۔ مگر ملک اور عوام کے حالات وہی رہے۔ کبھی پہلے سے بدتر ہو جاتے اور کبھی کسی قدر بہتر ہو جاتے۔ بدتر اس وقت ہوتے کہ کوئی دستیاب چیز اچانک ہی غائب ہو جاتی۔ کبھی بجلی، کبھی گیس اور کبھی پیٹرول۔ کھانے پینے کی اشیاء کا ذکر میں نے یوں نہیں کیا کہ ان کی قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کے ہم عادی ہو چکے ہیں۔ سی این جی تو بند تھی کچھ عرصے پہلے پیٹرول بھی غائب ہو گیا۔ ان دنوں میں، بیگم اور بچے کس طرح اسکول و کالجز آئے گئے یہ ہم ہی جانتے تھے۔ محلے والے ایک دوسرے کی گاڑیوں میں بھر کر دفاتروں کو جا رہے تھے اور بعض اوقات ایک گاڑی میں سات آٹھ افراد ٹھنسنے ہوتے تھے۔ جب یہ بحران گزر گیا اور اسی طرح دوسرے بحران گزر جاتے ہیں تو ہم بہتری محسوس کرتے ہیں۔

میں نے بتایا کہ جب میں اس علاقے میں آیا تو یہ لاہور سے باہر شمار ہوتا تھا۔ آبادی بہت کم اور زمین و مکان بہت سستے تھے۔ کم سے کم آج کل کی قیمتیں دیکھی جائیں تو یہ مفت ہی ملے تھے۔ میں نے مکان کے ساتھ دو عدد پلاٹ بھی لیے تھے۔ میرا ارادہ تھا کہ ایک بیٹیوں کی شادی کے لیے رکھوں گا اور دوسرا بیٹے کی تعلیم کے لیے۔ بیس سال پہلے جب ہمارے ملک میں نجی تعلیمی ادارے جو اعلیٰ پیشہ وارانہ تعلیم دیتے تھے ان کی تعداد سرکاری جامعات کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ تب میں نے اندازہ لگایا کہ ایک وقت آئے گا جب سرکاری جامعات کا حال بھی سرکاری اسکولوں

”دیکھو تم میرے شاگرد رہے ہو اس لیے معاملہ ابھی میرے ہاتھ میں دیا، ہوا ہے ورنہ اس کالونی میں رہنے والے لوگ معمولی حیثیت کے نہیں ہیں ان میں سب سے معمولی مجھے ہی سمجھو۔ ورنہ وہاں ایک سے بڑھ کر ایک آدمی ہے اور وہ اپنے تعلقات استعمال کرنے پر تل گئے تو اوپر سے آنے والے دباؤ کے بعد کام کرو گے۔ ممکن ہے تم کچھ فائدہ اٹھا لو لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہیں تاخیر کا ڈرے وار قرار دے دیا جائے۔ اس لیے بہتر ہے تم جلد از جلد اسے مکمل کر لو۔“

وہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ ”آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں۔“

”نہیں، سمجھا رہا ہوں تم دس برس میرے شاگرد رہے اور بارہا ایسا ہوا کہ تم میرے سامنے آئے۔ تم کمزور اور معمولی سے بچے تھے کیا اس وقت تمہیں کبھی دھمکی دی، نہیں میں نے ہمیشہ تمہیں سمجھایا۔ تم آج بھی میرے لیے شاگرد ہو اور میں تمہیں آج بھی سمجھا رہا ہوں۔ آگے تمہاری مرضی ہے۔“

میں نے واپس آ کر کالونی والوں سے کہہ دیا کہ میرے بس میں جو تھا میں کر چکا ہوں اب جو حکم بیچوں گا۔ اگلے اتوار کو میٹنگ کال کر لی گئی، سب کا موڈ جارحانہ تھا اور شاید سب نے اپنے اپنے تعلقات استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مگر اس سے پہلے ہی جمعے والے دن ٹرکوں میں

ایک بیس میں، اسی میں تیری خیریت ہے۔“
 ”مجھے شاہ جی کا پتہ دے دو میں چلا جاتا ہوں۔“
 دوسرے نے ایک گالی دی اور آگے بڑھا۔ ”دو
 تجھے شاہ جی کا پتا۔“

میں اندر سے خوفزدہ ہوا تھا مگر اوپر سے ثابت قدم
 رہا۔ ”نہ دو وہ میں کہیں اور سے لے لوں گا مگر جب شاہ جی کو
 پتا چلے گا کہ تم نے مجھے اس کا پتا نہیں دیا اور بات خراب ہوئی
 تو وہ.....“ میں نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور
 میری توقع کے عین مطابق وہ دب گئے تھے۔ ان کا خیال تھا
 کہ میں کوئی اونچی پارٹی ہوں اور مجھ سے ذرا ادب سے
 بات کرنا ان کے مفاد میں تھا۔ ان میں سے ایک نے
 کہا۔ ”ٹھیک ہے شاہ جی سے بات کر کے پوچھ لیتا ہوں۔“
 ”میں خود پوچھ لوں گا تم نمبر دے دو۔“

مگر وہ نہیں مانا اور اپنے موبائل سے کال کی۔ یہ لوگ
 دب گئے تھے مگر سرور شاہ جیسے لوگ کہاں دبتے ہیں اس نے
 اُسے گروں کو حکم دیا کہ وہ مجھے یہاں سے نکال دیں۔ میں
 گفتگو اور بات کرنے والے کے تاثرات سے کچھ گیا تھا کہ
 شاہ جی کیا کہہ رہا ہے اس سے پہلے کوئی مجھے دھکے دیتا
 میں خود پلٹ گیا اور اچالے کے پاس رک کر اونچی آواز سے
 کہا۔ ”شاہ جی سے کہہ دینا جگہ خالی کر دے اس میں اس کا
 بھی فائدہ ہے۔“

وہ میرے پیچھے دوڑے لیکن میں اس سے پہلے وہاں
 سے نکل گیا۔ یہ سب دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا تھا۔ مگر تعلیم
 اور عمر نے مجھے سکھایا تھا کہ مسئلہ لڑائی سے اسی وقت حل ہوتا
 ہے جب آپ کے بازوؤں میں لڑنے کا دم ہو۔ یہ دم
 میرے پاس نہیں تھا اس لیے میں نقصان میں رہتا۔ میں نے
 دیکھ لیا تھا کہ اس کالونی میں بھی اچھے خاصے مکانات بن گئے
 تھے اور ان میں سے اکثر بہت اچھے بنے ہوئے تھے یعنی
 یہاں پیسے والے لوگ آباد تھے۔ اب یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ
 سرور شاہ جی جیسے تھے یا محنت کر کے کمانے والے تھے۔
 سڑکیں اور گلیاں پختہ تھیں اور تمام سہولتیں بھی آگئی تھیں اس
 لیے مجھے اُمید تھی کہ ان پلاٹوں کی ویلیو تقریباً ساٹھ سے ستر
 لاکھ تک ہوگی۔ مگر قیمت تو اس وقت ملتی جب پلاٹ میرے
 قبضے میں ہوتے اور یہاں تو کوئی اور قبضہ کر کے بیٹھا ہوا تھا۔
 ہماری کالونی میں ایک صاحب ناصر حسین ڈی آئی جی کے
 پی اے تھے۔ میں نے واپس آتے ہی ان سے بات کی اور
 انہیں مسئلہ بتایا تو انہوں نے کہا۔

اور کالجوں جیسا ہو جائے گا اور تب پیشہ وارانہ تعلیم بھی نجی
 اداروں کے ہاتھ میں چلی جائے گی اور اس وقت یہ بہت
 مہنگی اور سفید پوش طبقے کی پہنچ سے باہر ہو جائے
 گی۔ میں نے احد کی تعلیم کے لیے اسی وقت سے سوچ لیا تھا
 کہ مجھے شاید بہت بڑی رقم کی ضرورت پڑے جو ہم
 ملازمت پیشہ بچت کر کے جمع نہیں کر سکتے تھے اس لیے ایک
 پلاٹ احد کے لیے لیا تھا۔ یہ آدھے آدھے کنال کے دو
 پلاٹ تھے اور ساتھ ساتھ تھے۔ اگر دونوں کو ملا کر ایک کنال
 بنا کر فروخت کرنا تو ان کی زیادہ قیمت مل سکتی تھی۔

دو سال پہلے ساحل کی شادی کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس
 کی منگنی اپنے چچا زاد سے ملے تھی۔ میرا بھتیجا آرمی میں کیپٹن
 ہے۔ بلکہ اس وقت کیپٹن تھا اب وہ میجر کی پوسٹ پر آ گیا
 ہے۔ میرے بڑے بھائی نے ساحل کو بچپن میں مانگ لیا تھا
 اور میں نے یہ رشتہ بڑے ہونے کے بعد ساحل کی
 رضامندی سے مشروط کر کے مان لیا تھا۔ ساحل نے بڑے
 ہونے کے بعد اس رشتے کو پسند کیا اور یوں شادی کا فیصلہ
 ہوا۔ مگر ساحل ماسٹر کر رہی تھی اس لیے شادی میں تاخیر ہوئی
 تھی۔ اس کا ماسٹر مکمل ہو گیا تو میں نے پلاٹ فروخت کرنے
 کا سوچا۔ کئی سال ہو گئے تھے کہ میں پلاٹ دیکھنے بھی نہیں گیا
 تھا۔ حالانکہ وہ برابر والی کالونی میں تھے۔ وہاں سہولتیں بھی
 آگئی تھیں۔ اس لیے مجھے اُمید تھی کہ ان کی قیمت اب اچھی
 خاصی ہو گئی ہوگی۔ مگر جب میں پلاٹ دیکھنے پہنچا تو وہاں
 بھینسوں کا باڑا بنا ہوا تھا اور چند بد معاش قسم کے لوگ
 چارپائیوں پر استراحت فرما رہے تھے۔ میں نے
 پوچھا۔ ”اس باڑے کا مالک کون ہے؟“

”سرور شاہ جی۔“ ان میں سے ایک نے جواب
 دیا۔ ”تم کون ہو؟“
 ”سرور شاہ جی کہاں ہے؟“

”اوہ جی وہ اپنے ڈیرے پر ہوتا ہے یہاں اس کا کیا
 کام۔“ دوسرے نے جواب دیا۔ ”کام کے لیے ہم بیٹھے
 ہیں، فرماؤ کیا بات ہے؟“
 ”بات یہ ہے کہ تم لوگ جس زمین پر بیٹھے ہو یہ میری
 ہے۔“ میں نے ملائمت سے کہا۔ ”اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ
 میرا شاہ جی سے بات کرنا کیوں ضروری ہے۔“
 ابھی میں نے بات مکمل بھی نہیں کی تھی کہ وہ کھڑے
 ہو گئے اور ان کے تیور خطرناک ہو گئے۔ ان میں سے ایک
 آگے آیا اور دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔ ”باؤ چلا جا یہاں سے

اسلامیہ یونیورسٹی

پاکستان میں قائم ہونے والی پہلی اسلامی یونیورسٹی۔ اس کا قیام جامعہ عباسیہ بہاولپور کی حیثیت سے 1965ء میں ہوا اسے جامعہ زہرہ قاہرہ مصر کی ٹیچ پر اسلامی علوم کی تعلیم کے مرکز کی حیثیت سے متعارف کرایا گیا۔ 1964ء میں اس کا نام جامعہ عباسیہ سے تبدیل کر کے جامعہ اسلامیہ رکھ دیا گیا اور جدید سائنسی علوم کی تدریس کا آغاز ہوا۔ 1975ء میں پنجاب اسمبلی کے ایکٹ کے مطابق اسے ملک کی دیگر جامعات کے مساوی درجہ دے دیا گیا جس میں سائنس، سوشل سائنسز، لسانیات، ایم بی اے اور کمپیوٹر سائنس میں ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر تدریس اور تحقیق کا آغاز ہوا۔ یہ ملک کی واحد یونیورسٹی ہے جس میں ایم اے ایم ایس کی سطح پر اسلامیات لازمی کا مضمون متعارف ہے۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کا کلیہ علوم اسلامیہ پاکستان کے ممتاز کلیات میں شمار کیا جاتا ہے اور اسلامی علوم کی تحقیق کے حوالے سے اس کا ایک منفرد مقام ہے۔ 2002ء میں تین نئے شعبہ جات قائم کیے گئے جن میں (1) قرآن و تفسیر (2) حدیث و سیرت اور (3) تقابل ادیان شامل ہیں۔ شعبہ علوم اسلامیہ، شعبہ عربی زبان و ادب، شعبہ اسلامی تاریخ اور سیرت چیئر کا ایک ریسرچ سل پہلے ہی سے کام کر رہا ہے۔ سیرت چیئر سل کو یونیورسٹیز کی سطح پر پہلی انٹرنیشنل سیرت کانفرنس منعقد کرانے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس سل کے تحت اب تک چھ مستقل تحقیقات سامنے آچکی ہیں۔ کلیہ علوم اسلامی کا تحقیقی مجلہ بھی شائع ہوتا ہے۔

مرسلہ: اقرار الحسن سومرو۔ خیر پور میرس

”کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے آپ کل ایک درخواست ڈی آئی جی کے نام لکھ کر لے آئیں اور میں ان سے بات کر لوں گا۔ تھانے کی ایک وین آپ کے ساتھ جائے گی اور ان کو وہاں سے اٹھا دے گی۔“

میں نے اگلے دن اسکول سے چھٹی کی اور ڈی آئی جی کے دفتر پہنچ گیا۔ میں نے درخواست ناصر حسین کو دی اور انہوں نے ڈی آئی جی تک پہنچائی۔ ڈی آئی جی نے اسی وقت ہمارے علاقے کے تھانے کال کی اور میرے بارے میں بتاتے ہوئے درخواست پر فوری عمل درآمد کرنے کو کہا۔ ناصر حسین نے مجھ سے کہا۔ ”آپ تھانے چلے جائیں وہاں سے یہ کام ہوگا۔“

میں نے درخواست کے ساتھ پلاٹوں کی ملکیت کی دستاویزات بھی لگائی تھیں۔ اس تیز رفتار کارروائی سے مجھے امید بندھی کہ شاید میرا کام اب آسانی سے ہو جائے گا۔ مگر جب میں تھانے پہنچا اور محرر سے بات کی تو اس نے بے نیازی سے کہا۔ ”ڈی ایس پی صاحب ابھی مصروف ہیں۔“ میرا ماتھا ٹھنکا۔ یہاں ڈی آئی جی کا حوالہ بھی کام نہیں کر رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وال میں کالا تھا۔ میں نے ایک طرف ہو کر ناصر صاحب کو کال کی اور انہیں صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ بھی نگر مند ہو گیا۔ ”اسد بھائی یہ تو کہانی کچھ اور لگ رہی ہے۔ میں دیکھتا ہوں۔“

ناصر صاحب نے کچھ کیا تو دس منٹ بعد ڈی ایس پی کے کمرے سے بلاوا آ گیا۔ میں وہاں پہنچا تو ایک ادھیڑ عمر اور صورت سے بد معاش نظر آنے والا شخص وہاں پہلے سے موجود تھا۔ ڈی ایس پی نے بہت سرد انداز میں مجھے سامنے بیٹھنے کو کہا اور چھوٹے ہی پوچھا۔ ”تم ہو اسد اللہ جو شاہ جی کی زمین کو اپنی ملکیت بنا رہے ہو۔“

اس نے کہتے ہوئے غیر محسوس انداز میں بد معاش صورت کی طرف دیکھا تھا۔ میں نے کہا۔ ”ہاں اور کیا یہی سرور شاہ جی ہیں۔“

”میں ہوں سرور شاہ جی۔“ اس نے رعونت سے تعارف کرایا۔

”میں اسد اللہ اسکول پرنسپل ہوں اور یہ زمین میں نے بیس سال پہلے خریدی تھی۔ میرے پاس اس کے تمام کاغذات ہیں اور رجسٹر آفس میں بھی یہ میرے نام ہے۔“

”اوہ میاں جی۔“ سرور شاہ تمسخرانہ انداز میں

بولاً۔ ”کہنے سے بیوی اور گھوڑی اپنی نہیں ہو جاتی۔ اس پر قبضہ رکھنا پڑتا ہے۔“

”شاید تم ایسا ہی کرتے ہو گے لیکن میں ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہوں ہمارے ہاں عورتوں کو عزت سمجھا جاتا ہے۔“ میں نے سکون سے کہا۔ ”تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ وہ زمین تمہاری ہے؟“

”ثبوت جتنے چاہو مل جائیں گے۔ کسی آٹومیٹک بھی اور آٹومیٹک بھی۔“ اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ میں نے بے نیازی سے موبائل میں لگے ڈی ایس پی سے کہا۔ ”آپ اس کی بات سن رہے ہیں۔ یہ مجھے قتل کی دھمکی دے رہا ہے۔“

”اوپاؤ۔“ اس بار سرور شاہ کے تیور خطرناک ہو گئے۔ ”سرور شاہ دھمکی نہیں دیتا کر گزرتا ہے۔ اگر اپنی اور اپنے خاندان کی خیریت چاہتے ہو تو اس جگہ سے دور رہو۔ یہ مت سمجھنا کہ ڈی آئی جی کی ایک کال سے زمین مل جائے گی۔ تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو زمین ملی بھی تو میانی صاحب میں ملے گی۔“

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اب میری سمجھ میں آ گیا تھا کہ مقامی پولیس اس معاملے میں پوری طرح ملوث تھی اور بات صرف میری زمین کی نہیں تھی یقیناً یہ کوئی قبضہ مافیا تھی جس نے بڑے پیمانے پر دوسروں کی زمین پر قبضہ کر رکھا تھا۔ ان لوگوں سے بات کرنا بیکارگی میں کھڑا ہوا تو سرور شاہ میرے ساتھ باہر تک آیا اور اس نے برآمدے میں آہستہ سے کہا۔ ”پرہیز میں تمہارا پتا جانتا ہوں اور یہ بھی کہ تمہارے بچے کہاں پڑھتے ہیں۔ تمہاری تین جوان بیٹیاں ہیں اور بیٹا تو ایک ہی ہے۔ خیال رکھنا بیٹے کی جان اور بیٹیوں کی عزت بہت قیمتی ہوتی ہے۔“

”سرور شاہ وہ پلاٹ میں نے حق حلال کی کمائی سے لیے اور مجھے یقین ہے کہ اسے کوئی مجھ سے چھین نہیں سکتا ہے۔ میری قسمت میں ہوں گے تو مجھے ضرور ملیں گے۔“ میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ”ٹھیک ہے میں تم جیسے آدمی کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور میرے بچوں کا ایک ناخن بھی اس زمین سے زیادہ قیمت رکھتا ہے۔ مگر تم یہ مت سمجھنا کہ میں ڈر جاؤں گا۔ میں نہ کسی لیکن ممکن ہے جلد کوئی تم سے تمہاری زبان میں بات کرے۔“

وہ سفاک انداز میں مسکرایا۔ ”اس کے لیے تو سرور شاہ ہمیشہ تیار رہتا ہے۔“

میں نے اسے جوابی دھمکی دے دی تھی مگر اس کا کوئی امکان نہیں تھا کہ میری طرف سے اسے کوئی اسی کے انداز میں جواب دے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب میں کیا کروں۔ ٹھیک ہے میرے خاندان میں بہت سے اعلیٰ سرکاری عہدوں پر تھے۔ پولیس اور فوج میں بھی تھے مگر بد معاشوں سے کون لڑ سکتا ہے جب کہ وہ آپ کے بچوں کے حوالے سے دھمکی دے رہے ہوں۔ جب بیگم اور بچوں کو پتا چلا تو وہ ہم گئے۔ بیگم نے کہا۔ ”بھاڑ میں جائے ایسی زمین، ہمارے لیے جان اور عزت سے زیادہ قیمتی چیز اور کچھ نہیں ہے۔“

”مگر بیگم ہمارے پاس اثاثہ بھی پلاٹ ہیں۔ میں نے تو سوچا تھا کہ انہیں فروخت کر کے بچیوں کی شادی کریں گے اور احد کو اعلیٰ تعلیم دلائیں گے۔ اس نے ایف ایس سی کر لیا ہے اور اب اسے کسی یونیورسٹی میں داخلہ لینا ہے۔“

”سب ہو جائے گا مگر آپ ان بد معاشوں کے پاس دوبارہ نہیں جائیں گے۔“

میں نے بیگم اور بچوں سے وعدہ کر لیا کہ میں ایسی کوئی کوشش نہیں کروں گا۔ مگر اندر سے مجھے بے چینی تھی۔ مجھے یاد ہے جب میں نے یہ پلاٹ لیے تو میں اس حد تک خالی ہاتھ ہو گیا تھا کہ چند مہینے ہم نے بہت مشکل سے گزارا کیا تھا۔ میں نے کچھ قرض بھی لیا تھا، اسے اتارنے کے چکر میں ہم نے بعض اوقات تین کے بجائے دو وقت بھی کھایا تھا اور بیگم نے سال بھر ایک سوٹ بھی نہیں بنایا تھا۔ بچوں نے اپنا دل مارا تھا۔ صرف ان پلاٹوں کی خاطر اور آج جب ہمیں ضرورت تھی تو ان پر دوسرے قبضہ کر کے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے پلاٹوں پر دوبارہ جانے اور سرور شاہ کے خلاف خرید کارروائی کی کوشش نہیں کی تھی۔ مگر میں ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگ گیا۔ میں اس کا لوٹی میں گیا اور وہاں لوگوں سے ملا۔ اکثر نے تو کسی قسم کے تعاون سے انکار کر دیا کیونکہ ان بد معاشوں سے سب ڈرتے تھے۔ اگرچہ وہ ان سے نفرت بھی کرتے تھے کیونکہ انہوں نے نہ صرف صاف ستھری کالونی کو قبضہ کر کے خراب کیا تھا بلکہ یہاں کا ماحول بھی گندہ کر رہے تھے۔

مگر ایک دو افراد نے تعاون کیا اور انہوں نے انکشاف کیا کہ سرور شاہ اصل میں سیاسی پشت پناہی کی بنیاد پر اتنا اکر رہا ہے۔ اس شخص کی کوئی ذاتی حیثیت نہیں ہے۔

سابقہ اپکشن میں اس نے جیتنے والے امیدوار کے لیے حلقے میں بہت کام کیے یعنی جتنے غنڈہ گردی والے کام تھے وہ اس نے اپنے ڈٹے لے لیے اور کامیابی کے بعد اس امیدوار نے اسے علاقے میں زمینوں پر قبضے کے لیے کھلی چھوٹ دی تھی۔ صرف اسی کالونی میں نہیں سرورشاہ نے بے شمار جگہوں پر قبضے کر کے وہاں اپنے بندے بٹھار کھے تھے۔ جن زمینوں پر اس کا قبضہ پکا ہو جاتا اور وہ ان کے کاغذات کسی وجہ سے حاصل نہیں کر پاتا تھا تو ان کے جعلی کاغذات بنوا لیتا تھا۔ رجسٹرار آفس میں اس کے تعلقات تھے اور وہاں سے اصلی ریکارڈ غائب کروا دیتا تھا۔ یہ سن کر مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں وہ میرے پلاٹوں کا ریکارڈ بھی غائب نہ کروادے۔ میں اگلے دن ہی رجسٹرار کے دفتر گیا۔

وہاں کافی پاپڑ بیلنے کے بعد میری زمین کا ریکارڈ برآمد ہوا اس کی حالت سے لگ رہا تھا کہ یہ شاید بڑے کی زمین کا ریکارڈ تھا۔ مگر یہ دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ یہ میری ہی زمین کا ریکارڈ تھا۔ جو آج کے کمپیوٹرائزڈ دور میں بھی خستہ حال فائلوں کی صورت میں تھا اگر اسے دیکھ کھا جاتی تو میرے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا کہ وہ پلاٹ میرے ہیں۔ اگرچہ قبضہ مافیا کی دیکھ کا خطرہ تھا۔ مگر وہ ابھی میری زمین کے ریکارڈ تک نہیں پہنچی تھی اس لیے یہ برقرار تھا۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر رجسٹرار سے اپنی فائلوں کی مصدقہ نقول حاصل کر لیں۔ شاید یہ دل کو تسلی دینے والی بات تھی کیونکہ سرورشاہ نے بنا کسی ہیرا پھیری کے خالص زور زبردستی سے میری زمین پر قبضہ کیا ہوا تھا اور شاید اسے ان چیزوں کا پرواہ بھی نہیں تھی ورنہ جیسا کہ میں نے سنا تھا وہ رجسٹرار آفس تک رسائی رکھتا تھا اور وہاں ریکارڈ غائب کرادیا کرتا تھا۔

ہمارے علاقے کا ایم پی اے جو ملک صاحب کے نام سے مشہور تھا۔ میں اسے نہیں جانتا تھا اور نہ ہی میں نے گزشتہ انتخابات میں ووٹ کاسٹ کیا تھا میرے حساب سے کوئی جماعت ایسی نہیں ہے جسے۔ آدمی ووٹ دے سکے۔ حد یہ کہ جو تہذیبی کانفرنس لگا کر آئے وہ بھی ان کی نقل کر رہے تھے جو برسوں سے اس ملک پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ مجھے کوئی تہذیبی نظر نہیں آئی اس لیے اپکشن والے دن میں باہر نہیں نکلا۔ سرورشاہ کی دھمکی میرے ذہن میں تھی اور میں اپنے بچوں کے حوالے سے ایک فیصد رسک بھی نہیں لے سکتا تھا۔ اس کے باوجود میں اپنے پلاٹ نہیں چھوڑنا چاہ رہا تھا

اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ ایک ایم پی اے کے درمیان میں آنے کے بعد یہ توقع حماقت ہوتی کہ پولیس یا قانون میری مدد کرے گا۔ ناصر صاحب نے معذرت کر لی تھی کہ وہ اس سے زیادہ نہیں کر سکتے تھے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ ان کی اور ڈی آئی جی کی کیا مجبوری ہو سکتی ہے۔

ایک اتوار والے دن سب گھر میں تھے اور میں ناشتے کی میز پر اخبار دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نے مجھے چونکا یا۔ ہمارے حلقے کے ایم پی اے ملک صاحب کی ڈگری جعلی ہونے پر کورٹ نے اسے آسٹی کے لیے نااہل قرار دے دیا تھا۔ تفصیلی خبر کے مطابق اس نے جس یونیورسٹی کی ڈگری اپنے کاغذات کے ساتھ لگا کر پیش کی تھی اس نے اسے اپنی ڈگری تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اب ملک صاحب کو جعلی ڈگری کیس میں مقدمے کا سامنا بھی کرنا تھا۔ مگر چونکا دینے والی چیز اس کی تصویر تھی اور یہ خاصی پرانی تصویر تھی اسی وجہ سے میں اسے شناخت کر پایا ورنہ اس کی تصویریں تو ہمارے علاقے میں ہر کھجے پر تھیں مگر اب وہ بہت بدل گیا تھا اس لیے میں کبھی نہیں جان سکا کہ ہمارا ایم پی اے ملک صاحب اصل میں میرا شاگرد ریاض فخر ہے۔ اس نے کٹاری دار موچیس رکھ لی تھیں اور سر کے بال جو کسی زمانے میں خوب صورتی سے کرپوکٹ ہوتے تھے اب لمبے ہو گئے تھے اور آنکھوں پر گہرے رنگ کی عینک لگانے لگا تھا تاکہ آنکھوں کی سرخی نظر نہ آئے۔ میں کچھ دیر کے لیے دنگ رہ گیا تھا۔

اب مجھے پتا چلا کہ میرے پلاٹ پر اصل میں کس نے قبضہ کیا تھا۔ مگر وہ خود اپنی سیٹ سے بے دخل ہو گیا تھا۔ لازمی بات تھی اب یہاں کوئی دوسرا ایم پی اے آتا۔ مگر سرورشاہ اس کا آدمی تھا اور اگر وہ چاہتا تو سرورشاہ میرے پلاٹوں سے قبضہ چھوڑ سکتا تھا۔ میں نے بیوی بچوں میں سے کسی کو اس بارے میں نہیں بتایا ورنہ وہ شاید اس سے ملنے سے بھی منع کرتے۔ شام کو میں بہانے سے گھر سے نکلا اور ملک ہاؤس پہنچ گیا۔ وہ ایم پی اے ہمارے علاقے کا تھا مگر اس کی رہائش ماڈل ٹاؤن میں تھی۔ اتفاق سے خبر میں ملک ہاؤس کا پتا بھی تھا کیونکہ جعلی ڈگری کے عکس میں یہی پتا لکھا ہوا تھا۔ عام طور سے وہاں ملنے والوں کا ہجوم ہوتا ہوگا مگر اس وقت وہاں ستانا تھا اور کوشی کے گیٹ پر گارڈز مستعد تھے۔ میں نے آمد کی وجہ ریاض فخر سے ملاقات بتائی اور حوالہ اس کے استاد کا دیا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد اندر سے

اجازت ملی کہ مجھے اندر آنے دیا جائے۔ ایک مستعد قسم کے سیکریٹری نے میرا استقبال کیا اور اس کے اشارے پر گارڈز نے میری تلاش کی کہ میرے پاس کوئی ہتھیار تو نہیں ہے سیکریٹری نے اس سے پہلے معذرت کی تھی۔

”یہ سیکورٹی پروسیجر ہے۔“

اس مرحلے سے گزر کر میں اندر ایک چھوٹی سی نشست گاہ میں پہنچایا گیا اور یہاں مزید آدھے گھنٹے انتظار کے بعد ریاض فخریوں اندر آیا کہ اس کے دونوں ہاتھوں میں موبائل فون تھے اور وہ ایک پرکسی سے بات کر رہا تھا۔ ”میں سب سمجھتا ہوں، یہ اسی..... کی کارروائی ہے۔“ اس نے ایک خوش گالی کے ساتھ کہا۔ ”جب سے میں نے الیکشن جیتا وہ پیچھے پڑا ہوا تھا۔ عدالت میں کیس لے جانے کے پیچھے بھی اسی کا ہاتھ ہے۔ اچھا میں بعد میں بات کروں گا ابھی ایک ملنے والا آیا ہے۔“ اس نے اس موبائل کی کال کاٹی اور دوسرا کال سے لگا لیا۔ ”صاحب سے ملو۔“ اس بار اس کا لہجہ مؤدبانہ تھا۔ ”سر یہ میرے خلاف سازش ہے..... وہ تو ٹھیک ہے۔“ اس کا لہجہ کمزور ہو گیا اور وہ دبی آواز میں بولا۔ ”سر یہاں تو سب جعلی ڈگری لیے بیٹھے ہیں..... میرا مطلب ہے سر.....“ اس نے بات کرتے کرتے موبائل کو دیکھا اور زپر لب ایک اور خوش گالی دی تھی۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہوا تھا۔ شاید اسے ابھی تک دھیان نہیں آیا تھا کہ اس سے ملنے کون آیا ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ چونکا۔ ”سر..... آپ؟“

”ہاں۔“ میں نے کہا۔ میں اس کی آمد پر کھڑا ہو گیا تھا اور اب تک کھڑا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھایا تو میں نے مصافحہ کیا۔ ”شکر ہے تم نے پہچان لیا۔“

”میں آپ کو بھولا نہیں تھا۔“ اس نے مکاری سے کہا۔ ”کیا آپ خبر دیکھ کر آئے ہیں؟“

”نہیں، لیکن خبر دیکھ کر مجھے پتا چلا کہ جعلی ڈگری میں معطل ہونے والا میرا ایک شاگرد ہے اور میرے اسکول سے پڑھا ہوا ہے۔ تم سوچ سکتے ہو کہ میرے لیے یہ کیسی خبر ہوگی؟“

اس نے تڑپ کر کہا۔ ”یہ دشمنوں کی سازش ہے۔ انہوں نے یونیورسٹی سے ساز باز کر کے میری ڈگری کا ریکارڈ غائب کرادیا۔“

”جیسے تمہارے آدی رجسٹرار آفس میں لوگوں کی جاہد اداور زمینوں کا ریکارڈ غائب کراتے ہیں۔“

وہ چونکا۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“

”سرور شاہ تمہارا آدی ہے اس نے..... کالونی میں میرے ایک کنال کے دو پلاٹوں پر قبضہ کر کے وہاں بازار بنایا ہوا ہے۔ جب میں نے پولیس کی مدد حاصل کی تو سرور شاہ نے خود مجھے بتایا کہ وہ تمہارا آدی ہے۔ اس وقت میں جانتا تھا کہ تم ملک صاحب ہو ریاض فخر کا مجھے پتا نہیں تھا۔“

”سرور شاہ کو میں جانتا ہوں لیکن وہ میرا آدی نہیں ہے اور نہ ہی میں نے کبھی یہ کام کیا ہے۔“

”اگر تم نے نہیں کیا تب بھی وہ تمہارا نام استعمال کر رہا ہے اس نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے پھر پولیس یا کسی اور طریقے سے اس سے قبضہ چھڑانے کی کوشش کی تو بات میری بیوی بچوں تک آجائے گی۔“

ریاض فخر خاموش ہو گیا۔ وہ کسی قدر فکر مند لگ رہا تھا۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”سر میں وعدہ تو نہیں کرتا لیکن میں کوشش کروں گا۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”یعنی میرا آنا بیکار ثابت ہوا۔“

”یہ بات نہیں ہے۔“ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ”آپ جانتے ہیں میں مشکل میں آ گیا ہوں۔ میں اب اپیل کروں گا اور مجھے امید ہے میں بحال ہو جاؤں گا۔ اس صورت میں سب سے پہلا کام میں آپ کا کروں گا۔“

میں نے کہا۔ ”میرا تو خیال ہے تم ابھی بھی اگر سرور شاہ سے بات کرو تو وہ سر آنکھوں پر مانے گا۔“

ریاض فخر کھسیا گیا۔ ”کہاں سر جی، اب وہ بات بھی نہیں کرے گا ہاں میں بحال ہو گیا تو وہ دوڑا آئے گا اور قدموں میں لوٹ جائے گا۔“

میں مایوس سا اس کے پاس سے اٹھ آیا۔ ریاض فخر حکمران جماعت میں شامل تھا مگر دوسری فون کال پر اس نے جس طرح سے بات کی تھی لگ رہا تھا اندرون خانہ یہاں بھی اس کے خلاف کوئی فیصلہ ہو گیا تھا اور اسے سائیڈ لائن کر دیا گیا تھا۔ سیاسی جماعتیں بھی جیتنے والے امیدواروں کو ترجیح دیتی ہیں ہارنے والوں اور اسپلی سے باہر ہو جانے والوں کی ان کے نزدیک اتنی وقعت ہوتی ہے جتنی کہ ریس کے گھوڑے کی جو لنگڑا ہو جائے۔ اس نے مجھ سے میرا نمبر لے لیا۔ مگر مجھے امید نہیں تھی کہ وہ کچھ کر سکے گا۔ اول تو اس جیسے شخص سے مجھے یہ امید بھی نہیں تھی کہ وہ کچھ کرنے کی کوشش کرے گا۔ اسے مجھ سے کوئی مطلب نہیں تھا اور وہ بتا مفاد کے کسی کے لیے کچھ کرنے والا آدی نہیں تھا۔ اب میں پچھتا

آغا بلالی

(1911ء-2001ء)

پاکستان کے ممتاز سفارت کار۔ وہ آغا عبداللہ کے ہاں بنگلور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد مدراس یونیورسٹی سے 1933ء میں ایم اے اور کیمبرج یونیورسٹی سے قانون کی تعلیم پائی۔ کنگز کالج کیمبرج سے آنرز کے ساتھ بی اے کیا۔ 1936ء میں انڈین سول سروس میں شمولیت اختیار کی۔ ڈپٹی سیکریٹری جوائنٹ سیکریٹری اور مختلف ممالک میں ہائی کمشنر اور سفیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ انہیں ان کی اعلیٰ سفارتی خدمات کے صلے میں متعدد انعامات دیے گئے۔ جن میں ہلال قائد اعظم، ستارہ پاکستان، گرینڈ کراس، آرڈر آف نارتھ اسٹار سوشیڈن وغیرہ شامل ہیں۔

مرسلہ: نعمان خان۔ پشاور

والا شوہر ایک سال کے کورس پر بیرون ملک گیا تھا تو اس نے تب تک مزید پڑھ لینا مناسب سمجھا۔ نبیلہ بی بی اے آنرز کے آخری سسٹر میں تھی اور ڈیڑھ سال میں اس کا ایم بی اے مکمل ہو جاتا۔ احد کا میں بتا چکا ہوں۔ رامینا میٹرک میں تھی۔ اب وہ میرے اسکول میں موجود واحد اولاد رہ گئی تھی۔ سوائے ساحل اور احد کے باقی دونوں بچیاں یونیورسٹی اور اسکول جاتی ہیں۔ میں ان کو گھر کیسے روک سکتا تھا۔ مگر اس وقت میں ان کو جانے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ اس لیے میں نے گھر میں آتے ہی نبیلہ اور رامینا کو بلا کر کہا۔ ”آپ دونوں چند دن کے لیے چھٹی کرو۔“

”لیکن کیوں پاپا۔“ نبیلہ بولی۔ ”ان دنوں بہت اہم لیکچر ہیں پھر چھٹیاں آنے والی ہیں۔“

”بس کہہ دیا نا۔“ مجھے غصہ آ گیا۔
 راحیلہ کو پتا چلا تو وہ پوچھنے آ گئی۔ ”آپ بچیوں کو یونیورسٹی اور اسکول جانے سے کیوں منع کر رہے ہیں؟“
 ”راحیلہ مجھے پھر سرور شاہ کی کال آئی ہے وہ دمکی دے رہا تھا۔“

راحیلہ چونکی۔ ”پھر مگر کیوں؟“
 ”مجھے نہیں معلوم۔“ میں نے جھوٹ بولنے کی کوشش کی مگر راحیلہ تاڑ گئی اور اس نے میرے پیچھے پڑ کر اگلا لیا کہ

رہا تھا کہ میں اس سے ملنے آیا ہی کیوں۔

میں اس کی کوشی سے نکل رہا تھا کہ میں نے ایک جیب اندر آتے دیکھی۔ یہ بڑے نازوں اور شاندار قسم کی فیکسچر والی کھلی جیب تھی جس کے سامنے والے اینگل آئرن پر نصف درجن سرچ لائٹس لگی تھیں۔ اس کی فرنٹ سیٹ پر ایک مضبوط جسم کا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سر کے بال مختصر اور کلین شیو کے ساتھ اس نے بہت ہلکی سی موچھیں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ سرور شاہ جیسی کوئی چیز لگ رہا تھا۔ مگر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا تاثر تھا۔ مجھے یہ تاثر جانا پہچانا لگا تھا۔ اس نے قریب سے گزرتے ہوئے مجھے دیکھا تھا۔ ڈرائیور کے علاوہ پیچھے تین عدد مسلح افراد موجود تھے اور ان کے ہاتھوں میں جدید خود کار رائفلیں اور شاٹ گنز تھیں۔ میری گاڑی باہر کھڑی ہوئی تھی۔ اسے اندر آنے کی اجازت نہیں ملی تھی اور یہ شخص اپنی جیب اور مسلح آدمیوں سمیت اندر آ گیا تھا۔ شاید وہ بھی ریاض خنجر کے خاص گروں میں سے تھا۔ میں ابھی گھر تک پہنچا تھا کہ میرے فون کی بیل بجی۔ نمبر اجنبی تھا میں نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے کسی نے غضبناک لہجے میں کہا۔

”استاد تجھ سے کہا تھا کہ اب اس معاملے سے دور رہنا، مگر تو مانا نہیں۔“
 ”تم کون ہو؟“ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

”سرور شاہ بول رہا ہوں۔“ اس نے غرا کر کہا۔ ”اب انتظار کر تیرے ساتھ کیا ہوتا ہے۔“
 ”پہلے یہ بتاؤ میں نے کیا کیا ہے؟“
 ”تو ملک صاحب کے پاس گیا تھا۔ تجھے منع کیا تھا؟“

”مگر فائدہ کیا ہوا ملک نے انکار کر دیا۔“
 ”اسے انکار کرنا تھا وہ ہارا ہوا گھوڑا ہے اور سرور شاہ ہارے گھوڑے پر دوبارہ بازی نہیں لگاتا ہے۔ تجھے جلد پتا چل جائے گا۔“ اس نے کہتے ہوئے کال کاٹ دی۔ اگر میں کہوں کہ میں خوف زدہ نہیں ہوا تھا تو یہ سفید جھوٹ ہوگا۔ میں بہت زیادہ خوف زدہ ہو گیا تھا اور اس وقت تک گاڑی میں بیٹھا رہا جب تک میرے تاثرات نارمل نہیں ہو گئے اور میں اپنے گھر والوں کا سامنا کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ پھر میں اندر آیا تھا۔ ساحل نے ماسٹر مکمل کر لیا تھا اور ان دنوں ایم فل کی تیاری کر رہی تھی۔ دراصل اس کا ہونے

اصل بات کیا تھی۔ راحیلہ کا رنگ سفید پڑ گیا۔

”اسد یہ آپ نے کیا کیا؟“

”میرا خیال تھا کہ سرور شاہ ریاض فخر کا آدمی ہے تو

شاید اس سے بات بن جائے۔“

”یوں تو بات بگڑ گئی اور وہ جس بل بوتے پر سرور شاہ

کا پاس بنا ہوا تھا وہ وجہ تو یہی نہیں تب وہ کیوں اس کی سنے

گا۔“

میں نے سر تھام لیا۔ ”اس وقت میں نے سوچا نہیں تھا

کہ بات اس حد تک بگڑ جائے گی۔“

”اسد آپ سرور شاہ کو کال کریں اور اس سے

معذرت کر لیں۔ کوئی چیز بھی ہمارے بچوں کی جان اور

عزت سے بڑھ کر نہیں ہے۔“

میں نے سوچا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مگر راحیلہ وہ

بد معاش ہے۔ میں اس سے بات کروں اور معذرت کروں تب

وہ یہ ظاہر بات ختم کر دے اور اس کے بعد اچانک کچھ کر

گزرے تو ہم اس کا کیا بگاڑ لیں گے۔“

”ہم اپنے طور پر محتاط رہیں گے۔ آپ نے ٹھیک کیا

جو بچوں کو منع کر دیا۔ مگر آپ اس سے بات ضرور کر لیں۔“

میں نے اس نمبر پر کال کی جس سے سرور شاہ کی کال

آئی تھی۔ بیل جا رہی تھی مگر کوئی اٹھا نہیں رہا تھا۔ میں وقفے

وقفے سے کوشش کرتا رہا مگر اس نے کال ریسیو نہیں کی۔ ایسا

لگ رہا تھا کہ وہ اسے طور پر بات ختم کر چکا تھا۔ اب وہ

صرف اپنی دھمکی پر عمل کرتا۔ یہ سوچ کر میری اور میرے

ساتھ راحیلہ کی نیند بھی اڑ گئی تھی۔ ہم دونوں میاں بیوی اس

ساری رات جاگتے رہے۔ جب میں نے یہ گھر لیا تھا تو اس

وقت یہ کھلے مگن والا تھا مگر جب میں نے اسے مزید تعمیر کرایا

تو اس کی تمام کھلی جگہوں کو کورڈ کر لیا اور چھت کو بھی گرل اور

دروازہ لگا کر بند کر دیا۔ اب کوئی بھی اندر گھس نہیں سکتا

تھا۔ پھر جب سے ہم یہاں آئے تھے ایسا کوئی واقعہ بھی پیش

نہیں آیا کہ کسی نے ہمارے گھر میں گھسنے کی کوشش کی ہو۔ مگر

اس ساری رات ہمیں لگتا رہا کہ کوئی کہیں سے اندر گھسنے کی

کوشش کر رہا ہے۔ ہم بار بار اٹھ کر دیکھتے رہے کہ سچ ایسا

ہی تو نہیں ہے۔ مگر وہ ہمارا وہم تھا۔ اگلے دن نہ تو میں اسکول

گیا اور نہ ہی بچوں میں سے کسی کو باہر نکلنے دیا۔ اب بچوں کو

بھی علم ہو گیا تھا۔ لڑکیاں تو سہمی ہوئی تھیں مگر احد غصے میں تھا

اس نے کہا۔

”پاپا ہم کیوں ڈریں، کیا ہم نے چوڑیاں پہن رکھی

ہیں؟“

”بیٹا ہم بزدل نہیں ہیں مگر ہم ان بد معاشوں کا

مقابلہ بھی نہیں کر سکتے۔“

”ٹھیک ہے ہم ان کو نہیں لگا رہے مگر اس طرح سے

گھر میں بیٹھ جانا تو ٹھیک نہیں ہے پاپا۔“

ساحل نے بھائی کی تائید کی۔ ”ہاں پاپا آپ سوچیں

ہم کب تک اس طرح گھر میں رہیں گے۔“

”کم سے کم آج کے دن کوئی باہر نہیں جائے گا۔“

میں نے کہا۔

”تمہارے پاپا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ راحیلہ نے

میری تائید کی۔ ”ہمیں ایک دو دن محتاط رہنا ہوگا۔“

بچے ہمارا حکم ماننے پر مجبور تھے۔ اس سارا دن اگر

کوئی بڑوسی بھی دروازے پر آتا تو ہم پوری تسلی کر کے

دروازہ کھولتے تھے۔ شام ہوئی تو کل والا خوف ایک بار پھر

دل و دماغ پر طاری ہونے لگا۔ اس دن بھی میں وقفے وقفے

سے اس نمبر پر کال کرتا رہا مگر سرور شاہ نے کال ریسیو نہیں کی

تھی۔ نو بجے کے قریب کال بیل بجی تو میں فکر مند ہو گیا۔

سب کو اندر رہنے کا کہہ کر میں خود گیٹ تک آیا اور برآمدے

سے پوچھا۔ ”کون ہے؟“

”سرور شاہ۔“ باہر سے کسی نے دھیسے لہجے میں کہا

لیکن مجھے یقین نہیں آیا کہ سرور شاہ اس طرح بات کر سکتا

تھا۔

”کون سرور شاہ؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ جس نے آپ کے پلاٹوں پر قبضہ کیا ہوا ہے۔“

اس نے پھر اسی انداز میں کہا تو مجھے قطعی یقین نہیں آیا

تھا۔ منع کرنے پر بھی راحیلہ میرے پیچھے آگئی تھی اس نے سنا

تو تڑپ کر مجھے منع کیا۔

”اسد آپ دروازے پر مت جائیے گا۔“

میں گیٹ اگر چہ لوہے کا بنا ہوا تھا مگر اس میں درمیان

میں خلا تھے جن میں رنگین منقش شیشے جڑے ہوئے

تھے۔ میں نے پلٹ کر اس سے کہا۔ ”تم اندر رہو۔“ پھر میں

نے بلند آواز سے کہا۔ ”سرور شاہ کیوں آئے ہو؟“

”سرجی میں آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ میں

نے آپ کے پلاٹوں پر قبضہ ختم کر دیا ہے۔ آج میں یہی کام

کراتا رہا۔ ابھی مکمل ہوا ہے تو بتانے آیا ہوں۔“

اس کی بات اس کے تعارف سے بھی زیادہ ناقابل

یقین تھی۔ میں بے ساختہ گیٹ تک آیا اور ایک سوراخ سے

باہر جھانکا تو سرور شاہ مجھے اکیلا اور خالی ہاتھ نظر آیا۔ اس نے شاید بھانپ لیا کہ میں دروازے تک آیا ہوں۔ اس نے کہا۔ ”سرجی میرا یقین کریں۔ میں آپ کو صرف یہی بتانے آیا ہوں۔ بے شک آپ دروازہ بھی نہ کھولیں اور جب کوئی آپ کو کال کر کے پوچھے تو اسے یہی کہیں۔“

”کون کال کر کے پوچھے گا؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ آپ کو خود بتا دے گا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کیا آپ کو میری بات کا یقین آ گیا ہے اگر نہیں تو ابھی چل کر دیکھ لیں یا صبح دیکھ لیجئے گا۔“

”سچی بات ہے مجھے تمہاری بات کا یقین نہیں آرہا ہے۔ کیا ریاض فخر نے تمہیں مجبور کیا ہے۔“

اس کا چہرہ بگڑ گیا تھا پھر اس نے کہا۔ ”اس کا نام نہ لیں جی اس سے ہماری دشمنی ہے۔“

”ٹھیک ہے تب تم کیا چاہتے ہو اور میں کس طرح تمہاری بات کا یقین کروں۔“

”چلیں یقین نہ کریں مگر جو شخص کال کرے تو اسے یہ سب تو بتا سکتے ہیں جو میں نے ابھی کہا ہے۔“

میں سوچ رہا تھا کہ اس میں سرور شاہ کی کوئی چال تو نہیں ہے ممکن ہے وہ کسی دباؤ کے تحت یہاں تک چلا آیا ہو مگر

بعد میں وہ اچانک کچھ کر گزرے۔ وہ اچانک پلٹا اور گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ میں اندر آیا تو راجیلہ اور بچے

سب ہی دروازے سے لگے کھڑے تھے اور انہوں نے بھی سب سنا تھا۔ ساحل نے کہا۔ ”پاپا یہ کیا تھا؟“

”پتا نہیں بیٹا۔“ میں نے کہا اچانک ہی اندر سے میرے موبائل کی بیل سنائی دی اور میں تیزی سے اندر آیا۔

اجنبی نمبر سے آنے والی کال ریسیو کی اور پوچھا۔ ”کون بات کر رہا ہے۔“

”سر کیا سرور شاہ کچھ دیر پہلے آپ کے گھر سے ہو کر گیا ہے؟“ دوسری طرف سے بھاری آواز لیکن مؤدب لہجے میں کسی نے پوچھا۔

”ہاں وہ ابھی گیا ہے۔“

”کیا اس نے پلاٹوں کا قبضہ ختم کرنے کا کہا تھا؟“

”ہاں اس نے بتایا کہ قبضہ ختم کر کے اس پر کی جانے والی تعمیر ختم کر دی ہے۔ لیکن مجھے اس کی بات کا یقین نہیں آیا۔“

”آپ یقین کر لیں۔“ بھاری آواز والے نے کہا۔ ”سرور شاہ کے آدمی وہاں سے جا چکے ہوں گے اور

آئندہ وہ کبھی آنکھ اٹھا کر آپ کو یا آپ کے بچوں کو نہیں دیکھے گا۔“

”میں کیسے مان لوں اور تم کون ہو؟“

”آپ نے مجھے پرسوں ریاض فخر کی کوٹھی سے نکلنے دیکھا تھا۔ میں جیب کی فرنٹ سیٹ پر تھا۔“

تب میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور میں نے جان لیا کہ وہ عجیب آنکھوں والا شخص کون تھا۔ وہ اعظم تھا۔ میرا

سب سے نالائق شاگرد۔ میں نے کہا۔ ”تم اعظم ہو؟“

”آپ نے ٹھیک پہچانا سر، اس کا مطلب ہے میں آپ کو یاد تھا۔“

”اعظم ویسے تو مجھے اپنے بہت سے شاگرد یاد ہیں لیکن چار ایسے تھے جنہیں میں نے کبھی فراموش نہیں کیا ان میں سے ایک تم ہو لیکن تمہیں کیسے پتا چلا اور تم نے سرور شاہ

جیسے آدمی کو کیسے سیدھا کیا؟“

”میں نے آپ کو پہچان لیا تھا باقی مجھے ریاض سے پتا چل گیا۔ سرور شاہ کے بھاگ جانے کے بعد اس نے مجھے

بلا یا تھا مگر میں نے اس کا کام کرنے سے انکار کر دیا۔ جہاں تک بات سرور شاہ جیسے کو سیدھا کرنے کی ہے تو سرور میرا

ہی پٹھا ہے۔ کیسے سیدھا ہوتا۔“

اعظم سے میری بس اتنی بات ہوئی اور اس کے بعد نہ تو اس سے بات ہوئی اور نہ ملاقات ہوئی۔ مگر اس نے میرا

مسئلہ حل کر دیا۔ یہ کہانی سنانے کا مقصد اپنے مسائل اور ان کا حل بتانا نہیں ہے۔ بعد میں میں نے غور کیا تو میں نے خود کو

بالکل غلط پایا۔ جس شاگرد کے بارے میں میں نے سوچا تھا کہ وہ سب سے ناکام نکلے گا وہی سب سے زیادہ کامیاب

رہا۔ جو سب سے ذہین تھا وہ اس کا ماتحت بنا جو ذہانت میں اس سے کم تھا۔ جو تیسرے نمبر کا تھا وہ دوسرے نمبر والے

سے زیادہ کامیاب رہا۔ بے شک اس کی ڈگری جعلی نکل آئی مگر مجھے یقین تھا کہ ریاض فخر اس کا کوئی نہ کوئی توڑ کر لے

گا۔ اعظم جس سے مجھے کوئی توقع نہیں تھی وہ سب سے آگے نکلا۔ اس کے آگے ریاض فخر کی بھی نہیں چلتی کیونکہ وہ

بد معاشوں کا بد معاش ہے وہ مافیا کا سربراہ ہے جو سب پر حاوی ہے۔ تو یہ ہے ہمارا نظام تعلیم اور اس کی پیداوار۔ اب

اسے نظام جہالت نہ کہیں تو اور کیا کہیں؟ ہمیں معاشرے کو سدھارنا ہو گا ورنہ آنے والی نسلیں ہمیں معاف نہیں کریں گی اور یہ کام صرف اخلاق و کردار سے کرنا ہو گا۔

جرم کی کھیتی

مکرم و محترم ایڈیٹر ماہنامہ سرگزشت
سلام تہنیت

میں نے اپنے محلے میں پیش آنے والے واقعے میں کہانی کے لوازمات
شامل کر کے ایک اچھی کہانی بنا دی ہے تاکہ لوگ سمجھ لیں کہ
جرم کی کھیتی کبھی پھلتی پھولتی نہیں ہے۔ ایک دن زوال ضرور ہے۔
اس لیے انسان کو ہر قسم کے جرائم سے خواہ وہ معاشرتی ہوں یا
قانونی ان سے دور رہنا چاہیے۔

محمد عرفان رامے
(لاہور)



صبح سویرے دستک کی آواز پر گرم بستر کو الوداع
کہہ دینا مجھ جیسے کاہل انسان کے لیے آسان نہیں تھا۔ لیکن
میرا کیا نہ کرتا۔ اُن دنوں زندگی کچھ اس انداز سے گزر رہی
تھی کہ میں چاہتے نہ چاہتے ہوئے بھی یہ سب کرنے پر مجبور
تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ گزشتہ کئی دنوں سے میرے کان طلوعِ سحر
سے پہلے ہی کسی خاص مہمان کی آمد پر بچنے والے اس
نقارے کو سننے کے لیے بے چین ہو جاتے تھے۔
اُس روز بھی فلیٹ کے برسوں پرانے خستہ حال

دروازے پر فرزانہ کی نازک انگلیوں سے دی جانے والی مخصوص دستک نے میرے جسم میں بجلی سی بھردی تھی۔ اگلے ہی لمحے میں نے اچھی طرح لیٹے ہوئے گرم لحاف کو دونوں ٹانگوں سے اچھال کر مردہ جانور کی طرح ڈور پھینکا اور پھر بیڈ سے اتر کر ننگے پاؤں دروازے کی جانب بڑھا۔

یہ سلسلہ گزشتہ کئی ہفتوں سے جاری تھا پر آج بھی مجھے فرزانہ کو خوش آمدید کہنے کی اس قدر جلدی تھی کہ میں پاؤں میں چپل اور گلے میں قمیص پہننا تک بھول گیا تھا۔

دروازے کے قریب پہنچ کر میں نے کسی غیر مرئی آئینے میں اپنا حلیہ دیکھتے ہوئے اچھے بالوں میں انگلیاں پھریں اور جھٹ سے لاک گھما کر دروازہ کھول دیا۔ راستہ ملتے ہی سامنے کھڑی فرزانہ نے لمحہ بھر کے لیے ادھر ادھر دیکھا اور پھر بجلی کی سی تیزی سے اندر داخل ہوتے ہی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر یوں بری طرح ہانپنے لگی جیسے میلوں کی مسافت پیدل طے کر کے آئی ہو۔

فرزانہ کو خوف زدہ دیکھ کر میں نے مسکراتے ہوئے دروازہ بند کیا اور قریب پہنچ کر اُسے باندوؤں کے حصار میں لے لیا۔ میرے دل کی دھڑکن کو قریب سے محسوس کرتے ہی فرزانہ نے اپنی بے ترتیب سانسوں کو درست کیا اور اپنا سر میرے سینے پر ٹکا دیا۔ پھر وہ چند لمحے توقف کے بعد بولی۔

”جلال خان پانچ روز سے گھر نہیں آیا۔ کچن کا سامان بھی ختم ہو گیا ہے۔ صبح صبح چائے کی طلب ہو رہی تھی سو چا پڑوسیوں سے مدد مانگنے میں کاہے کی شرم، آخر ہمسائی کا بھی اپنے ہمسائے پر حق ہوتا ہے۔“

”تم ہر روز یہی رٹا رٹایا جملہ بولتی ہو، اور میں تمہیں بانہوں میں بھر کر یہی جواب دیتا ہوں کہ وہ ہمسایہ ہی کیا جو مصیبت کے وقت ہمسائی کے کام نہ آئے۔“ میں نے اُس کے کان میں سرگوشی کی تو فرزانہ چاہتے ہوئے بھی اپنا تقرائی قبہ نہ دبا سکی اور پھر مجھے دھکا دے کر صوفے پر گرانی کے بعد کچن کا رخ کرتے ہوئے بولی۔

”تم پیو گے؟“

”کیوں نہیں۔ اتنے دن ہو گئے ہیں صبح سویرے میری نیند خراب کرتے ہوئے۔ اب تو تمہارے بغیر ناشتا کرنے کا تصور ہی نہیں رہا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں رات کا کھانا کھاتے ہی صبح کے ناشتے کا انتظار کرنے لگتا ہوں۔“

”جھوٹ بولنا تو کوئی تم سے سیکھے۔ دو عورتوں کے

ساتھ محبت محبت کھیل رہے ہو۔ جب کہ وہ دونوں نادان اسی خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ تم اُن کی جدائی میں مرے جا رہے ہو۔“

”خیر ایسی بھی بات نہیں۔ تم سے تو اپنا دل کا رشتہ ہے۔“ میں نے اپنی بائیں آنکھ کا کونا دباتے ہوئے ہوائی بوسہ اس کی جانب اچھالا۔

”اور بیوی سے؟“ فرزانہ چائے کا پانی چولہے پر چڑھا کر کچن کے دروازے میں آکھڑی ہوئی۔

”مجبوری کا۔“

”مت بھولو کہ مجبوری محبت کے مقابلے میں اکثر جیت جایا کرتی ہے۔“

”ہاں! بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی..... ویسے تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“ میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بن گیا۔ ”آج تم کچھ اکھڑی اکھڑی سی لگ رہی ہو۔ لگتا ہے رات بھر نیند نہیں آئی۔ آنکھوں کے گلابی ڈورے کچھ اور ہی چٹلی کھا رہے ہیں۔ نصیب دشمنان طبیعت تو ناساز نہیں؟“

”سنا ہے راشدہ گھر واپس آنے والی ہے۔ تم نے اپنی عزیز بیوی سے معافی مانگ لی ہے اور یقین دلایا ہے کہ اب ہڈ حرامی نہیں کرو گے اور ایک ہفتے کے اندر اندر ملازمت ڈھونڈ کر اُسے گھر واپس لے آؤ گے۔“

”تمہیں کس نے بتایا؟“ میں کھیانی ہنسی ہنسا۔

”خود راشدہ نے۔ فون آیا تھا رات۔ کہہ رہی تھی کہ اس مرتبہ کرایہ اپنے ناصر بھیا کو مت دینا۔ میں بہت جلد واپس آ رہی ہوں۔ اپنے پیا کی محبت میں مری جا رہی تھی احمق عورت۔“

”تم نے اُسے بتایا نہیں کہ ناصر بھائی تو آج کل روزانہ کی بنیاد پر مجھ سے نہار منہ کرایہ وصول کر رہے ہیں۔“

میں نے کھیل بگڑتے دیکھا تو جلدی سے آگے بڑھ کر فرزانہ کی ٹانگن جیسی سیاہ بل کھاتی لٹ کو چھونے کی کوشش کی۔ لیکن فرزانہ نے میرا ہاتھ راستے میں ہی جھٹک دیا اور واپس چولہے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

فرزانہ کا بدلا ہوا رویہ محسوس کرتے ہی میں نے بغور اُس کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر گہری سانس لیتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ”لگتا ہے تمہاری طبیعت واقعی ٹھیک نہیں ہے۔“

”ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ آج میں تم سے دو ٹوک

لینا چاہتا تھا۔ مگر اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ وہ چند لمبے میری باتوں پر غور کرتی رہی اور کندھے اچکا کر پُرسکون لہجے میں بولی۔

”جلال خان کو اس بات پر راضی کرنا کہ وہ مجھے طلاق دے، میرا نہیں تمہارا کام ہے۔ لہذا یہ طریقہ بھی تم ہی سوچو کہ اُسے کیسے قائل کرو گے۔“

”کیا؟“ مجھے زمین اپنے پیروں تلے سے کھسکتی محسوس ہونے لگی۔ ”یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ میں اُسے یہ بات کیسے کہہ سکتا ہوں کہ وہ تمہیں آزاد کر کے میری جھولی میں ڈال دے۔ تم جلال خان کو اچھی طرح جانتی ہو۔ وہ مجھے جان سے مار ڈالے گا۔“

”اس مسئلے کا حل بھی موجود ہے میرے پاس۔ اس سے قبل کہ وہ تمہیں جان سے مارے، تم اُسے ٹھکانے لگا دو۔“ وہ پُرسکون لہجے میں بولی۔

”کیا بکو اس کر رہی ہو۔ دماغ تو خراب نہیں ہو گیا تمہارا۔ جب سے آئی ہو اول قول بکے جا رہی ہو۔“

”دعا کرو کہ میرا دماغ ٹھیک کام کرتا رہے۔ اگر یہ واقعی خراب ہو گیا تو راشدہ اور جلال خان کو سب کچھ سچ بتا دوں گی۔ پھر کتنی منہ پھانسنے کی جگہ نہیں ملے گی، اور تمہیں ہر صورت مجھے قبول کرنا پڑے گا۔“

اب تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ ”نہیں نہیں..... تم مذاق کر رہی ہو یقیناً۔ تم جیسی سمجھ دار عورت ایسی سنگین غلطی کیسے کر سکتی ہے۔“

”مجھ جیسی سمجھ دار عورت ہی تمہاری اس سنگین غلطی سے فائدہ اٹھا سکتی ہے ڈارلنگ۔ مجھے ہر صورت جلال خان جیسے عورت بیزار مرد سے نجات چاہیے اور یہ کام تم ضرور کرو گے..... ورنہ میں تمہیں اپنے ساتھ ہی لے ڈوبوں گی۔“ فرزانہ نے میرے موقف کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بات کھل کی اور جواب کا انتظار کیے بغیر اپنے فلیٹ میں چلی گئی۔

-☆-

شہر کے مضافات میں واقع اس رہائشی عمارت کی تیسری منزل پر چار فلیٹ تھے۔ جن میں سے دو فلیٹ مجھے وراثت میں ملے تھے۔

میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ والدین کی زندگی میں ہم سب ایک ہی فلیٹ میں مقیم رہے جب کہ دوسرا فلیٹ مستقل بند پڑا رہا۔ یہیں میری شادی راشدہ سے ہو

بات کرنا چاہتی ہوں اور مجھے اپنے سوال کا دو ٹوک جواب چاہیے۔“ اُس نے چولہا بند کیا اور چائے دو پیالیوں میں ڈال کر واپس صوفے پر آ بیٹھی۔

”کیا بات ہے؟“

میں نے پیالی ہونٹوں سے لگا کر چسکی لیتے ہوئے پوچھا تو وہ خاموشی سے سامنے پڑی پیالی کو گھورتی رہی اور پھر میری جانب دیکھا۔ ”میں چاہتی ہوں کہ تمہاری بیوی کبھی لوٹ کر واپس نہ آئے۔ تم اُس کی چھٹی کر دو۔ اب یہ گھر میرا ہے اور اس ناطے تم پر بھی صرف میرا حق ہے۔“ فرزانہ کا لہجہ اس قدر پُرعزم تھا جیسے وہ اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہنا کر جائے گی۔

”کیسی باتیں کر رہی ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں راشدہ کو یوں کھڑے کھڑے اپنی زندگی سے نکال دوں۔ وہ میری بیوی ہے کوئی ملازمہ نہیں۔“

”اگر تم یوں کھڑے کھڑے مجھ سے روابط قائم کر سکتے ہو تو اُسے زندگی سے نکال دینا انہونی بات نہیں ہے۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں تمہاری اس قدر عادی ہو چکی ہوں کہ وہ عورت خیالوں میں بھی زہر لگنے لگی ہے۔ یہ سوچ کر میرا دم گھٹتا ہے کہ دو چار روز میں راشدہ واپس آ کر دو بارہ اس گھر پر قابض ہو جائے گی اور میں تم سے مل نہیں پاؤں گی۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم اول درجے کے بزدل انسان ہو۔ اُس کے آتے ہی سسکی ملی بن جاؤ گے۔“

میں اُس کی باتیں سن کر شہنشاہ سا گیا تھا۔ فرزانہ اس وقت حسد کی آگ میں جل رہی تھی۔ اگر میں اس مسئلے کو سلجھانے میں ذرا سی بے احتیاطی کا مظاہرہ کرتا تو نتائج سنگین ہو سکتے تھے۔

معاطفے کے ہر پہلو پر غور کرتے ہوئے میں نے چائے کا خالی کپ میز پر رکھا اور قریب پڑی ڈبیا سے سگریٹ نکال کر سلگانے کے بعد گہرے کش لینے لگا۔ کچھ دیر کمرے میں گہری خاموشی چھائی رہی پھر میں نے گفتگو کا دوبارہ آغاز کیا۔

”راشدہ کا بندوبست تو میں کر ہی لوں گا۔ البتہ تم بتاؤ کہ جلال خان کا کیا بنے گا۔ وہ تمہارا شوہر ہے۔ کیسے سوچ لیا تم نے کہ وہ ضدی شخص تمہیں طلاق دے دے گا اور مجھ سے درخواست کرے گا کہ میں اُس کی سابقہ بیوی سے نکاح کر لوں۔“ میری نظریں مسلسل فرزانہ کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ میں اُس کے تاثرات کو زبان کھلنے سے پہلے ہی پڑھ

ذریعے دباؤ ڈالا کہ میں راشدہ کو واپس اپنے گھر لے جاؤں۔

اب میرے پاس انکار کا کوئی خاص جواز نہیں تھا لہذا صلح پر آمادہ ہونا پڑا۔

لیکن آج فرزانہ کا رویہ دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ سب اتنا آسان نہیں رہا۔ میں فرزانہ کی دیوانگی سے خوب واقف تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ بظاہر معصوم اور بے زبان دکھائی دینے والی یہ خوبصورت حسینہ درحقیقت کس قدر کینہ پرور ہے۔

فرزانہ تو اپنا فیصلہ سنا کر لوٹ گئی تھی مگر میں انہی سوچوں میں گم بیٹھا رہا۔ میرا موڈ بہت خراب تھا اور نظریں کھڑکی سے باہر دکھائی دینے والی سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ فی الحال بچت کی یہی صورت دکھائی دے رہی تھی کہ کسی طرح ان لوگوں سے فلیٹ خالی کروا لیا جائے۔ لیکن یہ بھی فوری ممکن نہیں تھا۔ بحیثیت فلیٹ مالک معاہدے کے مطابق میں اس بات کا پابند تھا کہ کرائے دار کو فلیٹ خالی کرنے کے لیے ایک ماہ کا پیشگی نوٹس دوں۔

آج کی تلخ کلامی کے نتیجے میں فرزانہ میرے دل سے اتر گئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں آج دن بھر فلیٹ میں رہا تو فرزانہ مودع پاتے ہی دوبارہ آدھمکے گی۔ لہذا بحث اور بد مزگی سے بچنے کے لیے میں نے باہر جا کر دوستوں کے ساتھ وقت گزارنے کا فیصلہ کیا اور الماری سے کپڑے نکال کر واش روم میں کھس گیا۔

-☆-

اس روز میں رات دیر تک دوستوں کی محفل میں بیٹھا اپنا غم غلط کرتا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ فرزانہ جلدی سو جانے کی عادی ہے۔ چنانچہ جیسے ہی گھڑی نے گیارہ بجائے میں نے بھی نیند کا بہانہ بنا کر محفل پر خاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

جب میں واپس پہنچا تو پوری عمارت اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ یہ لوڈ شیڈنگ بھی کبھی کبھی انسان کے لیے نعمت ثابت ہوتی ہے۔ میں نے زپر لپ بڑبڑاتے ہوئے بائیک پارک کی اور سیڑھیاں چڑھتا اپنے فلیٹ کے دروازے تک پہنچ گیا۔

ہر سو گپ اندھیرا تھا۔ میں نے موبائل کی ٹارچ روشن کر کے فلیٹ کا تالا کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ لیکن دروازہ بند کرنے سے قبل فرزانہ کے فلیٹ کا جائزہ لینا نہیں

گئی۔ راشدہ میری خالہ زاد تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اور اس کے والدین کو بھی ہماری پسند پر کوئی خاص اعتراض نہیں تھا سوائے یہ کہ میں مستقل مزاجی سے کسی ایک جگہ کام نہیں کرتا تھا۔

جب اس اعتراض کی بھٹک راشدہ کے ذریعے میرے کانوں میں پڑی تو میں فوراً ایک کارخانے میں ملازم ہو گیا اور چند ماہ مسلسل کام کر کے ثابت کر دکھایا کہ میں ایک ذمے دار آدمی ہوں اور گھر چلانے کی مکمل صلاحیت رکھتا ہوں۔ یوں ایک سال کے اندر ہی راشدہ دلہن بن کر میرے جیون میں آ گئی۔

شادی کے دو سال بعد میرے والدین یکے بعد انتقال کر گئے تو میں خود بھی کام دھندا چھوڑ کر گھر میں بیٹھ گیا۔ پہلے پہل تو راشدہ نے سوچا کہ شاید یہ سب والدین کی موت کا صدمہ ہے۔ لیکن جلد ہی اُسے احساس ہو گیا کہ میری نیت خراب ہے اور میں ہڈ حرام ہو گیا ہوں۔ یوں ہمارے گھر میں دن کا نسا شروع ہو گیا۔

انہی دنوں میرے ایک دوست نے دوسرا فلیٹ کرائے پر چڑھانے کا مشورہ دیا۔ نیکی اور پوچھ پوچھ میں تو پہلے ہی چاہتا تھا کہ بنا ہاتھ پاؤں ہلائے آمدن کا کوئی مستقل سلسلہ بن جائے۔ دوست کا مشورہ دل کو لگا تو ضروری مرمت کروا کر فلیٹ کرائے پر چڑھا دیا۔

ہمارے پہلے کرائے دار ادھیڑ عمر جلال خان اور اُس کی جواں سال بیوی فرزانہ تھے۔ جلال خان کی فرم میں ڈرائیور تھا اور دفتری کام کے سلسلے میں اکثر شہر سے باہر جاتا رہتا تھا۔ جب کہ فرزانہ نے بوریٹ سے بچنے کے لیے راشدہ سے دوستی کر لی تھی اور جلال خان کی غیر موجودگی میں اُس کا ہمارے ہاں آنا جانا کافی بڑھ گیا تھا۔ مگر کچھ دنوں کی علیک سلیک کے بعد ہی میں نے بھانپ لیا کہ فرزانہ مجھے پسند کرنے لگی ہے اور صرف مجھ سے ملنے یہاں آتی ہے۔

قرابتیں بڑھیں تو ہماری خفیہ ملاقاتوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ ان ملاقاتوں میں سب سے بڑی رکاوٹ راشدہ تھی۔ چنانچہ میں نے راشدہ کے ساتھ اتنا سخت رویہ اختیار کیا کہ ایک روز تنگ آ کر وہ اپنے میکے چلی گئی۔

اب ہم دونوں آزاد تھے۔ جلال خان کی بے توجہی نے فرزانہ کو باغی بنا دیا تھا۔ یوں بات آگے بڑھتی چلی گئی۔ ادھر جیسے ہی راشدہ کے والدین کو میری بے پروائی کا احساس ہوا تو انہوں نے برادری کے چند معزز لوگوں کے

جلدی سے اٹھا اور آگے بڑھ کر بیرونی دروازے کے کی ہول سے باہر کا منظر دیکھنے لگا۔

قلیٹ سے نکلنے والا جلال خان ہی تھا۔ اس مرتبہ فرزانہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ جلال خان نے احتیاط سے دروازہ لاک کیا اور چابی جیب میں ڈال کر بیٹھیاں اترتا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

جلال خان کے جاتے ہی تیسری منزل کی راہداری کسی آسیب زدہ کھنڈر کی طرح ویران ہو گئی تھی۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا تھا کہ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ یہ بات مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ جلال خان اپنے ہی گھر میں اتنے پراسرار انداز میں کیوں آیا اور پھر واپس لوٹتے وقت باہر سے تالا کیوں لگا دیا جب کہ دروازہ تو اندر سے فرزانہ کو بند کرنا چاہیے تھا۔

رات جیسے جیسے ڈھلتی چلی جا رہی تھی میرے دل میں پیدا ہونے والے درد سے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ”کہیں جلال خان نے فرزانہ کو نقصان نہ پہنچایا ہو۔ ممکن ہے ان دونوں کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہو گیا ہو؟“

میں نے دیوار گہر گھڑی پر نظر دوڑائی تو رات کے دو بجتے والے تھے۔ میں کافی دیر تک کمرے میں ٹہلتا رہا اور پھر موبائل اٹھا کر فرزانہ کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ لیکن کئی مرتبہ کوشش کرنے کے باوجود اس نے میری کال اٹینڈ نہیں کی تھی۔

”اب مجھے خود اندر جا کر صورت حال کا جائزہ لینا چاہیے۔ کہیں جلال خان نے فرزانہ کا کام تمام نہ کر دیا ہو۔“ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے حتمی فیصلہ کیا اور پھر ان کے قلیٹ کی دوسری چابی اٹھا کر باہر نکل گیا۔ چند لمحے بعد میں فرزانہ کے قلیٹ کے سامنے موجود تھا۔ میں نے آخری مرتبہ دروازے سے کان لگا کر اندر کوئی آہٹ سننے کی کوشش کی اور پھر کی ہول میں چابی ڈال کر گھما دی۔

اگلے ہی لمحے ”کنک“ کی ہلکی سی آواز سے لاک کھل گیا تو میں نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔

مجھے یہ اندیشہ بھی پریشان کیے جا رہا تھا کہ اگر جلال خان واپس لوٹ آیا تو اپنے قلیٹ میں دیکھ کر غصے سے پاگل ہو جائے گا۔ چنانچہ میں نے سرگوشی کے سے انداز میں فرزانہ کو آواز دی۔ جب کوئی جواب نہ ملا تو آگے بڑھ کر کمرے کی لائٹ آن کر دی۔ کمر روشن ہو گیا مگر فرزانہ وہاں موجود نہیں تھی۔ میں مزید آگے بڑھا اور بیڈروم، ہاتھ روم

بھولا تھا جہاں مکمل خاموشی اس بات کی شاہد تھی کہ وہ گہری نیند سو رہی ہے۔

کھانا میں باہر سے کھا آیا تھا۔ اس لیے کچن کا رخ کرنے کی بجائے کپڑے تبدیل کر کے بستر میں گھسنے ہی والا تھا کہ کسی کے دبے پاؤں بیٹھیاں چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ کوئی بنا آواز پیدا کیے احتیاط سے بیٹھیاں چڑھتا چلا آ رہا تھا۔

اس منزل پر صرف چار قلیٹ تھے جن میں سے دو مستقل بند رہتے تھے۔ اس لیے کسی اجنبی کے اوپر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ”پھر یہ کون ہو سکتا ہے؟“

میں نے خود سے سوال کیا اور ماہر سراغ رساں کی طرح دروازے کے پاس پہنچ گیا۔ بیٹھیاں چڑھنے والا اب ہماری منزل پر پہنچ چکا تھا۔ اگر وہ کوئی چور اچکا نہیں تھا تو اُسے میرے یا فرزانہ کے قلیٹ میں سے کسی ایک دروازے پر دستک دینا پڑے گا۔

چند لمحے گہری خاموشی چھائی رہی اور پھر وہ دھیمی چاپ چاپ رگ رگ گئی۔ میں نے کی ہول پر نظریں جما کر باہر کا منظر دیکھا تو سامنے جلال خان محتاط انداز میں اپنے قلیٹ کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

”جلال خان آج کیسے لوٹ آیا اُسے تو دو دن بعد آنا تھا؟“ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ قلیٹ کا دروازہ کھلا اور فرزانہ کا چہرہ دکھائی دیا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ فرزانہ بھی اُسے یوں اچانک سامنے دیکھ کر ٹھنک سی گئی تھی۔ اگلے ہی لمحے جلال خان نے تیزی سے قدم آگے بڑھائے اور اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔

جلال خان کی پراسرار آمد اور پھر اندر گھس کر دروازہ بند کرنے کا انداز اس قدر عجیب تھا کہ میں کچھ مشکوک سا ہو گیا تھا۔ حالانکہ جلال خان جب بھی گھر لوٹتا تھا۔ بلاوجہ ہمارے قلیٹ کے دروازے پر ایک دھپ ضرور رسید کر دیا کرتا تھا۔ جیسے یہ اعلان سمجھا جاتا تھا کہ جلال خان واپس لوٹ آیا ہے اور کل دوپہر تاش کی بازی ہوگی لیکن آج کی صورت حال میری سمجھ سے باہر تھی۔

اُن کے اندر جاتے ہی میں واپس اپنے بستر پر لوٹ آیا اور ایک فلمی میگزین اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگا مگر میرا ذہن وہیں اٹکا ہوا تھا۔

بمشکل ایک گھنٹا گزرا تھا کہ فرزانہ کے قلیٹ کا دروازہ کھلنے کی چڑچھاہٹ سنائی دی، آواز سنتے ہی میں

”آخر وہ کہاں جا سکتی ہے؟“

یہ سوال دماغ پر ہتھوڑے برسار ہاتھا۔ میں نے فلیٹ کی الماریاں تک چیک کر لی تھیں مگر فرزانہ گدھے کے سر سے سینک کی طرح غائب تھی۔ میرا ذہن یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ ایک جوان عورت یوں اچانک بند فلیٹ سے غائب بھی ہو سکتی ہے۔ اس وقت زیادہ دیر وہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اب میں کمرے کی لائٹ آف کر کے واپس پلٹنے ہی والا تھا کہ کونے میں فریزر پر نظر پڑتے ہی میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ”کہیں فرزانہ.....؟“

میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر فریزر کی طرف لپکا اور پھر بنا وقت ضائع کیے ڈھکن اوپر اٹھا دیا۔ فریزر کا اندرونی منظر دیکھتے ہی میری آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیلتی چلی گئیں اور دل کی دھڑکن بے قابو ہو گئی۔ شدید سردی کے باوجود میری پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے کیوں کہ سب سے فریزر میں ٹھوسی گئی فرزانہ کی نیم وا آنکھیں اور سر سے بہہ کر جننے والا خون اصل کہانی بیان کر رہا تھا۔ وہی عورت جو چند گھنٹے قبل میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے لگا رہی تھی اب محض مٹی کی سورت بن کر رہ گئی تھی۔ جانے کتنی دیر اُسے یونہی دیکھتے رہنے کے بعد جبر جبری لیتے ہی مجھے ہوش سا آ گیا۔

یہ خیال ذہن میں آتے ہی مجھے فرزانہ کے فلیٹ میں تھن محسوس ہونے لگی تھی کہ میں ایک لاش کے سر ہانے کھڑا ہوں۔ اس لمحے اگر کوئی مجھے واردات کی جگہ پر دیکھ لیتا تو سارا مطلب مجھ پر گر سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے احتیاط سے فریزر کا دروازہ بند کر کے ہر ممکنہ جگہ اپنے فنگر پرنٹ صاف کیے اور کسی چیز کو چھوئے بغیر احتیاط سے اپنے فلیٹ میں آ گیا۔

-☆-

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ میری بے چینی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اپنا سکون تو شاید میں فرزانہ کی لاش کے پاس ہی چھوڑ آیا تھا۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ مجھے فرزانہ کے بہیمانہ عمل کا افسوس ضرور تھا مگر اس بات کا اطمینان بھی تھا کہ اب وہ کبھی مجھے بلیک میل نہیں کر سکے گی۔ ہمارے سارے راز فرزانہ کی موت کے ساتھ ہی فریزر میں مدفون بن چکے تھے۔

یہ سب سوچتے ہوئے مجھے دلی راحت محسوس ہو رہی

تھی۔ اب اگلا مرحلہ یہ معلوم کرنا تھا کہ جلال خان فرزانہ کی لاش کو فلیٹ سے غائب کیسے کرتا ہے؟

اگلی صبح ناشتے کے بعد میں نے فلیٹ میں رہنے کا فیصلہ کیا تا کہ جلال خان غیر موجودگی میں فرزانہ کی لاش ٹھکانے لگانے کی کوشش نہ کرے۔ لیکن سارا دن گزر جانے کے باوجود جلال خان واپس نہ لوٹا۔

اسی طرح اگلادین بھی گزر گیا۔ اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا تھا اور شدید ذہنی کوفت محسوس ہو رہی تھی۔ یہ سوچ کر میرے دل میں ہول اُٹھ رہا تھا کہ سامنے والے فلیٹ میں فرزانہ کی لاش سردی کا عذاب جھیل رہی ہے۔ مگر میں جلد بازی میں کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔

تیسری رات دس بجے کے قریب میرے خاموش موبائل نے انگڑائی لی۔ میں نے جلدی سے نمبر چیک کیا تو کال جلال خان کی تھی۔ میں نے زبردست مسکراتے ہوئے موبائل فون کان سے لگا کر نہایت پرسکون انداز میں سلام کیا تو جلال خان نے بھی اسی محبت کا اظہار کرتے ہوئے خیر خیریت دریافت کی۔ پھر چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد اس نے اصل موضوع پر آتے ہوئے اپنے تعین مجھے اطلاع دی کہ دو روز قبل فرزانہ کی ماں کو ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا۔ یہ خبر سنتے ہی وہ بنا آپ کو بتائے کراچی چلی گئی۔ اب فی الحال اُس کی واپسی کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ دارصل وہ اپنی بوڑھی ماں کے پاس رہ کر اُس کی خدمت کرنا چاہتی ہے۔ لہذا ہم نے فلیٹ خالی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

”مجھے فرزانہ کی پریشانی کا سن کر افسوس ہوا۔ باقی جیسے آپ لوگ مناسب سمجھیں۔ میں آپ کی مجبوری سمجھتا ہوں۔۔۔۔۔“ میں افسوس کا اظہار کرتے ہوئے دل ہی دل میں جلال خان کی عیاری پر ہنس رہا تھا۔ ”تو پھر آپ لوگ اپنا سامان کب اٹھائیں گے تاکہ میں کسی دوسرے کرایہ دار کا بندوبست کر سکوں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ اسی فلیٹ کے کرائے سے ہمارے کچن کا خرچہ چلتا ہے۔“

”سامان بہت جلد اٹھالیا جائے گا۔“ جلال خان نے جواب دیا ”سارا سامان کراچی پہنچانا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ لہذا میں نے اپنا ڈیپ فریزر اور چند دوسری چیزیں ایک قریبی دوست کو دینے کا ارادہ کیا ہے۔ کل میرا دوست یہ سامان اٹھانے آ جائے گا۔ آپ اُس کی مدد کر دیجیے گا۔ فلیٹ کا حساب بے باق کرنے کے لیے دو تین دنوں تک میں خود آپ کے پاس حاضر ہو جاؤں گا۔“

رہی تھی کہ وہ رات بھر جاگتا رہا ہے۔ ”اندرا آ جاؤ۔“
میں نے سنبھل کر قدرے سخت لہجے میں کہا۔ حالانکہ
ہم دونوں ایک دوسرے کو آپ جناب کہہ کر مخاطب کرتے
تھے۔ میرا جذبات سے عاری روکھا رویہ دیکھ کر جلال خان
خاموشی سے آگے بڑھا اور سامنے پڑے صوفے پر بیٹھ گیا۔
”چائے پیو گے۔“ میں نے اُس کے مقابل بیٹھتے
ہوئے پوچھا۔

”نہیں وقت کم ہے۔ مجھے واپس جانا ہے۔“
”مجھے سے کیا چاہتے ہو۔“ میں نے سگریٹ سلگایا۔
”تم اپنے واجبات وصول کر لو۔ میں سارا سامان
آج ہی اٹھانا چاہتا ہوں۔ دراصل مجھے چند روز کے لیے
شہر سے باہر جانا ہے۔ میرے حساب سے فلیٹ کا کرایہ اور
دیگر واجبات ملا کر کل پانچ ہزار بنتے ہیں۔“ جلال خان نے
جیب سے پرس نکالا تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے
روک دیا۔

”فلیٹ کی حد تک تو تمہارا حساب کتاب بالکل ٹھیک
ہے مگر شاید تم اس میں فریزر کا کرایہ شامل کرنا بھول گئے ہو۔
وہ فریزر اب عام نہیں رہا۔ کسی نے گھر بسالیا ہے اُس ٹھنڈی

”آپ جب چاہیں اپنا سامان اٹھا سکتے ہیں۔ مجھے تو
حسرت ہے کہ آپ نے وہ فریزر اسی حالت میں اپنے
دوست کو دینے کا فیصلہ کر لیا۔ یقیناً آپ میری بات کا
مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔“
یہ کہتے ہوئے میں نے طنزیہ قہقہہ لگایا اور جواب سے
بغیر کال منقطع کر دی۔ اب میں تصور کی آنکھ سے جلال خان
کا زرد پڑتا چہرہ اور کانپتی ٹانگیں دیکھ کر خوب محفوظ ہو رہا
تھا۔

رات بھر ہونے والی تیز بارش نے موسم کچھ زیادہ ہی
خنک بنا دیا تھا۔ میں اپنے گداز بستر میں بے خبر سو رہا تھا کہ
صبح سویرے ہونے والی دستک نے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر
دیا۔

”فرزانہ تو خود گہری نیند سو رہی ہے پھر اس وقت
کون آ گیا؟“ میں نے چونک کر گھڑی پر نظر دوڑائی تو صبح
کے پانچ بج رہے تھے۔ پھر ہمت کر کے بستر سے نکلا اور
آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ اگلے ہی لمحے میرا دل تیزی
سے دھک دھک کرنے لگا۔ کیونکہ سامنے کھڑا جلال خان
گہری سرخ آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس کی حالت بتا

گم گشتہ

سیہونی سازشوں کا پردہ چاک کرتی ایک تلخ اور دلخراش داستان
آخری صفحات پر ڈاکٹر ساجد امجد کا نیا انداز

خندگ عثمانی

تاریخ کے گم شدہ لمحات کا احاطہ کرتے صفحات کا دلکش
انداز..... الیاس سیٹاپوری کے قلم کا سحر

شیش محل

اسماء قادری کے قلم سے دل کے سازوں کو
چھیڑنا اور معاشرتی ناسوروں کو چھوڑنا ایک عجیب سلسلہ

ماروی

خواب ہونے والے شہرے دن رات کے بدلتے تیور اور دلوں کے موسم
کا بدلتا انداز..... محی الدین نواب کی خوب صورت تحریر

اکتوبر 2015ء کے شمارے کی ایک جھلک

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
سیٹاپوری
ماہنامہ شیش محل



مزید

خطوطِ انگی محفل،
محفلِ شعر و سخن
اور
ملکِ مستدر حیات کی تقبیل

کاشفِ ذہن منظرِ امامِ تنویرِ ریاض

سلیم انور، ثمر عباس کی کیلی کہانیاں

اس کے علاوہ

رقم مانگ کر میں نے غلطی کی تھی۔ اب میرے کانوں میں جلال خان کا جملہ گونجنے لگا تھا کہ مجھے جلد ہی کچھ نہ کچھ بندوبست کرنا پڑے گا۔

یہ بھی ممکن تھا جلال خان مجھے راستے سے ہٹانے کی کوشش کرتا۔ کیوں کہ انسان کے لیے پہلا قتل ہی مشکل ہوتا ہے۔ پھر وہ اپنا جرم چھپانے کے لیے دوسرا قتل کرنے میں کبھی عار محسوس نہیں کرتا ہے۔

اُس رات میں بہت مضطرب رہا۔ خیند مجھ سے کوسوں دور تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ جلال خان اب کون سی چال چلنے والا ہے۔

اگلی صبح ناشتے کے بعد میں بے چینی سے جلال خان کا انتظار کرنے لگا۔ رات ڈھلتے ہی میں اپنی ڈیمانڈ پر پھر سے ڈٹ گیا تھا۔ اب مجھے قوی اُمید تھی کہ جلال خان اپنی جان بچانے کے لیے ہر صورت رقم کا بندوبست کر کے آئے گا۔ دوپہر کے وقت میں کھڑکی کھول کر باہر سڑک کا نظارہ کر رہا تھا کہ اپنی عمارت کے سامنے پولیس کی گاڑی رکتی دکھائی دی۔ میں خالی ذہن کے ساتھ پولیس کی گاڑی دیکھ رہا تھا کہ اُس میں سے اترنے والے جلال خان پر نظر پڑتے ہی میرے ہوش اڑ گئے۔ جلال خان اب عمارت کے صدر دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ اُس کے ساتھ قریبی تھانے کا ایک انسپکٹر اور تین سپاہی بھی موجود تھے۔

یہ منظر دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔ میں ابھی تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پایا تھا کہ جلال خان پولیس پارٹی کے ساتھ کیا کر رہا ہے۔ اب میرے ذہن پر ایک انجانا سا خوف دستک دینے لگا تھا۔

کچھ دیر بعد فلیٹ کے دروازے پر دستک ہوئی تو میں ہمت کر کے آگے بڑھا اور دروازہ کھول دیا۔ حسب توقع جلال خان پولیس کے ہمراہ میری دہلیز پر موجود تھا۔ آنے والا پولیس انسپکٹر قریبی تھانے میں ڈیوٹی انجام دے رہا تھا اور کسی حد تک میرا شناسا بھی تھا۔

میں نے مسکرا کر آنے والے مہمانوں کو خوش آمدید کہا تو انسپکٹر نے بھی گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور اپنی آمد کا مقصد بیان کرتے ہوئے بولا۔ ”جلال خان کی بیوی فرزانہ گزشتہ تین روز سے غائب ہے۔ کیا آپ اس سلسلے میں کچھ جانتے ہیں۔“

میں خود بھی جلال خان کی چال سمجھ گیا تھا۔ میرے دل میں یہ خیال بھی آیا کہ انسپکٹر کو حقیقت سے آگاہ کر کے فرزانہ

قبر میں۔“
جواباً جلال خان نے گھور کر مجھے دیکھا اور پھر صوفے کی پشت سے سر نکال کر جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ ”تو یہ بات ہے۔ خیر بتاؤ اب تم کیا چاہتے ہو؟“
”تمہارے گناہ کی قیمت۔“

”کھل کر بات کرو۔“ جلال خان کا لہجہ پُر سکون تھا۔ شاید وہ ہر صورت معاملے کو ختم کرنا چاہتا تھا۔
”صرف پانچ لاکھ۔“

میری ڈیمانڈ سن کر جلال خان نے لمحہ بھر کے لیے کچھ سوچا اور پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ ”یہ رقم تو بہت زیادہ ہے۔ تم جانتے ہو میں کوئی عادی مجرم نہیں ہوں۔ یہ صرف ایک حادثہ تھا۔ فرزانہ عمر میں مجھ سے چھوٹی تھی اور ہر وقت مجھے یہی احساس دلاتی رہتی تھی۔ اس اختلاف نے ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے زہر گھول دیا تھا۔ کل جب میں واپس لوٹا تو ایک چھوٹی سی بات پر ہمارا جھگڑا شروع ہو گیا۔ میں اُسے مارتا نہیں چاہتا تھا۔ اضطرابی طور پر ہاتھ ہتھوڑی کی طرف بڑھا اور میں نے اس کے سر پر وار کر دیا یہ سب غصے میں ہو گیا جس کا مجھے دلی افسوس ہے۔۔۔۔۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس مشکل وقت میں میری مدد کرو۔ اس کے عوض میں تمہیں پچاس ہزار روپے ادا کر سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔“

”جانتا ہوں کہ تم کوئی عادی مجرم نہیں ہو۔ اسی لیے ابھی تک پولیس کو فون نہیں کیا۔ ورنہ اب تک تم حوالات کی ہوا کھا رہے ہوتے۔ باقی جہاں تک تمہارے حالات کا تعلق ہے تو مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ تمہیں پورے پانچ لاکھ ادا کرنا ہوں گے۔ میں تمہیں چوبیس گھنٹے کی مہلت دے سکتا ہوں۔ اس کے بعد مجھ سے بھلائی کی توقع مت رکھنا۔“

”ٹھیک ہے۔ اگر تم بھند ہو تو میں کچھ بندوبست کرتا ہوں۔“

میرا حتمی فیصلہ سن کر جلال خان نے اثبات میں سر ہلایا مگر اس کے لہجے میں سفاکی سی عود آئی تھی۔ لیکن اب مجھے اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی۔ کیوں کہ مفت میں لمبی رقم کمانے کے لیے تھوڑی دیریری دکھانا بہت ضروری تھا۔

جلال خان کے جاتے ہی میں نے ٹھنڈے دل سے اپنی ڈیمانڈ پر غور کیا تو اپنے فیصلے میں نظر ثانی کی گنجائش محسوس ہوئی۔ اس کے مالی حالات اتنے اچھے نہیں تھے کہ لاکھوں میں ادائیگی کر سکے۔ یقیناً جلال خان سے اتنی بڑی

کی لاش کے بارے میں بتا دوں۔ مگر دماغ نے خطرے کا الارم بجاتے ہوئے ایسا کرنے سے روک دیا۔ اگر میں ایسا کرتا تو انسپکٹر یقیناً پہلا سوال یہی پوچھتا کہ اب تک آپ نے پولیس کو اطلاع کیوں نہیں دی۔

صورت حال بگڑ جاتی تو میں کسی طور بھی جلال خان کو قاتل ثابت نہ کر پاتا۔ جلال خان قتل کی رات فلیٹ میں موجود تھا، اس بات کا واحد چشم دید گواہ صرف میں تھا۔ مگر فی الوقت خاموش رہنا ہی دانشمندی تھی۔ وجہ یہ کہ لائسنس کا اظہار کر کے میں آسانی سے اپنی جان بچا سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے حیرت سے کندھے اچکائے۔

”یہ بات تو خود میرے لیے بھی حیران کن ہے۔ فرزانہ میری بیوی کی موجودگی میں اکثر ہمارے ہاں آیا کرتی تھی۔ لیکن جب سے میری بیوی میکے گئی ہے اُس سے بہت کم سامنا ہوا ہے۔ مجھے جلال خان کی پریشانی کا احساس ہے۔ آپ حکم کریں میں اس سلسلے میں کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

”چند روز قبل فرزانہ نے جلال خان سے آپ کی شکایت کی تھی۔“ انسپکٹر نے بغور میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیسی شکایت؟“ میں چونکا۔

”فرزانہ کا کہنا تھا کہ آپ آتے جاتے اُسے بہت عجیب نظروں سے گھورتے ہیں۔ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ ایک روز آپ بلا وجہ اُس کے فلیٹ میں گھس آئے تھے اور دوستی نہ کرنے پر سنگین نتائج کی دھمکی دی تھی۔“

”بالکل نہیں۔ انسپکٹر صاحب یہ سراسر الزام ہے۔ میں کبھی جلال خان کی غیر موجودگی میں ان کے ہاں نہیں گیا۔“ میں اس بدلتی صورت حال پر گھبرا گیا۔

”آپ ذرا ان کے فلیٹ کی دوسری چابی لے آئیں تاکہ ہم خود اندر جا کر فلیٹ کا جائزہ لے سکیں۔ ممکن ہے ہمیں کوئی اہم سراغ مل جائے۔“ انسپکٹر نے میرے جواب کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا تو میں نے احتجاجاً پوچھا۔

”ان کی اپنی چابی کہاں ہے؟“

اس سے پہلے کہ انسپکٹر کوئی جواب دیتا جلال خان دنیا بھر کا غم اپنے لہجے میں سینے آگے بڑھا۔ ”آپ تو جانتے ہیں ہمارے پاس فلیٹ کی صرف ایک ہی چابی ہے جو فرزانہ کے ساتھ ہی غائب ہو گئی۔ میں اپنے کام کے سلسلے میں شہر سے باہر تھا۔ وہاں سے فرزانہ کو بہت فون کیے لیکن رابطہ نہیں ہو پایا۔ پھر میں نے اس کی قریبی سہیلیوں سے معلوم کیا لیکن وہ سب بھی اُس بارے میں لاعلم تھیں۔ لہذا مجھے عجلت میں اپنا

کام ادھورا چھوڑ کر واپس آنا پڑا۔“

میں جلال خان کے جھوٹ بر دل ہی دل میں بیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ اس وقت میں کبھی کیا سکتا تھا، خاموشی سے واپس مڑا اور الماری سے اُن کے فلیٹ کی دوسری چابی لا کر انسپکٹر کے ہاتھ میں تھما دی۔ چابی ملتے ہی انسپکٹر نے مجھے بھی ہمراہ آنے کا اشارہ کیا اور سب لوگ جلال خان کے فلیٹ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔

جلال خان اور پولیس والوں نے فلیٹ کے مختلف حصوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس دوران جلال خان نے ایک مرتبہ بھی فریزر کا رخ نہیں کیا تھا۔

جب پولیس کے جوان فرزانہ کا سراغ نہ لگا سکے تو جلال خان نے کرسی پر بیٹھ کر رونا شروع کر دیا۔ اسے روتا دیکھ کر انسپکٹر بھی قریب چلا آیا اور دلاس دینے لگا کہ فرزانہ کو بہت جلد تلاش کر لیا جائے گا۔

انسپکٹر کی تسلی پر جلال خان کا رونا تو کم ہو گیا تھا مگر وہ یوں ہچکیاں لے رہا تھا جیسے سانس لینے میں تکلیف ہو رہی ہو۔ پھر ہچکیاں لیتے لیتے وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور پانی کی بوتل نکالنے کے لیے اُس فریزر کی جانب بڑھنے لگا جس میں فرزانہ کی لاش تھی۔ جلال خان کی عیاری دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ شاید اب یہ ڈراما اختتامی مرحلے میں تھا۔

جلال خان نے فریزر کے قریب پہنچ کر جیسے ہی اُس کا دروازہ اوپر اٹھایا خود چیخ مار کر زمین پر گر پڑا۔ اُسے گرتا دیکھ کر انسپکٹر اور سپاہی بھی فریزر کے پاس پہنچ گئے جہاں فرزانہ کی پتھرائی ہوئی ادھ کھلی آنکھیں خود پر ہونے والے ظلم کا نوحہ سنا رہی تھیں۔

جلال خان نے فرزانہ کی لاش دیکھتے ہی دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دیا تھا۔ انسپکٹر نے سپاہیوں کی مدد سے لاش کو فریزر سے باہر نکالا اور اُس کا معائنہ کرنے کے بعد میری جانب متوجہ ہوا۔ ”یہ سب کیا ہے جناب!“

”میں اس بارے کچھ نہیں جانتا۔ میں تو خود فرزانہ کی لاش دیکھ کر پریشان ہو گیا ہوں۔“

مجھے اپنی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ جلال خان کی چیخ و پکار سن کر عمارت کے چند دوسرے رہائشی بھی وہاں پہنچ گئے تھے اور فرزانہ کی لاش دیکھ کر خوفزدہ تھے۔

”یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے انسپکٹر صاحب۔ مجھے

یقین ہے فرزانہ کا قتل اسی سفاک انسان نے کیا ہے۔ فرزانہ نے خود مجھے بتایا تھا کہ یہ عیاش آدمی اُس پر بری نظر رکھتا ہے۔ کاش میں نے اُس کی شکایت کو سنجیدگی سے لیا ہوتا تو آج میری فرزانہ زندہ ہوتی۔“ جلال خان دونوں ہاتھوں سے سینہ کو پی کرنے لگا۔

”یہ جھوٹ ہے۔ جلال خان اپنا گناہ چھپانے کے لیے مجھ پر الزام لگا رہا ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے حقیقت کو مزید چھپانا مناسب نہ سمجھا اور ساری بات تفصیل سے انسپکٹر کے گوش گزار کر دی۔

”انسپکٹر صاحب!“ جلال خان چیخا۔ ”یہ شخص اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے اوجھی حرکتوں پر اتر آیا ہے۔ میں تو گزشتہ پانچ روز سے ڈیوٹی پر تھا۔ آپ چاہیں تو میرے ادارے سے تصدیق کر سکتے ہیں۔“

”میں قسم کساتا ہوں کہ جلال خان ہی فرزانہ کا قاتل ہے۔ قتل کی رات میں نے خود اسے قلیٹ میں آتے اور پھر واپس جاتے دیکھا تھا۔“ جب میں اپنے موقف پر ڈٹ گیا تو جلال خان پہلے سے زیادہ آگ بگولا ہو گیا اور طنز یہ نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

”میں نے اپنی بیوی کو قتل نہیں کیا۔ لیکن اگر پھر بھی یہ حیوان نما انسان قتل کی رات اس شہر میں میری موجودگی ثابت کر دے تو میں یہ ناکر وہ جرم قبول کر لوں گا۔“

جلال خان کا چیخ سن کر انسپکٹر نے میری جانب دیکھا۔ ”جلال خان کا مطالبہ بالکل جائز ہے۔ اگر آپ واقعی بے گناہ ہیں اور جانتے ہیں کہ یہ قتل جلال خان نے کیا ہے تو واردات کی رات اس شہر میں موجودگی کو ثابت کرنا پڑے گا۔۔۔ لیکن یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ اس وقت میں آپ کو فرزانہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کرتا ہوں۔“

اپنا فیصلہ سنا کر انسپکٹر نے قریب کھڑے سپاہی کو اشارہ کیا تو وہ جھکڑی لے کر آگے بڑھا۔

اپنی گرفتاری کا حکم سنتے ہی میری حالت غیر ہو گئی اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اس سے قبل کہ سپاہی مجھے لوہے کی چوڑیاں پہناتا قلیٹ کا دروازہ کھلا اور ایک سب انسپکٹر دو سپاہیوں کے ہمراہ اندر داخل ہوا۔ ان کے ہمراہ عام سے حلے میں ایک محنت کش نوجوان بھی تھا جسے سپاہیوں نے حراست میں لے رکھا تھا۔

اس سے قبل کہ انسپکٹر اُن کی آمد کا مقصد دریافت کرتا نوجوان نے جلال خان پر نظر پڑتے ہی چلا کر کہا۔ ”جناب!

یہی ہے وہ آدمی۔ اسی نے تین روز قبل رات کے وقت مجھ سے سگریٹ خرید کر ہزار روپے کا جعلی نوٹ دیا تھا۔ جس گاڑی کا میں نے آپ کو نمبر بتایا تھا وہ یہی آدمی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اُس وقت رات کا ایک بج تھا اور میں دکان بند کر رہا تھا۔ یہ شخص بہت پریشان اور عجلت میں دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے پریشانی کی وجہ پوچھی تو یہ بات کوٹال گیا کہ سگریٹ کی طلب ہو رہی تھی۔ پھر اس نے مجھے ہزار روپے کا نوٹ دیا اور گھبراہٹ میں بقایا رقم لینا بھی بھول گیا۔“

شناخت کا عمل مکمل ہوتے ہی سب انسپکٹر کے کہنے پر جلال خان کی جامہ تلاشی لی گئی تو پرس میں سے مزید دو جعلی نوٹ برآمد ہو گئے۔

دکاندار نے جلال خان کی شہر میں موجودگی کا جو وقت اور تاریخ بتائی تھی وہ فرزانہ کے قتل کی رات تھی۔

صورت حال بہت حد تک کھل کر سامنے آ چکی تھی۔ چنانچہ جلال خان کو جعلی کرنسی اور فرزانہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا اور وہی جھکڑی جو چند لمحے مجھے پہنائی جانے والی تھی اب اصل قاتل کو اپنی گرفت میں چکڑ چکی تھی۔ میرا چہرہ ابھی تک خوف سے زرد تھا اور ناکلیں سوکھے

پتوں کی طرح کاتب رہی تھیں۔ میں حیرت سے گنگ جلال خان کو پولیس کی حراست میں دیکھ رہا تھا کہ انسپکٹر دھیرے دھیرے چلا ہوا میرے قریب آیا اور نرم لہجے میں بولا۔

”آپ کا دعویٰ درست ثابت ہوا ہے۔ واردات کی رات جلال خان اسی شہر میں تھا اور اب اُسے فرزانہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔“

انسپکٹر نے میرا کندھا تھپتھا کر تسلی دی اور فرزانہ کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے ہسپتال روانہ کر دی گئی۔ پھر اس نے جلالی خان سے پوچھا۔ ”یہ نوٹ آئے کہاں سے؟“

”صاحب جی میرا ایک دوست ہے جو جعلی نوٹ کا دھندا کرتا ہے۔ اکثر میں اس سے ہزار کا نوٹ پانچ سو میں خریدتا رہتا ہوں اور اسے گاؤں دیہات کے چھوٹے دکانداروں کو دیا کرتا ہوں۔ اس رات میں بہت گھبرایا ہوا تھا اسی لیے غلطی سے وہ نوٹ محلے کے دکاندار کو دے دیا۔“

”خان یہ بھول گیا تھا کہ محلے کا دکاندار اسے پہچانتا ہے۔ دکاندار کے ساتھ آنے والے ایس آئی نے کہا۔“ اسی لیے پکڑ میں گتے ہی وہ ہمیں خان کے گھر لے آیا یہاں آ کر پتا چلا کہ ایک اور کہانی منظر ہے۔

-☆-☆-

مکرمی مدیر اعلیٰ

سلام مسنون

عورت کی زندگی بھی کیا زندگی ہے، وہ خود کو کتنا ہی مضبوط کیوں نہ بنا لے مگر مردوں کے اس معاشرے میں اسے وہ مقام نہیں مل سکتا جس کی اسے چاہ ہوتی ہے نتیجاً وہ ہمت ہار دیتی ہے۔ ارسال کردہ واقعات میری ایک واقف کار کی ہے۔ وہ معاشرے میں ایک مقام رکھتی ہے اس لیے اس کا نام بدل دیا۔ اس کی روداد ہر ایک کے لیے سبق بھری ہے اس لیے اسے ضرور شائع کریں۔

ظہیر مرزا
(کراچی)



روئے سینے کی دلخراش آوازیں سنتے ہی ہاسپٹل کے کارڈیور میں تیزی شہناز تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازے کے پاس ایک لڑکی چیخ مار کر کھڑے قدموں سے گر گئی تھی۔ اطراف کے سبھی لوگ اس کے پاس جمع ہونے لگے۔ وہ لڑکی ہلکے ہلکے کر رہی تھی۔ شہناز بھی سہمے ہوئے دل اور لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ ان لوگوں کے قریب گئی۔ کوئی اس سرایکی لڑکی کو تسلی دے رہا تھا۔ کوئی

اسے پانی پلانے کی کوشش کر رہا ہے۔

”نہیں نہیں..... شکر ہے..... یہ تو کوئی اور ہے۔“
لڑکی کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی شہناز نے سکون کا سانس لے کر زیر لب کہا۔

چند لمحوں بعد ہی شہناز کو اپنے کہے ہوئے الفاظ کا احساس ہوا اور وہ خود سے شرمندہ سی ہو گئی۔ پھر وہ اس لڑکی کی حالت دیکھ کر اس پر کڑھنے لگی۔

ہاسپٹل کی انتظار گاہ میں بیٹھے بیٹھے شہناز کو کافی وقت ہو گیا تھا اور اسے ابھی تک نیلم کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا۔

”خدا جانے میری ملاقات نیلم سے ہو بھی سکے گی یا نہیں“ یا سیدت سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے شہناز نے خود کلامی کی اور آنکھیں بند کر کے کسی وظیفے کا دورو کرنے لگی۔

نیلم پر قاتلانہ حملے کی خبر ملتے ہی شہناز بے قرار ہو کر دوڑی چلی آئی تھی مگر نیلم کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے اس کا اضطراب مسلسل بڑھتا جا رہا تھا۔

”چلئے خالہ.....“ روٹی کی آواز سنتے ہی شہناز نے ایک دم ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔

شہناز نے سوالیہ نگاہوں سے روٹی کو دیکھا پھر تیزی سے روٹی کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ شہناز کے دل میں سو طرح کے خیالات گڈمڈ ہو رہے تھے۔

”ک..... کیا ہوا..... کہاں ہے نیلم.....“ شہناز نے بیقراری سے پوچھا۔

”کچھ نہیں خالہ..... سب خیریت ہے۔“ روٹی نے تسلی دیتے ہوئے سمجھایا ”انہیں ہاسپٹل سے گھر لے جایا جا چکا ہے..... ان کی کوئی رشتہ دار خاتون بھی یہاں انہیں دیکھنے آئی تھیں..... ان سے پتا معلوم کر لیا ہے۔“

روٹی کی تسلی دینے کے باوجود شہناز کو یقین نہیں آ رہا تھا مگر کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ خاموشی سے روٹی کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ شہناز کو اس قدر مضطرب دیکھ کر روٹی اس کا دھیان بنانے کے لیے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔

”یہ تو پچھلے سال ہمارے کالج کے فکشن میں چیف گیسٹ کے طور پر آئی تھیں۔“ روٹی نے شہناز کو متوجہ کرتے ہوئے کہا ”لیکن آپ نے پہلے کبھی بتایا نہیں کہ نیلم آپ کی کوئی رشتہ دار ہیں؟“

”نیلم میری بہن ہے..... سو تیلی۔“ شہناز نے

نظریں ملائے بغیر جواب دیا۔

چند لمحے شہناز خاموش رہی پھر اس نے آہستہ آواز میں کہا۔ ”جب تک ہم دونوں سہیلیاں تھیں خوب دوستی رہی ہم دونوں میں..... بالکل ساتھ والا مکان تھا نیلم کا۔ نیلم شاید گیارہ برس کی ہوگی..... جب نیلم کی ماں کا انتقال ہوا..... پھر..... اس کے ابا نے میری اماں سے شادی کر لی اور.....“

روٹی نے مزید کچھ نہیں کہا اور صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔

”آپ کو پتا ہے مجھے ان کی شاعری بہت زیادہ پسند ہے..... جب میں نے پہلی بار ان کی کتاب پڑھی تب سے ہی مجھے بہت شوق تھا ان سے ملنے کا..... اور اب آج میں ان سے ملوں گی..... مجھے یقین نہیں آ رہا۔“ چند لمحوں بعد روٹی نے کچھ سوچتے ہوئے جذباتی انداز میں خوش ہو کر کہا۔

”میں بھی کتنے برسوں بعد آج اس سے ملوں گی۔“ شہناز نے حسرت سے خود کلامی کی ”میں تو پل پل اس پر جان چھڑکتی رہی مگر.....“

”مگر آپ کے ان سے اختلافات کیوں تھے؟“ روٹی نے روانی میں کہہ دیا۔

شہناز کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور چلے گئے۔ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی روٹی نے ٹیکسی کی کھڑکی سے دور دیکھنا شروع کر دیا۔ شہناز کے لبوں کو ذرا سی جنبش ہوئی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر کچھ سوچ کر رک گئی۔

”کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ میری امی جب طلاق لے کر گئی تھیں..... تو کاش وہ مجھے بھی ساتھ لے جاتیں..... میری تربیت کچھ ٹوڈھنگ سے ہوئی ہوتی..... میں لوگوں سے بات کرتے ہوئے پتا نہیں کیا الٹا سیدھا بول جاتی ہوں کہ بس.....“ روٹی نے رو ہانسی ہو کر شرمندگی سے کہا۔

”نہیں بیٹا..... ایسا نہ سوچا کرو..... اور تمہاری جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی پوچھتا..... میں تمہیں سب بتاتی ہوں۔“ شہناز نے پیار سے اسے لپٹاتے ہوئے کہا۔

شہناز نیلم کی باتیں کرنے کے لیے شاید خود بھی بیٹاب تھی۔ چند لمحوں بعد شہناز نے کہنا شروع کیا ”میں ہمیشہ نیلم کو بڑا آئیڈیالازمانا کرتی تھی..... کیوں کہ اس کی زندگی ہمیشہ مشکلات میں گھری رہی مگر اس نے کبھی ہار نہیں مانی..... زمانے کی یا لوگوں کی ہر مخالفت کو، اور ہر رکاوٹ کو اس نے

اس کے ہونٹوں پر کبھی میں نے مسکراہٹ نہیں دیکھی۔ لگتا تھا کہ ادا سی اس کے چہرے پر ٹھہر گئی تھی۔ "شہناز نے کالج کی لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے روبی سے کہا ہلکے سے جھٹکے سے ٹیکسی دوبارہ آگے بڑھ گئی۔"

"میرے دل میں تو بس یہی تمنا تھی کہ کاش اس کی ماں زندگی میں اس کی کامیابیوں کو حاصل کرتے دیکھ پاتی تو کتنا خوش ہوتی....." شہناز نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔ "بڑی نیک عورت تھی اس کی ماں صالحہ..... کبھی کسی کی بدی برائی میں نہیں رہتی..... مگر نیلم کو اپنی ماں سے زندگی بھر شکوے ہی رہے....."

"ماں سے....." روبی نے تعجب سے بے ساختہ کہا شہناز خاموش رہی۔

روبی کو نیلم سے متعلق ہر بات اس کی اپنی زندگی سے جڑی محسوس ہونے لگی۔ وہ نیلم کی زندگی کے ہر پہلو کو اپنی کھوکھلی زندگی کے بے کیف خانوں میں رکھ کر دیکھنے لگی۔ اگر وہ نیلم کی جگہ ہوتی تو کیا کرتی، شاید ایسا ہوتا یا پھر کچھ اور ہوتا..... کچھ کچھ سوچنے پر بھی اسے کوئی واضح شکل سمجھ میں نہ آئی..... اسے لگا کہ اس کی سوچ اس کے ذہن کے بند تاریک غار میں سر جھکتی پھر رہی ہے مگر کوئی راستہ سمجھائی نہیں دیتا۔

چند لمحوں بعد شہناز نے آہستہ آواز میں کہا۔ "ہاں..... ماں سے..... اب تمہیں بتاؤں بھی تو کیا..... نظام ہی اوندھا تھا اس گھر کا..... نیلم واقعی بہت حساس لڑکی تھی..... اور اس کی ماں صالحہ بہت سادہ طبیعت کی، شوہر پرست عورت..... اس کا باپ تھا تو پڑھا لکھا شخص مگر بیوی سے اس کا رویہ وہی عام روایتی مردوں والا تھا..... زندگی میں کبھی اپنی بیوی کو کوئی اہمیت نہیں دی..... پیسے کی تو ریل پل تھی، آئے دن دوستوں کی دعوتیں ہوتی رہتی تھیں اس کے گھر پر لوگوں کی مگر صالحہ کو کسی بات پر کوئی اختیار نہیں تھا..... سچ پوچھو تو میرا بھی بڑا دل دکھتا تھا کہ وہ سوائے اپنی بیوی کے دنیا کے ہر انسان کے ساتھ خوش رہتا تھا۔ اس پر صالحہ بیماری اپنے شوہر کی ہر جائز و ناجائز بات خوش دلی سے مانتی تھی پھر بھی شوہر کی جھڑکیوں، بے عزتی میں کوئی کمی نہ ہوتی اور شاید شوہر پرستی کے اسی رویے کی وجہ سے نیلم اپنے باپ سے متنفر ہو گئی تھی۔ اسی لیے اس نے زندگی میں اپنا راستہ خود بنایا....."

روبی نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا "یہ تو بڑی عجیب بات

بار کیا اور خود اپنی زندگی بنائی..... مجھ میں شاید اتنی ہمت کبھی بھی نہیں تھی..... مگر میں یہ ضرور سوچا کرتی تھی کہ اگر خدا نے مجھے بیٹی دی تو میں اسے نیلم کے جیسی مضبوط عورت بناؤں گی۔"

ٹیکسی نے ایک موڑ کاٹا اور نسبتاً کچے رستے پر آ گئی۔ "آپ دونوں ایک ہی شہر میں رہتی تھیں لیکن پھر کبھی وہ آپ سے ملنے نہیں آئیں۔" روبی نے بہت محتاط انداز میں پوچھا۔

"ہم حالات سے مجبور تھے اور....." شہناز نے آنسو پونچھتے ہوئے یاسیت سے کہنا چاہا مگر الفاظ اس کے حلق میں گھٹ گئے۔ گھٹل سرخ ہو گیا۔ ٹیکسی کے رکتے ہی ماتنگنے والے بچے اور کھلونے بیچنے والے نے آگھیرا۔ شہناز نے جلدی سے پرس کھول کر ماتنگنے والی ایک چھ سات سالہ بچی کو نوٹ دیا۔

"شاید اتنی بڑی ہی ہوگی نیلم کی بیٹی شائستہ جب میں نے اسے آخری بار دیکھا تھا..... اب تو کافی بڑی ہو گئی ہوگی وہ۔" شہناز نے ماتنگنے والی بچی کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے روبی سے کہا "بہت بڑی افسر لگی تھی نیلم..... بڑے شاٹھ ہاتھ تھے اس کے..... میں اپنے شوہر کی ملازمت کے لیے سفارش کرانے گئی تھی اس کے پاس..... یوں کام ہوا اس کے قلم چلانے سے۔" اس نے جھکی بجا کر کہا۔

روبی نے اپنے ذہن میں نیلم کی شخصیت کا جو خاکہ بتایا ہوا تھا، شہناز کے الفاظ اس خاکے میں رنگ بھرنے لگے تھے۔ شہناز کی باتیں سنتے سنتے روبی کے ذہن میں ایک خیال شدت سے سراٹھانے لگا..... کاش وہ بھی زندگی میں نیلم کی طرح باہمت ہوتی، کاش اس نے بھی اپنی زندگی کے بارے میں کچے جانے والے فیصلوں کے آگے سر نہ جھکایا ہوتا تو آج وہ بھی زندگی میں کسی نمایاں مقام پر ہوتی۔ اسی سوچ کی بناء روبی کے دل میں نیلم کے بارے میں ہر بات جاننے کی خواہش بڑھ گئی۔

ڈرائیور نے ٹیکسی کی رفتار تھوڑا آہستہ کی۔ کالج کی کچھ لڑکیاں ہنسی کھلکھلاتی ہوئی تیزی سے ٹیکسی کے سامنے سے گزریں۔ ان کے سڑک گراس کرتے ہی ڈرائیور نے گاڑی کو اسپید سے آگے بڑھا دیا۔

"تمہیں پتا ہے ہمارے کالج کا کوئی فکشن اس کے بغیر کھل نہیں ہوتا تھا..... ایسی زبردست تقریریں کیا کرتی تھی، پورے کالج میں ہر طرف اسی کی دھوم تھی..... مگر....."

ہے..... آخر وہ اتنی بے جا باتیں کیوں مانتی تھیں اپنے شوہر کی؟“

ہوئے پوچھا۔
 ”نہیں..... اور کسی کے ساتھ ایسا برا رویہ نہیں تھا ان کا.....“ شہناز نے سوچتے ہوئے کہا ”بلکہ وہ صالحہ کے ساتھ بھی ہر وقت برا نہیں کرتے تھے..... موڈ اچھا ہوتا تو تھیلے بھر کر فروٹ لادیتے، طرح طرح کی چیزیں، کپڑے لادیتے مگر اس میں بھی صرف ان کی اپنی مرضی ہی ہوتی تھی..... بیوی کی خواہش اور اختیار کو کبھی اس نے اہمیت نہ دی..... اور آفرین ہو اس عورت پر جس نے نہ جانے کیسے نباہ کیا ایسے شخص کے ساتھ اور زبان پر کبھی شکوہ تک نہ لائی..... شوہر نے جو کچھ لادیا احسان سمجھ کر رکھ لیتی.....“

شہناز نے سیٹ کی پشت پر سر نکا دیا اور دھیرے سے اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ ”یہی قلق تو نیکم کو بھی تھا..... اس کی ماں ایک آن پڑھ عورت تھی..... وہ اکثر اپنی ماں سے ان باتوں پر ناراض ہوا کرتی تھی کہ اس کی ماں نے ہمیشہ اپنی مرضی، پسندنا پسند اور خواہشات، اپنی ذات کو بھلا کر ہمیشہ شوہر کی بات کو مقدم کیوں رکھا مگر اس کو ملا کیا؟ صرف دو وقت کی روٹی اور چار دیواری کی خاطر اپنی زندگی کو اتنا بے رنگ کر لیا۔ اس پر اس کی ماں اسے بس اتنا ہی جواب دے پاتی تھی، ہمیں تو ہمارے بڑوں نے یہی بتایا ہے ہم اسی طرح زندگی گزارتے آئے ہیں..... مگر نیکم..... وہ ہمیشہ چاہتی تھی کہ اس کی ماں بھی برابری کے حق کی بات کرے۔“

”ہوں..... کالج کے زمانے میں بھی کتنے ہی اخباروں، رسالوں میں، اس کی غزلیں، اس کی تصویریں اس کے انٹرویوز چھپتے تھے..... دور دور تک اس کی شاعری کی شہرت تھی۔ ایک شہر سے دوسرے شہر تک مشاعروں میں اسے بلایا جاتا تھا..... میری بھی بڑی تصویریں چھپی ہیں نیکم کے ساتھ ساتھ کالج کے میگزینوں میں.....“ شہناز نے خوشی سے جذباتی انداز میں کہا۔

نیکسی ایک جھٹکے سے رکی۔ بریک چر چرائے ڈرائیور نے اچانک سامنے آتے ہوئے ایک فقیر کو زوردار آواز میں ڈانٹا۔ شہناز نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھنا چاہا مگر ڈرائیور نے تیزی سے نیکسی آگے بڑھا دی۔ نیکسی کے برابر میں ایک اسکول وین ساتھ ساتھ چلنے لگی جس میں سے کئی شریر بچے لوگوں کو دیکھ کر منہ چڑا رہے تھے اور ہاتھ ہلا رہے تھے۔ شہناز بھی انہیں دیکھ کر محظوظ ہونے لگی۔

”گلتا ہے کبھی کچھ بدل گیا ہے اتنے برسوں میں.....“ کھڑکی سے باہر جھانک کر شہناز نے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بہت عرصہ بعد آئی ہیں آپ اس علاقے میں؟“ روٹی نے استفسار کیا۔

”ایک بار کی بات بتاؤں..... جب میں اسکول میں تھی تو میں ضد کر کے اپنی سالگرہ نیکم کے گھر پر ہی منایا کرتی تھی..... اس کی ماں مجھ سے بڑا پیار کرتی تھی۔“ شہناز نے ہنستے مسکراتے بچوں کو دیکھ کر اپنے بچپن کی یادوں کو پھر سے تازہ کرنا شروع کر دیا ”پر مجھے اس کے ابا سے بڑا ڈر لگتا تھا..... بعد میں تو وہ میرے ابا بھی ہو گئے مگر اس کے مزاج کا کچھ بھروسا نہیں تھا..... بات بات پر جھگڑا کرتا، چیختا چلاتا اور گھر سے نکالنے کی دھمکی تک دیتا مگر اس کی ماں ہر بات پر اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے جتن کرتی رہتی بات کو دبانے کے لیے، بات ختم کرنے کے لیے کوششیں کرتی۔ بے قصور ہونے کے باوجود معافیاں تلافیاں کرتی رہتی۔ شوہر کے ماتھے کی شکنیں دور کرتے کرتے اس کی زندگی ختم ہو گئی۔“

”ہوں..... یہاں کیا میرا تو کسی کے پاس بھی آنا جانا نہیں ہوتا اب..... نیکم کی طلاق کے مقدمے کے بارے میں بھی لوگوں ہی سے سنا ہے میں نے.....“ شہناز نے دکھی لہجے میں کہا ”خدا جانے وہ اب بھی مجھ سے ملنا چاہے گی یا نہیں؟“ ”آپ ان سے اتنی زیادہ محبت کرتی ہیں..... میرا دل کہہ رہا ہے کہ وہ آپ کو دیکھ کر خوش ہوں گی۔“ روٹی نے ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔

”خدا معلوم جو حالات رہے ان سب معاملوں میں وہ اپنے باپ کو زیادہ قصور وار زیادہ سمجھتی تھی یا میری ماں کو

”اچھا..... پھر ان کا رویہ بعد میں آپ کی امی کے ساتھ بھی ایسا ہی رہا؟“ روٹی نے پیشانی پر ہل ڈالتے

کاٹتے ہوئے ڈرائیور نے پوچھا۔ تو باتوں کا سلسلہ رک گیا۔ شہناز نے گلیوں کو بغور دیکھتے ہوئے ایک جانب اشارہ کیا اور گاڑی اس طرف بڑھ گئی۔

شہناز اور روبی ایک بڑے سے بنگلے میں داخل ہوئیں۔

نیلیم کے لیے شہناز سے ملاقات واقعی بہت غیر متوقع تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے معافی کی خواستگار تھیں مگر شاید پہل کرنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ گلے شکوے دور ہونے کے بعد دونوں پرانی یادوں کو تازہ کرتے لگیں۔

نیلیم کی بیٹی شائستہ نے چائے کا اہتمام کر لیا۔ شائستہ کے تعارف پر شہناز ذرا حیران سی رہ گئی۔ کیونکہ وہ ابھی تک اسے نیلیم کی نوکرانی سمجھ رہی تھی۔ شائستہ نے اپنے سر پر منڈھے ہوئے دوٹے کے کناروں کو کانوں کے پیچھے اڑسا ہوا تھا۔ لباس بھی بالکل عام سا تھا۔

نیلیم کے بازو پر بندھی ہوئی بیٹیوں اور چہرے پر چوٹوں کے نشانات کو بغور دیکھتے ہوئے شہناز نے استفسار کیا تو اسے بھی معلوم ہوسکا کہ کسی پڑوس کی عورت کی حمایت میں اس کے مقدمے میں گواہی دی تھی، اس کے دشمنوں نے انتقام لینے کے لیے اس پر فائرنگ کر دی۔

”تم واقعی بہت مضبوط عورت ہو۔ نیلیم.....“ شہناز نے ستائشی انداز میں اس کی ہمت کو سراہتے ہوئے کہا چاہا مگر نیلیم نے پھر رُخ پھیر کر آنکھیں سختی سے بند کر لیں۔

”ارے واقعی سچ کہہ رہی ہوں..... پوچھ لو تم اس سے..... میں تو سارے رستے ہی باتیں کرتی آئی ہوں روبی سے.....“ شہناز نے یقین دلاتے ہوئے کہا مگر ایسا لگ رہا تھا جیسے نیلیم کو یہ الفاظ مسلسل کسی تکلیف میں مبتلا کر رہے تھے۔

اسی لمحے دروازے پر آہٹ سی ہوئی، ہنکارا بھر کر شائستہ کا شوہر کمرے میں داخل ہوا۔

شہناز خاموش ہو گئی۔ شائستہ نے آگے بڑھ کر اس کا خوش دلی سے استقبال کیا، پھر شہناز کا تعارف کر دیا مگر شائستہ کے شوہر نصیر نے نہایت بے دلی اور روکھے لہجے میں بات کی۔

شہناز کو یہ سب بہت عجیب سا لگا مگر کچھ کہہ نہ سکی۔ نصیر نے اخبار اٹھایا اور صفحے پلٹنے لگا۔ شائستہ نے پھرتی سے دسترخوان سجایا اور جھٹ پٹ گرم گرم روٹیاں بنا کر اس کے سامنے رکھ دیں۔ وہ اخبار کی ورق گردانی

مگر..... میں نے ہمیشہ اس کو دل سے چاہا.....“ شہناز نے بھی خود کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ ”تمہیں پتا ہے جب نیلیم کی ماں کا انتقال ہوا تو میری ماں نے نیلیم کا بہت خیال رکھا۔ نیلیم سارا دن میرے گھر پر ہی رہتی تھی..... شام کو جب اس کا باپ کام سے واپس لوٹتا تو نیلیم اپنے گھر چلی جاتی لیکن..... اس وقت ہمارے گھر میں پائی پیسے کی بڑی تنگی تھی۔ نیلیم کے باپ کو اندازہ تھا وہ ہماری مالی امداد کرنے لگا پھر.....“ شہناز کہتے کہتے اچانک رک گئی جیسے کچھ باتیں حذف کرنا چاہتی ہو۔ ”پھر..... وہی ہوا جو..... ان حالات میں ہوتا ہے..... گلی محلے کے لوگوں نے سو سو باتیں بنانی شروع کر دیں میری ماں کے متعلق..... چند لمحے خاموش رہنے کے بعد شہناز نے بہت آہستہ آواز میں کہا۔

ٹریفک جام ہونے کی وجہ سے ٹیکسی رک گئی۔ اچانک کالم گلوچ کی تیز زوردار آوازیں آنے لگیں۔ پریش پاران اور بے نیلیم سی آوازوں میں کچھ کچھ سنیں نہیں آ رہا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور بھی اتر کر باہر چلا گیا۔

روبی بالکل خاموش رہی۔ آگے کچھ کہنے کی ہمت بھی نہیں ہو رہی تھی اور اس کی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کہے تو کیا کہے۔

”میری ماں نے شاید کسی کے کہنے سننے کی زیادہ پرواہ نہیں کی..... بہت دن اسی طرح گزرتے گئے۔ ایک روز میری ماں کا نیلیم کے باپ سے بہت جھگڑا ہوا..... وہ دیر تک روتی رہی اور نیلیم کا باپ اس پر چیختا چلاتا رہا..... اس روز میری ماں نے چوہے مارنے والی دوائی پی کر خودکشی کرنے کی کوشش کی.....“

”کچھ نہیں ہے..... ارے یہ چھوٹے موٹے ایکسڈینٹ تو ہوتے رہتے ہیں.....“ ٹیکسی ڈرائیور نے بڑبڑاتے ہوئے دوبارہ گاڑی اشارت کرتے ہوئے کہا اور آہستہ آہستہ گاڑی آگے بڑھانی شروع کر دی۔

کچھ لمحوں بعد شہناز نے..... روبی سے نگاہیں ملانے بغیر کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ”اور پھر..... ڈاکٹروں نے میری ماں کی جان بچالی۔ اگلے چند روز میں نیلیم کے باپ نے میری ماں سے نکاح کر لیا۔ دو تین دن میں ہی ہم لوگ نئے محلے میں شفٹ ہو گئے۔ چھ مہینے بعد میری ماں کے ہاں میرا بھائی پیدا ہوا..... جو پیدا کسی طور پر ذہنی معذور تھا۔“

”باجی آگے کس طرف.....“ اشاپ کے قریب موڑ

کرتے ہوئے بڑے بڑے نوالے توڑ کر چباتا رہا۔ شائستہ نے خوش دلی سے جو بھی بات پوچھی اس نے توجہ دیئے بغیر ہاں ہوں میں جواب دے دیا۔ اس کی نظریں مستقل اخبار پر جمی رہیں۔

شہناز کو ان چند لمحوں میں ہی اندازہ ہو گیا کہ نیلم کا داماد کس قدر کڑوے مزاج کا انسان ہے لیکن اس کے باوجود شائستہ کے رویئے پر حیران رہ گئی جو شوہر کی ایسے آؤ بھگت کرنے لگی جیسے وہ کسی ملک کا سربراہ ہو۔

شائستہ نے ٹھنڈا پانی اسے لا کر دیا۔ کھانا کھانے کے بعد صالحہ اٹھی اور نصیر کے بناء مانگے ہی جھٹ پٹ ماچس اور ایش ٹرے لے آئی۔ نصیر نے سگریٹ سلگایا اور پھر اخبار کی سرخیوں پر نظریں دوڑانے لگا۔ شائستہ نے برتن اٹھائے اور پھر نصیر کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ شہناز کو لگ رہا تھا کہ جیسے وہ بہت شوق سے یہ سارے کام کر رہی ہو۔

شائستہ باورچی خانے میں ہی تھی کہ اس کی چار سالہ بیٹی سوتے سوتے جاگ گئی۔ شائستہ دوڑی دوڑی اس کے پاس آئی۔ بچی کو بہلانے کی کوشش کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد شائستہ نے اپنی بچی کو کھانا کھلانا شروع کیا تو بچی نخرے کرنے لگی۔

شہناز کو وہاں بیٹھے یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے کوفت سی ہونے لگی لیکن حیران اس بات پر تھی کہ شائستہ بچی کو بہلانے کے لیے لاکھ جتن کرتی رہی، ہر نوالے پر کہانیاں سناتی رہی اور نہ اس پر غصہ کیا نہ اس کی پیشانی پر کوئی تل آیا۔ بچی کے رونے دھونے سے شہناز ذرا چڑھی گئی۔

ماحول کی کشیدگی کم کرنے کے لیے شہناز نے شائستہ کی بچی کے کپڑوں کی تعریف کر دی تو نیلم نے اسے بتایا کہ صالحہ کو گھر داری کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ نہ ٹی وی دیکھنے کا شوق ہے نہ ہی سنگھار پٹار کا لیکن سلائی کڑھائی میں ماہر ہے۔ نہ صرف بچی کے بلکہ اپنے کپڑوں اور چادروں کی سلائی کڑھائی خود ہی کرتی ہے۔

یہ سب سن کر شہناز کا دل اور بچھ سا گیا۔ جو کچھ اسے اس گھر میں نظر آ رہا تھا وہی اس کا دل جلا دینے کے لیے کافی تھا۔ کچھ کہہ تو نہ سکی ہاں ہوں کر کے رہ گئی۔ لیکن اسے مسلسل اس بات کا دکھ ہو رہا تھا کہ نیلم نے جس انداز سے اپنی زندگی گزار رہی اور لوگوں کے لیے ایک مثال بنی، اس نے اپنی بیٹی کی تربیت نہ جانے کس ڈھنگ سے کی ہے۔ اگر کسی اچھے کالج، یونیورسٹی سے پڑھایا ہوتا تو شاید وہ آج دوسری پڑھی

لکھی عورتوں کے طور طریقے سے زندگی گزارتی۔

”لگتا ہے تم نے شائستہ کی شادی چھوٹی عمر میں ہی کر دی تھی..... میرا مطلب ہے کہ وقت سے پہلے ذمہ داریاں کاندھوں پر پڑ جاتی ہیں تو بچی کی اپنی شخصیت نکھر نہیں پاتی.....“ شہناز بہت محتاط انداز میں اپنا شکوہ زبان پر لے آئی ”مجھے تو شائستہ تمہاری بیٹی نہیں لگتی.....“

نیلم کے کوئی جواب دینے سے پہلے ہی شائستہ نے آ کر بتایا کہ پڑوس میں کسی کی طبیعت خراب ہے۔ کچھ میڈیکل اسٹور سے دوائیں خریدنے جانا ہے۔

نصیر نے انگڑائی لے کر ناک منہ چڑھا کے اس کی طرف دیکھا، معاملے کو سنبھالنے کے لیے شائستہ نے اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی کہا ”کوئی بات نہیں آپ تھکے ہوئے آئے ہیں..... آرام کر لیں میں لے آتی ہوں..... مجھے کار کی چابی دے دیں۔“

شہناز یہ دیکھ کر حیران سی رہ گئی پھر ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف ہو گئی۔

کچھ دیر بعد شائستہ واپس آئی۔ اس نے اطمینان دلاتے ہوئے بتایا کہ میڈیسن مل گئی تھیں تو اس نے وہیں انجیکشن بنا کر لگا بھی دیا ہے۔

شہناز کی حیرانی اور بڑھ گئی۔ باتوں باتوں میں شائستہ نے بتایا کہ اس نے بی فارمیسی کیا ہوا ہے۔ جاب اس لیے چھوڑ دی کہ گھر کو اس کی زیادہ ضرورت تھی لیکن کوچنگ سینٹر میں پڑھاتی ہے۔

شہناز دل ہی دل میں خود سے شرمندہ سی تھی۔ اس کے اندازے اس قدر غلط نکلے۔ لیکن اسے ایک بحسب بھی تھا۔ شوہر اور گھر کے معاملے میں شائستہ کا بے پڑھی لکھی عورتوں کا سا رویہ اسے بے چین کیے ہوئے تھا۔ شہناز سے رہا نہ گیا اور اٹھتے اٹھتے اس نے نیلم سے پوچھ ہی لیا ”تمہاری ماں نے تمہیں ایک مضبوط عورت بنایا تھا..... شائستہ پر تو تمہاری پر چھائی بھی نہیں پڑی.....“

نیلم کے چہرے پر کئی رنگ ایک ساتھ آئے جیسے کسی شکست خوردہ زمین پر کسی نے فتح کا علم لہرایا ہو..... نیلم نے نیم وا آنکھوں کے ساتھ کہا ”میری ماں نے مجھے..... مضبوط عورت..... بنایا تھا..... میں نے اسے..... صرف عورت بنایا ہے.....“





دانش سب سے بڑا کام

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم

لوگ دوسروں کی کہانیاں لکھتے ہیں لیکن میں نے اپنی کہانی لکھی ہے۔ ایک بوڑھے شخص نے خاموش رہ کر مجھے کس طرح سبق دیا یہی میں نے اپنی سرگزشت میں بیان کیا ہے۔

طارق جمال
(کراچی)



اب تو مجھے اس آدمی سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔
بظاہر وہ ایک بے ضرر انسان تھا۔ دبلا پتلا، پچاس
سے زیادہ ہی کا ہوگا۔ سستے کپڑے اور خستہ حال جوتے۔ یہ
اس کی شناخت تھی لیکن اس عام سے بے ضرر انسان نے
مجھے خوفزدہ کر دیا تھا۔
میرا خیال ہے کہ مجھے خوف زدہ ہونے کی اصطلاح
نہیں استعمال کرنی چاہیے۔ یوں کہیں کہ انجمن میں ڈال دیا
تھا۔ یہ بالکل مناسب ترجمانی ہے۔

اس نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا لیکن یہ پہلے کی بات ہے۔ اب تو الجھن کے ساتھ ساتھ خوف بھی محسوس ہونے لگا تھا۔

میرا نام طارق جمال ہے۔ وکیل ہوں، ایک کامیاب وکیل۔ میں اپنے آپ کو کامیاب وکیل اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ایسا شاید ہی ہوا ہو کہ میں نے کوئی کیس ہاتھ میں لیا ہو اور اس میں کامیابی نہ حاصل کی ہو۔

بہر حال میں اس وقت اپنی کامیابیوں کی کہانیاں نہیں سنارہا۔ بلکہ اس بے ضرر عام سے بوڑھے کے بارے میں بتا رہا ہوں جس نے مجھے خوف زدہ کر دیا تھا۔

اس کے ہاتھ میں ہمیشہ ایک موٹا سا رجسٹر ہوا کرتا۔ یعنی میں نے اسے ہمیشہ رجسٹر کے ساتھ ہی دیکھا۔ ایک رجسٹر اور ایک قلم۔

وہ مجھے دیکھتے ہی رجسٹر پر جلدی جلدی کچھ لکھنے لگتا تھا۔ خدا جانے کیا لکھتا ہو گا لیکن ہوتا ہی تھا کہ وہ ایک نظر میری طرف ڈالتا اور رجسٹر پر لکھنا شروع کر دیتا۔ شاید دو چار جملوں کے بعد پھر دیکھتا پھر لکھتا۔

پہلی دفعہ اس کا احساس اس وقت ہوا جب گھر سے کچھ ہی فاصلے پر گاڑی خراب ہو گئی۔ میں اپنے ساتھ ڈرائیور نہیں رکھتا بلکہ اپنی گاڑی خود ہی چلاتا ہوں۔ میرا تعلق جس پیشے سے ہے اس پیشے کے لوگوں کو ہر قسم کی احتیاط کرنی چاہیے۔ بہر حال یہ ایک الگ سی بات ہے۔

تو اس دن میں گھر سے چلا ہی تھا کہ گاڑی خراب ہو گئی۔ بلکہ اسے خراب ہونا ہی نہیں کہنا چاہیے کیونکہ اس کا ایک ٹائر پھینچ ہو گیا تھا۔

میں جھنجھلا کر گاڑی سے باہر آ گیا۔ گاڑی میں فالتو ٹائر بھی موجود تھا اور جو ضروری اوزار ہوتے ہیں وہ بھی تھے لیکن پراہلم یہ تھی کہ مجھے ٹائر بدلنا نہیں آتا تھا۔

فوری طور پر میں نے ایک آدمی کی مدد سے گاڑی کو ایک طرف لگا دیا۔ میں نے دھکا لگانے والے سے پوچھا۔

”بھائی تمہیں ٹائر بدلنا آتا ہے؟“

”نہیں صاحب میں نہیں جانتا۔“ اس نے جواب دیا۔

”چلو کوئی بات نہیں۔ تمہارا شکر یہ کہ تمہاری مدد سے گاڑی یہاں تک آ گئی۔“

اس آدمی کے جانے کے بعد میری نگاہ اس عام سے

بے ضرر بوڑھے پر پڑی جو اپنے ہاتھ میں ایک رجسٹر لیے ہوئے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔

اس کی اس حرکت نے مجھے چونکا دیا کہ وہ ایک نظر میری طرف دیکھتا پھر رجسٹر پر کچھ لکھنے لگتا۔ پھر دیکھتا پھر لکھنے لگتا۔

میں ابھی اس کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ میری گاڑی سے آگے ایک گاڑی آ کر رک گئی اور ایک صاحب مجھے آواز دیتے ہوئے اپنی گاڑی سے اتر کر میری طرف آنے لگے۔

وہ میرے دوست تھے امجد درانی۔ میری طرح وہ بھی وکیل تھے لیکن وہ سول کیسز لیتے تھے۔ امجد درانی کو دیکھ کر جان میں جان آ گئی تھی۔

”اوہ بھائی! کیوں اکیلے یوسف بے کارواں بن کر کھڑے ہوئے ہو۔“

”امجد صاحب! ٹائر پھینچ ہو گیا ہے۔“ میں نے بتایا۔

”تو کیا ہوا۔ اب تک تو دوسرا ٹائر لگا لینا چاہیے تھا۔“

”لیکن مجھے ٹائر بدلنا نہیں آتا۔“

”یہ بتاؤ فالٹو ٹائر ہے؟“

”ہاں ہے۔“

”تو پھر کیا پراہلم ہے۔ میں بدل دیتا ہوں۔“

امجد درانی نے ٹائر بدلنا شروع کر دیا۔ پھر مجھے بوڑھے کا خیال آیا تو وہ اب وہاں سے جا چکا تھا۔

اس وقت اس کے بارے میں ذرا سا خیال آیا تھا۔ پھر ذہن کو جھٹک کر امجد کو ٹائر بدلتے ہوئے دیکھنے لگا۔

اس بوڑھے سے آدمی سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ ملاقات کیا پہلی ٹڈی بھرتھی جو گھر سے کچھ فاصلے پر ہوئی تھی۔

اس کے بعد میں نے اسے دوسری بار اپنے گھر کے باہر دیکھا۔

میں اپنے خوب صورت سے گھر میں اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہتا ہوں۔ پرسکون زندگی گزار رہا ہوں۔ کسی قسم کی کوئی خاص پریشانی نہیں ہے لیکن اس بوڑھے کی آمد نے ایک ہچکل سی محاذی تھی۔

وہ کچھ بھی نہیں کہتا تھا بس مجھے دیکھتا اور اپنی ڈائری میں کچھ لکھنا شروع کر دیتا تھا۔ کیا لکھتا تھا یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن اتنا ضرور احساس ہوتا تھا کہ وہ میرے ہی بارے میں کچھ لکھ رہا ہے۔

ٹائر والے واقعے کے بعد وہ مجھے ایک شاپنگ سینٹر کے باہر مل گیا۔ میں اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ آیا ہوا تھا۔

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر پہ بے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ سسٹمز
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

امریکا کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے
ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر
رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے پیاوون کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے
ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر
بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیزا 111 سٹیشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 021-35895313 فیکس: 021-35802551

مجھے اپنے لیے شٹس اور بچوں کے لیے جوتے
خریدنے تھے۔ وہ سب لے کر باہر نکلا تھا کہ اسے سینٹر کے
باہر کھڑا ہوا دیکھ لیا۔

بالکل ایسا ہی محسوس ہوا جیسے وہ میرے ہی انتظار میں
کھڑا ہو یا اور میرا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آیا ہو۔ پہلی بار
مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
بہت طنزیہ سی مسکراہٹ تھی، مذاق اڑاتی ہوئی۔

اس کے ہاتھ میں وہی ڈائری تھی جس میں وہ کچھ لکھا
کرتا تھا۔ اس نے پھر لکھنا شروع کر دیا۔
”غزالہ۔“ میں نے اپنی بیوی کو مخاطب کیا۔
”ہوں۔“

”اس آدمی کو دیکھ رہی ہو۔“ میں نے اس بوڑھے کی
طرف اشارہ کیا۔

”ہاں۔“ غزالہ نے اس پر ایک اچھتی ہوئی نگاہ
ڈالی۔ ”ہاں دیکھ رہی ہوں، تو پھر۔“

”یہ آدمی مجھے پاگل کیے دے رہا ہے۔“ میں نے
کہا۔ ”یہ کم بخت میرے اعصاب پر سوار ہو گیا ہے۔“
”ارے، ایسی کیا بات ہو گئی؟“

”گھر چلو تفصیل سے بتاؤں گا۔ اس وقت مجھے اس کو
دیکھ کر وحشت ہو رہی ہے۔“

گھر پہنچ کر میں نے غزالہ کو اس کے بارے میں بتا
دیا۔ میری بات سن کر وہ بھی سوچ میں پڑ گئی تھی۔
”یہ تو بہت حیرت کی بات ہے۔ وہ کہتا بھی کچھ نہیں
ہے۔“

”نہیں، اسی لیے تو میں زیادہ پریشان ہوں۔ مجھے
اس کی خاموشی نے خوفزدہ کر دیا ہے۔ اگر وہ کچھ کہے یا کسی
ردعمل کا اظہار کرے تو معاملہ صاف ہو سکتا ہے۔ یہاں تو وہ
بالکل خاموش رہتا ہے۔“

”اور آپ کو دیکھ کر لکھتا کیا ہے؟“

”یہی تو نہیں معلوم کہ وہ کیا لکھتا ہے؟“

”آپ تو اتنے بڑے وکیل ہیں۔“ غزالہ نے کہا۔
”پولیس والوں سے تو آپ کی جان پہچان ہوگی۔ ان سے
شکایت کر دیں۔“

”لیکن کس بات کی شکایت، وہ تو یہی کہیں گے کہ
جب آپ کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچ رہا ہے تو پھر آپ کو
کیا پریشانی ہے۔“

ایسا کریں ایک دن خود اس سے پوچھ لیں۔ آپ

کی الجھن دور ہو جائے گی۔“

”ہاں یہ ہو سکتا ہے۔“ میں نے اس کی تائید کی۔
”میں یہ کر کے دیکھتا ہوں۔“

میری برسوں کی عادت ہے کہ میں واک کرنے کے لیے قریبی پارک کی طرف جایا کرتا ہوں۔ چونکہ صبح کو وقت نہیں ملتا اس لیے میری یہ واک شام کو ہوا کرتی ہے۔

اس شام وہ کم بخت پارک میں بھی تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے پھر اپنی ڈائری سنہال لی اور کچھ لکھنا شروع کر دیا۔

اور اس وقت میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ میں اس کم بخت سے معلوم کر کے رہوں گا کہ اس نے یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے۔

میں اپنی واک کے ٹریک سے ہٹ کر اس کی طرف چل پڑا۔ اس نے شاید یہ اندازہ کر لیا تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ اس لیے اس نے ایک طرف دوڑ لگا دی۔

میں نے اسے آواز دی۔ ”اے..... بات سنو..... بات سنو۔“

اس نے بس ایک بار مڑ کر میری طرف دیکھا۔ پھر تقریباً دوڑتا ہوا پارک کے گیٹ سے باہر نکل گیا۔

اس کی یہ حرکت مجھے خوفزدہ کر گئی تھی۔

اس کے دل میں یقیناً کوئی بات تھی، کوئی چور تھا، ورنہ اسے بھاگنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں تو اس سے صرف بات کرنا چاہتا تھا۔ پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے اور مجھ کو دیکھ کر ڈائری میں کیا لکھنے لگتا ہے۔

بہر حال اب میں اتنا بے زار، چڑچڑا ہوا گیا تھا کہ میں نے ہر قیمت پر اسے پکڑنے اور یہ راز جاننے کا ارادہ کر لیا تھا۔

میں نے اپنے ایک جاننے والے پولیس آفیسر سے بات کی۔ میں یہ بتا چکا ہوں کہ میں ایک مشہور وکیل ہوں۔ اس لیے بہت سے پولیس والوں سے میری دوستی ہے۔

شعیب نام تھا اس کا۔ اس نے میری پرابلم بہت حیرت سے سنی تھی۔ ”یار یہ تو واقعی بہت الجھا ہوا معاملہ ہے۔

ویسے اب خود مجھے بھی اس کہانی میں دلچسپی محسوس ہونے لگی ہے کہ یہ کیا چکر ہے؟“

”یار! اس لیے تو میں بھی الجھ گیا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”اچھا یہ بتاؤ وہ کہاں ملتا ہے۔“

”ہر اس جگہ جہاں میں جاتا ہوں۔“ میں نے بتایا۔
”خاص طور پر اس پارک میں جہاں میں شام کے وقت واک کے لیے جاتا ہوں۔“

”تم نے تو بتایا ہے کہ وہ تم کو پاس آتے دیکھ کر بھاگ گیا تھا۔“

”ہاں! لیکن اب وہ گیٹ کے پاس کھڑا رہتا ہے اور جیسے ہی میں گاڑی روکتا ہوں وہ ایک طرف ہٹ کر کچھ لکھنے لگتا ہے۔“

”بس تو پھر فکر مت کرو۔ آج ہی شام میں کچھ سادہ لباس والوں کی ڈیوٹی لگا دیتا ہوں۔“

”اور تم خود کہاں رہو گے پتہ میں نے پوچھا۔“

”میں بھی آس پاس ہی رہوں گا۔“ اس نے بتایا۔

”بس جیسے وہ نظر آئے اس کی طرف اشارہ کر دینا۔ میرے بندے اسے پکڑ لیں گے۔ دیکھوں تو میں اس نے کیا ڈراما لگا رکھا ہے۔“

ہم نے یہ پروگرام طے کر لیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بوڑھا ضرور آئے گا۔ کیوں کہ وہ میرے لیے سائے کی طرح ہو گیا تھا۔

معمول کے مطابق میں شام کے وقت واک کرنے پارک کی طرف چلا گیا اور معمول کے مطابق وہ بوڑھا ڈائری لے کر ایک طرف کھڑا ہوا تھا۔

میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ کچھ فاصلے پر وہ پولیس آفیسر میرا دوست بھی دکھائی دے گیا۔ اس کی نگاہیں میری ہی طرف تھیں۔

میں نے اس بوڑھے کی طرف اشارہ کر دیا۔ ذرا سی دیر میں اس پولیس آفیسر کے آدمیوں نے اسے پکڑ لیا تھا۔

پولیس آفیسر نے اس کے ہاتھ سے رجسٹر چھین لیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے میرے پاس لے آیا۔

میں نے یہ دیکھا کہ اس دوران وہ بوڑھا بالکل مطمئن انداز میں کھڑا رہا تھا۔ کسی قسم کی پریشانی کوئی گھبراہٹ نہیں تھی۔

”ہاں بڑے میاں، کیا لگا رکھا ہے تم نے؟“ میرے دوست نے اپنے مخصوص انداز میں پوچھا۔

”کچھ بھی نہیں۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔“ اس نے کہا۔

”پھر یہ کیا چکر ہے۔ تم ان صاحب کا پیچھا کیوں کرتے ہو اور ان کو دیکھ کر رجسٹر میں کیا لکھتے ہو۔“

نے یا دولا یا۔

میں نے اب کچھ پہنچتی ہی محسوس کی۔ ”ہاں تو پھر۔
اڑتا ہی رہتا ہوں۔“ میں ویل ویل ہوں اور اس قسم کے کیس

آدی میرے بیٹے کا قافل ہے۔ اس کے باوجود آپ نے
اس کا کیس بڑا اور اسے باعزت بری کر دیا۔“

”ہاں تو پھر۔“ پولیس آفیسر نے پوچھا۔ ”لیکن تم یہ

سب کیا کرتے پھر رہے ہو۔“
”میں صرف ایک تجربہ کر رہا تھا صاحب۔“ اس نے

”دیکھا تجربہ؟“

”میں یہ دیکھتا چاہ رہا تھا کہ ایسے معاملات میں کسی
کے ضمیر پر کوئی بوجھ ہوتا ہے یا نہیں اور اگر بوجھ ہوتا ہے تو

اس کی کسی نہ کسی حرکت سے اعزاز وہ ہو جاتا ہوگا کہ وہ دل
ہی دل میں شرمندہ ہو رہا ہے لیکن ہوا یہ کہ اسے دنوں تک

ویل صاحب کی ٹھکانی کے باوجود بھی یہ احساس نہیں ہوا کہ
ان کے دل اور ضمیر پر کوئی بوجھ ہے۔ یہ بالکل تارل ہیں۔

اس لیے تو میں نے ہر تاریخ کے آگے لکھا ہوا ہے کہ کچھ بھی
نہیں۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں اپنے تجربے میں تا کام ہو گیا

ہوں۔ بس اتنی ہی بات ہے۔“

ہم سب خاموش رہے۔ اس بوڑھے نے بہت
اطمینان کے ساتھ اپنا رجسٹر واپس لیا اور جاتے جاتے میری

طرف دیکھا۔ ”صاف کرنا لکل صاحب میں نے آپ کو
پریشان کیا ہے۔ آئندہ آپ مجھے نہیں دیکھیں گے۔ کیوں کہ

مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ کے دل اور ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں
ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے۔“

بوڑھا چلا گیا۔ ہم سب اس کی طرف دیکھتے رہے۔
کسی میں اسے روکنے کی ہمت نہیں تھی لیکن اس نے ڈائری

میں قلم لکھا تھا کہ کچھ نہیں ہوا ہے۔
”کاش وہ مل جائے تو میں اسے بتا سکوں کہ بہت
کچھ ہو گیا ہے۔ میں نے اگلے ہفتے ہی سے وکالت چھوڑ
دی تھی۔ اور میں ایک فرم میں کام کرنے لگا تھا اور آپ
میں راتوں کو اٹھ اٹھ کر خدا سے اپنے اس کناہ کی سحافی
باتگا کرتا ہوں۔ بہت کچھ ہو گیا ہے میرے ساتھ، بہت
کچھ۔“

”رجسٹر آپ کے پاس ہے چنانچہ۔ آپ خود دیکھ
لیں۔“ میرے دوست نے رجسٹر کھول کر دیکھنا شروع

کر دیا۔ وہ جیسے جیسے ورق پلٹا جا رہا تھا اس کے چہرے پر
حیرت کے تاثرات گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

”اس میں تو کچھ نہیں لکھا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”ہر
ورق پر ایک ہی جمل لکھا ہوا ہے۔“ کچھ نہیں، کچھ نہیں، کیا

ہے یہ؟“

میں نے بھی اس کے ہاتھ سے رجسٹر لے کر دیکھنا
شروع کر دیا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا ہر ورق پر ایک جمل لکھا

ہوا تھا۔ ”کچھ نہیں، کچھ نہیں۔“
”بڑے مہیاں یہ کیا سلسلہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے دیکھ کر تم یہ جملہ کیوں لکھتے ہو؟“
”میں ایک تجربہ کر رہا تھا۔“ اس نے کہا۔ ”ابھی تک کچھ بھی نہیں

تا کام ہو گیا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”ابھی تک کچھ بھی نہیں
ہوا۔“

”بڑے مہیاں صاف صاف تا کیا تجربہ کر رہے
تھے؟“

”دیکھ آپ لوگ تسلی کے ساتھ سری بات سن لیں
گے؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں کیوں نہیں سنیں گے۔“ پوچھ لیس آفیسر
نے کہا۔

”صاحب آپ کو یاد ہے۔ اب سے تین سال پہلے
مطلوب نام کے ایک نوجوان کابل ہوا تھا۔“ اس نے میری

طرف دیکھ کر کہا۔
”آپ اتنا کہاں یاد رہتا ہے۔ تم ذرا تفصیل سے

بتاؤ۔“

”صاحب، مطلوب کی ایک چھوٹی سی دکان تھی
کریانے کی۔ اور اسے وہ دکان میں نے ہی کر کے دی

تھی۔“

”ہاں یاد آ گیا۔ پھر اس کا سر ڈر ہو گیا تھا۔“ میں نے
کہا۔

”اور اس کا خون بہنے کے پھر میں ہوا تھا چنانچہ۔“
اس نے بتایا۔ ”اس کا قافل ایک بڑا غنڈہ اور پیسے والا آدمی
تھا۔“

”ہاں یاد آ گیا۔“ میں نے کہا۔ ”شاید ہاشم تا تم تھا
اس کا۔“

”جی چنانچہ اور آپ اس کے وکیل بنے تھے۔“ اس

آخر کیوں

محترم مدیر اعلیٰ

السلام علیکم

میں ایک ڈاکٹر ہوں، میرے پاس مریضوں کی قطار لگی زہتی ہے۔ یہ مریض صرف جسمانی مرض کا شکار نہیں ہوتے، کچھ مریض ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی روح میں بیماری سرایت کر چکی ہوتی ہے۔ یہ آپ بیٹی بھی ایک ایسے ہی مریض کی ہے جو خود میں سبق آموز ہے۔

ڈاکٹر فراز آفریدی

(کراچی)

خدا یا! انسان کے ساتھ یہ سب کیا ہوتا رہتا ہے۔ وہ کتنا با اختیار اور کتنا مجبور ہوتا ہے۔

میں داخل ہوا۔ وہ ایک ڈاکٹر ہوں۔ نہ جانے کتنے روتے، کراہتے مریضوں کو دیکھا کرتا ہوں لیکن میں جس مریض کا ذکر کر رہا ہوں اس نے مجھے حیران کر کے رکھ دیا تھا۔

میں جس اسپتال میں ہوں وہاں کینسر کے مریضوں کا علاج ہوتا ہے اور میں اس مرض کے علاج میں ملک بھر میں شہرت رکھتا ہوں۔

دور دور سے مریض میرے پاس آتے ہیں۔ روتے، بسورتے اور موت کے خوف سے لرزتے ہوئے مریض۔ دکھ ان کی آنکھوں میں ہوتا ہے اور ان کے چہروں پر نمایاں ہوتا ہے۔

یہ ایک انتہائی تکلیف دہ مرض ہے۔ اگر کسی کو کینسر تشخیص ہو گیا تو یہ سمجھ لیں کہ اس کی موت کے پروانے پر دستخط ہو گئے۔ جس طرح کسی کو پھانسی کی سزا ملنے کے بعد ہوا کرتا ہے۔ یہ حکم سنتے ہی وہ پھانسی سے پہلے ہی موت کی گود میں چلا جاتا ہے۔ لیکن اس دن میں نے ایک عجیب مریض کو دیکھا۔

میں اپنے کمرے میں تھا کہ مجھے بتایا گیا کہ ایک مریض لایا گیا ہے اور اس مریض کو لانے والے پولیس کے افسران ہیں۔

چند لمحوں بعد پولیس کا ایک اعلیٰ افسر میرے کمرے میں آیا۔

”ڈاکٹر صاحب! میں آپ کے پاس ایک مریض کو لے کر آیا ہوں۔“ اس نے بتایا۔

”آفسیر یہ تو اسپتال ہے۔ یہاں تو مریض آیا کرتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”لیکن یہ خاص قسم کا مریض ہے۔“

”میں نہیں سمجھا۔ کیا خاص بات ہے اس میں۔“

”وہ ایک قاتل ہے ڈاکٹر صاحب۔“ آفسیر نے بتایا۔

”دو آدمیوں کا خون کر چکا ہے۔“

”اوہ۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”پھر تو یہ معاملہ ذرا سیریس ہے۔ لیکن اس کے مرض کا کیسے پتا چلا۔“

”جب ہم نے اس کو گرفتار کیا اور حوالات میں لائے تو اس کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔“ آفسیر نے کہا۔

”آپ تو جانتے ہیں کہ ان حالات میں اگر کسی مریض کی موت ہو جائے تو سارا الزام پولیس والوں پر آ جاتا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ پولیس نے اس کو تشدد سے مار دیا۔ چاہے اس کی موت کی وجہ کچھ بھی ہو۔“

”جی ہاں جانتا ہوں میں۔“ میں مسکرا دیا۔ ”آگے بتائیں۔“

”پھر یہ ہوا کہ تھانہ انچارج نے محکمے کے ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ اس نے معائنہ کر کے بتا دیا کہ یہ کینسر کا مریض ہے اور ہم اس کے علاج کے لیے آپ کے پاس آگئے ہیں۔“

کیوں کہ اس مرض کے علاج کے لیے آپ کے اسپتال کی بہت شہرت ہے۔
”ایسے لوگ اسی قسم کے ہوتے ہیں ڈاکٹر صاحب۔“
آفسر نے بتایا۔ ”ان کو دیکھ کر آپ اندازہ بھی نہیں کر سکتے کہ یہ اندر سے اتنے بے رحم اور خطرناک بھی ہوں گے۔ اس نے اپنے دونوں قتل کا اعتراف کر لیا ہے۔“
”اوہ۔“ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

میں نے متعلقہ ماتحت عملے سے کہا کہ مریض کو بیڈ دے دیا جائے۔ اس کا نام امجد بتایا گیا تھا۔ میرے کمرے سے جاتے ہوئے امجد نے ایک نظر میری طرف دیکھا اس وقت اس کی نگاہیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔
پتا نہیں وہ آنکھیں اتنی دیر میں کیا کیا کہہ گئی تھیں۔ ان میں حقارت تھی، بے نیازی تھی، غصہ تھا، بے چارگی تھی، بہت کچھ تھا ان نگاہوں میں۔

بہر حال ضروری خانہ پری کے بعد امجد کو اسپتال میں داخل کر لیا گیا۔ اب مجھے اس کا علاج کرنا تھا۔ چاہے وہ گوئی بھی ہو، کیسا بھی ہو۔

شام کے وقت جب میں وارڈ میں راؤنڈ لینے گیا تو امجد اپنے بستر پر تھا اور ایک پولیس والا اس کے پاس ہی کھڑا

”جب وہ کینسر سے مرنے جا رہا ہے تو پھر اس کے کیس کا کیا ہوگا یا دوسرے الفاظ میں جب اس کے جرم پر اسے پھانسی کی سزا ہونے والی ہے تو پھر اس کے علاج کا کیا فائدہ۔“

Downloaded from paksociety.com

”یہ تو ہے ڈاکٹر۔ لیکن کچھ قانونی تقاضے بھی ہوتے ہیں۔“ آفسر نے بتایا۔ ”ان کو پورا کرنا ضروری ہوتا ہے۔“
”چلیں ٹھیک ہے۔ مریض کو میرے پاس لائیں۔“
وہ مریض دو سپاہیوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ ایک لاغر سا انسان۔ جس کی آنکھیں بچھی ہوئی تھیں اور موت کے سائے اس کے ارد گرد منڈلا رہے تھے۔

اس کی شیوہ بڑھی ہوئی تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ ہو سکتا ہے بھی وہ روشن بھی رہی ہوں لیکن اب مرجھائی ہوئی آنکھیں تھیں۔

اس کے ہاتھ میں ہتھکڑیاں پڑی ہوئی تھیں اور وہ کسی طرح بھی قاتل دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

”آفسر یہ تو ایک سیدھا سادہ آدمی معلوم ہوتا ہے۔“



READING
Section

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے غصہ آ گیا تھا۔ اس قسم کے مریض کا علاج صرف ان کی تسلی کے لیے کیا جاتا ہے۔ ورنہ موت تو ان کے قریب ہی کھڑی ہوتی ہوتی ہے۔

دو دنوں کے بعد جب میں اس کے پاس گیا تو اس نے مجھ سے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب کیا آپ جانتے ہیں کہ میں ایک وی آئی پی قسم کا مریض ہوں۔“

”وہ کیسے!“

”خود دیکھ لیں۔ پولیس والے میری حفاظت کے لیے پہرہ دیتے ہیں اور وہ بھی چوبیس گھنٹے۔ ایسا سلوک تو عام مریضوں کے ساتھ نہیں ہوتا۔“

”ہاں اس میں تو کوئی شک نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”تم عام مریض نہیں ہو لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کہ تم جیسا خاص مریض قاتل کیوں بن گیا۔“

وہ خاموش ہو گیا۔ میں نے جب اسے کرپانے کے لیے اپنا سوال دہرایا تو اس نے دھیرے سے کہا۔ ”اب میں آپ کو ایک بات بتا دوں ڈاکٹر صاحب۔“

”ضرور بتاؤ۔“

”میں نے کوئی قتل نہیں کیا۔“ اس نے بتایا۔

”کیا!“ میں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

”جی ڈاکٹر صاحب آپ میری بات کا یقین کریں۔“

اس نے کہا۔ ”میں نے کسی کا خون نہیں کیا۔ میں ایسا آدمی ہوں ہی نہیں کہ کسی کا خون کر سکوں۔ کیوں کہ میں ایک بزدل انسان ہوں اور بزدل انسان اپنے آپ کو تو مار سکتا ہے لیکن کسی اور کو نہیں مار سکتا۔“

”تو پھر یہ سب کیا ہے۔ یہ الزام کیسا ہے تم پر۔“

”اس لیے کہ میں ایک بے گھر، بے سہارا اور کمزور انسان ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”پولیس والوں کو تو خانہ پری کرنی پڑتی ہے نا۔ اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے انہیں بتانا پڑتا ہے کہ آج انہوں نے اتنے مجرموں کو پکڑا ہے۔ تو میں بھی اس لیٹ میں آ گیا ہوں۔ بس اتنی سی بات ہے۔“

”لیکن وہ تو بتا رہا تھا کہ تم نے اپنے قاتل ہونے کا اعتراف بھی کر لیا ہے۔“

”ہاں میں نے اعتراف تو کر لیا ہے۔“

”لیکن کیوں؟“

”اس لیے کہ میں بھوک، بیماری، بے گھری اور مفلسی کے ہاتھوں پریشان ہو چکا تھا۔“ اس نے بتایا۔

”تم کس لیے کھڑے ہو؟“ میں نے پولیس والے سے پوچھا۔

”سرجی یہ خطرناک قیدی ہے۔ اس کی نگرانی کے لیے میری ڈیوٹی لگائی گئی ہے۔“ اس نے بتایا۔

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن تم اس کے سر پر مت سوار رہو۔“ میں نے کہا۔ ”تمہیں کرسی مل جائے گی تم دروازے کے باہر آمدے میں بیٹھو۔“

”وہ تو ٹھیک ہے سرجی لیکن اگر یہ بھاگ گیا تو۔“

”یہ کہیں نہیں بھاگے گا۔“

”ٹھیک ہے سرجی۔“ پولیس والے نے کہا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

”ہاں بھائی کیسے ہو تم۔“ پولیس والے کے جانے کے بعد میں نے امجد سے پوچھا۔

”آپ کا بہت بہت شکریہ ڈاکٹر کہ آپ نے اس سے نجات دلوا دی۔“ امجد نے کہا۔ ”ورنہ تو یہ میرے اعصاب پر سوار ہو گیا تھا۔“

بہت مہذب لہجہ تھا اس کا۔ پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جرم کرنے والے اس دنیا سے تعلق رکھنے والے انسان ہی ہوتے ہیں۔

پڑھے لکھے، غیر تعلیم یافتہ، خوب صورت، بد صورت، سب کا تعلق اس دنیا اس معاشرے سے ہوتا ہے اگرچہ امجد بھی پڑھا لکھا اور مہذب تھا تو اس میں حیرت کی ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

”مسٹر امجد! آج تمہارے دو چار ٹیسٹ ہوں گے۔“

میں نے بتایا۔ ”اس کے بعد یہ دیکھا جائے گا کہ تمہارا مرض کس اسٹیج پر ہے۔“

”ارے ڈاکٹر صاحب اب تو میں آپ کے رحم و کرم پر ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔“

اس نے ایک بار پھر مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ تو خاصا پڑھا لکھا تھا اور باذوق بھی معلوم ہوتا تھا۔ ورنہ اس قسم کے حوالے کون دیا کرتا ہے۔

بہر حال اس کے دو ٹیسٹ ہوئے۔ دو دنوں کے بعد رپورٹ بھی آگئی۔ وہ واقعی کینسر کا مریض تھا اور اس کے مرض کی نوعیت شدید ہوتی جا رہی تھی۔

مزید بڑھا دی تھی۔ اس لیے میں بہت دھیان سے اس کی کہانی سن رہا تھا۔ ”پھر یہ ہوا ڈاکٹر صاحب کہ ماں کا انتقال ہو گیا۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ بیمار پڑی تھیں اور ان کی بیماری کی وجہ سے ہم مقروض ہو گئے تھے۔ ہم نے اپنے طور پر ان کا بہت علاج کروایا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا اور ان کا انتقال ہو گیا۔“

والدہ کی موت کے بعد والد صاحب بالکل ہی ٹوٹ کر رہ گئے تھے۔ برسوں کا ساتھ تھا جواب ختم ہو گیا تھا۔ وہ اب گھر پر رہتے۔ اسکول کی نوکری بھی ختم ہو چکی تھی۔ میں نے گھر کا خرچ چلانے کے لیے ملازمت شروع کر دی اور ملازمت بھی ایسی کہ نہ پوچھیں۔ دن کے وقت ایک پیٹرول پمپ پر اور رات کے وقت شیشے کے گلاس بنانے والی ایک فیکٹری میں۔

”اب سمجھا۔“ میں نے کہا۔ ”یہ مرض شاید تم نے ایسی ہی جگہوں سے حاصل کیا ہے۔“

”ہو سکتا ہے ڈاکٹر صاحب۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”ممکن ہے کہ دنیا بھر کی پریشانیوں نے کینسر کی شکل اختیار کر لی ہو۔“

”یہی ہوا ہے تمہارے ساتھ۔“

”آپ میری کہانی سے بور تو نہیں ہو رہے۔“ اس نے پوچھا۔

”نہیں ہرگز نہیں۔ بلکہ تمہاری کہانی کے راستے میں خود کو تمہیں تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میں کیا اور میری تلاش کیا۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”بہر حال اتنا بتا دوں کہ دن رات کام کرنے اور آرام نہ ملنے کی وجہ سے میں کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا گیا۔ بے چارے والد صاحب میری حالت دیکھ دیکھ کر رویا کرتے تھے۔“

”طرفہ ستم یہ ہوا کہ والد صاحب بھی بیمار پڑ گئے اور ان کے علاج کی ساری ذمے داری مجھ پر آ گئی۔ مختصر یہ کہ جب والد صاحب کا انتقال ہوا تو میں بالکل مفلس ہو چکا تھا۔ میری دونوں ملازمتیں ختم ہو گئی تھیں۔ کرائے دینے کے پیسے بھی نہیں رہے تھے۔ میں ہر لحاظ سے بے گھر اور نادار ہو چکا تھا۔“

اتنا بتا کر وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی نگاہیں چھت کی

میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر میں نے کہا۔ ”مسٹر امجد! کیا تم مجھے اپنے بارے میں کچھ بتاؤ گے۔“

”کیوں نہیں ڈاکٹر میں تو خود بتانا چاہتا تھا۔“ وہ مسکرا دیا۔

☆.....☆

میں نے ایک ادبی اور علمی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ والد صاحب ایک باذوق آدمی تھے۔ وہ ایک سیکنڈری اسکول میں استاد تھے۔ پوری دنیا میں، کہانیوں اور اخلاقی کتابوں میں استاد کا چاہے جو بھی مرتبہ ہو لیکن ہمارے ملک اور معاشرے میں اس بے چارے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

وہ معاشرے کا معزز فرد نہیں ہوتا کیوں کہ معاشرے کے معزز افراد دولت والے اور اقتدار والے سمجھے جاتے ہیں۔

بہر حال اتنا ضرور تھا کہ ہمارے پاس سر چھپانے کے لیے ایک کوارٹر تھا۔ خدا جانے والد صاحب نے کتنی محنتوں سے وہ کوارٹر خریدا ہوگا۔

ہم چار بچے تھے۔ بیٹا صرف میں تھا اور میرے بعد تین بہنیں تھیں۔ خدا جانے غریبوں کے یہاں لڑکیاں کیوں پیدا ہونے لگتی ہیں۔

وہ بڑی ہوتی جا رہی تھیں اور ہمیں ان کی شادیوں کی فکر تھی۔

بہر حال کسی نہ کسی طرح ان کی شادیاں ہو گئیں لیکن ان شادیوں نے ہم سے وہ کوارٹر بھی چھین لیا۔ ہم کرائے کے کوارٹر میں آ گئے۔

میں آپ کو اپنی کہانی بہت مختصر طور پر سن رہا ہوں ڈاکٹر صاحب۔ ویسے تو دکھوں کی کہانیاں بہت طویل ہوتی ہیں کیوں کہ ان میں برسوں کی تلخیاں شامل ہوتی ہیں اور برسوں کی تلخیاں لمحوں میں تو بیان نہیں ہو سکتیں۔

بہر حال تینوں بہنیں اپنے گھروں کی ہو گئیں۔ ہمارے لیے یہی بہت تھا۔ ہم کسی نہ کسی طرح اپنی زندگی گزار رہے تھے۔ ہم نے یہ سمجھا تھا کہ شاید اب کچھ دن سکون کے گزر جائیں گے لیکن بعض لوگوں کی قسمت میں حادثات اور بد نصیبیوں کی طویل قطار ہوتی ہے۔ ایک لمحہ بھی جو پاؤ غم ہستی سے فراغ۔

اس نے ایک اور بر محل شعر پڑھ کر میری دل چسپی

طرف لگی ہوئی تھیں۔ جیسے اپنی پریشان حالی کا جواز معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ”پھر یہ ہوا ڈاکٹر کہ میں دونوں سے بھوکا تھا۔“ اس نے پھر بتانا شروع کیا۔ ”دو دن۔ ایک کمزور انسان اور دونوں کی بھوک میں نہیں جانتا کہ میں کس طرح عبداللہ شاہ غازی کے مزار کی طرف جا نکلا۔ نقاہت سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ میں ایک طرف چکر کر رہ گیا اور اس وقت نہ جانے کس نے میرے ہاتھ میں بریانی کی تھیلی پکڑا دی۔“

”بس وہ دن تھا ڈاکٹر صاحب کہ میں وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ کھانے کے لیے وہیں جاتا اور رہنے کے لیے فٹ پاتھ تھی اور کیا چاہیے تھا بس دروے چمن کیے رکھتا۔ اس وقت تو یہ اندازہ ہی نہیں تھا کہ میں کینسر کا مریض ہو چکا ہوں۔“

”قتل کا الزام کیسے آیا تم پر۔“ میں نے پوچھا۔
 ”وہی تو بتا رہا ہوں۔ مزار کے باہر جو احاطہ ہے اس احاطے میں ایک رات دو مزدوروں کا ٹل ہو گیا۔ بے چارے تھک ہار کر سوئے ہوئے تھے کہ کسی بے رحم نے ان کا خون کر دیا۔ دوسری صبح پولیس آئی اور اس نے مجھے پکڑ لیا۔ کیوں کہ انہیں ایک میں ہی سب سے زیادہ مظالم اور کمزور دکھائی دیا تھا۔“

”چلو یہاں تک تو بات سمجھ میں آگئی۔ لیکن تم نے قاتل ہونے کا اعتراف کیوں کر لیا۔“ میں نے پوچھا۔
 ”تو اور کیا کرتا۔ اس بہانے مجھے کھانا تو مل جاتا۔ سونے کے لیے بستر تو ہوتا اور آپ خود دیکھ لیں وہاں فٹ پاتھ پر رہ کر کون میرا علاج کراتا اور اب دیکھیں میں کتنی شان سے رہتا ہوں۔ میری دیکھ بھال ہوتی ہے۔ وقت پر دوائیں ملتی ہیں، سونے کے لیے بستر ہے۔ پولیس والے میری حفاظت کے لیے پہرے دیتے رہتے ہیں۔ ایک بے گھر اور مفلس انسان کو اس کے علاوہ اور کیا چاہیے ڈاکٹر صاحب۔“

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
 میں اس کے پاس بیٹھ نہیں سکا۔ انسان کی ناداری کی کیسی مثال سامنے آئی تھی لیکن میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اس الزام سے تو اس کی جان چھڑانے کی ضرورت کوشش کروں گا۔
 میں نے اپنے ایک دوست وکیل کو بلا کر اسے امجد کی ساری کہانی سنا دی۔ وہ بھی یہ داستان سن کر بہت متاثر ہوا تھا۔ جانے بعض لوگ اتنے بد نصیب کیوں ہوتے ہیں۔

میرے وکیل دوست نے اس کا کیس اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ امجد کو میں نے بڑی مشکلوں سے وکالت نامے پر دستخط کرنے کے لیے راضی کیا تھا۔ ”کیا فائدہ ڈاکٹر صاحب۔“ اس نے کہا۔ ”مرنا تو دونوں صورتوں میں ہے پھر آپ میرے لیے اتنی زحمت کیوں اٹھا رہے ہیں۔“
 ”نہ جانے کیوں میری خواہش ہے کہ تم اس الزام سے آزاد ہو کر اس دنیا سے جاؤ۔“ میں نے کہا۔
 ”چلیں آپ کی مہربانی۔“

پھر اس نے اپنے دستخط کر دیے تھے لیکن وکیل دوست کو اس کے لیے محنت کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ دوسری صبح پولیس آفیسر بہت سویرے میرے کمرے میں آ گیا تھا۔ ”ڈاکٹر صاحب اصل بندہ ہماری پکڑ میں آ گیا ہے۔“

”کون اصل بندہ۔“
 ”وہی جس نے دونوں مزدوروں کے خون کیے تھے۔ وہ ٹھیکیدار ہے جی اور مزدوروں سے اس دن کسی بات پر اس کا جھگڑا ہو گیا تھا اور اس نے سوتے میں دونوں کا کام کر دیا۔“
 ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ بے چارہ امجد بے گناہ ہے۔“

”ہاں جی بالکل بے گناہ ہے۔ نہ جانے کیوں اس نے اعتراف کر لیا تھا۔“
 ”میں جانتا ہوں کہ اس نے کیوں اعتراف کیا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”چلیں دونوں اس کے پاس چل کر اسے آزادی کی خبر سنا تے ہیں۔“
 ہم کمرے سے باہر بھی نہیں نکلے تھے کہ ایک نرس دوڑتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ ”سر اس مریض کی ڈیڑھ گھنٹے سے رات ہی کو وہ مر گیا تھا سر۔“
 ”کس کی بات کر رہی ہو۔“
 ”وہی جو پولیس کی کسٹڈی میں تھا۔“ نرس نے بتایا۔

میں اور پولیس آفیسر ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے تھے۔
 میں بہت دنوں کے بعد اس شخص کی کہانی لکھتے ہوئے سوچ رہا ہوں کہ آخر کیوں کچھ لوگوں کے نصیب میں صرف مایوسیاں اور پریشانیاں ہی کیوں ہوتی ہیں! کیوں؟

خراماں اسٹاپ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بس پہلے ہی کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ اس نے مروت کو بالائے طاق رکھ کر بہت سی لڑکیوں اور عورتوں کو دھکے دیے، کسی کے پاؤں پر پاؤں مارا اور بس میں داخل ہونے کی کوشش کی لیکن بس میں تو پیر ٹکانے تک کی جگہ نہیں تھی۔ وہ بے بسی سے ہاتھ ملتی رہ گئی اور بس کھڑکھراتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

اپنی بے بسی کے تصور سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اسے پہلی دفعہ ابو پر غصہ آیا۔ شوکت بھائی پر غصہ آیا

گرمی، جس اور سلگتی ہوئی دوپہر میں بس کا انتظار اسے گویا موت کا انتظار لگتا تھا۔ اس وقت بھی شمینہ اسی انتظار کے عذاب میں مبتلا تھی۔ اس کے دائیں بائیں لڑکیوں، عورتوں اور مردوں کی بھیڑ تھی۔ گرمی کی پیش سے زیادہ لڑکوں کی سلگتی ہوئی نظروں سے چڑھی۔ فیشن کے نام پر عجیب و غریب حلیوں والے یہ جو کر خود کو ہیر و سمجھ کے اس کے ارد گرد منڈلاتے رہتے تھے۔

اسے دور سے لہرائی، بل کھاتی بس نظر آئی جو خراماں

جان لیوا

محترم مدیر اعلیٰ

السلام علیکم

کچی عمر کی لڑکیاں کبھی کبھی نادانستگی میں ایسی غلطیاں کر جاتی ہیں جو والدین کے لیے جلتا ہوا انگارہ ثابت ہوتا ہے۔ شمینہ بھی ایک ایسی ہی غلطی کر بیٹھی تھی جس کی وجہ سے اس کی جان بھی گئی اور گھر والوں کی پیشانی پر داغ بھی لگا۔ بھائی نے جیل بھی کائی۔ عبرت حاصل کرنے کے لیے ہر لڑکی کو میرا مشورہ ہے کہ اسے ضرور پڑھے۔

امیمہ

(لاہور)



اکتوبر 2015ء

251

ماہنامہ سرگزشت

READING
Section

کہ کمر میں دو گانڈیاں اور دو تین سوڑ سا نیکیں ہونے کے باوجود وہ اس سنگتی ہوئی کمری میں بس کے لیے دھکے کھا رہی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ ابو سے رکھا لگانے کو کہوں گی۔ میں اسی طرح دھکے کھاتی رہی تو ایک اسے کرتے کرتے حلیہ ہی بگڑ جائے گا۔

اجانک اس کے سامنے چھپاتی ہوئی ایک گاڑی رکی۔ اس نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ گاڑی میں وہیم کو دیکھ کر اس کا سوڈ خراب ہو گیا۔ وہیم اس کے پڑوس میں رہتا تھا۔ اس کے ایسا کارنی ٹھیکے دار تھے اور بڑے بڑے ٹھیکے لیتے تھے۔ کمر میں دولت کی ریل بیل تھی۔ وہیم اکثر اسے ٹھیکے کے تلو پر نظر آتا تھا۔ وہ شہینہ کو حسرت بھری نظروں سے اس وقت تک دیکھتا رہتا جب تک کہ وہ کمر میں داخل نہ ہو جاتی۔ وہیم صرف اسے دیکھتا ہی تھا بھی اس سے بات کرنے کی جرات نہیں کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ شہینہ، شوکت کی بہن ہے۔ اور شوکت اس معاملے میں بہت حساس تھا۔ وہ تو ایسا تھا کہ دوسری لڑکیوں کی خاطر لنگھوں سے لڑ جاتا تھا، اپنی بہن کے لیے تو شایہ کسی کی جان بھی لے لیتا۔

یوں بھی کھلے میں شوکت کا بہت رعب تھا۔ ذرا ڈرا سی بات پر وہ لڑنے سرنے پر تیار ہو جاتا تھا۔ سارے کھلے پر اس کی دھاک تھی۔

اجانک وہاں بھگدڑ مچ گئی۔ وہ بھی گھبرا کر ایک دکان کی طرف بھاگی۔ بھاگتے ہوئے اس نے لوگوں کی آوازیں سنیں کہ ایک سیاسی تنظیم کے ٹین کارکن مارے گئے تھے۔ اس کے ڈوئل کے طور پر پڑتال ہوئی تھی۔

شہینہ کی جان نکل گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب کمر کیسے پہنچوں؟ شوکت بھائی کو ٹیلی فون کسوں یا ابو کو؟ وہ جانتی تھی کہ اس وقت ابو بھی آفس میں ہوں گے اور شوکت بھائی بھی۔ کمر تو پہنچتا ہی تھا۔

اس وقت اسے وہیم کی آواز سنائی۔ ”شہینہ..... حالات خراب ہو گئے ہیں..... اور مزید خراب ہوں گے..... چلو ابھی تمہیں کمر چھوڑ دوں گا۔“

اس نے وہیم کو گورا اور کچھ کہتا چاہا۔

”شہینہ پلینر۔“ وہیم یوں اٹھا۔ ”جلدی کرو۔ ورنہ مشعل لوگ۔ ہماری گاڑی بھی جلا دیں گے۔ آ جاؤ پلینر۔“

شہینہ نے چند لمبے کچھ سوچا پھر گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے عمیق تشست کا دروازہ کھولا اور بیٹھ گئی۔ اس اچانک بڑبوںگ سے وہ خود بھی بہت گھبرا گئی تھی۔ وہیم کے

ماہنامہ مسرگزشت

پارے میں اسے اطمینان تھا کہ وہ اسے کمر ہی لے جائے گا۔

”شہینہ!“ وہیم نے گاڑی اشارٹ کرنے کے بعد آہستہ سے کہا۔ ”مجھے غلط مت سمجھنا..... میں نے تمہیں پریشانی میں دیکھا تو تمہیں لفٹ کی آفر کر دی..... آخر میں تمہیں بچھین سے جانتا ہوں..... تم.....“

وہیم صاحب! ”اس نے ناگواری سے کہا۔ ”آپ انہادھیان ڈرائیونگ پر رکھیں۔“

میری اس حرکت کا برا تو نہیں مانتا؟“

شہینہ نے جواب دیا۔

پھر وہیم نے کوئی بات نہیں کی۔ خاموشی سے گاڑی ڈرائیونگ کرتا رہا۔ ان دنوں گاڑی پر ایک نظر ڈال لیتا تھا۔

کمر کے نزدیک پہنچ کر شہینہ نے اسے گاڑی روکنے کو کہا۔ اس نے سعادت مندی سے گاڑی روک دی اور اسے اتار کر آگے بڑھ گیا۔

پھر وہ اکثر شہینہ کو اپنے کیف کے پاس یا گلی کے کنارے کے پاس نظر آتا۔ اس کی آنکھوں میں شہینہ کے لیے ایک خاموش پیغام ہوتا تھا، منہ سے وہ کچھ نہیں بولتا تھا۔

کمر کی شہینہ کے ساتھ ان کی ایک بیوہ بچھو اور ان کے بچے بھی رہتے تھے۔ اب ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ وہ تمہیں بھی محبت کے قائل۔ شہینہ کا بھوئی زواہ آفتاب اور زرین بھی ان کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ بچھو کے تمام اخراجات اب بھی پورے کر رہے تھے۔ آفتاب ان دنوں ایک بی بی ایسے کر رہا تھا اور زرین اس سال گریجویشن کر کے فارغ ہوئی تھی۔

شوکت، زرین کو لیتا کرتا تھا۔ وہ بھی اسے چاہتی تھی۔ شہینہ ان دونوں کی خاموش محبت کی گواہ تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ امی ابو بھی ان کی محبت سے واقف ہیں۔ ایک دن شہینہ کے تایا ابو۔ ٹیلی سمیت ان کے کمر آئے ہوئے تھے۔

کمر میں بہت رونق تھی۔ شہینہ کو معلوم ہوا کہ آج امی اور ابو نے شوکت اور زرین کا رشتہ طے کرنے کے لیے تایا ابو اور چوٹی پھپھو کو بلایا تھا۔ کھانے کے بعد اس نے اس رشتے کا

اعلان کر دیا۔ حسب بہت خوش ہوئے۔ شوکت اور زرین کو سب ہی پسند کرتے تھے۔ یوں ان کا رشتہ طے ہو گیا۔ دھچکا تو

شمینہ کو اس وقت لگا جب امی نے اس کا اور آفتاب کا رشتہ طے کیا۔ وہ تو مارے گھبراہٹ کے کن ہو کر رہ گئی۔ اس کے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ امی اب اس کے رشتے کی بات بھی کرنے والے ہیں۔

آفتاب اسے شروع سے ہی اچھا لگتا تھا۔ وہ بھی شمینہ کو عجیب سی نظروں سے دیکھا کرتا تھا۔ شمینہ ان کا مفہوم خوب سمجھتی تھی۔ وہ بہت یادگار شخصیت کا مالک تھا اس لیے اس نے بھی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔

آفتاب سے باقاعدہ رشتہ طے ہوا تو شمینہ کو شرم آنے لگی۔ وہ ان سے چھٹی پھرتی تھی لیکن ایک گھر میں رہ کر کہاں تک چھپ سکتی تھی۔ کہیں نہ کہیں ان کا ٹکراؤ ہو جاتا۔ وہ شمینہ کی گھبراہٹ پر سکر ادا ہوتا۔ وہ بھی فوراً ہی وہاں سے بھاگ جاتی۔

ایک دن پھپھو کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ آفتاب گھر میں موجود نہیں ہے۔ وہ ان دنوں ایم بی اے کر چکا تھا اور چاہ کی تلاش میں تھا۔ ابو نے شوکت کی شادی تو دو ماہ بعد رکھ دی تھی لیکن پھپھو نے آفتاب کی شادی کے لیے ایک سال کا وقت لے لیا تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ آفتاب چاہ کر کے اپنے دونوں بچوں کو گراہو جائے پھر شادی کی جائے۔

پھپھو کچھ دیر تو اس سے باتیں کرتی رہیں پھر وہ اٹھ کر ان کی طرف چلی گئیں۔

وہ بھی اٹھنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ اچانک آفتاب آ گیا۔ اسے دیکھ کر شمینہ گھبرا گئی۔ وہاں سے جانے لگی تو آفتاب نے اچانک اس کا راستہ روک لیا۔ شمینہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر شوٹی لگی اور آنکھوں میں شمینہ کے لیے بے انتہا محبت، وہ سنجیدگی سے بولا۔ "شمینہ! تم اتنی گھبراتی کیوں ہو؟"

"جواب دیا۔
"پھر مجھے دیکھ کر بھاگتی کیوں ہو؟ کیا تمہیں یہ رشتہ پسند نہیں ہے؟"

"اے..... ایسی..... تو کوئی بات نہیں ہے۔" شمینہ نے کہا۔ وہ آفتاب کی تیز لگا ہوں کی پیش سے جھکی جا رہی تھی۔

"مجھے لگتا ہے کہ ایسی ہی بات ہے۔" آفتاب کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔ "ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔" وہ سنجیدگی سے

بولا۔ "اگر تمہاری مرضی نہیں ہے تو میں انکار کر دوں؟" شمینہ نے تڑپ کر نظریں اٹھائیں اور بولی۔ "آپ اتنی سی بات کیوں نہیں سمجھتے کہ..... میری..... مرضی کے..... بغیر یہ رشتہ نہیں..... ہو سکتا تھا..... میں....."

کو پریشان دیکھ کر کہا اور راستہ چھوڑ دیا۔
شمینہ، زرین کے ساتھ چھت پر چلی گئی۔ ان کی چھت بہت بڑی تھی۔ شمینہ اور زرین نے وہاں بہت سے گیلے رکھ دیے تھے۔ وہ دونوں شام کی چائے پھت پر ہی بیٹھی تھیں۔

شمینہ، زرین سے باتوں میں مصروف تھی کہ اسے پڑوں کی چھت پر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ بیٹھا ہوا آدمی دوسری چھت سے نظر نہیں آتا تھا۔ شمینہ باتیں کرنے کے دوران ہی کسری ہو گئی۔

اچانک سے دوسری چھت پر دستم نظر آیا۔ وہ شمینہ کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ وہ کچھ ایسے معنی کے خیر انداز میں کھڑا تھا کہ اس کے سکرانے پر شمینہ کو بھی ہنسی آ گئی۔

زرین نے حیرت سے کہا۔ "تم ہنس کیوں رہی ہو؟"
"مجھے تمہاری باتوں پر ہنسی آ رہی ہے۔" شمینہ پھر ہنس کر بولی۔

زرین نے معذرتی شکل سے کہا۔ "میں نے ابھی تو کوئی بات نہیں کی ہے۔"
"مجھے کچھ سوچ کر ہنسی آ گئی تھی۔" شمینہ پھر ہنس کر بولی۔

اسے ہنسا دیکھ کر دستم بھی بے ساختہ ہنسنے لگا۔
"تمہاری باتیں میری تو کچھ میں آتی نہیں ہیں۔"

زرین نے کہا۔
اچانک شوکت چھت پر آ گیا۔ شمینہ اسے دیکھ کر گھبرا گئی۔ شوکت کا دھیان زرین کی طرف تھا۔ شمینہ نے گھبرا کر براہِ والی چھت کی طرف دیکھا وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ شمینہ نے سکون کا سانس لیا اور شوکت سے بولی۔ "شوکت بھائی آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟"

زرین، شوکت کو دیکھ کر پہلو بدل رہی تھی۔ وہ بھی شوکت سے اس طرح گھبرا رہی تھی جیسے شمینہ آفتاب سے گھبراتی تھی۔

"میں تو اپنے ایک کام سے آیا تھا تاہم جلدی سے بولا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ تم لوگ یہاں ہو۔" اس نے زرین کو گھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم پریشان مت ہو۔ میں جا رہا ہوں۔" اس نے زرین کی طرف دیکھتے ہوئے



شمینہ سے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔
 ”ویسے تو تمہاری زبان خوب قینچی کی طرح چلتی ہے۔“ شمینہ نے زرین سے کہا۔ ”شوکت بھائی کو دیکھ کر تمہارے ہونٹوں پر تالے پڑ جاتے ہیں؟“
 ”مجھے شرم آتی ہے ان سے۔“ زرین نے کہا۔
 ”ان سے؟“ شمینہ ہنس کر بولی۔ ”شوکت بھائی ابھی سے ان سے ہو گئے۔“
 ”مجھے تنگ مت کرو شمینہ۔“ زرین نے نظریں جھکا کر کہا۔ ”ورنہ میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔“
 شمینہ کی حالت خود بھی آفتاب کے سامنے ایسی ہی ہو جاتی تھی اس لیے اس نے ہنس کر کہا۔ ”اچھا تم پریشان مت ہو۔ اب میں کچھ نہیں بولوں گی۔“
 ”میں ویسے بھی جا رہی ہوں۔“
 ”ارے بیٹھو!“ شمینہ نے کہا۔ ”میں نے بوا سے چائے لائے کو کہا ہے۔“
 اسی وقت بوا چائے لے کر آئیں اور بولیں۔ ”زرین بیٹا! آپ کو نسیم صاحبہ بلا رہی ہیں۔“
 ”امی مجھے بلا رہی ہیں؟“ زرین نے پوچھا۔
 ”کیوں؟“
 ”وہ عالیہ صاحبہ اور ان کے بچے آئے ہیں۔“ پھر وہ شمینہ سے بولی۔ ”آپ کو بھی نسیم صاحبہ نے بلایا ہے۔“ یہ کہہ کر بوا وہاں سے چلی گئی۔
 ”یہ بوا بھی عجیب ہیں۔“ شمینہ نے کہا۔ ”جب ہمیں بلانے ہی آئی تھیں تو یہ چائے لے کر کیوں آئیں۔“
 ”تم چائے پی کر آ جانا۔“ زرین نے کہا۔ ”میں چلتی ہوں ہم دونوں ہی سے کہا ہے کہ نیچے ہونا چاہیے۔“ زرین یہ کہہ کر چلی گئی۔ شمینہ چائے کا گک اٹھا کر چائے پینے لگی۔
 چائے پیتے پیتے اس کی نظر پھر برابر والی چھت کی طرف اٹھ گئی۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ وسیم بائیں منڈیر کے پاس کھڑا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر بولا۔ ”شمینہ۔“
 ”جاؤ یہاں سے۔“ شمینہ گھبرا کر بولی۔ ”شوکت بھائی کسی بھی وقت اوپر آ سکتے ہیں۔“
 ”آنے دو۔“ وسیم نے کہا۔ ”شوکت زیادہ سے زیادہ مجھے مار ہی دے گا اچھا ہے وہ مجھے مار دے۔ میں روز جینے اور روز مرنے سے نجات چاہوں گا۔“
 ”تم مرنے ہی کا فیصلہ کر چکے ہو تو یہاں بیٹھو میں جا رہی ہوں۔ شوکت بھائی کو سمجھتی ہوں۔“

”میں نے کہا نا شمینہ! مجھے شوکت کی دھمکی مت دو۔ میں اب مرنے سے نہیں ڈرتا۔ تم پر تو میری محبت کا اثر ہوتا نہیں۔ مجھے شوکت نے نہ مارا مگر میں یہاں سے نیچے کود کر اپنی جان دے دوں گا۔“
 اچانک شمینہ کے کانوں میں شوکت کی آواز آئی۔
 ”شمینہ..... شمینہ!“ وہ میٹر حیاں چڑھ کر اوپر ہی آ رہا تھا۔
 شمینہ نے بوکھلا کر وسیم کی طرف دیکھا۔ وہ اسی طرح ڈھٹائی سے وہاں کھڑا ہوا تھا۔
 ”تم جاتے کیوں نہیں۔“ شمینہ بوکھلا کر بولی۔
 ”شوکت بھائی اوپر آ رہے ہیں۔“
 ”آنے دو۔“ وسیم نے دیدہ دلیری سے کہا۔
 ”اللہ کے واسطے، تم یہاں سے جاؤ۔“ شمینہ اب بہت پریشان ہو گئی تھی۔ ”وسیم پلیز چلے جاؤ۔“
 ”ایک شرط پر۔“ وسیم نے کہا۔
 ”تم کل سات بجے یہاں آؤ گی۔“
 ”ارے بابا! ابھی تو جاؤ۔“ شمینہ جھنجھلا کر بولی۔
 ”پہلے تم وعدہ کرو، آؤ گی نا؟“ وسیم نے ڈھٹائی سے کہا۔
 ”اچھا بابا! آ جاؤں گی۔“ شمینہ نے دانت پیس کر کہا۔
 اچانک شوکت حیت پر آ گیا اور بولا۔ ”شمینہ! تمہیں امی کب سے بلا رہی ہیں۔“
 ”میں بس جا رہی تھی۔“ شمینہ نے چائے کا کپ ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا اور ڈرتے ڈرتے وسیم کی چھت کی طرف دیکھا۔ وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ شمینہ نے سکون کا سانس لیا اور زینے کی طرف بڑھ گئی۔
 دوسرے دن اسے یونیورسٹی جانا تھا۔ اس شدید گرمی میں جانے کا موڈ تو نہیں ہو رہا تھا لیکن جانا ضروری تھا۔ سمسٹر شروع ہونے والے تھے۔ وہ واپسی میں پھر بس اسٹاپ پھر کھڑی ہوئی تھی اور بس میں سوار ہونے کے تصور ہی سے نڈھال ہو رہی تھی۔
 اچانک اسے پھر وسیم دکھائی دیا۔ اس کی چھمپاتی ہوئی گاڑی اس سے کچھ ہی فاصلے پر رکھی تھی۔ وسیم نے دروازہ کھولا اور اس کے نزدیک آ کر بہت متانت سے بولا۔
 ”شمینہ! گھر چلنا ہے تو چلو، میں بھی گھر ہی جا رہا ہوں۔“
 وسیم کو دیکھ کر ارد گرد کے لوگ شمینہ کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ شمینہ خاموشی سے وسیم کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔

جب وسیم وہاں سے آگے بڑھ گیا تو شمینہ بھنا کر بولی۔ ”تمہاری حرکتیں کچھ بڑھتی ہی جا رہی ہیں..... میں.....“

”تم شوکت سے شکایت کرو گی۔ یہی نا؟“

”مجھے یہ بھی کرنا پڑے گا۔“ شمینہ سلگ کر بولی۔

”بلکہ شوکت بھائی کے ساتھ ساتھ میں تمہاری شکایت آفتاب سے بھی کروں گی۔“

”تو پھر کر دو۔“ وسیم ڈھٹائی سے بولا۔ ”میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔“

”تم آخر چاہتے کیا ہو؟“ شمینہ چیخ کر بولی۔

”میں..... تمہیں چاہتا ہوں۔“ وسیم نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”سامنے دیکھو ورنہ.....“

وسیم مسکرا کر سامنے دیکھنے لگا۔

”کسی کو چاہنے کا یہ کون سا طریقہ ہے؟“ شمینہ نے بولی۔

”تمہیں تو میری چاہت کی پرواہ ہی نہیں تھی۔“ وسیم نے جواب دیا۔ ”یہ راستہ تو مجھے مجبوراً اختیار کرنا پڑا۔“

”تم مجھے چاہتے ہو تو میرے والدین سے بات کرو۔“

”والدین سے بات بھی کر دوں گا پہلے تم سے تو بات کر لوں۔“ وسیم ڈھٹائی سے بولا۔ اس دوران ہی وہ گھر کے

نزدیک پہنچ چکے تھے۔ اس نے گاڑی روکتے ہوئے شمینہ سے کہا۔ ”ہاں شام کو چھت پر ضرور آنا۔“ وہ اس کا جواب

سنے بغیر چلا گیا۔

شمینہ عجیب مصیبت میں گرفتار تھی۔ وہ وسیم کو بالکل پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ تو کسی بلائے ناگہانی کی طرح اس

سے چٹ گیا تھا۔ وہ اگر شوکت کو وسیم کے بارے میں بتا دیتی تو یہ مسئلہ اس دن بلکہ اس وقت ختم ہو جاتا۔ وہ شوکت

اور آفتاب کو بھی جانتی تھی ان دونوں کے غصے کو بھی۔ اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ وسیم اگر مارا نہ جاتا تو اس کے ہاتھ پیر تو ضرور

ٹوٹ جاتے۔ پھر پولیس تھانے اور پکھری کا چکر چلنا اور شمینہ بری طرح رسوا ہو کر رہ جاتی۔ وسیم کو قتل یا اقدام قتل کی

پاداش میں شوکت یا آفتاب کو جیل کا منہ دیکھنا پڑتا اور پھر..... پھر.....

”نہیں نہیں۔“ وہ چونک کر بولی۔ ”میں شوکت بھائی کو تو ہرگز نہیں مٹاؤں گی پھر..... پھر کیا کروں۔ اس مصیبت

سے کیسے جان چھڑاؤں؟“ شمینہ نے زچ ہو کر سوچا۔ پھر اس نے اپنی بات کا خود ہی جواب دیا۔ ”چھ مہینے کی تو بات ہے۔ پھر میری شادی آفتاب کے ساتھ ہو جائے گی۔ بس کسی طرح چھ ماہ کا یہ وقت گزر جائے اپنے اس فیصلے سے اسے خود بھی بہت سکون ملا۔“

شام کو جب وہ چھت پر پہنچی تو وسیم اپنی چھت پر موجود نہیں تھا۔ شمینہ نے سکون کا سانس لیا۔

تھوڑی دیر بعد زرین بھی آگئی۔ ان دونوں نے ایک ساتھ چائے پی اور ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہیں۔

اچانک برابر کے گھر کی منڈیر پر وسیم دکھائی دیا۔ اس طرف زرین کی پشت تھی۔ وسیم اشاروں سے کچھ کہہ رہا تھا۔

کہ زرین کو نیچے بھیجو ورنہ..... اس نے منڈیر سے شمینہ کی چھت پر کودنے کی دھمکی دی۔

اس سے پہلے کہ وہ زرین سے کوئی بہانہ بناتی وہ خود ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”میں تو نیچے جا رہی ہوں۔ تم شوق سے

بیٹھ کر ٹھنڈی ہوا کھاؤ۔“

شمینہ نے یوں ظاہر کیا جیسے وہ بھی نیچے جا رہی ہے۔ وسیم نے پھر اسے رکنے کا اشارہ کیا۔

اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ آئندہ چھت پر نہیں آؤں گی۔ زرین کے جانے کے بعد وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

چھت پر اس وقت بالکل سناٹا تھا۔ وسیم نے اس سے کچھ کہنا چاہا لیکن فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے اس کی آواز شمینہ تک

پہنچ تو رہی تھی لیکن الفاظ واضح نہیں تھے۔ وہ دل ہی دل میں مسکرائی اور بولی اب کیا کرو گے میاں مجنوں؟

وہ واقعی مجنوں تھا۔ اچانک شمینہ کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ شمینہ نے طویل سانس لے کر آنکھیں موندھ لیں اور

سوچنے لگی۔ شاید وسیم مایوس ہو کر چلا گیا۔

اچانک پیچھے سے کسی نے اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

شمینہ بری طرح چونک اٹھی۔ وہ سمجھی کہ زرین پھر آگئی ہے۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے وسیم کے ہاتھ پکڑے تو پھر

وہ بری طرح چونکی اور سوچا یہ زرین کے ہاتھ تو نہیں ہو سکتے۔ لو کیا شوکت بھائی اوپر آگئے ہیں؟ شوکت بھی کبھی کبھی اسے تنگ کرنے کو ایسا کیا کرتا تھا۔

وہ ہنس کر بولی۔ ”شوکت بھائی! میں نے آپ کو پہچان لیا ہے، ہاتھ تو ہٹائیں۔“

ہاتھ بدستور اس کی آنکھوں پر جمے رہے۔ اس نے ایک مرتبہ ہاتھ ٹٹولے تو اس کا ہاتھ انگوٹھی سے ٹکرایا۔ اس

”جی جا رہی ہوں۔“ شمینہ نے اپنا دوپٹا سمیٹ کر ڈرتے ڈرتے پیچھے کی طرف دیکھا لیکن وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ وسیم نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ نیچے اتر گئی۔

وسیم اس کے لیے عذاب بن گیا تھا۔ اس نے سوچا شادی ہونے میں ابھی پورے چھ مہینے ہیں۔ اس دوران میں تو وسیم نہ جانے کیا کر بیٹھے۔ میں زرین کو اس کے بارے میں بتا دیتی ہوں۔ وہ امی کو بتا دے گی۔ ہم سب مل کر اس ابھرنے کا حل ڈھونڈ لیں گے۔ امی اور پھوپھو خود بھی جہاں دیدہ اور تجربے کار ہیں۔ وہ خود نہیں چاہیں گی کہ میں یا شوکت اور آفتاب کسی مشکل میں پھنسوں۔ امی، شوکت بھائی کو بھی سمجھائیں گی کہ اس معاملے میں جوش سے نہیں ہوش سے کام لیں۔ وہ یہ بھی سوچ کر کچھ مطمئن ہو گئی۔

ایک ہفتے بعد گھر میں شوکت کی شادی کے ہنگامے شروع ہو گئے۔ شمینہ اس ہلے گلے میں ایسی مگن ہوئی کہ وسیم کو بالکل بھول گئی۔

اس دن شوکت کی برأت تھی۔ علیم صاحب نے بہن کو عارضی طور پر کرائے کا ایک مکان لے کر دے دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ زرین رخصت ہو کر اس مکان میں جائے اور کچھ عرصے بعد یہاں آجائے ورنہ ایک گھر میں رہ کر یہ کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

وہ لوگ شوکت کی برأت لے کر دہن کے گھر پہنچے تو اچانک شمینہ کی نظر وسیم پر پڑی۔ وہ سفید کلف والا کرتہ شلوار پہنے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ پڑوسی ہونے کے ناتے ان لوگوں کو بھی شادی کا بلاوا دیا گیا تھا۔

وسیم نے شاکی نظروں سے شمینہ کو دیکھا اور اسے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ اس کی دیدہ دلیری پر شمینہ حیران رہ گئی لیکن وہ تو شمینہ کی محبت میں پاگل ہو رہا تھا اس سے کچھ بعید نہیں تھا وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ یہ ایک طرح سے اس کی بلیک میلنگ تھی اور اب شمینہ اس بلیک میلنگ سے تنگ آ گئی تھی۔ وہ دل پر جبر کر کے اس کے نزدیک چلی گئی۔

اس نے شمینہ کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور اوباش انداز میں بولا۔ ”شمینہ! آج تو تم بجلیاں گرا رہی ہو دل پر۔“

”تم نے مجھے کیوں بلایا ہے وسیم؟“ شمینہ نے ترش لہجے میں پوچھا۔

”بھئی اس لیے بلایا ہے کہ تمہارے حسن کی تعریف کر سکوں۔ آج تو تم نے میرا سکون اور قرار سب کچھ لوٹ لیا

مرتبہ اسے دھچکا لگا۔ انگوشی تو شوکت بھائی اور آفتاب میں سے کوئی نہیں پہنتا تھا۔ شمینہ نے ہول کر سوچا کہیں..... وسیم تو چھت کی منڈیر پھلانگ کر نہیں آ گیا۔

وہ خوف زدہ ہو کر بولی۔ ”کون ہو تم، ہاتھ ہٹاؤ اپنے ورنہ میں شور کروں گی۔“

”آج شور کر ہی دو۔“ اسے اپنے عقب سے وسیم کی آواز سنائی دی۔ اس نے پوری قوت سے اس کے ہاتھ اٹھائے اور تڑپ کر کھڑی ہو گئی۔ وسیم کو دیکھ کر تو اس کی جان ہی نکل گئی۔ اس وقت اگر شوکت بھائی یہاں آجائیں تو وہ کیا سوچیں گے؟ شمینہ نے سوچا۔

”تم اتنی ڈری ہوئی کیوں ہو؟“ وسیم پراسکون انداز میں بولا۔

”تم کیوں میری جان کے دشمن بنے ہو؟“ شمینہ نے روہانسی ہو کر کہا۔ ”تمہیں شاید یہ اندازہ نہیں ہے کہ تمہارے ساتھ ساتھ شوکت بھائی مجھے بھی مار دیں گے۔“

”ہاں تو مار دیں..... جب میں مرجاؤں گا تو مجھے اس سے کیا کہ تم زندہ رہو یا مرجاؤ۔“

”تم تو مجھ سے محبت کے دعوے دار ہو؟“ شمینہ سلگ کر بولی۔

”اب میں مجنوں فرہاد کی طرح پاگل بھی نہیں ہوں۔“

”اچھا اب تو یہاں سے جاؤ۔“

اچانک زینے پر قدموں کی آہٹیں سنائی دیں۔ پھر شوکت کی آواز آئی۔ ”شمینہ۔“

شوکت کی آواز سن کر شمینہ حواس باختہ ہو گئی اور وسیم کی خوشامد کرتے ہوئے بولی۔ ”وسیم تمہیں اللہ کا واسطہ..... اگر مجھے

بدنامی اور رسوائی سے بچانا چاہتے ہو تو یہاں سے چلے جاؤ۔“

دوسری مرتبہ شوکت کی آواز بہت واضح طور پر آ رہی تھی۔ شمینہ نے بوکھلا کر وسیم کی طرف دیکھا اور بولی۔

”وسیم..... تمہیں اللہ کا واسطہ..... تم.....“

”شمینہ!“ شوکت کی آواز زینے کے پاس سے آئی۔

”جی بھائی۔“ شمینہ کی آواز لرز رہی تھی۔ وہ اٹھ کر زینے کی طرف چلی گئی۔

دوسرے ہی لمحے شوکت چھت پر آ گیا۔ ”میں کب سے تمہیں آوازیں دے رہا ہوں امی بلا رہی ہیں تمہیں۔“

پھر وہ ہنس کر بولا۔ ”اب چھت پر بھی انٹرکام لگانا پڑے گا۔ ویسے تو تم سنتی ہی نہیں ہو۔“

تصور میں آ گیا۔ آج اس نے پہلی دفعہ شمینہ کے حسن کی تعریف کی تھی۔ اسے بھرپور نظروں سے دیکھا تھا۔ آفتاب کا تصور کر کے شمینہ شرمنا رہی تھی۔

دوسرے دن ناشتے کی میز پر سب موجود تھے لیکن آفتاب موجود نہیں تھا۔ شمینہ کو بے چینی ہو رہی تھی۔ آفتاب اس کا منگیتر تھا اس لیے وہ کسی سے اس کے بارے میں پوچھ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کی شکل اینٹہ سیکم نے حل کر دی۔ وہ بولی۔

”یہ آفتاب کہاں رہ گیا؟“

”وہ جو گنگ پر گیا ہوگا۔“ پھپھو نے جواب دیا۔ ”آندھی

آئے یا طوفان ان حضرت کی جو گنگ ضرور ہوتی ہے۔“

”شمینہ بیٹا!“ علیم صاحب نے کہا۔

”جی ابو۔“ شمینہ چونکی۔

”بیٹا، ذرا گرم چائے تو لے آؤ۔ میری چائے تو

ٹھنڈی ہو گئی۔“

”جی ابو۔“ شمینہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ کچن میں پہنچی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ آفتاب

فریج سے پانی نکال کر پی رہا تھا۔

”آپ..... آپ کب آئے؟“ شمینہ نے کہا۔

”سب لوگ آپ کو پوچھ رہے تھے۔“

”بس تو کافی دیر پہلے یہاں آ گیا تھا۔ تم تو جانتی ہو

کہ میں علی آج جو گنگ کے لیے جاتا ہوں تو کچن ہی کا

دروازہ استعمال کرتا ہوں تاکہ گھر کے دوسرے افراد

ڈسٹرب نہ ہوں۔“

”تو آپ یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟“ شمینہ نے پوچھا۔

”تمہارے انتظار میں۔“ آفتاب نے اسے بھرپور

نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

شمینہ کا دل پھر بے قابو ہونے لگا۔ ”مم..... میرے

انتظار میں؟“ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”ہاں بھئی، ویسے تو تم سے بات کرنے کا موقع ہی

نہیں ملتا۔ کبھی تم امی کے ساتھ ہوتی ہو کبھی مامی کے ساتھ۔“

”اچھا اب جائیں یہاں سے..... ابھی کوئی آ جائے

گا اور.....“

”آنے دو۔“ آفتاب نے شوخی سے کہا۔ ”بھئی کسی

کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ وہ یہی کہے گا کہ آفتاب اپنی

ہونے والی دہن سے بات کر رہا ہے۔“

شمینہ کے کانوں میں اچانک امی کی آواز آئی۔

”شمینہ!“

ہے شمینہ۔“ وسیم جذباتی ہو کر اس کی طرف بڑھا۔

”تم کیوں مجھے تماشانا چاہتے ہو وسیم!“ شمینہ نے

کہا۔ ”یہاں ابو، شوکت بھائی، امی، دونوں ماموں کبھی

موجود ہیں اور تم.....“

”ایک دن تو ان سب لوگوں کو معلوم ہونا ہی ہے۔“

وسیم نے کہا۔ ”تو پھر ڈرنا کیسا؟“

اس وقت چھوٹے ماموں کی بیٹی روپی، شمینہ کو دیکھ کر

وہاں آ گئی اور بولی۔ ”شمینہ! میں تمہیں اسٹیج پر ڈھونڈ رہی

ہوں اور تم یہاں کھڑی ہو۔“

”ہاں! میں ذرا اپنی ایک دوست کو تلاش کر رہی

تھی۔“ شمینہ نے جلدی سے کہا۔

”دوست سے پھر مل لینا۔ وہاں رکھیں شروع ہونے

والی ہیں اور دولہا کی بہن بھی غائب ہے جو میرے

ساتھ.....!“

شمینہ نے موقع غنیمت جانا اور وہ روپی کے ساتھ چلی گئی۔

پھر پوری تقریب کے دوران میں وسیم نے اسے

پریشان نہیں کیا۔ شمینہ کو اب اس کی شکل سے بھی نفرت ہو گئی

تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ وسیم کو جان سے مار دیتی۔ کم بخت

نے اسے ذہنی مریض بنا کر رکھ دیا تھا۔ یہ اس کی اچھی

زبردستی تھی۔ وہ شمینہ پر ہر روز باؤ ڈھاتا ہی جا رہا تھا۔ بغیر

کسی وجہ کے۔ شمینہ نے کبھی اس سے پیار کی باتیں نہیں کی

تھیں۔ کبھی وسیم کو خواب نہیں دکھائے تھے۔

وہ اسٹیج کے نزدیک پہنچی تو آفتاب نے اسے روک

دیا۔ شمینہ کو ایسا لگا جیسے آفتاب نے اسے وسیم کے ساتھ دیکھ لیا

ہو۔ اس نے ڈرتے ڈرتے آفتاب کی طرف دیکھا۔

آفتاب کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں عجیب سی

چمک تھی۔ اس نے سیاہ شپردانی پگن رکھی تھی جو اس کے

کسرتی جسم اور سرخ و سفید رنگت پر بہت اچھی لگ رہی تھی۔

آفتاب یوں بھی خاصا وجیہ تھا۔ شمینہ کا دل بے اختیار بے

قابو ہو گیا۔

”شمینہ!“ آفتاب نے آہستہ سے کہا۔ ”آج تم

بہت اچھی لگ رہی ہو؟“

شمینہ اس کی بات کا جواب دیے بغیر جلدی سے اسٹیج پر

چلے گئی۔

تقریب ختم ہوئی تو شمینہ نے سکون کا سانس لیا۔ وسیم

کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید وہ جا چکا تھا۔

شمینہ سونے کے لیے لیٹی تو آفتاب چہم سے اس کے

”یار کھانا تو کھا لینے دو۔“ آفتاب نے کہا۔
 ”تمہاری تجسس پیدا کرنے والی سماعت گئی
 نہیں۔“ شوکت منہ بنا کر بولا۔ ”مت بتاؤ۔“ اس نے
 اٹھتے ہوئے کہا۔

”اوہو..... یار تم تو ناراض ہو گئے۔“ آفتاب نے
 جلدی سے کہا۔ ”بیٹھو یار، بتا رہا ہوں۔“
 وہ دونوں بچوں کی طرح لڑ رہے تھے اور بزرگ اس
 پر زربل مسکر رہے تھے۔
 ”چھوٹے ماموں..... مائی، امی مجھے جاب مل گئی
 ہے۔“

”واقعی۔“ علیم صاحب نے خوش ہو کر پوچھا۔
 ”چھوٹے ماموں!“ آفتاب نے کہا۔ خوشی اس کے
 چہرے پر چمک رہی تھی۔ ”مجھے ایک ایسی نیشنل کمپنی میں جاب
 مل گئی ہے۔“
 ”میاں یہ تو خوشی کی خبر ہے۔“ علیم صاحب نے کہا۔
 ”یار تو اس میں تجسس پھیلانے کی کیا ضرورت تھی؟“
 شوکت نے منہ بنا کر کہا۔

”گلتا ہے تمہیں میری جاب سے خوشی نہیں ہوئی؟“
 آفتاب نے مصنوعی حلق سے کہا۔
 شوکت نے اسے گھور کر دیکھا۔ پھر ہنستا ہوا اس سے
 لپٹ گیا۔ ”یار مجھ سے زیادہ خوشی اور کسے ہو سکتی ہے؟“
 ثمنینہ حسب معمول کچن میں چائے بنا رہی تھی۔
 کھانے کے بعد کبھی چائے یا کافی پینے کے عادی تھے۔ اس
 وقت آفتاب دبے پاؤں کچن میں چلا آیا۔ ثمنینہ نے چونک کر
 اسے دیکھا۔ اب وہ آفتاب سے اتنی شرماتی نہیں تھی۔ اسے
 گھبراہٹ صرف اس وقت ہوتی تھی جب آفتاب اسے
 گہری نظروں سے دیکھتا تھا۔

”آپ کو جاب بہت بہت مبارک ہو۔“ ثمنینہ نے
 ہنس کر کہا۔

”ثمنینہ!“ آفتاب نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔
 ”اس مبارک باد کی حق دار تو تم ہو۔“
 ”میں ہوں؟“ ثمنینہ نے حیرت سے اپنی خوب
 صورت آنکھیں پھیلائیں۔ ”وہ کیسے؟“
 ”بھئی بزرگوں سے سنتے آئے ہیں کہ رزق بیوی
 کے نصیب کا ہوتا ہے۔“

اس کی بات سن کر ثمنینہ بری طرح شرمائی۔
 ”صرف جاب ہی نہیں۔“ آفتاب نے کہا۔ ”کمپنی

آفتاب بوکھلا گیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ثمنینہ کو اس
 کی حالت پر بے اختیار ہنسی آگئی۔ چائے تیار ہو چکی تھی۔
 اس نے جلدی سے چائے دانی اٹھائی اور کچن سے باہر نکل
 گئی۔ چہرے پر اب بھی دلی دلی مسکراہٹ تھی۔ امی اسی
 طرف آرہی تھیں۔ وہ اسے دیکھ کر بولیں۔ ”بھئی جلدی سے
 چائے لے آؤ۔ تمہارے ابو کو دیر ہو رہی ہے۔“
 اس نے علیم صاحب کو چائے دی اور خود بھی چائے
 لے کر بیٹھ گئی۔

اچانک داخلی دروازہ کھلا اور آفتاب اندر داخل ہوا۔
 ثمنینہ اسے دیکھ کر مسکرانے لگی۔ وہ یوں گھر میں داخل ہوا تھا
 جیسے ابھی ابھی آیا ہو۔

پھر خاندان میں زرین اور شوکت کی دعوتوں کا سلسلہ
 شروع ہو گیا۔ دعوت کہیں بھی ہوتی۔ زرین اسے ضرور ساتھ
 لے جاتی تھی۔ خاندان والے بھی ثمنینہ کو ضرور بلاتے تھے۔
 چھوٹی پھوپھی نے دعوت کی تھی زرین نے ثمنینہ سے
 کہا۔ ”تم جلدی سے جا کر تیار ہو جاؤ۔ چھوٹی خالہ کے ہاں
 جانا ہے۔“

”بھابی آج تو مجھے معاف کر دیں۔“ زرین نے
 خوشامد سے کہا۔ وہ شادی کے بعد زرین کو بھابی کہنے لگی تھی۔
 ”دعوتیں کھا کھا کر میں موٹی ہو رہی ہوں۔“
 ”آپ چاہتی ہیں کہ میں بھی آپ کی طرح موٹی ہو
 جاؤں؟“ ثمنینہ ہنس کر بولی۔

”میں موٹی ہوں۔“ زرین نے آنکھیں نکالیں۔
 ”اب تو تم ضرور چلو گی۔ بس جلدی سے جا کر تیار ہو جاؤ۔“

لاکھ انکار کے باوجود ثمنینہ کو جانا ہی پڑا۔ اسے یہ جان
 کر خوشی ہوئی کہ آفتاب بھی اس دعوت میں جا رہا ہے۔
 شادی کے ایک ہفتے بعد ہی شوکت، زرین کو لے کر
 دوبارہ اپنے گھر آ گیا تھا۔ فرق صرف یہ پڑا تھا کہ اب
 زرین ماں کے کمرے میں سونے کی بجائے شوکت کے بیڈ
 روم میں شفٹ ہو گئی تھی۔

اس دن سب کھانا کھانے بیٹھے ہی تھے کہ آفتاب بھی
 آ گیا۔ وہ خاصا خوش اور مہر جوش نظر آ رہا تھا۔ شوکت ہنس کر
 بولا۔ ”کیا بات ہے آفتاب! بہت خوش نظر آ رہے ہو۔“
 ”یار بات ہی ایسی ہے۔“ اس نے نکلیوں سے ثمنینہ
 کی طرف دیکھا۔

”یار کوئی خوش خبری ہے تو ہمیں بھی بتاؤ تاکہ ہم بھی
 خوش ہو سکیں۔“

کے لیے ٹی وی کھول دیا اور خود بستر پر شام دراز ہو گئی۔
اچانک اسے ایسا لگا جیسے زینے پر کسی کے قدموں کی
آہٹ گونجی ہو۔

شمینہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ چھت پر جانے کے دوزینے
تھے۔ ایک زینہ برآمدے میں تھا اور دوسرا زینہ بنگلے کی عقیبی
سمت میں تھا۔ وہ جس کوریڈور میں کھلتا تھا اس کے بالکل
سامنے شمینہ کا بیڈروم تھا۔

اس نے ہول کر سوچا زینے میں کوئی ہے۔ اچانک
اسے خیال آیا کہ زینے کا دروازہ کوریڈور میں کھلتا ہے۔ وہ
اس وقت بند نہیں ہے۔

وہ جلدی سے اٹھی، جسم کے گرد اونی شال لپیٹی اور
ڈرتے ڈرتے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر جھانکا لیکن
اسے دروازہ بند کرنے میں دیر ہو چکی تھی۔

اس نے جیسے ہی دروازہ کھولا کوئی دھکیلا ہوا اندر
آ گیا۔ شمینہ کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ گھبرا کر پیچھے
ہٹی تو اسے وسیم کا چہرہ نظر آیا۔ وہ اسے نظروں ہی نظروں میں
گھائل کر رہا تھا۔

کسی نادیدہ قوت کی بجائے وسیم کو وہاں دیکھ کر اس کا
خوف اب غصے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ درشت لہجے میں
بولی۔ ”تم یہاں کیوں آئے ہو؟“
”تم کئی دن سے چھت پر کیوں نہیں آئیں؟“ وسیم
نے ڈھٹائی سے کہا۔

”تم فوراً یہاں سے دفع ہو جاؤ، ورنہ.....“
”ورنہ تم شوکت کو بلا لو گی؟“ وسیم نے طنزیہ انداز
میں اس کا جملہ پورا کر دیا۔

”اس وقت میں شوکت کو نہیں پوچھوں گا۔“
شمینہ نے دانت پیس کر کہا۔ ”تم میرے گھر میں داخل کیسے
ہوئے؟“

”میں تمہارے گھر میں چھت کے ذریعے داخل
ہوا؟“ وسیم مسخر آمیز لہجے میں بولا۔ ”میں نے تمہارے گھر
دالوں کو جاتے دیکھا تھا۔ ان میں تم نہیں تھیں۔ میں سمجھ گیا
کہ آج تم گھر پر اکیلی ہو۔ بس پھر میں یہاں آ گیا۔“

”میں ابھی پولیس کو کال کرتی ہوں۔“ شمینہ نے
دروانیہ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

وسیم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے پیچھے کھینچ لیا۔ شمینہ اس
سے ٹکرائی تو وسیم نے اسے ہانہوں میں لے لیا اور بولا۔ ”اتنا
خوب صورت وقت اس ہاتھ پائی میں برباد مت کرو۔“ وسیم

کی طرف سے فرنٹڈ بنگلا بھی ملے گا اور کار بھی۔“
”ارے واہ! آپ تو قسمت کے دھنی ہیں۔“ شمینہ
نے ہنس کر کہا۔

”واقعی میں قسمت کا دھنی ہوں جسے تم جیسی خوب
صورت اور مقدر والی بیوی ملی ہے۔“

شمینہ کا چہرہ مارے شرم کے ایک بار پھر سرخ ہو گیا۔
اس وقت اگر شوکت وہاں نہ آ جاتا تو آفتاب نہ
جانے اور کیا کچھ کہتا۔ شوکت نے کہا۔ ”یار تم تو بہت ہی بے
صبرے ہو۔ چائے کے لیے یہاں چلے آئے۔“

”شمینہ بھی تو چائے کی جگہ پائے لگاتی ہے۔“
آفتاب نے ہنس کر کہا اور شوکت کے ساتھ باہر نکل گیا۔

دو دن بعد پھر ایک پارٹی تھی۔ اس دن شمینہ کو خاصا
تیز بخار تھا۔ اس نے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ زرین
نے بھی اس پر زیادہ زور نہیں دیا۔ پھیپھوں نے کہا بھی کہ میں
تمہارے ساتھ رک جاتی ہوں لیکن شمینہ نے انکار کر دیا اور
بولی۔ ”پھیپھو! میں نے ٹیکس لے لی تھیں۔ بخار تو اب
بہت کم ہو گیا ہے ابھی تھوڑی دیر میں وہ بھی اتر جائے گا۔
میں ٹھیک ہوں۔“

پھیپھوں نے ایک مرتبہ اس کی پیشانی چھو کر دیکھی اور
مطمئن ہو کر بولیں۔ ”بس میری جان تم آرام کرنا۔ کمرے
سے باہر مت نکلتا۔ آج سردی کچھ زیادہ ہے۔“

”آپ پریشان مت ہوں پھیپھو۔“ شمینہ نے ہنس کر
کہا۔ ”میں کوئی چھوٹی پنچی نہیں ہوں جو فضول میں سردی میں
گھومتی پھروں گی۔“

سب لوگ دعوت میں چلے گئے۔ ان کے جانے کے
بعد گھر پر ایک عجیب ستانا چھا گیا۔ پورا گھر بھائیں بھائیں
کر رہا تھا۔

دس منٹ بعد ہی شمینہ کو اپنے فیصلے پر افسوس ہونے
لگا۔ اب ایسی بیمار بھی نہیں تھی کہ دعوت میں جانے پائی۔
دعوت بھی کون سی غیروں کے گھر میں تھی اس کے سگے چچا
کے گھر میں تھی۔ شمینہ وہاں جا کر اطمینان سے لیٹ بھی سکتی
تھی۔

اس نے گھڑی دیکھی۔ ابھی صرف ساڑھے دس بجے
تھے۔ شمینہ جانتی تھی کہ وہ لوگ ساڑھے بارہ ایک بجے سے
پہلے واپس نہیں آئیں گے۔

وقت گزارنے کے لیے اس نے ایک ناول اٹھالی
لیکن ناول میں بھی اس کا دل نہ لگا۔ اس نے ستانا توڑنے

اور کہنا چاہتی تھی مگر شدت غم اور سر پر رکنے والی ضرب نے اسے موقع نہیں دیا۔ وہ تورا کر گرتی چلی گئی۔

شمینہ کی بات پر آفتاب سکتے میں رہ گیا تھا۔ اس کا پورا جسم گویا مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے شمینہ کی طرف سے اتنے بڑے بہتان کی امید نہیں تھی۔

شوکت نے قہر آلود نظروں سے آفتاب کو گھورا اور اچانک اسے گھونسوں پر رکھ لیا۔ وہ اسے مارتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”ذلیل کینے ہمارے نکلڑوں پر پل کر ہماری ہی عزت کو ڈس لیا۔“ وہ اسے بے دردی سے مارنے لگا۔

آفتاب اگر چاہتا تو شوکت کو روک سکتا تھا اس کے تشدد کا جواب دے سکتا تھا لیکن وہ خاموشی سے مار کھاتا رہا۔ اسے تو صدمہ اس بات کا تھا کہ شمینہ نے اسے سب کے سامنے ایک دم گالی بنا دیا تھا۔ یہ وہ شمینہ تھی جس کی محبت میں وہ دن رات سگتا تھا۔ اس کی ایک مسکراہٹ کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اس شمینہ نے اس پر اتنا بڑا الزام لگا دیا تھا کہ وہ اپنی ہی نظروں میں ذلیل ہو گیا تھا۔

”شوکت!“ علیم صاحب چیخ کر بولے۔ ”چھوڑ دو اسے تم کیوں اس بے غیرت کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنا چاہتے ہو؟“ پھر وہ آگے بڑھے اور نفرت بھرے لہجے میں بولے۔ ”نیک حرام احسان فراموش! تو نے میری محبتوں کا یہ صلہ دیا ہے۔ میں نے کبھی تجھ میں اور شوکت میں فرق نہیں سمجھا۔ تیری ہر خواہش پوری کی، اعلیٰ تعلیم دلائی تو نے اس کا یہ صلہ دیا۔ پھر اب شمینہ تو تیری ہی عزت تھی۔ تو نے ایسا کیوں کیا؟“

اس وقت پھپھو آگے بڑھیں اور پے در پے کئی تھپڑ آفتاب کے منہ پر مار دیے اور روتے ہوئے بولیں۔ ”میری تربیت میں کہاں گئی رہ گئی تھی بد نحت..... تو نے اپنے ساتھ ساتھ ہمیں بھی کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ میں تجھے کبھی معاف نہیں کروں گی..... کبھی معاف نہیں کروں گی۔ دفع ہو جا اس گھر سے ہمیشہ کے لیے اپنی یہ منحوس صورت لے کر گم ہو جا۔ بد ذات! میں تیری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی ہوں۔“

”آفتاب نے حسرت و یاس سے ماں کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے شمینہ کی طرف دیکھا کہ ممکن ہے اس کا دل بچ جائے اور وہ سب کو سچائی کا دے۔“

”یہاں سے دفع ہو جا آفتاب۔“ شوکت چیخ کر بولا۔ ”اس سے پہلے کہ میرا ضبط جواب دے جائے دفع ہو جا۔“

نے اسے میز پر دھکیل دیا۔ پھر وسیم کی دست درازیاں بڑھتی گئیں۔ شمینہ اسے پہلے تو روکنے کی کوشش کرتی رہی لیکن آخر کب تک! ایک وقت آیا کہ اس نے ہتھیار ڈال دیے لیکن وہ زبان سے کہہ رہی تھی کہ وسیم تمہیں خدا کا واسطہ، مجھ پر رحم کر ڈاب میں کسی کی امانت ہوں۔“

”تم میری ہو..... صرف میری۔“ وسیم نے جذباتی لہجے میں کہا۔

اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور شمینہ کو آفتاب نظر آیا۔ کمرے کا منظر دیکھ کر آفتاب کی آنکھیں غیر یقینی سے پھٹ گئیں۔

اچانک وسیم نے بھی ڈرینگ ٹیبل کے آئینے سے آفتاب کو دیکھ لیا۔

اس نے شمینہ کو چھوڑ دیا اور اپنے جوتے اٹھا کر اچانک کوریڈور والے دروازے کی طرف بھاگ گیا۔ آفتاب نے اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن وسیم اسے دکھا دے کر بیڑیوں کی طرف بھاگ گیا۔

آفتاب کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا اور پورا جسم کانپ رہا تھا۔ ”شمینہ!“ وہ چیخ کر بولا۔ ”کون تھا یہ اور تم.....“ اس نے جنونی انداز میں شمینہ کے چہرے پر زور دار تھپڑ رسید کر دیا۔ ”کس کے ساتھ منہ کالا کر رہی تھی بے حیا۔“ آفتاب پھر چیخا۔ ”میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ دھوکے باز۔“

”آفتاب..... میری بات تو سنو..... میں.....“

”بکو اس بند کر بد چلن لڑکی۔“ آفتاب نے اس کے بال پکڑ لیے اور اس کے سر پر اتنا زور دار تھپڑ مارا کہ شمینہ کے حلق سے اذیت ناک چیخ بلند ہوئی۔

اچانک باہر بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ پھر شوکت، علیم صاحب، زرین، پچھو سبھی کمرے میں آگئے۔

شوکت کے آتے ہی شمینہ بلک بلک کر رونے لگی۔ اس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے بازوؤں پر خراشیں تھیں اور ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ شوکت نے شمینہ کے جسم پر چادر ڈال دی اور غضب ناک لہجے میں بولا۔

”یہ سب کیا ہے شمینہ!“

”بھیا!“ شمینہ ہلکتے ہوئے بولی۔ ”یہ آفتاب..... آفتاب نے.....“ وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ کچھ

جا یہاں سے۔“ آفتاب ہارے ہوئے جواری کی طرح بوجھل قدموں سے باہر نکل گیا۔

نسیہ بیگم نے روتے ہوئے اچانک عظیم صاحب کے پاؤں پکڑ لیے۔ ”بھیا مجھے معاف کر دینا۔ شاید میری تربیت میں ہی کہیں خامی رہ گئی تھی۔ مجھے معاف کر دینا بھیا۔ مجھے معاف کر دینا۔“ وہ عظیم صاحب کے پیر پکڑے رو رہی تھی۔

عظیم صاحب نے انہیں اٹھایا اور بولے۔ ”نسیہ! اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ تم کیوں شرمندہ ہو رہی ہو؟“

نسیہ بیگم نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ”میں جانتی ہوں مجھے کوئی معاف نہیں کرے گا۔ انہیں معاف کرنا بھی نہیں چاہیے۔“ وہ آنسو بہاتی ہوئی کمرے سے نکل گئیں۔

نسیہ بیگم عظیم بھاگی ہوئی آئیں اور بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولیں۔ ”شوکت! نسیہ نے خود کو بیدروم میں بند کر لیا ہے۔ جلدی چلو کہیں وہ کچھ کر رہی ہیں۔“

شوکت سے پہلے عظیم صاحب، نسیہ کے بیدروم کے دروازے پر پہنچ گئے اور اس طرح دروازہ پیٹ ڈالا اور چیخ کر بولے۔ ”نسیہ..... دروازہ کھولا..... نسیہ!“

”پھپھو۔“ شوکت چیخ کر بولا۔ ”دروازہ کھولے ورنہ میں اسے توڑ دوں گا۔“ اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔

شوکت نے اچانک دروازے پر اپنے کندھے سے وار کیا۔ دروازہ شوکت کی دو ضربوں میں بھی برداشت نہ کر سکا۔ زوردار آواز کے ساتھ اندر جا گرا۔

کمرے کا منظر دیکھ کر زرین بری طرح چیخی۔ کمرے میں پکھے کے ہک سے نسیہ کی لاش لٹک رہی تھی بیڈ پر ایک کرسی اونڈھے پڑی تھی۔ نسیہ بیگم نے اس کرسی پر چڑھ کر اپنے گلے میں رسی کا پھندا ڈالا تھا اور کرسی کو پرے گرا دیا تھا۔

زرین نے ایک چیخ ماری اور دھم سے فرش پر گر پڑی۔ شوکت نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا اور صوفے پر لٹایا۔

شمینہ کے ہوش میں آنے سے پہلے ہی صرف آدھے گھنٹے میں اس گھر میں قیامت آگئی تھی۔

عظیم صاحب اسٹول پر چڑھ کر نسیہ کی لاش اتار رہے تھے کہ چھت کی طرف سے پھل کے قاز کی آواز آئی۔ شوکت اور عظیم صاحب گھر کی چھت کی طرف بھاگے۔

شوکت اور عظیم صاحب گھر کی چھت کی طرف بھاگے۔

چھت کا منظر دیکھ کر وہ دہل کر رہ گئے۔ وہاں پر مڑا تڑا آفتاب کا جسم بڑا تھا۔ اس کی کن پٹی سے خون بہہ کر کان سے ہوتا ہوا زمین پر گزر رہا تھا۔ آفتاب کے جسم میں ابھی جان باقی تھی۔ وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔

”آفتاب بیٹا!“ عظیم صاحب چیخ کر بولے۔ ”تو نے یہ کیا کر دیا بیٹا۔“

اس نے دھندلائی ہوئی نظروں سے عظیم صاحب کو دیکھا اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔

اس کے ہاتھ سے ایک پرچہ نکل کر زمین پر گر گیا۔ عظیم صاحب نے آگے بڑھ کر وہ پرچہ اٹھالیا اس میں لکھا تھا۔

”چھوٹے ماموں اور امی! میں اتنا کم ظرف اور احسان فراموش نہیں ہو سکتا کہ اپنے حسن کی عزت کا جنازہ نکال دوں۔ آپ لوگ سوچ بھی کیسے سکتے ہیں کہ میں اتنی گری ہوئی اور گھٹیا حرکت کر سکتا ہوں۔ میں بالکل بے گناہ ہوں۔ میں زندگی میں یہ پہلا اور آخری گناہ کروں گا کہ حرام موت مروں گا۔ آپ سب تو میری کسی بات پر یقین کرنے کو تیار ہی نہیں تھے لیکن مجھے یقین ہے کہ حرام موت مرنے پر میرا اللہ مجھے معاف کر دے گا۔ میں آپ میں سے خاص طور پر شوکت سے ایک مرتبہ پھر معافی مانگتا ہوں۔ ممکن ہو تو مجھے معاف کر دیجئے گا۔“

شوکت بلک بلک کر روتا ہوا آفتاب کی لاش سے لپٹ گیا۔

شمینہ کو ہوش آچکا تھا۔ اس نے کچھ بولنا چاہا لیکن بول نہ سکی۔

اس واقعے کو اٹھارہ سال گزر چکے ہیں۔ وسیم جو واقعہ کے فوراً بعد گھر سے فرار ہو کر دعویٰ چلا گیا تھا پھر واپس نہیں آیا۔ شمینہ بھی گزشتہ اٹھارہ سال سے خاموش ہے۔ عظیم صاحب نے اسے بہت سے ڈاکٹروں کو دکھایا اس کا نفسیاتی علاج بھی کرایا لیکن اس کی قوت گویائی واپس نہ آسکی۔ دو انسانوں کو شدید ذہنی اذیت پہنچانے کے بعد ان کی جان لینے کی یہ سزا تو کچھ بھی نہیں ہے۔

شمینہ گونگوں کی طرح سارے گھر کا کام کرتی ہے۔ نہ جانے کب تک کرتی رہے گی۔ اس کے بعد اس کی شادی بھی نہ ہو سکی۔ شمینہ کو اس وقت تک یہ سزا بھگتنا ہے جب تک موت اسے دیوچ نہیں لیتی۔ وہ خود بھی شدت سے موت کی منتظر ہے۔

اس واقعے کو اٹھارہ سال گزر چکے ہیں۔ وسیم جو واقعہ کے فوراً بعد گھر سے فرار ہو کر دعویٰ چلا گیا تھا پھر واپس نہیں آیا۔ شمینہ بھی گزشتہ اٹھارہ سال سے خاموش ہے۔ عظیم صاحب نے اسے بہت سے ڈاکٹروں کو دکھایا اس کا نفسیاتی علاج بھی کرایا لیکن اس کی قوت گویائی واپس نہ آسکی۔ دو انسانوں کو شدید ذہنی اذیت پہنچانے کے بعد ان کی جان لینے کی یہ سزا تو کچھ بھی نہیں ہے۔

شمینہ گونگوں کی طرح سارے گھر کا کام کرتی ہے۔ نہ جانے کب تک کرتی رہے گی۔ اس کے بعد اس کی شادی بھی نہ ہو سکی۔ شمینہ کو اس وقت تک یہ سزا بھگتنا ہے جب تک موت اسے دیوچ نہیں لیتی۔ وہ خود بھی شدت سے موت کی منتظر ہے۔

شمینہ کے ہوش میں آنے سے پہلے ہی صرف آدھے گھنٹے میں اس گھر میں قیامت آگئی تھی۔

عظیم صاحب اسٹول پر چڑھ کر نسیہ کی لاش اتار رہے تھے کہ چھت کی طرف سے پھل کے قاز کی آواز آئی۔ شوکت اور عظیم صاحب گھر کی چھت کی طرف بھاگے۔

شوکت اور عظیم صاحب گھر کی چھت کی طرف بھاگے۔

قابل احترام مدیر
سلام تہنیت

انسان غلط کام کرتے وقت یہ بھول جاتا ہے کہ ہر کام کی پکڑ ہے۔ اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے۔ یہ کہانی میری عزیز سہیلی شاہین کے گاؤں کی ہے۔ جہاں وہ سب بھول گئے تھے کہ ہر برے کام کا انجام برا ہوتا ہے۔ شاہین کی عزیزہ نے بھی گناہ کو دعوت دے کر اپنے لیے تباہی کا راستہ چن لیا اور اس کا انجام بھی تباہی کا عمیق غار ٹھہرا۔

شاہدہ ملک
(سرگودھا)

”ماسی او ماسی!“ ذکیہ گلا پھاڑ کے بولی۔

ماسی نے چیختی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مت سے تو

پھوٹ کیا بات ہے؟“

ماسی ابھی ابھی اپنے شوہر سے لڑ کر بیٹھی تھی اور اس کا

شوہر ناراض ہو کر رحمت کی بیٹھک کی طرف جا رہا تھا۔ پتیل

کے جس درخت کے نیچے ماسی اور اس کے شوہر کا جھگڑا ہو رہا

تھا ذکیہ اسی پر چڑھی بیٹھی تھی۔ ذکیہ پہلے تو ان دونوں کا جھگڑا

سنتی رہی۔ پھر جب ماسی کا شوہر ناراض ہو کے جلا تو وہ دم



سے نیچے کودی اور ماسی کو دیکھ کر ہانک لگائی۔ ”ہورنگ لٹھ گیا ملل توں۔ رس رس پینداوے میرا ڈھولاوے گل گل توں“ (ملل سے رنگ اتر گیا اور میرا محبوب بات بات پر روٹھ جاتا ہے۔)

Downloaded from paksociety.com

ماسی نے بھٹا کر اسے مارنے کو جوتی اتاری تو ذکیہ چھلا نکلیں مارتی ہوئی یہ جاوہ جا!

وہاں سے بھاگ کر وہ شاہین کے پاس پہنچی وہ اس کی واحد سہیلی تھی جو اسی کی طرح سارا دن کد کڑے لگاتی پھرتی تھی مگر وہ پھر بھی گھر کا تھوڑا بہت کام کر لیتی تھی۔ ذکیہ کو تو قسم تھا کوئی کام کرنا! شاہین اس وقت رومال کاڑھنے میں مگن تھی اس لیے ذکیہ پر اس نے زیادہ توجہ نہیں دی اور اپنے کام میں مصروف رہی۔ یہ دیکھ کر ذکیہ نے کہا۔ ”شاہین دیکھ تیری بکریاں گنجنے کے کھیت میں جا رہی ہیں۔ ابھی آجائے گا وہ۔“ یہ سن کر شاہین نے رومال ایک طرف پھینکا اور گنجنے کے کھیت کی طرف بھاگی۔

شاہین کو بھاگتے دیکھ کر اس نے اپنی ہی دھن میں ہانک لگائی۔ ”انجن دے دے دھوں ماہیا، میں اک بت جاناں، روح میری دے توں ماہیا“ ذکیہ اپنی دھن میں گائے جا رہی تھی۔ اسے احساس بھی نہ ہو سکا کہ گنجا کب آکر اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ وہ ماہیا سن کر خواستخواہ شرمائے لگا۔ ذکیہ گاتے گاتے گھومی تو گنجنے کو شرماتے دیکھ کر بے اختیار ہنسنے لگی اور بولی۔ ”گنجنے! تیری مگتیر نہر پر کپڑے دھونے آئی تھی، باتوں ہی باتوں میں وہ تجھے بھائی جان کہہ بیٹھی۔ اب کیا ہوگا؟“ ذکیہ کے لہجے میں شرارت تھی۔

گنجا بے چارہ سیدھا سادہ آدمی تھا۔ نام تو اس کا غلام حسین تھا مگر بد قسمتی سے ایک دفعہ وہ گنجا ہو گیا تھا جسی سے ذکیہ نے اسے گنجا کہنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اتنا بے وقوف تھا کہ شخص اس شے میں کئی سنگتیاں توڑ چکا تھا کہ اس کی جن لڑکیوں سے سنگتی ہوئی تھی انہوں نے اسے بھائی کہہ دیا تھا۔ یہ اطلاع ہمیشہ اسے ذکیہ ہی دیتی تھی کہ تیری مگتیر نے فلاں وقت تجھے بھائی کہا تھا۔

اس وقت بھی ذکیہ کی زبان سے یہ سن کر کہ اس کی مگتیر نے اسے بھائی کہا گنجا تیز تیز قدم رکھتا ہوا اپنے گھر کی طرف بڑھ گیا۔

گاؤں کا ہر شخص ذکیہ کی شرارتوں کا نشانہ بنا رہتا تھا۔ وہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھی اس لیے گھر بھر کی لاڈلی تھی۔ اس کے سب بہن بھائیوں کی شادی ہو چکی

تھی۔ بہنیں اپنے گھر کی ہو چکی تھیں۔ گھر کے کاموں کی ذمہ دار اس کی بھابھیاں تھیں۔ اس لیے وہ دن دن بھر گھومتی پھرتی تھی۔ وہ مویشیوں کو چرانے کے بہانے صبح گھر سے نکلتی اور شام کو لوٹتی۔ اس پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ اس کے بھائیوں کی وجہ سے گاؤں والے اس کا خیال رکھتے تھے۔ اب تو وہ اس کی شرارتوں کے عادی بھی ہو چکے تھے۔ وقت بے وقت گیت گانا، شرارتیں کر کے لوگوں کا ناک میں دم کرنا اور وہی تباہی گھومنا اس کے محبوب مشغلے تھے۔

گاؤں میں کسی کی شادی ہوتی، ذکیہ پیش پیش! عقیدہ ہو تو ذکیہ ہی سب سے آگے دو عورتیں لڑ رہی ہوں تو جلتی پر تیل کا کام کرنے کے لیے ذکیہ موجود! وہ گانے بٹھکتی تو یوں لگتا ڈھولک اس کے اشاروں پر تال دے رہی ہو، آواز اتنی خوب صورت کہ راہ چلتے اسے سننے کے لیے رک جاتے۔ ناچ رہی ہوتی تو لڑکیاں تو لڑکیاں اچھی خاصی عمر دراز عورتوں کو اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہتا، جتنی اس کی آواز خوب صورت تھی اس سے کہیں زیادہ وہ خود حسین لگی۔ بڑی بڑی، خوب صورت روشن آنکھیں، لمبے گھنے سیاہ بال، سرخ و سفید رنگت، متناسب جسم اور بوٹا سا قد، جو بھی اسے دیکھتا، دل تھام کے رہ جاتا۔ گاؤں کے بہت سے نوجوان اس کے امیدوار تھے مگر اس نے اب تک کسی کو گھاس نہ ڈالی تھی۔ اب تک وہ اپنے خوابوں کے شہزادے کی تلاش میں سرگرداں تھی۔

ذکیہ کو گورا رنگ بہت پسند تھا اور وہ چاہتی تھی کہ جو شخص بھی زندگی کا ہم سفر بنے اس کی رنگت سفید ہو۔ گوری رنگت ہی کی وجہ سے شاہین اس کی سہیلی تھی، ورنہ اس کے نین نقش تو بہت معمولی سے تھے۔

انہی دنوں گاؤں میں جمیل خان کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا۔ وہ بہت چھوٹا سا تھا تو اس کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے ماموں ان دنوں لندن میں تھے، انہوں نے جمیل کو بھی لندن بلا لیا۔ اس وقت اس کی عمر بمشکل سات برس تھی۔ اب وہی جمیل ایک طویل عرصے کے بعد وطن لوٹ رہا تھا۔ اس کے ایک دوست نے گاؤں میں اس کے لیے جدید طرز کی کوٹھی بنوانا شروع کر دی تھی۔ راج مزدور دن رات کام کر رہے تھے۔ جمیل نے وہ کوٹھی بالکل یورپین طرز پر بنوائی تھی۔

وہاں جانے کے بعد جمیل ایک مرتبہ بھی گاؤں نہیں آیا تھا۔ وہ لندن سے کئی دفعہ پاکستان آچکا تھا مگر وہ اپنے گاؤں

کی بجائے ایبٹ آباد جاتا تھا جہاں اس کے ماموں کا خاندان تھا اور ماں تھی۔

یہ کوشی وہ شوق میں کم اور ماں کی خواہش پر زیادہ بنوا رہا تھا۔ اس کی ماں چاہتی تھی کہ ذرا ڈھنگ کا مکان ہو تو جمیل کی شادی کر دی جائے۔ اس کی خواہش تھی کہ جمیل کی شادی گاؤں کی ہی کسی لڑکی سے کی جائے کیوں کہ خاندان میں کوئی ایسی لڑکی نہ تھی جس سے اس کی شادی کی جاسکتی۔ خاندان کی لڑکیاں یا تو شادی شدہ تھیں یا پھر ان کی تنگنی ہو چکی تھی۔ جمیل بھی گاؤں میں ہی شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس کی کوشی اب قریب قریب مکمل تھی اور لوگ جمیل کی آمد کے منتظر تھے۔ انیس بجس تھا کہ اتنے برس ولایت میں گزارنے کے بعد جمیل کے انداز میں کسی حد تک تبدیلیاں واقع ہوئی ہوں گی۔ بعض تو دبی دبی زبان میں یہ بھی کہہ رہے تھے کہ ممکن ہے اس نے وہاں کسی فرنگن سے شادی کر لی ہو اور اسی کے لیے اتنی شاندار کوشی بنا رہا ہو، کوئی کہتا تھا کہ وہ انتہائی شریف لڑکا تھا۔ وہ ایسی حرکت نہیں کرے گا جس سے اس کی ماں کی دل آزاری ہو، غرض جتنے منہ اتنی ہی باتیں ہو رہی تھیں۔

پھر ایک صبح گاؤں میں یہ خبر گردش کر رہی تھی کہ جمیل آج سہ پہر کے وقت گاؤں پہنچ رہا ہے۔ وہ پاکستان آچکا ہے اور آج کل ایبٹ آباد میں ہے۔

شام کو قریباً چار بجے جمیل اپنی ماں کے ہمراہ گاؤں پہنچ گیا۔ گاؤں والے اس کے ٹھاٹھ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ وہ ایک چچھاتی ہوئی جدید ماڈل کی کار میں گاؤں آیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی ماں اور ایک ملازم اور دو ماموں زاد بھی تھے۔ جمیل کو گاؤں والے حیرت اور فخر سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے بہترین تراش کا قیمتی سفاری سوٹ پہن رکھا تھا، ہونٹوں میں خوب صورت سا پائپ دبا ہوا تھا اور اس پر دو تار شخصیت میں سب سے زیادہ نمایاں اس کی سیاہ، بڑی بڑی ذہن آنکھیں تھیں۔ گاؤں والوں نے والہانہ انداز میں ان لوگوں کا خیر مقدم کیا اور انہیں چوہدری خان محمد کے گھر کی طرف لے چلے۔ چوہدری خود بھی وہاں موجود تھا اور اس نے پیشکش کی تھی کہ جب تک جمیل کا بنگلا مکمل نہیں ہو جاتا، یہ میرا مہمان رہے گا۔

اس دن ذکیہ کی طبیعت خراب تھی اس لیے وہ گھر سے باہر نہ نکل سکی۔ بخار بہت شدید تھا اور سر میں بھی درد تھا، ورنہ ذکیہ ایسے موقع پر پیچھے رہنے والی کب تھی۔ شام کو شاہین سے اس نے سب سے پہلا سوال یہی کیا۔ ”شاہین

تو نے دیکھا جمیل کو؟“ میں نے دیکھا تو ہے مگر مجھے پتا نہ چل سکا کہ ان میں سے جمیل کون سا ہے۔ گاڑی میں سے دو تین مرد ایک ساتھ اترے تھے۔ کبھی خوب بنے ٹھننے تھے۔ پھر وہ چونک کر بولی۔ ”مگر تو یہ سب کیوں پوچھ رہی ہے، خیر تو ہے۔“ ”کچھ نہیں بس ویسے ہی پوچھ رہی تھی۔“ ذکیہ نے جلدی سے کہا۔

گاؤں کے ہر فرد کی زبان پر جمیل کی تعریف تھی۔ ہر شخص اس کے خلوص اور محبت کے گن گار رہا تھا، ہر شخص اس کی دولت سے مرعوب تھا۔ ذکیہ کے دل میں بھی یہ خواہش انگڑائیاں لے رہی تھی کہ وہ بھی ایک نظر جمیل کو دیکھ لے مگر اسے معلوم ہوا کہ گاؤں میں ایک دن رہ کر وہ واپس ایبٹ آباد چلا گیا ہے کیوں کہ اس کی چھٹی ختم ہو گئی تھی اور اب وہ اگلے سال پاکستان آئے گا۔ پھر جمیل کی ماں نے اس کے لیے لڑکی کی تلاش شروع کر دی۔ انہوں نے گاؤں کی ہر لڑکی کو غور سے دیکھا مگر کوئی لڑکی انہیں پسند نہ آسکی۔ ایک دن وہ گھومتی ہوئی اس طرف جا نکلیں جہاں گاؤں کی لڑکیاں پانی بھرتی تھیں۔ وہاں گاؤں کی تقریباً ساری ہی لڑکیاں موجود تھیں۔ وہ ایک ایک لڑکی کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔ ذکیہ کو دیکھ کر وہ چونک اٹھیں اور منہ ہی منہ میں بڑبڑائیں۔ ”لو بھلا میں بھی کتنی پاگل ہوں ذکیہ گاؤں میں موجود ہے اور لڑکی کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی ہوں۔“

لڑکیاں جمیل کی ماں کی موجودگی سے بے خبر آپس میں ہنسی مذاق کر رہی تھیں۔ کسی لڑکی نے ذکیہ سے گانے کی فرمائش کر دی۔ پھر تو سب لڑکیاں اس کے پیچھے ہی پڑ گئیں کہ ہمیں گانا سناؤ۔ کسی نے مانی بھرنے کا ڈول بھی ذکیہ کو تھما دیا۔ وہ ہر طرف سے مجبور ہو گئی تو ڈول بجا بجا کر اپنی خوب صورت آواز میں گانے لگی۔

”چنے چناں چاندنی وہ ہے، اے فصلاں بکیاں نیں، اسان تیریاں راہواں نکلیاں نیں۔“ جمیل کی ماں گانا سن رہی تھی اور خوش ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد سب لڑکیاں وہاں سے چلی گئیں تو جمیل کی ماں بھی اٹھی۔ انہوں نے دل ہی میں فیصلہ کر لیا کہ میری بہو ذکیہ ہی بنے گی۔

دوسرے دن گاؤں کے ہر آدمی نے یہ خبر حیرت سے سنی کہ جمیل کی ماں نے ذکیہ کو جمیل کے لیے مانگ لیا ہے۔ گاؤں کی ہر لڑکی ذکیہ کی قسمت پر رشک کر رہی تھی۔ بلکہ کئی

لڑکیاں تو حسد کی آگ میں جلی مری تھیں اور ایک دوسرے سے کہہ رہی تھیں بھلا اس ذکیہ میں ایسی کیا خاص بات ہے جو جمیل کی ماں نے اسے پسند کر لیا؟

ذکیہ تو خوشی سے دیوانی ہوئی پھر رہی تھی۔ ان دنوں اس کی شوخیاں اور شرارتیں کچھ زیادہ ہی ہو گئی تھیں۔ کنبے نے تو اس کے پاس سے گزرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ کیوں کہ ذکیہ کے مذاق کا نشانہ سب سے زیادہ گنجا ہی بنتا تھا۔ شاہین اکثر ذکیہ کو سمبھاتی۔ ”ذکیہ! اب تو یہ بچکانہ حرکتیں چھوڑ دے تیری ساس یہ دیکھ کر منگنی توڑ دے تو؟“

”توڑتی ہے تو توڑ دے۔“ ذکیہ بے نیازی سے جواب دیتی۔ ”میں نے اس کی خوشامد نہیں کی تھی کہ اپنے بیٹے کی شادی مجھ سے ہی کرے۔“ یہ جواب سن کر شاہین خاموش ہو جاتی۔

جمیل کی ماں نے جمیل کو لکھ دیا کہ میں نے تمہارے لیے لڑکی ڈھونڈ لی ہے۔ اب جلد از جلد چھٹی لے کر آ جاؤ تاکہ تمہاری شادی ہو سکے۔ خط کے جواب کے ساتھ جمیل نے ڈھیروں چیزیں وہاں سے بھیج دیں اور لکھا کہ آپ کی پسند میری پسند ہے۔ میں جلد از جلد آنے کی کوشش کروں گا۔ آپ شادی کی تیاریاں کریں اور عینی رقم کی بھی ضرورت ہو مجھے لکھ دیں۔

جمیل کا جواب ملتے ہی دونوں گھر دن میں زور و شور سے شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ذکیہ کے گھر سے رات گئے تک ڈھولک، گیتوں کی آوازیں بلند ہوتی رہتیں۔ جمیل کے گھر میں بھی ان دنوں خوب چہل پہل تھی۔ اس کی ماموں زاد اپنی بہت سی سہیلیوں سمیت ایٹ آباد سے آگئی تھیں اس لیے وہاں ہر وقت ہلا گلا رہتا تھا۔

شادی کی تاریخ طے ہو چھی جمیل کی ماں نے لکھ دیا کہ تمہاری شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی ہے۔ اب جتنی جلدی ممکن ہو پاکستان آ جاؤ۔ شادی سے تین دن پہلے جمیل بھی گاؤں پہنچ گیا۔ وہ دہن کے لیے ایسے ایسے کپڑے اور ایسا قیمتی سامان لایا تھا کہ گاؤں بھر میں اسی کا چرچا تھا۔ عورتیں اٹھتے بیٹھتے اس کے لائے ہوئے سامان کی تعریف کر رہی تھیں۔

مہندی والے دن جمیل کی کونھی بھئی نورینی ہوئی تھی۔ گاؤں کے کسی گھر میں بجلی نہیں تھی مگر جمیل نے جزیئر کے ذریعے اپنی کونھی کے ایک ایک کونے کو روشن کر دیا تھا۔ دہن کی طرف سے لڑکیاں مہندی لے کر پہنچیں تو کونھی کی اندرونی

سجاوٹ اور آرائش کو دیکھ کر دنگ رہ گئیں۔ شاہین ان سب میں پیش پیش تھی کیوں کہ وہ ذکیہ کی بہت خاص سہیلی تھی۔ مہندی لگانے جب دولہا کے پاس پہنچی تو ایک لمحے کو سن ہو کر رہ گئی۔ یوں تو جمیل ہر لحاظ سے مردانہ وجاہت کا نمونہ تھا مگر اس کا رنگ سانولا تھا، وہ جانتی تھی کہ گورا رنگ ذکیہ کی کمزوری ہے اور سانولے رنگ سے اسے چڑ ہے۔ کہیں وہ محض سانولے رنگ کی بنیاد پر جمیل سے بددل نہ ہو جائے۔ یہی سوچتے ہوئے اس نے مہندی لگائی اور خاموشی سے لڑکیوں میں آٹھنٹھی۔ دونوں طرف کی لڑکیاں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے زور و شور سے گار رہی تھیں مگر شاہین اس شور شرابے سے بے نیاز یہ سوچ رہی تھی کہ جب ذکیہ کو اس کا آئیڈیل نہیں ملے گا تو اس کا کیا رڈ ٹیل ہوگا۔

وہاں سے واپسی پر بھی وہ خاموش خاموش تھی۔ ذکیہ اس کی خاموشی سمبھاتی گئی اور اس سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے شاہین کیا وہ دلہا پسند نہیں آیا۔“

”دولہا تو اتنا اچھا ہے کہ تو دیکھے گی تو پاگل ہی ہو جائے گی۔“ شاہین نے تعجب سے کہا۔ وہ حقیقت بتا کر ذکیہ کو اداس نہیں کرنا چاہتی تھی۔ پھر ذکیہ سے کچھ بعید بھی نہیں تھی کہ وہ عین موقع پر انکار کر دیتی۔

بالآخر ذکیہ رخصت ہو کر جمیل کی شاندار کونھی میں آگئی۔ اسے ایک آراستہ کمرے میں بٹھا کر لڑکیاں آہستہ آہستہ باہر کھسک گئیں۔ اس نے سرسری طور پر کمرے کا جائزہ لیا۔ فرش پر خوب صورت قالین بچھا ہوا تھا دیواروں پر فریم کی ہوئی تصویریں تھیں اور جس پلنگ پر وہ بیٹھی تھی اس کا گدا اتنا نرم تھا کہ وہ اس میں دھنسی جا رہی تھی۔ ابھی وہ کمرے کا جائزہ لے ہی رہی تھی کہ جمیل کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے جلدی سے سر جھکا کر گھونگھٹ نکال لیا مگر کن آنکھوں سے جمیل کو دیکھتی رہی ابھی تک جمیل کے چہرے پر اس کی نظر نہیں پڑی تھی۔

جمیل نے اس کا گھونگھٹ الٹا تو اس نے شرماتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ اس کا چہرہ دیکھ کر وہ ستانے میں رہ گئی۔ اسے اپنے خواب ریزہ ریزہ ہوتے محسوس ہوئے۔ جمیل انہماکی پر کشش تھا مگر زیرو یاد کے بلب کی روشنی میں ذکیہ کو اس کا سانولا رنگ بھی سیاہ نظر آیا۔ اس کا دل بچھ کر رہ گیا۔ اس نے تو بچپن سے گورے بچے رنگ کے خواب دیکھے تھے۔ اس کا دل چاہا کہ چیخ کر روئے اور اسی وقت اپنے گھر چلی جائے مگر پھر خاندان کی عزت اور بھائیوں کا

آگیا۔ اسے دیکھ کر اب کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ محض گاؤں کی ان پڑھ لڑکی ہے۔ ساری زندگی یورپ میں گزارنے کے بعد جمیل نے گاؤں کی گنوار اور ان پڑھ لڑکی سے شادی کی تھی۔ اسے بھی چاہیے تھا کہ وہ جمیل کی محبت کا جواب گرجوشی سے دیتی مگر وہ تو ابھی تک سفید چڑی والے آئیڈیل کے چکر میں تھی۔

جمیل نے روانہ ہوتے وقت ذکیہ سے کہا: "اپنی عزت اور وقار کا بھرم رکھنا، میں تمہیں کہیں آنے جانے سے نہیں روکوں گا مگر ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا تم میری عزت ہو۔"

ذکیہ نے جمیل سے وعدہ کیا کہ میں تمہاری عزت پر کبھی آنچ نہیں آنے دوں گی۔

جمیل کے جانے کے بعد تو وہ بالکل آزاد ہو گئی۔ وہ ہمیشہ شہر سے جدید تراش کے کپڑے سلواتی، گاؤں میں شادی بیاہ یا کوئی دوسری تقریب ہوتی تو ذکیہ کی سبج ڈیج دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ قیمتی زیورات سے لدی ہوئی، بھڑک دار کپڑے پہن کر محلے کی کسی بھی تقریب میں اس شان سے شریک ہوتی کہ لڑکیاں اور عورتیں اسے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتیں۔

ذکیہ کی ساس بیچ وقت کی نماز یا بندی سے پڑھتیں اور اکثر اسے بھی نماز پڑھنے کی تلقین کرتی رہتیں۔ ذکیہ کی ساس نے ایک دو دفعہ ذکیہ سے کہا بھی کہ بیٹی زیادہ بن سنور کر مت گھوما کر اس پر ذکیہ نے انہیں وہ سنائی کہ بے چاری اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔ یونہی دن گزرتے رہے اور ذکیہ ایک دن ایک خوب صورت سے گول مٹول بچے کی ماں بن گئی۔ اس کی بے حسی کی انتہا تو یہ تھی کہ اس نے دو تین گھنٹے تک اپنے جگر گوشے کو اس خوف سے نہ دیکھا کہ کہیں وہ بھی اپنے باپ کی طرح گندی نہ ہو۔ شاہین نے اس حرکت پر اسے خوب برا بھلا کہا اور بتایا کہ تیرا بچہ رنگت میں بالکل تجھ پر گیا ہے۔ دسکی ہی سرخ و سفید رنگت، بڑی بڑی خوب صورت آنکھیں اور بھورے بال اور اگر یہ سب بھی نہ ہوتا تو وہ بہر حال ہے تو تیری اولاد ہی تا۔ جانور بھی اپنی اولاد سے بے پناہ محبت کرتے ہیں، تو تو پھر انسان ہے۔ جمیل کی فرمائش پر دادی نے پوتے کا نام ثاقب رکھا تھا۔

ثاقب جب بھوک سے بلک کر رو یا تو ذکیہ کا دل ہیچ گیا اور اس نے جھپٹ کر پہلو میں لیٹے ہوئے ثاقب کو اپنے سینے سے چمٹالیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس کا بیٹا سرخ،

خوف آڑے آگیا اور وہ اپنی قسمت پر شاکر ہو کے بیٹھ رہی۔ اگلے روز اس نے دن کے اجالے میں جمیل کو دیکھا۔ وہ اتنا کالا بھی نہیں تھا جتنا وہ سمجھ رہی تھی۔ بس ذکیہ کے سرخ و سفید رنگ سے اس کا رنگ کچھ دبتا ہوا تھا۔ ذکیہ نے غور سے اسے دیکھا۔ دراز قد، کسرتی جسم، بڑی بڑی ذہین آنکھوں اور کشادہ پیشانی والا جمیل اسے اچھا لگا اور اس نے خود پر لعنت ملامت کی کہ رات خواجوا اتنے خوب و اور دلکش آدمی کو ناپسند کر رہی تھی۔

پھر وہ دونوں ہنی مون منانے سوات، کاغان اور ناران چلے گئے۔ جمیل اس دفعہ کچھ زیادہ چھٹی لے کر آیا تھا۔ اسے بھی ذکیہ بے انتہا پسند آئی تھی اور اس نے ذکیہ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر حالات نے اجازت دی تو لندن جاتے ہی تمہیں بھی بلوالوں گا۔ ایک مہینا پلک جھپکتے گزر گیا اور وہ لوگ گھوم پھر کر گاؤں لوٹ آئے۔

جمیل کی ماں بھی بہت خوش تھی۔ ایک تو انہیں من پسند بھولتی تھی دوسرے یہ کہ ان کا بیٹا بھی اس شادی سے خوش تھا۔ سب سے زیادہ خوشی شاہین کو تھی۔ اس کے سب اندیشے غلط ثابت ہوئے تھے۔ ذکیہ نے جمیل کے سانولے رنگ کو بالکل مسئلہ نہیں بنایا تھا۔

ذکیہ یوں بھی ہر وقت بنی سنوری رہنے کی شوقین تھی۔ شادی کے بعد تو اسے اور بھی چھوٹ مل گئی کیوں کہ اس معاملے میں نہ تو جمیل۔۔ اسے ٹوکتا تھا اور نہ اس کی ماں۔ ذکیہ خوب بھڑک دار، قیمتی اور جدید فیشن کے سلے ہوئے کپڑے پہنتی اور خوشبو تو اس فراخ دلی سے لگاتی کہ جس راستے سے گزر جاتی وہ رستہ معطر ہو جاتا۔ اس راستے سے گزرنے والے سمجھ جاتے کہ ابھی انہی یہاں سے ذکیہ گزری ہے۔ جمیل کی موجودگی میں بھی وہ اکثر باہر گھومتی رہتی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اسے جمیل کی ذرا برابر بھی پرواہ نہ ہو اور وہ کچھ ایسی سلجھی ہوئی طبیعت کا مالک تھا کہ اس نے ذکیہ پر کوئی روک ٹوک نہیں لگائی۔

پھر جمیل کی چھٹی ختم ہو گئی اور جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔ اسے ذکیہ سے پھڑنے کا بہت افسوس تھا مگر ذکیہ کو اس بات کی بالکل فکر نہیں تھی۔ شاہین کا یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ ذکیہ نے ذہنی طور پر جمیل کی ساتویں رنگت کو قبول کر لیا ہے۔ اس نے صرف جمیل کی دولت اور اس کی لائی ہوئی قیمتی چیزوں کی بدولت اسے قبول کیا تھا۔ جمیل نے اسے ہر چیز کے استعمال کا طریقہ سکھا دیا۔ اسے پہننے اوڑھنے کا سلیقہ

سفید اور انتہائی خوب صورت تھا۔ جمیل کو بیٹے کی پیدائش کی اطلاع ملی تو وہ سب کام چھوڑ کر پاکستان دوڑا آیا۔ بیٹے کو پا کر وہ انتہائی خوش تھا۔ اب اس کے دل میں ذکیہ کی محبت بھی پہلے سے کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ وہ ثاقب کے لیے ڈھیروں کھلونے اور کپڑے لایا تھا۔ یہاں آ کر سب سے پہلا کام اس نے یہ کیا کہ بینک میں ثاقب کا اکاؤنٹ کھول دیا۔ پندرہ دن گاؤں میں گزارنے کے بعد جمیل واپس چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے ذکیہ سے کہا۔ ”میں وہاں مکان ڈھونڈنے کی سرٹوژ کوشش کر رہا ہوں مگر ابھی تک مکان نہیں مل سکا ہے۔ جیسے ہی مکان مل گیا میں تمہیں اور ثاقب کو بلوالوں گا۔“

اسی طرح ایک سال اور بیت گیا۔ ثاقب اب سارے گھر میں دوڑتا پھرتا تھا۔ اسی دوران میں شاہین کی شادی ہو گئی۔ اس کی شادی گاؤں ہی میں ہوئی تھی۔ اس لیے وہ اب بھی تقریباً روزانہ ہی ذکیہ کے گھر آ جاتی تھی۔ ذکیہ کا آنا جانا شاہین کے گھر ان دنوں اس لیے بھی بڑھا ہوا تھا کہ اس کی چھوٹی بہن نسرین کی شادی ہو رہی تھی۔ شادی والے دن اس نے بطور خاص اہتمام کیا تھا کہ وہ شاہین کی قریبی سہیلی تھی پھر یہ کہ ذکیہ تو ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتی تھی کہ کبھی اسکی کوئی تقریب ہو اور وہ اپنے زیورات، فیشن ایبل کپڑوں اور اعلیٰ ولایتی خوشبوؤں کا استعمال کرے۔

اس دن نسرین کی برات تھی۔ وہ بڑا سا زرق برق دوپٹا سنبھالتی ہوئی شاہین کے گھر میں داخل ہو رہی تھی۔ ثاقب اس سے چند قدم آگے چل رہا تھا۔ اچانک فضا گھوڑے کی ٹاپوں سے گونج اٹھی۔ دور سے ایک گھوڑا سر پٹ دوڑتا ہوا اسی کی جانب چلا آ رہا تھا۔ ذکیہ کو اپنی تو فکر نہیں تھی مگر اسے منے ثاقب کا خیال تھا۔ اس نے جھپٹ کر ثاقب کو اپنی گود میں اٹھالیا۔

وہ سوار اچانک اس کے سامنے آ کر رک گیا۔ ذکیہ گھوڑے کی رفتار دیکھ کر فوراً سہم گئی تھی۔ گھڑ سوار گھوڑے سے نیچے اترا تو مٹی اور دھول میں اٹے ہوئے ہونے کے باوجود اس کے چہرے پر مردانہ وجاہت تھی۔ سرخ و سفید رنگت تھی۔ وہ شاہین کی والدہ کے رشتے داروں میں سے تھا اور اپنے گاؤں سے گھوڑے پر شادی میں شرکت کرنے آیا تھا۔ اس کا نام دلدار خان تھا اور وہ کوئی اچھا آدمی نہیں تھا۔ ذکیہ نے اسے دیکھا تو مبہوت ہو گئی۔ وہ شخص بالکل ویسا ہی تھا جیسی تصویر ذکیہ نے اپنے دل میں بسا رکھی تھی۔ اس کی

سرخ و سفید رنگت دیکھ کر اس کا دل بے قابو ہوا چار ہاتھ اور اس لمحے وہ بھی یہ بھلا بیٹھی تھی کہ وہ جمیل کی عزت اور ایک بچے کی ماں ہے۔

اس وقت شاہین کسی کام سے باہر نکلی اور ذکیہ کو دیکھ کر اسے اپنے ہمراہ اندر لے گئی۔ دلدار خان بغور ذکیہ کی طرف دیکھتا ہوا اپنا گھوڑا باندھنے چلا گیا۔ وہ انتہائی آوارہ اور بدچلن شخص تھا اور اس کی دوستی بھی اپنے ہی پیسے بد معاش لوگوں سے تھی۔ اس نے اپنی مردانہ وجاہت کی بدولت بہت سی لڑکیوں کو محبت کا جھانسا دے کر بے وقوف بنایا تھا۔ اس نے شاہین پر بھی ڈورے ڈالنا چاہے تھے مگر وہ صاف بچ گئی تھی ذکیہ کو دیکھا تو اس پر بھی ہاتھ صاف کرنے کا سوچ لیا۔

ذکیہ اپنے ذہن سے دلدار خان کا خیال جھٹک کر شادی کے ہنگاموں میں گم ہو گئی۔ لڑکیوں نے حسب معمول اسے دیکھ کر ڈھولک تھادی اور گانے کی فرمائش کی۔ ذکیہ نے ڈھولک سنبھالی اور ایسی سریلی آواز میں گانا شروع کیا کہ سننے والیاں دم بخود رہ گئیں۔ ذکیہ خود بھی دنیا دماغیہا سے بے خبر، آنکھیں موندے گا رہی تھی۔ گاتے گاتے اس نے آنکھیں کھولیں تو سامنے اسے دلدار خان دکھائی دیا۔ وہ صحن کے باہر گلی میں کھڑا ہوا تھا مگر صحن کی کچی دیواریں اتنی نیچی تھیں کہ گلی میں کھڑا ہوا کوئی دراز تو ربا آسانی اندر دیکھ سکتا تھا۔

اس کے یوں والہانہ انداز میں گھورنے سے پہلے تو ذکیہ کو انجانا سی خوشی ہوئی مگر پھر فوراً ہی اسے اپنے معصوم بچے کا خیال آ گیا اور اس نے اپنا منہ پھیر لیا مگر اس کے دل میں اتھل پھل جاری تھی۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی کئی بار کن انکھیوں سے دلدار خان کی طرف دیکھا۔

شاہین بہت دیر سے ذکیہ کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ دیکھ رہی تھی۔ ایک دفعہ اس نے ذکیہ کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو اسے دلدار خان ذکیہ کو گھورتا ہوا نظر آیا۔ وہ فوراً سب معاملہ سمجھ گئی۔ اسی وقت ثاقب نے پانی مانگ کر ذکیہ کی محویت کو توڑ دیا۔ وہ اسے پانی پلانے اٹھی تو شاہین بھی اس کے پیچھے آئی اور بولی۔ ”ذکیہ! ثاقب کو پانی پلا کر ذرا اندر کرے میں آتا۔“

ذکیہ کمرے میں پہنچی تو شاہین کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ ذکیہ کی آہٹ سن کر اس نے گھوم کر پیچھے دیکھا۔ اس کا چہرہ اس وقت انتہائی سنجیدہ تھا۔ اس کا سنجیدہ اور اداس چہرہ

احمد قریح

فلسطین کے وزیر اعظم۔ ان کا شمار فلسطین کے اہم رہنماؤں میں ہوتا ہے۔ 1993-94ء میں فلسطینیوں اور اسرائیل کے مابین اوسلو (ناروے) میں جو معاہدہ امن طے پایا تھا وہ بھی ان کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ وزارت عظمیٰ کا عہدہ سنبھالنے سے پہلے وہ فلسطین کونسل کے اسپیکر کے عہدے پر فائز تھے اور وہ فلسطین کی سب سے بڑی تنظیم الفتح کے ایک مرکزی رہنما کی حیثیت سے بھی تسلیم کیے جاتے ہیں۔

مرسلہ: ناصر حسین سواتی۔ کراچی

میاں محمد اظہر

پاکستان مسلم لیگ (ق) کے صدر اور سابق گورنر پنجاب اور لاہور میٹروپولیٹن کارپوریشن۔ تعلق لاہور کی آرائیں فیملی سے ہے۔ مسلم ماڈل ہائی اسکول لاہور سے میٹرک کیا اور پھر ہیلے کالج آف کامرس اور گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ پاکستان مسلم لیگ کے رکن ہونے کی حیثیت سے پنجاب مسلم لیگ کے صدر رہے پھر لاہور میٹروپولیٹن کارپوریشن کے کونسلر اور لاہور میٹرو بھی رہے۔ 1988ء کے عام انتخابات میں لاہور سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ 6 اگست 1990ء تا 18 اپریل 1993ء پنجاب کے گورنر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ دسمبر 2000ء میں مسلم لیگ کے صدر میاں نواز شریف سعودی عرب چلے گئے تو انہوں نے مسلم لیگ ن سے ناٹھ توڑ لیا اور مسلم لیگ قائد اعظم گروپ قائم کیا۔ مارچ 2001ء میں انہیں بلا مقابلہ مسلم لیگ (ق) کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ اگست 1999ء میں وہ پاکستان فٹ بال فیڈریشن کے صدر بنے۔ اکتوبر 2002ء کے قومی اسمبلی کے انتخابات میں شرق پور اور لاہور سے حصہ لیا مگر دونوں حلقوں سے انتخاب ہار گئے۔ 2002ء کے عام انتخابات کے بعد انہیں باوجود مسلم لیگ کے صدر کے اپنے عہدے سے مستعفی ہونا پڑا۔ 2004ء میں لاہور میں پاکستان نیشنل فورم کا قیام عمل میں آیا تو انہیں پنجاب کا گورنر مقرر کیا گیا۔

مرسلہ: اقرار الحسن سومرو۔ خیر پور میرس

دیکھ کر ذکیہ بھی گھبرا گئی۔ ”کیا بات ہے شاہین! خیریت تو ہے؟“

”میں تم سے اتنا کہوں گی کہ تم اب نہ صرف جیل کی عزت ہو بلکہ ایک نیچے کی ماں بھی ہو۔ دلدار خان بہت برا آدمی ہے۔ اس نے گاؤں کی بہت سی لڑکیوں کو شادی کا فریب دے کر تباہ کیا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ دلدار خان کا ظاہر بہت اجلا اور خوب صورت ہے مگر باطن اتنا ہی سیاہ اور مکروہ ہے۔“

”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے شاہین۔“ ذکیہ نے جواب دیا۔ ”اتنی پاگل میں بھی نہیں ہوں کہ میں ایسے محبت کرنے والے شوہر اور معصوم بیٹے کو چھوڑ دوں گی۔“ ذکیہ نے واقعی یہ بات خلوص سے کہی تھی اور اس نے دل میں عہد کر لیا تھا کہ آئندہ جیل کے علاوہ کسی کی شکل بھی نہیں دیکھوں گی۔

”خدا کرے کہ یہ غلط فہمی ہی ہو۔“ شاہین نے کہا۔ ”مگر یہ یاد رکھنا یہ شخص دلدار خان اس سے پہلے دو بیویاں چھوڑ چکا ہے اور نہ جانے کتنی لڑکیوں کے مستقبل تاریک کر چکا ہے۔“

شادی کے دوران میں تمام وقت دلدار خان نے ذکیہ سے بات کرنے کی کوشش کی مگر ذکیہ نے اسے کوئی ایسا موقع ہی نہ دیا۔ پھر بات آئی گئی ہو گئی۔ دلدار خان اس کے بعد ذکیہ کو پھر کبھی دکھائی نہیں دیا۔

☆.....☆

وہ ایک گرمیوں کی دوپہر تھی۔ ذکیہ نے اپنی ساس سے صبح ہی میکے جانے کی اجازت لے لی تھی مگر گھر کے کام کرتے ہوئے اسے دوپہر ہو گئی تھی۔ چلتے وقت اس کی ساس نے اسے ٹوکا بھی تھا کہ اس دوپہر میں کہاں جاؤ گی مگر ذکیہ نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ ماں جی گرمی اتنی زیادہ نہیں اور پھر ماں کے گھر کا فاصلہ ہی یہاں سے کتنا ہے۔ یہ کہہ کر وہ ثاقب کو ساتھ لے کر اپنے میکے چل دی۔

گاؤں کے کھڑے پر پھیل کا وہ پرانا درخت تھا جس کی کھنی چھاؤں کے نیچے لوگوں نے ایک چبوتر سا بنایا ہوا تھا۔ اکثر راہ چلتے مسافر اور مویشی چرانے والے سستانے کے لیے اسی درخت کے نیچے آ بیٹھتے تھے۔ ذکیہ نے دیکھا کہ اس درخت کے نیچے دلدار خان اپنے دوست فرید خان اور دوسرے بد معاشوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ذکیہ نے اسے اس وقت دیکھا جب وہ اس کے بالکل نزدیک پہنچ گئی۔ دلدار

نوراں! تو ہر وقت دلدار خان کی تعریفیں کیوں کرتی رہتی ہے؟ شاہین تو کہہ رہی تھی کہ وہ بہت برا آدمی ہے۔

”تو یہ کس جی!“ نوراں نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔ ”شاہین کے گھر والے کیسے نیک آدمی پر الزام لگا رہے ہیں۔ اصل بات یہ ہے جی کہ شاہین کے گھر والے اس کی شادی دلدار خان سے کرنا چاہتے تھے، شاہین خود بھی اس کے لیے دیوانی تھی مگر دلدار خان نے نہ جانے کہاں آپ کو دیکھ لیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میں شادی کروں گا تو صرف ذکیہ سے ورنہ نہیں کروں گا۔ اس بات سے شاہین آپ سے حسد کرنے لگی اور آپ کے سامنے اس کی برائیاں کرتی ہے اور آپ پر تو ایسے ایسے الزام لگاتی ہے کہ بس میں کیا بتاؤں۔“

نوراں مکاری سے بولی۔ ”دلدار خان کے گھر والے تو شاہین کی جھوٹی جی باتوں میں آگے مگر دلدار خان نے اس کی کسی بات کا یقین نہ کیا۔ وہ تو اب بھی ہمیشہ آپ کی تعریفیں ہی کرتا ہے۔“

یہ سن کر ذکیہ کے دل میں شاہین کی طرف سے گہرے پڑ گئی اور اس نے سوچ لیا کہ اب میں شاہین کی کوئی بات نہیں مانوں گی۔

ماں جی ذکیہ کے آنے کے بعد گھر کو مکمل طور پر اس کے ہاتھوں میں دے چکی تھیں۔ انہیں گھر کے کسی کام سے کوئی مطلب نہیں تھا اور انہیں ذکیہ پر اس حد تک اعتماد تھا کہ وہ کئی کئی دن کے لیے اپنے بھائیوں کے پاس ایبٹ آباد چلی جاتی تھیں۔ روز روز جھوٹی جی تعریفیں کر کے بالآخر نوراں ذکیہ کو اپنی راہ پر لگا ہی لائی اور اس نے اپنے گھر میں ان دونوں کی ملاقاتوں کا بندوبست بھی کروا دیا۔ اس کے صلے میں وہ دلدار خان اور ذکیہ دونوں سے ہی بھاری رقم اٹھاتی تھی۔

ماں جی ایبٹ آباد چلی جاتی تھیں تو ذکیہ کو مزید آزادی مل جاتی اور دلدار خان کو کھلے عام اپنے گھر میں بھی بلا لیتی۔ ایسے میں نوراں نگرانی کرتی رہتی اور اگر کوئی بھی خلاف معمول باتیں دیکھتی تو ان دونوں کو مطلع کر دیتی۔ پھر دلدار خان پچھلے دروازے سے نکل جاتا۔

ایک دفعہ حسب معمول ماں جی ایبٹ آباد گئی ہوئی تھیں۔ ذکیہ کے لیے میدان صاف تھا۔ اس نے فوراً نوراں کے ذریعے دلدار خان کو بلا بھیجا اور نوراں کوٹھی کے گیٹ پر بیٹھ کر نگرانی کرنے لگی۔ ذکیہ نے آزادی میں خلل نہ پڑنے کی وجہ سے نوراں کو معمول کے مطابق چوکیداری پر بٹھایا ہوا تھا۔ اچانک نوراں کی بڑی بیٹی حیران پریشان وہاں جا پہنچی

خان نے اسے دیکھ کر اپنے دوست فرید کو اس دن والی باتیں بتائیں اور یہ بھی بتایا کہ شکار بھی جال میں پھنسنے کو بے تاب ہے۔ فرید خان تاسف کرتے ہوئے بولا یار تو نے سونے کی چڑیا ہاتھ سے نکال دی اگر تو ذرا سی محنت کرتا تو آج تیرے دارے نیارے ہوتے۔ ذکیہ کا شوہر ولایت میں ہے اس کے پاس لاکھوں روپیا ہوگا۔ خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا بس تو ذرا سی ہمت کر لے، باقی کام ہمارا ہے۔

یہ سن کر دلدار خان کو بھی جوش آگیا اور اس نے دوبارہ کوشش کرنے کی ہامی بھری۔

ذکیہ کے گھر سے تھوڑی ہی دور نوراں کا گھر تھا۔ نوراں بوجہ تھی اس لیے ذکیہ اس کی مالی امداد کرتی رہتی تھی مگر وہ انتہائی لاپٹی عورت تھی۔ دلدار خان نے چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ ذکیہ اکثر نوراں کے گھر آتی رہتی ہے اور اس نے کسی نہ کسی طرح نوراں کو لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ ایک دن نوراں، ذکیہ کے گھر گئی اور اس سے پرانے کپڑے مانگے۔ ذکیہ اسے اکثر پرانے کپڑے بھی دیا کرتی تھی۔ کپڑے باندھنے کے دوران میں ذکیہ گنگنا بھی رہی تھی۔

”چٹا گلڈیر ہے۔“

اسی وقت شاہین وہاں آگئی اور چتے ہوئے بولی۔

”ذکیہ تیرے ذہن سے ابھی تک سفید رنگت کا نشہ اتر نہیں۔“

”یہ نشہ تو مشکل سے اترے گا شاہین۔“ ذکیہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ ”کاش میرے خواب بھی پورے ہو جاتے۔“

پھر وہ دونوں کھٹکھٹا کر ہنس دیں۔

”ہم بھی کیسے پاگل ہوتے تھے ذکیہ۔“ شاہین نے چتے ہوئے کہا۔ خاص طور پر تو تو سرخ و سفید رنگت کی بہت دیوانی تھی۔

یہ باتیں نوراں کی موجودگی ہی میں ہوئی تھیں اور وہ فوراً سمجھ گئی تھی کہ دلدار خان کو ذکیہ اتنی دلچسپی سے کیوں دیکھ رہی تھی۔ نوراں نے جا کر دلدار خان کو ایک ایک بات بتا دی یہ سن کر دلدار خان خوشی سے پھول گیا اور بار بار اپنی شکل آئینے میں دیکھنے لگا۔

فرید نے کہا۔ ”یار دلدار! تو چیز ہی ایسی ہے کہ لڑکیاں تجھے دیکھتے ہی دیوانی ہو جاتی ہیں۔“

پھر تو نوراں اکثر ذکیہ سے دلدار خان کی تعریفیں کرنے لگی۔ ایک دن ذکیہ جھنجھلا کر کہنے لگی۔ ”کیا بات ہے

شاہین کو بھی کراچی بلا لیا۔ یوں ذکیہ میں جو تھوڑی بہت جھجک تھی وہ بھی جاتی رہی۔ اب وہ آزادانہ دلدار خان سے ملنے لگی کیوں کہ ثاقب بھی اسکول میں داخل ہو چکا تھا۔ اس کے میکے والا بھی کوئی نہیں آتا تھا۔ کیوں کہ ذکیہ چالاکی یہ کرتی تھی کہ وہ تین دن بعد خود ہی میکے والوں سے مل آتی تھی۔

ایک دن دوپہر کے وقت دلدار خان اور ذکیہ باتیں کر رہے تھے۔ ثاقب اسکول گیا ہوا تھا مگر اس کی واپسی کا وقت ہو گیا تھا۔ ثاقب سمجھ دار ہو گیا تھا اس لیے ذکیہ بار بار دلدار خان سے جانے کے لیے کہہ رہی تھی۔ دلدار خان نے جھنجلا کر کہا۔ ”مجھ سے اب یہ پابندیاں برداشت نہیں ہوتیں ذکیہ! اب تمہیں مجھ سے تعلق رکھنا ہے تو میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔“

”مگر..... میرا شوہر..... بچہ!“ ذکیہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔
 ”جھیل تو بعد میں تمہیں خود ہی طلاق دے دے گا۔ رہا بچے کا مسئلہ تو اسے تمہیں چھوڑنا ہی پڑے گا۔ یا تو مجھے چھوڑ دو یا اپنے بیٹے کو چھوڑ دو۔“ دلدار خان نے سفاکی سے کہا۔ ”پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ثاقب سے بعد میں بھی ملتی رہو۔ بولو کیا کہتی ہو؟“

ذکیہ تھوڑے سے پس و پیش کے بعد راضی ہو گئی اور انہوں نے اسی وقت فرار کا منصوبہ بھی طے کر لیا۔ دلدار خان نے کہا کہ اپنی ساس کے آنے سے پہلے جمیل کے اکاؤنٹ سے سارا روپیہ نکلوا لو۔

دوسرے ہی دن ذکیہ نے بینک سے جمیل کا سارا روپیہ نکلوا لیا اور اس نے فرار کے لیے قیمتی چیزیں بھی سیٹنا شروع کر دیں۔ اسی دن جمیل کا ٹیلی گرام آیا۔ ذکیہ تو اس وقت گھر میں موجود بھی نہیں۔ ثاقب نے ٹیلی گرام لے کر گاؤں کے ایک پڑھے لکھے آدمی احمد سے پڑھوایا۔ ٹیلی گرام میں لکھا تھا کہ میں پرسوں شام کو کسی وقت پہنچ رہا ہوں۔ یہ سن کر ثاقب خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ پہلے اس نے سوچا کہ یہ خبر امی کو سنا دوں مگر پھر وہ یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ انہیں اچانک معلوم ہوگا تو بہت حیران ہوں گی۔ اس لیے اس نے ماں سے ٹیلی گرام کا کوئی تذکرہ نہیں کیا اور خاموشی کے ساتھ کونھی کے اوپر والے کمرے میں جا کر سو گیا۔

ذکیہ ان باتوں سے بے نیاز اپنے عشق میں مگن تھی۔ وہ جلدی جلدی اپنی قیمتی چیزیں ایک سوٹ کیس میں بھر رہی تھی۔ اس کام میں نوران پورا پورا ہاتھ ملاتی تھی۔ اگر ذکیہ کوئی چیز

اور بولی ”اماں جلدی آؤ گھر میں سب لڑ جھگڑ رہے ہیں۔“
 ”کم بخت ایک منٹ سکون سے نہیں رہتے۔“ بچوں کو کوستی ہوئی وہ گھر کی طرف بھاگی۔

اسی وقت شاہین آگئی اور سیدھی اندر چلی گئی۔ ذکیہ اور دلدار کو ایک ساتھ بیٹھے دیکھ کر اس کا خون کھول گیا۔ اسے اچانک سامنے دیکھ کر ان دونوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ دلدار خان تیزی کے ساتھ باہر نکل گیا۔

”یہ بے غیرت نوراں نہ جانے کہاں مر گئی۔“ ذکیہ نے ڈھٹائی سے کہا۔

”بے غیرت وہ نہیں ہے تو ہے ذکیہ۔“ شاہین نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ”مجھے آج معلوم ہوا کہ وہ کتنی نوراں بھی تیرے ساتھ شریک ہے۔“

”زیادہ پارسا بننے کی ضرورت نہیں شاہین۔“ ذکیہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”میں جانتی ہوں کہ تو خود بھی دلدار خان کو پسند کرتی تھی۔“

”اپنا عیب چھپانے کے لیے مجھ پر الزام لگا رہی ہے۔ بے غیرت۔“ شاہین نے آہے سے باہر ہوتے ہوئے کہا۔
 ”مجھے نوراں سب کچھ بتا چکی ہے۔“ ذکیہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔

”تو بھی کتنی بھولی ہے ذکیہ۔“ شاہین نے انہوں سے کہا۔ ”میری کون سی بات تجھ سے چھپی ہے میں نے کبھی تجھ سے تذکرہ کیا تھا دلدار خان کا؟ تو میرے ایک ایک پل سے واقف ہے ذکیہ! نوراں نے تجھے بے وقوف بتایا ہے۔ تاکہ ہمارے تعلقات خراب ہو جائیں۔ میرا شوہر بہت کم کما تا ہے، میرے پاس دلالتی کپڑے اور خوشبوئیں نہیں ہیں۔ میرے پاس عالیشان مکان نہیں ہے مگر مجھے فخر ہے کہ میں عزت کی روٹی کھا رہی ہوں۔ گاؤں کا کوئی آدمی مجھ پر انگلی نہیں اٹھاتا۔ اب بھی وقت ہے۔ ان راہوں کو چھوڑ دے ذکیہ ورنہ تجھے پچھتانے کا وقت بھی نہیں ملے گا۔“

اس سے پہلے کہ ذکیہ کوئی جواب دیتی۔ ثاقب آنکھیں ملتا ہوا آگیا۔ ”آہا! شاہین خالہ آئی ہیں۔ شاہین خالہ آپ کو پتا ہے میں اس سال چھ برس کا ہو جاؤں گا۔ پھر ابو نے ایبٹ آباد والے رضا چاچا کو لکھ دیا ہے کہ وہ مجھے اسکول میں داخل کرادیں۔“

شاہین تھوڑی دیر وہاں رہی پھر گھر آگئی۔ شاہین کا شوہر کراچی میں ملازمت کرتا تھا۔ اس کی ترقی ہوئی تو اس نے

بھول بھی جاتی تھی تو وہ اٹھا کر سوٹ کیس میں ٹھونس دیتی۔
رات کے دس بجے ذکیہ، نوراں کے ہمراہ سوٹ کیس
اور سامان کی پوٹلیاں اٹھا کر اس طرف چل دی جہاں دلدار
خان پہلے سے موجود تھا۔ دلدار خان نے اسے دیکھ کر خوشی کا
اظہار کیا اور سب سے پہلے نقد رقم اور لاکھوں مالیت کے
زیورات پر قبضہ کیا۔ پھر اچانک اس نے بدلے ہوئے لہجے
میں کہا۔ ”ذکیہ! اب تم واپس جاؤ میں اس سامان کو ٹھکانے
لگا کر جلد ہی تمہیں بھی لے جاؤں گا۔“

ذکیہ کے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ اس
نے گھبرا کر کہا۔ ”دلدار میں تو اب گھر سے ہمیشہ کے لیے
آگئی ہوں اب میں کہاں جاؤں؟ میں تمہارے ساتھ چلوں
گی۔“

”نشوونگہ کی بات مت کرو ذکیہ۔“ اچانک فرید خان
نے جھاڑیوں سے نکل کر کہا۔ اسی وقت دلدار خان کے
دوسرے چار ساتھی بھی ذکیہ کے سامنے آ گئے۔ ”بہتری اسی
میں ہے کہ تم واپس چلی جاؤ۔“ فرید کا لہجہ سخت تھا۔

ذکیہ کو اس وقت پچھتاؤؤں کا احساس ہوا مگر اب کچھ
بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اس وقت بھی ٹھنڈی سے کام لیتی تو
شاید بات مال جانے پر ہی ختم ہو جاتی مگر وہ اپنے شوہر کے
خون پسینے کی کمائی یوں نشی نہ دیکھ سکی اور اچانک دلدار خان
سے لپٹ گئی۔ ”کتے کینے! مجھے لوٹ کر یہ سمجھتا ہے کہ میں
تجھے آسانی سے جانے دوں گی۔ میں تیرا خون پی جاؤں
گی۔“ ذکیہ نے جنوبی کیفیت میں کہا۔ ”تو نے مجھے شوہر سے
بے وفائی پر آمادہ کیا اور اب مجھے برباد کر کے کہہ رہا ہے کہ
میں لوٹ جاؤں۔ میں چیخ چیخ کر گاؤں والوں کو تیرے
دوستوں کے اور اس حرافہ نوراں کے کروت بتاؤں گی پھر
دیکھوں گی تو کیسے بچے گا۔“

”دلدار خان۔“ فرید نے دانت پیٹتے ہوئے کہا۔
”اس کا منہ بند کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اسے ہمیشہ کے
لیے خاموش کر دیا جائے۔“ یہ کہہ کر فرید خان نے چمک دار
پھل کا خوفناک چاقو نکال لیا۔

”نہیں..... نہیں.....“ ذکیہ سہم کر دو قدم پیچھے ہٹ
گئی۔ ”دلدار خان!“ اس نے دلدار خان کو مخاطب کیا جو
اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ ”تو تو مجھ سے محبت کا دعویٰ
کرتا تھا دلدار خان! میرے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھاتا
تھا۔ اب تجھے.....“ اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی فرید
خان کا خوف ناک چاقو اس کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ وہ

تھوڑی دیر تڑپی پھر ساکت ہو گئی۔

صبح ثاقب اٹھا تو ذکیہ کو گھر میں موجود نہ پا کر وہ اسے
پانگلوں کی طرح گاؤں بھر میں ڈھونڈتا پھرا۔ آن کی آن میں
گاؤں بھر میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ ذکیہ مع نقد رقم اور قیمتی سامان
کے غائب ہے۔ شام تک جمیل بھی پہنچ گیا۔ ثاقب نے رور و کر
اسے ذکیہ کی گمشدگی کے بارے میں بتایا۔ جمیل بالکل گم صم ہو کر
رہ گیا۔ اسی وقت ایبٹ آباد اطلاع بھجوائی گئی۔ کسی نے پولیس کو
بھی اطلاع کر دی اور پولیس نے بھی ذکیہ کی تلاش شروع کر دی
مگر اس کی لاش ایسی جگہ پڑی تھی جہاں سے لوگوں کا گزر شاذ و
نادر ہی ہوتا تھا۔ اتفاق سے جمیل دو کانشیلوں کے ساتھ ٹھہلا ہوا
اس طرف جا نکلا۔ اسے دور ہی سے کتوں کا جھگھکا نظر آ گیا۔
قریب گیا تو ذکیہ کی لاش نظر آ گئی۔ وہ اسے دیکھ کر سکتے میں رہ
گیا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ
اب بھی گاری ہو ”اے فصلاں پکیاں نیں، اسان تیریاں
راہوں نکیاں نیں۔“

ذکیہ کو لوٹنے والے بھی اپنے انجام سے نہ بچ سکے۔
دلدار خان نے لوٹی ہوئی رقم سے ایک ٹرک خریدا تھا۔ ایک
دن وہ سب لوگ اس میں سوار لاہور کی طرف جا رہے تھے۔
دلدار خان ٹرک ڈرائیو کر رہا تھا اور فرید خان کے علاوہ دیگر
ساتھی ٹرک میں موجود تھے۔ ایک خطرناک موڑ موڑتے
ہوئے ٹرک دلدار خان کے قابو سے باہر ہو گیا اور وہ خوفناک
طریقے سے ابھری ہوئی چٹان سے ٹکرا گیا۔ حادثے میں
دلدار خان کے علاوہ ہر شخص ہلاک ہو گیا۔ دلدار خان کی
دونوں ٹانگیں اور ایک ہاتھ ٹوٹ گیا جسے ڈاکٹر نے بعد میں
کاٹ دیا۔

نوراں دو ہی سال میں اندھی ہو گئی اور اس کی بہوؤں
نے اسے گھر سے باہر نکال دیا۔ اب وہ بھٹے پرانے کپڑوں
میں گھر کی دلہیز کے باہر بیٹھی رہتی ہے۔ اگر کسی کو ترس آ جاتا
ہے تو اسے روٹی دے دیتا ہے ورنہ وہ کئی کئی وقت کے قاتل
سے رہتی ہے۔ دلدار خان... بھی گاؤں سے کچھ فاصلے پر
واقع ایک حزار پر پڑا اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا
ہے۔ اتنا کچھ ہونے کے بعد ایک اچھی بات یہ ہوئی ہے کہ
ذکیہ کے فرار کی خبر گاؤں والوں سے پوشیدہ ہے ورنہ ثاقب
برباد ہو چکا ہوتا۔ لوگ یہی سمجھ رہے ہیں کہ ذکیہ نے چور کا
بیچھا کیا اور اس نے ذکیہ کو قتل کر دیا۔ برے کا انجام برا
بھی اس کہانی سے واقف نہ ہوتی اگر شاہین نہ سناتی۔



تہی دامن

جناب ایڈیٹر سرگزشت
آداب و نیاز

اس بار میں ایک ذرا الگ انداز کی سرگزشت لے کر آیا ہوں جو میرے ایک دوست کی ہے اور واقعات کو دلچسپ بنانے کے لیے میں نے کہانی کا انداز اختیار کیا ہے۔

محمد سلیم اختر
(راولپنڈی)

میں اس دنیا کا سب سے بد قسمت انسان ہوں۔
میرا قد نہایت ہی چھوٹا ہے۔ یعنی پست قامت ہوں۔ میرا
رنگ کونکے کی طرح کالا اور میرے چہرے اور جسم کے
اعضاء اور نقوش انتہائی غیر مناسب اور بے ڈھنگے ہیں۔ اس
بد صورت سراپا پر یہ اتنا بڑا سر تو گویا تاج کی حیثیت رکھتا
ہے۔ میرے چہرے پر دو گول گول اندر دھسی ہوئی دو
آنکھیں ہیں۔ پچی ہوئی ناک ہے۔ منہ اور لب مینڈک نما
ہیں۔ جگ پیشانی اور اطراف میں بڑے بڑے کان ہیں۔



مجھے اپنی قابلِ رحم اور حسرت ناک کیفیت کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔

☆.....☆

میں ابھی اس دنیا میں نہیں آیا تھا کہ میرے باپ کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہوش سنبھالنے پر میں نے گھر پر صرف اپنی بوڑھی ماں ہی کو دیکھا مگر وہ تو خاصی خوب صورت تھی اور لوگ کہتے ہیں کہ میرا باپ بھی بد صورت نہ تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میری بد صورتی موروثی نہیں ہے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کون ہستی ہے جو میری اس کراہیت انگیز اور دہشت ناک بد صورتی کی ذمہ دار ہے؟

میری ماں؟ میرا باپ؟ نہیں میں ان کو مورد الزام نہیں ٹھہراتا۔ شاید انہیں اولاد کی خواہش ہی نہ تھی۔ اس لیے میرے باپ نے زبردستی میری ماں کو ماں بننے سے محروم رکھنے کے لیے طرح طرح کی دوائیں استعمال کرائیں۔ وہ میری آمد کو تو نہ روک سکے مگر ان دواؤں کا بچھرا اثر ضرور ہو گیا۔ پھر بھی میں اپنے باپ کو قصور وار نہیں سمجھتا کیوں کہ ان کی آمدنی بھی کم تھی۔

میری آمد کے اعلان نے انہیں حواس باختہ کر دیا اور وہ زیادہ سے زیادہ محنت کرنے لگے اور یہی محنت ان کی موت کا سبب بن گئی۔ وہ تگاری سر پر رکھے تیسری منزل پر چڑھ رہے تھے کہ بانس کی سیڑھی سے پھسل کر نیچے آ گئے۔ باپ کی کمی کے باوجود میری ماں نے مجھے پالا اور اب میں ان کا ہاتھ بنا رہا تھا۔ میری ماں اور میں نے پھر کوشش کی تھی کہ گھر کی جڑیں مضبوط بنائیں۔ نہ تو میں اپنی محرومیوں سے مرجھایا اور نہ ہی ماں نے ہمت ہاری۔ ہم چاہتے تھے کہ گھر کا پودا پھلے پھولے۔ اس کوئی شاخیں پتے، پھول اور پھل لگیں۔ کیا ہماری یہ خواہش غیر فطری تھی؟ اسی خواہش کے پیش نظر میری ماں نے مجھ سے پوچھا۔ ”بیٹے اب اس گھر میں دلہن آ ہی جانی چاہیے۔“ ماں کے اس سوال کو سن کر مجھے کوئی حیرت نہ ہوئی کیوں کہ میں تو عرصہ سے یہ چاہتا تھا۔

میں نے جواب دیا۔ ”ہاں..... ماں اب یہ کام بھی ہو جانا چاہیے۔“

ماں نے اسی دن سے ہمسایوں کے ساتھ بات چیت شروع کر دی مگر یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا۔ ماں جب بھی کہیں سے لوٹی تو اس کے چہرے پر دکھ کی

ان سب کے علاوہ میرا چہرہ چمک کے بڑے بڑے داغوں اور گڑھوں سے بھرا ہوا ہے۔ (جو مجھے عمر کے بارہویں سال میں ہوئی تھی) بچپن میں گرنے سے میری دائیں ٹانگ مفلوج ہو گئی سواب میں لنگڑا کر چلتا ہوں۔

مختصر یہ کہ میں کراہیت انگیز بد صورتی کا پہاڑ ہوں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ مجھ پر پہلی نظر میں ہی کسی کا لے بندر کا گمان ہوتا ہے مگر بندر کو دیکھ کر یہ ضروری تو نہیں کہ لوگ ہنسیں۔ البتہ مجھے دیکھ کر وہ بہر صورت ہنس دیتے ہیں کیونکہ انہیں علم ہے کہ میں بھی ان ہی میں سے ہوں۔ وہ سب لوگ جن کے پاس آنکھیں ہیں مجھے دیکھتے ہی ہنسنے لگتے ہیں۔ کچھ کے تو قہقہے بھی چھوٹ جاتے ہیں۔ وہ اس غیر مہذب حرکت کے جواز کے طور پر آپ کو میرے بارے میں کئی مزیدار کہانیاں سناسکتے ہیں۔ یہ کہانیاں میرے کانوں تک بھی پہنچ چکی ہیں اور میں ان ساری وجوہات سے باخبر ہو چکا ہوں۔ جو انہیں گدھوں جیسی بے ہنگم آواز میں ہنسنے پر مجبور کرتی ہیں۔

☆.....☆

ان کی ہنسی کی ایک وجہ یہ ہے کہ میری بھی ایک محبوبہ تھی۔ مزید برآں میں نے اس سے شادی بھی کی۔ میں چونکہ پہلے عاشق اور پھر شوہر بنا۔ یہی تو وہ کہانی ہے جو عجیب و غریب و مستحکمہ خنزیر ہے۔

ایک بار جب میں سڑک پر جا رہا تھا تو میں نے ایک شخص کو اپنے سامنے سے یہ کہتے سنا۔

اس شخص کو دیکھ کر مجھے نوٹھے ڈیم کا کبڑا یاد آ جاتا ہے۔

میں اگرچہ کبڑا نہیں ہوں۔ اس کے باوجود میں کبھی اپنی اہانت کے خلاف احتجاج نہیں کرتا۔ اب یہ فیصلہ کرنا تو یقیناً میرے اختیار میں نہیں کہ مجھے دیکھ کر لوگوں کو کیا اور کون یاد آنا چاہیے؟ ان ساری اذیت ناک باتوں کے باوجود ان کی ہنسی نے مجھے اپنے بارے میں بہت سی باتوں سے باخبر کیا ہے۔ اپنی ذات کے شناخت کے اس عمل میں یقیناً مجھے خارجی حوالہ نے زیادہ مدد دی ہے۔

سڑکوں پر آتے جاتے جب میری نظر شوخ رنگ کپڑوں میں پٹی خوب صورت دو شیزاؤں پر پڑتی ہے تو میں آپ ہی آپ خود میں سمٹ جاتا ہوں کیوں کہ ان کا حسن جذب کرنے کے قابل ہوتا ہے مگر مجھے دیکھ کر وہ جلدی سے اپنا منہ دوسری طرف موڑ لیتی ہیں اور انسان ہونے کی حیثیت سے میرے جذبات کو نہیں پہنچائی جاتی ہے تو پھر

لکیریں کچھ اور گہری نظر آتیں جنہیں دیکھ کر میں بھی پریشان ہو جاتا۔ میں ہر روز اس سے پوچھتا۔

”ماں جی! کیا بتا؟“

”کچھ بھی نہیں۔“ ہر روز اس کا یہی جواب ہوتا۔ جواب دیتے ہوئے یوں لگتا جیسے وہ دکھ اور درد سے گراہ رہی ہو۔

بالآخر اس نے میرے لیے رشتے کی تلاش میں باہر جانا چھوڑ دیا۔ محلے میں بات پھیل گئی تھی کہ میری ماں اپنے لیے بہو تلاش کر رہی ہے۔ اس لیے اب وہ لوگ بھی مجھ پر ہنسنے لگے جو اس سے پہلے مجھ پر کبھی نہ ہنستے تھے۔ لوگ مجھ سے ہمدردی کرتے ہوئے کہتے۔ ”بے چارہ!.....! اس کی ماں نے اس کے لیے دلہن تلاش کرنے کی جتنی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ اے پروردگار! تو اس جیسے بے چارے انسان پیدا ہی کیوں کرتا ہے؟“

ماں کی ناکامی کے بعد میں نے اپنے چہرے اور لباس پر توجہ دینی شروع کر دی کہ شاید اس طرح کوئی لڑکی میری طرف متوجہ ہو جائے۔ میں اچھا اور صاف ستھرا لباس پہننے لگا۔ میں نے چہرے کی آرائش کے لیے کریمیں، لوشن اور خوشبو جات استعمال کرنی شروع کر دیں مگر میری یہ ساری کوششیں بھی میرے من کی مراد پوری نہ کر سکیں۔ لوگوں کی ہنسی مزید بڑھنے لگی جیسے میں مزید بھدا اور بد صورت ہو رہا ہوں۔ میں نے اس بات پر سنجیدگی سے غور کیا اور یہ بات عقل میں آگئی کہ نہانے سے میں خود کو راج ہنس میں تبدیل نہیں کر سکتا۔ بہو کے حصول کے لیے ماں کی ساری کوششیں ناکام ہو چکی تھیں۔ بھلا کون عورت ایک بندر نما انسان کی بیوی بننا پسند کرتی۔ ماں نے اس ناکامی کے غم کو سینے سے لگا لیا۔ اس کی قوت مدافعت بھی جواب دے گئی اور اس کی صحت دن بدن گرتی گئی۔ کئی بیماریوں نے اسے گھیر لیا اور پھر میری وہ ماں جو میرے جلتے دل میں اپنی روح کی چاہت سے ٹھنڈک ڈالتی تھی۔ میری پیاری ماں جس نے مجھے محبت سے عاری اس دنیا کے ساتھ اپنی محبت کے سنہری تار سے باندھ رکھا تھا۔ ماں جس کے پیار کے سہارے میں زندہ تھا اور جو میری کراہیت انگیز بد صورتی میں بھی کسی قسم کا حسن تلاش کر لیا کرتی تھی۔ وہ ماں مجھے اس دنیا میں تنہا چھوڑ کر اگلے جہاں سدھار گئی۔ میں نے اس کی جدائی میں بہت آنسو بہائے تھے مگر میرے آنسو اور آہیں میری ماں کو واپس نہ لائے۔

☆.....☆

کچھ مہینوں بعد میری زندگی میں اچانک ایک تبدیلی رونمائی ہوئی۔ میری زندگی ایک نئی جہت سے روشناس ہوئی ماں کی لوٹی ہوئی آس جو مجھ میں حلول کر چکی تھی۔ ایک روز پھر سے بیدار ہو گئی۔ میری بے رنگ، پھکی اور اذیت ناک زندگی میں مجھے ایک محبوبہ مل گئی۔ جس نے میری دکھوں بھری کہانی کو پیار کی کہانی بنا دیا۔ میرے اندر کے انسانی جذباتوں کو رعنائی بخش دی۔ بلاشبہ وہ بہت ہی عظیم تھی کہ اس نے مجھ سے پیار بھی کیا۔ میری بد صورتی کو نظر انداز کر کے مجھ سے شادی بھی کر لی۔ اس نے مجھ پر ہنسنے والوں کو حیرت زدہ کر دیا اور ان کے ذہنوں کو متلوج کر دیا۔

☆.....☆

اس روز میں اپنے کمرے میں بیٹھا اپنی بد نصیبی کا رونا رو رہا تھا کہ اچانک میں نے گھر کی دلہن کی بیڑھیوں پر زور زور سے لاشی مارنے کی ”ٹھک ٹھک“ سنی۔ اس کے ساتھ ہی ایک لڑکی کی آواز سنائی دی۔ ”خدا کے نام پر کچھ دے دو۔“ وہ ایک بھکارن لڑکی تھی۔ ”جناب میں اندھی ہوں۔“ وہ کہہ رہی تھی۔

میں نے دروازہ کھول کر اس کی آنکھوں کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ واقعی اندھی تھی۔ وہ ایک درد انگیز منظر تھا۔ میں اس وقت اپنی حالت کو بھول گیا اور سوچا۔ ”بے چاری نو جوان لڑکی ہے مگر بغیر آنکھوں کے ایک ایسی زندگی کی مالک جو سننے اور چھو کر محسوس کرنے تک محدود ہے۔“ وہ اتنی زیادہ خوب صورت تو نہ تھی مگر پھر بھی سینکڑوں میں ایک تھی۔ اس کے مناسب اور صحت مند جسم میں جوانی کا رس اور خمار تھا۔ ”بے چاری۔“ میں نے کہا اور پھر وہ میرے دل کے نرم گوشوں میں اتر گئی۔

”اندر آؤ اور بیٹھ جاؤ۔“ میں نے نرمی سے کہا۔ وہ راستہ ٹٹول کر آگے بڑھنے لگی۔ یہ دیکھ کر میں اٹھا اور اسے ہاتھ کا سہارا دے کر اندر لے آیا۔ یہ میری زندگی کا پہلا موقع تھا کہ میں کسی نو جوان اور نوخیز لڑکی کو چھو رہا تھا۔ اس کے نرم و نازک ہاتھ کا لمس محسوس کر کے میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں اور میرے جذبات انتہا کو چھونے لگے۔ میں نے ایک بار پھر اس کی جانب دیکھا۔ آنکھوں کی بے نوری کے باوجود اس کے چہرے پر تازگی اور رعنائی تھی۔

”یہاں بیٹھ جاؤ۔“ میں نے اسے برآمدے میں ایک صاف جگہ پر بٹھا دیا۔ اس نے بھی میرے ہاتھوں کی کبکپاہٹ کو محسوس کیا ہوگا۔ میں نے اسے کچھ کھانے کو بھی

وہ اس اقرار کے بعد جلد چلی گئی۔ آخر کار میرا شمار بھی ان مردوں میں ہونے لگا جن کی کوئی محبوبہ ہوتی ہے۔ اس بھری دنیا میں اب کوئی میرا بھی تھا۔ میری بے رنگ اور پھکی زندگی میں اب شیرینی اور قوس و قزح کے رنگ بکھرتے محسوس ہونے لگے۔ کیا یہ میری خوشی قسمتی تھی؟ پھر خیال آیا کہ وہ لوگ جو مجھ پر ہنستے ہیں۔ وہ جو میرے حاسد ہیں۔ اگر وہ میری بد صورتی کے بدلے میں شینا کو بتا کر ورغلائے لگے تو پھر کیا ہوگا؟ کہیں انہوں نے یہ حرکت کر ہی نہ دی ہو۔ کون جانے؟

مگر شینا کو کوئی کیونکر خوب صورتی اور بد صورتی کا فرق سمجھا سکتا ہے۔ جب کہ وہ تو دن اور رات کی بھی خود تمیز نہیں کر سکتی۔ وہ تو اندھی ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی بد قسمتی ہے مگر وہ پھر بھی اس زندگی سے مطمئن تھی۔

☆.....☆

اگلے روز حسب معمول شینا آگئی۔ میں سوچنے لگا کہ ہماری شادی کیونکر ہوگی؟ مجھے یہ کام ناممکن لگ رہا تھا کیونکہ ہم دونوں کا مذہب ایک نہ تھا۔ وہ ہندو اور میں مسلمان۔ کسی نے بھی اس معاملہ میں ہمارا ساتھ نہیں دینا تھا مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ شینا کے سوائے کوئی بھی عورت مجھ سے شادی کے لیے تیار نہ ہو سکتی تھی۔ پھر ہی میں نے شینا سے پوچھا۔

”مجھ سے شادی کرو گی؟“

یہ سن کر وہ ایک دم پت پت ہو گئی۔ یقیناً میرے مسلمان ہونے نے اس کو کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”تم کیا کہہ رہے ہو۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟“ اس نے حیرت اور خوف سے پوچھا۔

”شینا! کیا یہ بات کافی نہیں کہ ہم دونوں انسان ہیں اور خدا نے خود تمہیں میرے پاس بھیجا ہے۔ ذات پات اور دین دھرم کی دیواریں تو انسان ہی نے بنائی ہیں۔ انہیں گرانہ کوئی مشکل کام نہیں ہے اور پھر یہ کوئی گناہ بھی نہیں، میں نے دلائل دے کر اسے قائل کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ خاموش تھی۔ اس کی خاموشی مجھے معنی خیز لگنے لگی تو میں نے کہا۔ ”بولو شینا! میں تمہیں تحفظ دینا چاہتا ہوں۔ میں تمہاری آنکھیں بن کر زندگی بھر تمہارا ساتھ دینا چاہتا ہوں۔ تمہیں بھی وعدہ کرنا ہوگا کہ تم میرا ساتھ دو گی۔ تم میری خوشی اور خواہش کا احترام کرو گی۔“

”میں وعدہ کرتی ہوں۔“ شینا بولی۔

اس نے بالآخر میری چاہت کا بھرم رکھ لیا۔ وہ چند

دیا اور ایک دس روپے کا نوٹ بھی۔ وہ خوش ہو گئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کا نام شینا ہے اور وہ اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ شہر میں ایک بہت بڑی فیکٹری کے پیچھے ایک جھونپڑی میں رہتی ہے۔ اب وہ جانے کے لیے اٹھی تو میں نے اسے دوبارہ آنے کو کہا اس نے وعدہ کیا اور چلی گئی۔

شینا اب اکثر آنے لگی اور پھر اس کا میرے یہاں آنا ایک معمول بن گیا۔ ہم ہر قسم کے موضوعات اور چیزوں پر گفتگو کرتے تھے۔ اس سے باتیں کر کے میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا تھا اور زندگی کے بوجھل لمحے اب میری جانب خوشیاں منتقل کرنے لگے۔ شینا کی آنکھیں اگر ان میں روشنی ہوتی تو وہ اس کے حسن کو چار چاند لگا دیتیں۔ عورت کی آنکھیں ہی تو مرد کو اس کا دیوانہ بناتی ہیں۔ میرے پیاسے دل کی اپنی خواہشات تھیں۔ کاش شینا کی آنکھیں بینائی سے محروم نہ ہوتیں تبھی میرا دماغ ہنکارتا، اگر وہ دیکھ سکتی تو شاید وہ بھکارن نہ ہوتی اور اگر وہ بھکارن ہوتی بھی تو یقیناً وہ مجھ سے خیرات کے سوا اور کوئی چیز قبول نہ کرتی۔ بلکہ وہ مجھ سے نفرت کرتی۔ دوسرے لوگوں کی طرح مجھ پر ہنستی۔ اس کی آنکھیں اسے ہرگز یہ اجازت نہ دیتیں کہ وہ ہر روز میرے پاس آئے اور اپنے دل کی باتیں کرے۔

لوگوں کو ہماری ملاقاتوں کا علم ہو گیا تھا مگر کسی نے بھی ہمارے معاملات میں مداخلت نہ کی۔ بندر نما انسان ہونے کی بدولت میں تو پہلے ہی ان کے مذاق کا مستقل نشانہ ہوا تھا۔ اب مزید ان کے پاس ہنسنے کا سامان آ گیا۔ وہ بد ہمتی اور بے نوری کی کجکائی سے بہت لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اس انوکھے اتحاد پر ہر کوئی مسکرا رہا تھا۔

ایک روز میں نے شینا سے پوچھا۔ ”میرے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟“

جواب میں وہ صرف مسکرا دی۔ اس کی شرمیلی مسکراہٹ نے مجھے مسحور کر ڈالا۔

”شینا بولو نا!“ میں نے اصرار کیا۔

”کیا کبھی میں نے یہ کہا ہے کہ تم بڑے آدمی ہو؟“ اس نے خلوص بھرے انداز میں جواب دیا۔ میں خوشی سے دیوانہ ہو گیا اور بلا ضرورت پوچھ بیٹھا۔ ”شینا! تم مجھ سے پیار کرتی ہونا؟“

اس نے حیا سے گردن جھکالی اور زبان سے کچھ نہ کہا۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ زندگی کا سارا حسن اور رعنائی اس کے چہرے پر سمٹ آئی ہے۔

آسٹیوپوروسس (osteoporosis)

ہڈیوں کی ایک بیماری کا نام۔ اس بیماری میں کیلشیم کی وجہ سے ہڈیاں پتلی اور کمزور ہو جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ معمولی چوٹ لگنے سے ٹوٹ جاتی ہیں بلکہ بعض اوقات تو یہ معمولی ساد پاؤ بھی نہیں برداشت کر سکتیں۔ یوں تو یہ بیماری مردوں اور عورتوں دونوں کو ہو سکتی ہے لیکن عورتوں میں یہ بیماری مردوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ عموماً اس میں عورتوں اور مردوں کا تناسب تقریباً 2:1 ہے لیکن جیسے ہی خواتین 50 سال کی عمر سے آگے بڑھتی ہیں تو یہ تناسب تقریباً 6:1 تک ہو جاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جب خواتین 50 سال کی عمر کو پہنچتی ہیں تو ان کے جسم میں ایسٹروجن (ایک قسم کا ہارمون) کی تعداد کم ہو جاتی ہے۔ ایسٹروجن کی کمی کی وجہ سے خواتین کی ہڈیوں میں کیلشیم کے ساتھ ساتھ دوسرے مادے بھی کم ہونا شروع ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی ہڈیاں کمزور پڑ جاتی ہیں اور وہ اس بیماری کا شکار ہو جاتی ہیں۔ جدید تحقیق سے بات واضح طور پر سامنے آگئی ہے کہ جن عوامل کی وجہ سے یہ بیماری لاحق ہوتی ہے ان میں یہ شامل ہیں۔ عمر کی زیادتی (خواتین 50 سال سے زائد اور مرد 70 سال سے زائد)، خانہ دانی یا موروثی شواہد کی موجودگی، معمول کی خوراک میں کیلشیم کی مقدار میں کمی، پستہ قد ہونا (وزن 50 کلو سے کم)، خواتین میں ماہواری کے نظام کا جلد (45 سال کی عمر سے پہلے) بند ہو جانا، ورزش نہ کرنا، سگریٹ نوشی، کسی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور ہو جانا اور پھر بستر پر ہی رہنا، زیادہ سفید رنگت کا ہونا، ایشیائی نسل سے تعلق ہونا، چائے اور کافی کا بہت زیادہ استعمال۔ یہ بیماری اس اعتبار سے بہت زیادہ خطرناک ہے کہ اس مرض کے پیدا ہونے کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہوتی اور مریض بھی اس سے بے خبر ہوتا ہے مثلاً ریڑھ کی ہڈی کے مہروں کا اپنی جگہ سے ال جا جانا۔ اگر اس بیماری کی وجہ سے ہڈیوں کے نمکیات کم ہو جائیں تو ضروری ہے کہ ورزش کو باقاعدہ بنایا جائے، زیادہ بھاری سامان اٹھانے سے گریز کیا جائے، سگریٹ نوشی سے مکمل پرہیز کیا جائے۔ معالج اس بیماری میں جٹا مرض کو کیلشیم اور وٹامن ای کی گولیاں دیتے ہیں یا ٹیکے لگاتے ہیں جب کہ خواتین کو ایسٹروجن کی گولیاں استعمال کراتے ہیں۔

مرسلہ: توفیق بچہ۔ کراچی

لحوں تک شرماتی رہی اور پھر بتانے لگی۔ میں نے لوگوں کو اپنے بارے میں بڑی حقارت سے گفتگو کرتے ہوئے سنا ہے۔ جب میں ان کے پاس سے گزروں تو وہ کہتے ہیں۔ ”وہ دیکھو۔ بندر نما انسان کی داشتہ جارہی ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق تم حسن سے عاری ہو۔“

”مگر تم میرے بارے میں کیا محسوس کرتی ہو؟ تم نے مجھے کیسا انسان پایا ہے؟“

”میں اس حسن کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی جو وہ آپ کے بارے میں کہتے ہیں۔ میں نے تو کبھی بندر دیکھا ہی نہیں۔ بچپن میں جب آنکھیں تھیں تو شاید دیکھا ہو مگر اب تو یاد بھی نہیں۔ اس لیے مجھے ان باتوں کی کوئی پروا نہیں ہے۔ اگر وہ یہ بھی کہیں کہ تم دنیا کے حسین ترین انسان ہو، تب بھی میرا احساس اس سے مختلف نہ ہوتا۔ میں نے تو اس دنیا کو دل کی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میں حسن اور بد صورتی کو دل سے دیکھتی ہوں۔ تم مسلمان ہو اور میں ہندو۔ اگر تمہیں کوئی اعتراض نہیں تو مجھے بھی نہیں۔ میں سوچتی ہوں۔ اس دنیا میں کوئی بھی مجھے پورے خلوص اور دل کی گہرائیوں سے نہیں جانتا ہے گا لیکن.....“

”لیکن کیا؟“ میں نے بے تابی سے پوچھا۔

”ہاں..... مگر گداگری کے پیچھے بہت بڑا ”لیکن““

ہے۔ میں پاک دامن نہیں ہوں۔ میری عصمت کی چادر پر کئی دھبے لگے ہیں۔ اندھی ہونے کے باوجود میں محبت کی پیاسی تھی۔ میرا خالی کھنکول دن بھر کی گداگری کے باوجود خالی رہتا اور میرے اور میری ماں کے اداس چہروں پر ہنستا تھا۔ اسی نے رات کے اندھیروں میں مجھے مردوں کی آغوش میں دھکیلا۔ تم خود ہی سوچو بھلا ایک نوجوان لڑکی کو خدا اور بھگوان کے نام پر کوئی بھیک دیتا ہے؟ پہلی بار ہاں پہلی بار۔ جب تم مجھے اپنے گھر کے اندر لے گئے تو میرے ذہن میں یہی بات تھی کہ تم بھی مجھ سے بھیک کے عوض وہی طلب کرو گے جو ایک مرد کسی نوجوان اندھی اور مجبور بھکارن سے مانگ سکتا ہے۔ مگر تم نے تو ایسا نہ کیا۔ تم چاہتے تو میرا جسم پامال کر سکتے تھے مگر تم نے میری روح کے اندر اترنے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ میری نظر میں صرف تم ہی انسان ہو۔ تم ہی عزت کے مستحق ہو۔ میں صرف اور صرف تم سے محبت کرتی ہوں سچی اور پاک محبت۔“

میں ہینا کے خیالات جان کر سن ہو گیا۔ چند لمحوں تک

خاموشی چھا گئی۔

پھر میں نے ایک اعتماد سے کہا۔ ”ہینا! تم نے جو کچھ سنایا ہے وہ انسانی خود غرضی، ہوس اور کسی معذور کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کہانی ہے مگر میرے لیے اب یہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ میں اسے بھول جاؤں گا۔ وہ وقت اب ماضی بن چکا تم بھی اسے بھول جاؤ۔ اب دنیا میں کوئی بھی تمہیں لوٹ کا مال نہیں سمجھے گا۔ کوئی تمہیں بے بس نہیں کر سکے گا۔“

وہ خاموشی سے میری باتیں سنتی رہی۔ گویا وہ اپنی خوشی اور رضامندی کا اظہار کر رہی ہو۔

☆.....☆

چند ہی دن بعد وہ بات ہو گئی۔ جس نے محلہ میں بیجان پھیلا دیا۔ کیا یہ بات ہنگامہ خیز نہ تھی کہ کسی خدائی فوجداری کی موجودگی اور کسی کی اجازت یا حمایت کے بغیر ہی میں اور ہینا نزدیکی مسجد میں جا کر ایک ہو گئے۔ ہماری شادی کا سن کر لوگوں کے قہقہے اور بھی بلند ہو گئے۔ ہینا کی ماں کو بھی میں اپنے گھر لے آیا۔ ساج کے خود ساختہ ٹھیکیدار ہم کو شگ بھری نظروں سے گھورتے مگر اب ہمیں کسی کی پروا نہ رہی، ہم ایک دوسرے سے یہی کہتے کہ ”یہ احمق لوگ ہیں ان کو ہنسنے دو۔“

☆.....☆

ہماری ازدواجی زندگی نہایت ہی پُر مسرت اور خوشوار گزرنے لگی۔ ہم ایک دوسرے کو پا کر بہت خوش تھے۔ ہمارے دامن میں خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ پلک جھپکتے ایک سال گزر گیا۔ ہینا ماں بننے والی تھی۔ ہم دونوں کو اب بد صورتی اور اندھے پن کی کوئی پروا نہ تھی۔ آنے والے بچے کے بارے میں بھی لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے تھے مگر میں ان سے بے پروا خوشی سے دیوانا ہو رہا تھا۔ وہ خوشیاں جن کی بھی میں نے توقع ہی نہ کی تھی۔ اب وہ میری زندگی میں رنگ بھر رہی تھیں۔ میں پروردگار کا شکر گزار تھا کہ اس نے میرا دامن مسرت کے خزانوں سے بھر دیا ہے۔

☆.....☆

ہینا بچے کی پیدائش سے دو ماہ پہلے بیمار پڑ گئی تو میں ڈاکٹر کو گھر لے آیا۔ اس نے ہینا کا معائنہ کیا اور کہنے لگا۔ ”گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ معمولی بیماری ہے جلد ٹھیک ہو جائے گی۔“ اس نے چیک اپ کے دوران میں پوچھا کہ ”کیا ہینا پیدائشی اندھی ہے؟“

جب میں نے اسے بتایا کہ نہیں تو اس نے ایک بار پھر ہینا کی آنکھوں کا غور سے معائنہ کیا اور پھر بڑی سنجیدگی سے کہنے لگا۔ ”آپریشن کے ذریعے اس کی بینائی ٹھیک ہو سکتی ہے مگر ابھی نہیں بچے کی پیدائش کے دو ماہ بعد جب اس کی صحت بحال ہو جائے تو اسے میرے پاس لے آنا۔ میں اس کا آپریشن کرادوں گا اور پھر یہ دنیا دیکھ سکے گی۔“

ڈاکٹر یہ کہہ کر چلا گیا مگر اس کے الفاظ میرا سینہ چھلنی کر گئے۔ مجھے یوں لگا جیسے میری خوشیوں کا تاج کل زمین بوس ہو جائے گا۔ ہینا کی بینائی بحال ہو گئی تو یہ مجھے دیکھ کر کانپ اٹھے گی۔ بھلے سے وہ دل کی آنکھوں سے دیکھ چکی ہے اور محبت بھی کرتی ہے۔ بینائی بحال ہونے کے بعد وہ جب مجھے پہلی مرتبہ دیکھے گی تو اس کے خوابوں کا محل ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ کیا اس کے بعد بھی وہ مجھ سے محبت کرتی رہے گی؟“

میں چیخ کر ڈاکٹر کو کہنا چاہتا تھا کہ ہینا کو اب آنکھوں کی ضرورت نہیں ہے مگر میں ایسا نہ کہہ سکا۔ میں نے گھٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ہینا! ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ تمہاری آنکھوں کا آپریشن کرنے کے بعد تم دیکھنے کے قابل ہو جاؤ گی۔“

ہینا یہ جان کر بہت ہی خوش ہوئی۔ بھلا اس سے بڑھ کر اس کی خوشی اور خوش قسمتی کیا ہو سکتی تھی کہ وہ جب پہلی بار دنیا کو دیکھے گی تو اسے یوں لگے گا جیسے اس نے آج ہی نیا جنم لیا ہو۔ وہ کہنے لگی۔

”اگر مجھے بینائی مل گئی تو کتنا مزہ آئے گا۔ کیا تم بھی اتنے ہی خوش ہو گے جتنی کہ میں؟ میں جب تمہیں دیکھوں گی تو اس وقت تم مجھ سے اور بھی زیادہ پیار کرو گے۔“

”ہاں..... ہاں میں تم سے اور بھی زیادہ پیار کروں گا۔“ میں نے اس کی تائید کی۔

ہینا بہت ہی پُر سکون اور خوش ہو گئی اور باقاعدگی سے دوا کھانے لگی مگر میرے اندر ایک طوفان موجزن تھا۔ میرا ذہن عجیب و غریب خیالات کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ میں برآمدے کے آخری سرے پر بیٹھ گیا۔ میرے اس چھوٹے سے جھونپڑے میں یہی ایک سکون کا گوشہ تھا مگر اب یہ بھی طوفان کی زد میں آنے والا تھا۔ میری دنیا پہلے ہی محدود تھی مگر اب مزید محدود ہونے والی تھی۔

☆.....☆

ہینا ماں بن گئی۔ اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ لوگوں نے ہماری ہنسی اڑائی مگر ہم نے پروا نہ کی۔ بد صورت باپ

”میں زندہ نہیں رہوں گی۔ لگتا ہے میں مر رہی ہوں۔ کاش میں تمہیں ایک بار اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتی۔“ مجھے ہینا کی آخری خواہش سن کر یوں لگا کہ جیسے یہ میری قوت برداشت کا امتحان ہے۔ کیا وہ ڈاکٹر کی موت سے رنجیدہ تھی؟ پھر وہ خاموش ہو گئی۔

”ہینا۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے اپنی آنکھوں سے دیکھنا کوئی بڑی بات نہیں۔ کیا تم نے مجھے اپنے دل کی آنکھوں سے نہیں دیکھا؟ میں جانتا ہوں کہ اس دنیا میں صرف تم ہی ہو جس نے مجھے صحیح طور پر سمجھا اور دیکھا ہے۔ اس دنیا میں تو لوگ آنکھیں رکھتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے۔ تم گھبراتی کیوں ہو۔ میں تمہارے پاس ہوں نا۔ تم جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔“ ہینا نے میری باتیں سنیں اور زبان سے کچھ نہ بولی۔

چمکتا سورج مغربی افق کے کنویں میں اتر چکا تھا کہ اچانک ہینا کی کراہیں، چیخوں میں بدل گئیں۔ کرب سے میری مٹھیاں بھینچ گئیں۔ میری خود غرضی اور بے رحمی کا راز حلق میں اٹک کر زبان پر آنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ میں زیادہ دیر تک اس کے سامنے نہیں رہ سکتا تھا۔ اتنے میں ہینا کی ماں آگئی اور اس نے بچے کو ہینا کے پہلو میں لٹا دیا۔ بچہ بھی کرناک ماحول سے گھبرا کر چیخنے لگا۔

ہینا بھی چیخنے لگی۔ اس وقت میں خود کو بالکل بے بس اور تھکی دست محسوس کر رہا تھا۔ اتنا بے بس میں زندگی میں کبھی بھی نہ ہوا تھا۔

تمام رات اسی طرح گزر گئی۔ ڈاکٹروں نے اس پر کافی توجہ دی درد کش دوائیں دیں لیکن صبح صادق کے وقت ہینا کی روح جسم سے نکل کر آسمان کی وسعتوں میں چلی گئی۔ سورج طلوع ہوا تو تاریکیوں کا دامن دراز ہو گیا ہینا کی ماں بچے کو لے کر نہ جانے کہاں چلی گئی۔

وہ لوگ جو میری دہشت ناک ہستی اور میری اس عجیب و غریب محبت کی تہہ میں نہیں جھانکتے اور انہوں نے کبھی میرے دلی جذبات کو محسوس کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ وہ اب بھی مجھے دیکھ کر اسی طرح ہنسنے لگتے ہیں۔

اب میں کبھی کبھار برآمدے کے کونے میں بیٹھ کر حیرت سے سوچتا ہوں کہ اگر میں اندھا ہوتا اور ہینا بد صورت ہوتی۔ تو پھر میری کہانی کیسی ہوتی؟ میری زندگی کیسے گزرتی؟

اور اندھی ماں کا وہ بچہ بہت ہی معصوم تھا۔ اسے میری آنکھیں اور ہینا کا حسن ملا تھا اس سے بڑھ کر ہماری اور کیا خوشی ہو سکتی تھی۔

چند ہفتے گزرے، ہینا اب صحت یاب ہو گئی تو اس نے ایک روز مجھے اس ڈاکٹر کے بارے میں یاد دلایا۔ مجھے میں اپنی خود غرضی کے سبب بھول چکا تھا۔ ہینا اپنی آنکھوں کے آپریشن کے لیے اب اس کے پاس جانا چاہتی تھی مگر اسے یہ معلوم نہ تھا کہ میرے دل پر کیا قیامت گزر رہی ہے۔ میں نے اسے کہا کہ میں کل اس ڈاکٹر کے پاس جاؤں گا۔ پھر وہ جس دن آنے کا کہے گا میں تمہیں اس کے پاس لے چلوں گا مگر حقیقت یہ تھی کہ میں ہینا سے پہلی بار جھوٹ بول رہا تھا۔ اس روز میں نے اپنے آپ کو سمندر کے وسط میں طوفانی موجوں میں گھرا ہوا محسوس کیا۔ اگلے روز میں ڈاکٹر کے پاس جانے کا جھوٹ بول کر گھر سے نکلا اور دوپہر کو واپس آ کر ہینا کو بتایا کہ وہ ڈاکٹر ایک حادثے میں فوت ہو گیا ہے۔ اب میں کسی اور ڈاکٹر کا معلوم کروں گا۔

ہینا نے دکھ کا اظہار کیا مگر میں اسوس کا ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا۔ ہینا نے صرف اتنا کہا کہ آپ کسی اور ڈاکٹر کا پتا کریں۔ میں نے اقرار میں گردن ہلا دی۔ جس کو وہ نہ دیکھ سکی۔ میرے اندر خود غرضی اور ظلم کے جذبات سما گئے تھے اور یہ ایک بوجھ تھا جسے اٹھائے رکھنا میرے بس کی بات نہ تھی مگر اپنی دکھ بھری زندگی کے اختتام پر ملنے والی خوشیوں کے ان لمحات کو طول دینے کی بجائے میں کوئی اور طریقہ بھی تو اختیار نہیں کر سکتا تھا۔

☆.....☆

وقت کا دھارا کبھی نہ لوٹ کے آنے کے لیے بہتا رہا۔ ایک روز میں جب گھر لوٹا تو میں نے ایک دل دوز منظر دیکھا۔ بچہ اپنے جھولے میں زور زور سے رو رہا تھا۔ ہینا اسے سنبھالنے کے لیے تیزی سے بھاگی۔ اس نے کسی چیز کا سہارا بھی نہ لیا۔ کمرے میں تانبے کا ایک بڑا سا ٹب پڑا تھا۔ وہ اس سے ٹکرائی اور دروازے کی چوکھٹ پر جا گری۔ خون فوارے کی طرح اس کے سر سے اگلنے لگا۔ میں اسے فوراً اسپتال لے گیا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ بے چاری بری طرح گری ہے۔ زخم گہرا اور خطرناک ہے۔

انہوں نے اسے اس کا علاج شروع کیا مگر ہینا درد سے بے حال ہو رہی تھی۔ اس نے مجھے اپنے قریب بلایا اور سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔





ڈاٹک زمین کے لیے کام

محترم معراج رسول
سلام شوق

میں ایک ایسی سرگزشت کے ساتھ حاضر ہوا ہوں جو آپ اور قارئین کو ضرور پسند آئے گی۔ آج جب میں اپنے اردگرد مفاد پرستوں کا ٹولا دیکھتا ہوں تو مجھے والد صاحب کے دو دوست شدت سے یاد آتے ہیں۔ حب الوطنی کسے کہتے ہیں یہ انہوں نے عمل سے بتایا۔ ستمبر میں یوم دفاع ہے اگر اس موقع پر لگا دیں تو نوازش ہو گی۔

ایس اے قاضی
(کراچی)

میرے والد اس زمانے میں سرکاری نوکری پر لگے تھے جب مسلمانوں میں انگریزوں سے نفرت کی وجہ سے سرکاری نوکری کا رجحان بہت کم تھا اور اگر کوئی مسلمان سرکاری نوکری کرتا تو دوسرے اسے عجیب نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔ مگر والد صاحب کو ان کے والد یعنی میرے دادا نے سمجھایا تھا کہ جب مسلمان اپنا الگ ملک حاصل کر لیں گے تو ان کو ملک چلانے کے لیے ہر شعبے میں قابل اور تجربے کار افراد کی ضرورت ہو گی اس وقت یہی لوگ جو آج

انگریزوں کی نوکری کریں گے۔ وہ آگے چل کر مسلمانوں کے ملک کی خدمت کریں گے۔ بات والد صاحب کی سمجھ میں آگئی اور انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی سے بی اے کرنے کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کر لی تھی۔ انہوں نے سول سروس کا امتحان بھی دیا تھا مگر ناکام رہے۔

والد صاحب کا گھرانہ خاص گورداس پور کے علاقے میں رہتا تھا۔ آزادی کا سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا کہ اس علاقے کے مسلمانوں پر ہندو بلوائی ٹوٹ پڑے تھے۔ دور سے بلوائے یہ بلوائی تہیہ کر کے آئے تھے کہ آزادی کے دن تک دہلی کو مسلمانوں کے وجود سے خالی کر دیں گے۔ چاہے اس کے لیے انہیں ایک ایک مسلمان کو کیوں نہ قتل کرنا پڑے۔ وہ پوری طرح مسلح اور تیار تھے۔ مگر دوسری طرف مسلمان بھی بے خیر نہیں تھے اور انہوں نے اپنے دفاع کی ساری تیاریاں کر لی تھیں۔ آبادیوں کے گرد حصار بنا لیے تھے جو گھر بچے اور کمزور تھے ان کی دیواروں کو اونچا اور مضبوط کر لیا تھا۔ جگہ جگہ چھتوں پر مورچے بنا لیے تھے۔ آتشیں اسلحہ کم تھا مگر لوگوں نے بھالے، نیزے، ڈنڈے، غلیلیں اور تیر کمان تیار کر لیے تھے۔ عورتیں اور بچے بھی پیچھے نہیں تھے۔ انہوں نے پتھر اور اینٹیں جمع کی تھیں۔ ساتھ میں دیگیچیاں چولہوں پر چڑھا دی تھیں کہ جیسے ہی حملے کا شور ہو وہ آگ جلا دیں اور حملہ آوروں پر گرم پانی پھینکیں۔

آزادی کا اعلان ہوتے ہی بلوائی چاروں طرف سے مسلمان آبادیوں پر چڑھ دوڑے۔ مگر جب انہیں مسلمانوں کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تو ان کے ہوش ٹھکانے آ گئے تھے۔ وہ لاشوں کے انبار چھوڑ کر بھاگے تھے۔ تین دن تک مسلمان ان کے حملے استقامت سے سہتے رہے اور انہیں پسپا کرتے رہے لیکن جب چوتھے دن بلوائیوں کے ساتھ بھارتی فوج بھی شامل ہوئی جس کے پاس بھاری مشین گن جیسے جدید ترین ہتھیار تھے تو مسلمان ان کا مقابلہ نہ کر سکے۔ بہت سی آبادیوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور وہاں مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔

جو ہتھیار ڈالنے کو تیار نہیں تھے انہوں نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا اور قافلے بنا کر گورداس پور سے نکلنے لگے۔ والد صاحب کے محلے میں لوگ ہجرت کے مسئلے پر تقسیم ہو گئے تھے۔ ان میں سے کچھ رہنا چاہتے تھے اور کچھ جانا چاہتے تھے۔ والد صاحب کے ساتھ ان کی گلی کے دو خاندان اور بھی تھے جنہوں نے ہجرت کا فیصلہ کیا۔ یہ شیخ

صاحب اور خان صاحب کے خاندان تھے اور دونوں خاندانوں میں خاصی تعداد میں لوگ تھے۔ شیخ صاحب اور خان صاحب دونوں شادی شدہ تھے۔ شیخ صاحب کے تین بیٹے تھے اور خان صاحب کی ایک گود کی بیٹی تھی۔ میرے دو بڑے بھائی بھی امی اور والد صاحب کے ساتھ تھے، ان کا کہنا تھا کہ ان کے علاقے سے نکلنے والا قافلہ پانچ سو افراد پر مشتمل تھا اور محلے سے نکلنے ہی اس پر حملے شروع ہو گئے تھے۔ لوگوں نے ہر ممکن ہتھیار ساتھ لے لیا تھا۔ راستے میں اس قافلے میں مزید لوگ شامل ہوئے اور یہ ہزاروں تک پہنچ گیا۔ قافلے پر درجن سے زیادہ حملے ہوئے اور ہر حملے میں سو سے زائد مسلمان شہید ہوئے تھے۔

والد صاحب بتاتے ہیں کہ عورتوں اور بچوں کو درمیان میں رکھا گیا تھا۔ پھر ان کے گرد بوڑھوں کا حصار تھا اور جوان جوڑ سکتے تھے وہ قافلے کے سب سے باہر کے حصے میں تھے۔ اس لیے ہر حملے کا اولین نشانہ وہی بنتے تھے۔ مگر وہی مقابلہ بھی کرتے تھے۔ کتنے ہی بلوائی ان جوانوں نے جہنم رسید کیے۔ ان میں والد صاحب کے ساتھ خان صاحب اور شیخ صاحب بھی تھے۔ تینوں عمروں کے فرق کے باوجود ایک ہی علاقے اور گلی کے رہنے والے تھے۔ پھر مصیبت کا دور تھا اس لیے جلد ان تینوں میں بے تکلفی ہو گئی اور وہ شانہ بشانہ ہی سکھوں اور ہندوؤں سے لڑتے اور ایک دوسرے کی مدد کرتے۔ والد صاحب بتاتے ہیں کہ ان تینوں نے کم سے کم پندرہ بلوائی جہنم رسید کیے تھے اور کتنوں کو زخمی کیا تھا۔ اپنے حصے کی انہوں نے اتنی استقامت سے حفاظت کی کہ اس طرف بہت کم نقصان ہوا تھا۔

والد صاحب خاص طور سے خان صاحب کی بہادری اور استقامت کی تعریف کرتے تھے جو ہمیشہ ثابت قدم رہتے تھے اور نصف درجن پارزخمی ہونے کے باوجود انہوں نے کبھی حملہ آوروں کو پیٹھ نہیں دکھائی تھی۔ کئی کئی دن بنا آرام کیے مسلسل پہرے پر رہتے تھے۔ قافلے میں خوراک تو ایک طرف رہی پینے کے پانی کی بھی شدید قلت تھی۔ آبادیوں میں جانیں سکتے تھے اور جو کنویں اور تالاب مسلم بستیوں میں تھے ان میں ہندو سکھوں نے زہر ملا دیا تھا۔ پانی کا واحد ذریعہ نہریں اور دریا تھے۔ اس لیے سب ہی مشکل میں تھے مگر خان صاحب نے بہت زیادہ قاتلے کیے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ پاکستان کی سرحد میں داخل ہوئے تو بے ہوش ہو کر گر پڑے تھے اور پورے دو دن تک بے

ہوش رہے تھے۔ والد صاحب کا کہنا تھا کہ انہوں نے کم سے کم دو موافقوں پر ان کی اور شیخ صاحب کی جان بچائی تھی۔

☆☆☆

امی ابوان بوڑھی خاتون کو بھی اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ جن کا سارا خاندان راہ میں قربان ہو گیا تھا۔ وہ باقی عمر ہمارے ساتھ رہیں اور انہوں نے دس سال بعد ہمارے گھر میں اپنی آخری سانسیں لیں۔ مجھ سے بڑے دو بھائی اور ایک بہن اور پھر میں ان کے سامنے پیدا ہوئے اور ہم انہیں بہت عرصے تک اپنی سگی دادی سمجھتے رہے کیونکہ انہوں نے بھی اپنے ماضی کا ذکر ہی نہیں کیا۔ ہمیشہ ان کے لبوں پر یہی رہا کہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے ہم مسلمانوں کو الگ وطن دیا جہاں ہم آزاد ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد ایک دن امی نے بیٹھ کر ہم سب بہن بھائیوں کو ان کی زندگی کی اصل کہانی سنائی کیونکہ امی ان سے سب سن چکی تھیں۔ ان کی قربانی، نیک فطرت اور مہربان شخصیت کی وجہ سے امی اور والد ان کا سگی ماں جیسا احترام کرتے تھے بلکہ والد ان کے لیے اتنے جذباتی تھے کہ ان کے انتقال کے بعد کتنے ہی دن روتے رہے اور ان کے لیے ایصالِ ثواب کا سلسلہ جاری رکھا۔

انڈیا میں والد صاحب محکمہ داخلہ میں ملازم تھے۔ جب دونوں ملکوں میں سے کسی ایک ملک کو چننے کا مرحلہ آیا تھا تو والد صاحب نے فطری طور پر پاکستان کا انتخاب کیا۔ اگرچہ اس کے لیے انہیں اپنا جدی پشتی حویلی نما مکان چھوڑ کر آنا پڑا تھا اور یہاں آکر انہوں نے اس کے کلیم میں تین کمروں کا ایک چھوٹا سا فلیٹ ہنسی خوشی قبول کر لیا تھا۔ وہ امی سے کہتے تھے کہ بہت سوں کو تو یہ بھی نہیں ملا۔ جب بھی امی اس کی تنگی سے پریشان ہو کر شکوہ کرتیں تو والد صاحب انہیں دوسروں کی مثال دیتے تھے۔ پھر وقت گزرا اور بچے ہونے سے فلیٹ اور تنگ پڑنے لگا تو والد نے اسے فروخت کر کے ان ہی دنوں نئی نئی آباد ہونے والی پی آئی بی کالونی میں پلاٹ لے کر اس پر چھوٹا سا مکان بنوا لیا۔ شروع میں دو کمرے تھے پھر جیسے جیسے حیثیت ہوتی گئی وہ بنواتے رہے۔ پلاٹ دو سو گز سے زیادہ کا تھا اس لیے خالی حصہ خاصا بڑا تھا اور اس میں امی نے چھوٹا سا باغ بنا لیا۔ ایک آم، ناریل، پیتے کے درخت لگا لیے اور چھوٹی کھاریاں بنا کر ان میں پھریاں بولیں۔ ہم بہن بھائیوں کو کھیلنے کے لیے اچھی جگہ ملی تھی۔

جب ہم یہاں آئے تھے تو یہاں گئے چنے گھرتے اور باقی زمین پر کیکرا گا ہوا تھا یا دوسری جھاڑیاں تھیں۔ رفتہ رفتہ لوگ آتے گئے اور گھر بننے لگے۔ جب ہم یہاں آئے۔ تو بجلی بھی نہیں تھی جو کئی سال بعد آئی۔ پھر پانی کی لائنیں بچھیں اور سیوریج لائن ڈالی گئی البتہ گیس بہت بعد میں آئی تھی۔ مجھے یاد ہے امی بیک وقت مٹی کے تیل اور لکڑی سے جلنے والے چولہے پر کھانا پتاتی تھیں۔ دادی جب تک زندہ رہیں امی کا برابر ہاتھ بٹاتی رہیں۔ اگرچہ امی ان کو بہت منع کرتی تھیں مگر وہ کہتیں کہ بندہ چلتا پھرتا رہے تو اس کے ہاتھ پاؤں بھی کام میں رہتے ہیں بیٹھے بندھے کے ہاتھ پاؤں بھی بندھ جاتے ہیں۔ فارغ اوقات میں وہ پودوں اور درختوں کی دیکھ بھال اور صفائی کرتی تھیں، ان کو پانی دیتیں۔ شام کو کھانا کھا کر وہ لازمی آدھا پون گھنٹا محن میں چہل قدمی کرتی تھیں۔ گرمیوں میں محن میں سوتی تھیں اور سردیوں میں کمرے میں آجاتیں۔ انہیں پچھلے کی ہوا سے الجھن ہوتی تھی اس لیے وہ گرمیوں میں اندر کم ہی آتی تھیں۔ جب آم کا پھڑھ بڑا ہوا تو گرمیوں میں اس کے نیچے چار پائی لگانے لگی تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ آخر تک پوری طرح صحت مند رہیں اور جب ان کا اوپر سے بلاوا آیا تو بس دو دن بیمار رہ کر خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔

دادی جب پاکستان آئیں تب بھی وہ ساٹھ سے اوپر کی تھیں۔ اس سفر میں ان کے دو جوان بیٹے، دو بہویں اور سات پوتے پوتیاں شہید ہوئے تھے۔ خاندان کے دوسرے لوگ اس کے علاوہ تھے۔ وہ اس پر بھی اللہ کا شکر ادا کرتی تھیں کہ ان کے خاندان کی سب عورتیں شہید ہوئیں بلوائی کسی کو اٹھالے جانے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ چلتے وقت سب عورتوں نے اپنے لباس میں تیز چھری رکھی تھی اور جب ایسا موقع آیا کہ عزت اور زندگی میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کرنا ہو تو انہوں نے عزت کا انتخاب کیا اور جان دے دی اپنے خاندان اور اس کی قربانیوں کے حوالے سے امی اور والد صاحب نے انہیں بھی تاسف کرتے نہیں دیکھا، ہاں وہ قیام پاکستان کے بعد لوگوں کے بدل جانے پر افسوس کرتی تھیں۔ جو وطن ہم نے خون دے کر حاصل کیا اس سے اتنی جلدی لیے پروا ہو جانا اور صرف اپنے مفاد میں لگ جانا تعجب انگیز ہی تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے اور بعد کے حالات صرف ذادی ہی نہیں بلکہ والد صاحب بھی بتاتے۔ میں پاکستان آنے کے تین سال بعد پیدا ہوا تھا۔ میرے دو

بولے۔ ”مگر زمین واپس مانگتا ہوں تو مانتے نہیں ہیں۔“
 ”یہ ٹھیکیدار کی غلطی ہے۔ اب بنیادیں پڑ گئیں ہیں
 اور ستون اٹھ رہے ہیں۔ اتنا خرچا کر دیا ہے تو اسے کیسے توڑ
 دوں۔“

والد صاحب نے کہا۔ ”شیخ صاحب غلطی تو آپ کی
 ہے۔ بے شک ٹھیکیدار نے کی ہے مگر ذمے دار آپ ہیں۔“
 ”قاضی صاحب میں مان رہا ہوں۔ اب اس مسئلے کا
 حل یہ ہے کہ میں ایک فٹ زیادہ آجانے والی زمین کا
 معاوضہ ادا کر دوں۔“

خان صاحب نے فوراً انکار کر دیا۔ ”مجھے تو زمین
 چاہیے۔“

”دیکھا قاضی صاحب یہ کیا بات کر رہے ہیں۔“ شیخ
 صاحب نے شکایت کی۔ ”کیا یہ معقولیت ہے۔“
 ”ہاں جی کسی کی زمین کھا جانا تو بڑی معقول بات
 ہے۔“ خان صاحب نے طنز کیا۔

والد صاحب نے کہا۔ ”دیکھئے میں آپ کا پڑوسی
 ہوں اور میرے لیے آپ دونوں برابر ہیں۔ دوسرے آپ
 دونوں آپس میں اچھے دوست ہیں مشکل وقت کے ساتھی
 رہے ہیں۔ اب اگر آپ دونوں جھگڑے کو بڑھاتے ہیں تو
 بات کورٹ پکھری تک بھی جائے گی۔ اگر آپ مجھ سے ثالثی
 چاہ رہے ہیں تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔“
 ”مجھے اپنی زمین چاہیے۔“ خان صاحب نے پختہ
 لہجے میں کہا۔

شیخ صاحب نے فریاد کی۔ ”میں بنیاد میں ہی ہزاروں
 روپے لگا چکا ہوں۔“

یہ 1960ء کی بات ہے جب خان صاحب اور شیخ
 صاحب نے اپنے مکانات بنوانے شروع کیے تھے۔ سستا
 زمانہ تھا اور آٹھ سال پہلے والد صاحب نے ڈھائی ہزار کا
 پلاٹ لیا تھا اور دو کمرے کل پانچ ہزار میں ڈلوائے تھے۔
 اس کے بعد تھوڑے تھوڑے کر کے دو کمرے اور بنوا لیے
 تھے۔ ان پر بھی زیادہ خرچ نہیں آیا تھا۔ مگر والد صاحب نے
 سادہ بغیر بیم پلرز کا مکان بنوایا تھا۔ جب کہ خان صاحب اور
 شیخ صاحب پورا آرسی سی اسٹرکچر بنوا رہے تھے۔ اسی وجہ سے
 یہ مسئلہ ہوا تھا۔ شیخ صاحب کی بنیاد اور اسٹرکچر پہلے پڑا تھا اور
 خان صاحب کا دو تین دن بعد پڑا تھا۔ خان صاحب کی
 باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ مصالحت کے موڈ میں نہیں ہیں
 اس لیے والد صاحب نے مزید ان کے معاملے میں دخل

بڑے بھائی امی اور والد صاحب کے ساتھ ہی آئے تھے۔
 لاہور آنے کے بعد گورداس پور سے چلنے والا قافلہ تتر
 بتر ہو گیا تھا اور لوگ بکھر گئے۔ والد صاحب فوری کراچی
 چلے آئے تھے کیونکہ ان کی ڈیوٹی یہیں تھی۔ اس کے بعد والد
 صاحب کا خان صاحب اور شیخ صاحب سے رابطہ نہیں رہا۔
 کئی سال بعد ان کی ملاقات پہلے خان صاحب سے ہوئی اور
 پھر ان سے شیخ صاحب کا پتا چلا۔ ان دونوں کا آپس میں
 رابطہ تھا۔ خان صاحب بینک ملازم تھے اور شیخ صاحب
 کاروباری آدمی تھے اس لیے اپنا کاروبار کر رہے تھے۔ والد
 صاحب نے انہیں بتایا کہ وہ کہاں رہ رہے ہیں اور یہ اچھی
 آبادی ہے تو ان دونوں نے بھی ہماری کالونی میں اور ہماری
 گلی میں پلاٹ لے لیے۔ یہ دادی کے انتقال کے دو سال
 بعد کی بات تھی۔ اتفاق کی بات تھی کہ یہ دو پلاٹ بیک وقت
 بک رہے تھے اور ایک خان صاحب اور ایک شیخ صاحب
 نے لے لیا۔

کارنر والا پلاٹ شیخ صاحب نے لیا تھا اور اس کے
 برابر والا خان صاحب نے۔ ایک سال بعد انہوں نے تعمیر
 شروع کرا دی۔ دونوں آرسی سی مکان بنوا رہے
 تھے۔ بنیادیں پڑ چکی تھیں اور پلرز کھڑے ہو رہے تھے کہ
 ایک دن صبح سویرے گلی میں شور شرابا ہوا۔ والد صاحب دفتر
 جانے کی تیاری کر رہے تھے وہ اور ہم بھائی جو اسکول جانے
 کی تیاری کر رہے تھے شور سن کر باہر نکل آئے۔ اس وقت
 ہمیں خان صاحب اور شیخ صاحب کا زیادہ علم نہیں
 تھا۔ لڑکے ویسے بھی خود میں مگن رہتے ہیں۔ والد صاحب کی
 ان سے دوستی تھی اور وہی انہیں جانتے تھے اور وہی دونوں
 آپس میں لڑ رہے تھے۔ ان کی آوازیں اتنی بلند تھیں کہ
 پوری گلی میں گونج رہی تھیں اور تقریباً سب ہی گھروں سے لوگ
 نکل آئے تھے۔ والد صاحب نے جا کر پوچھا۔ ”کیا بات
 ہے آپ دونوں صبح سویرے اس طرح کیوں لڑ رہے ہیں۔“
 وہ دونوں ہی والد صاحب کی عزت کرتے
 تھے۔ کیونکہ ہمارا تعلق مشہور قاضی خاندان سے ہے۔ خان
 صاحب نے شکایتی انداز میں کہا۔ ”دیکھیں قاضی صاحب
 ہم نے مکان بنوانا شروع کیا تو شیخ صاحب نے ایک فٹ
 زمین زیادہ لے لی میرے پلاٹ میں سے۔“
 ”میں مانتا ہوں کہ زمین زیادہ آگئی ہے۔“ شیخ
 صاحب بولے۔ ”مگر میں نے جان بوجھ کر نہیں لی ہے۔“
 ”دیکھا یہ بات مان گئے۔“ خان صاحب چمک کر

خان صاحب تقریباً چالیس برس کے سرخ و سفید اور تنومند آدمی تھے مگر تہذیب اور تمیز کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ شیخ صاحب سے لڑائی جھگڑے کے دوران ان کی آواز ضرور بلند ہو جاتی تھی مگر الفاظ میں کبھی گھٹیا پن نہیں آیا۔ ہمیشہ آپ جناب سے بات کرتے تھے۔ گھٹیا الفاظ تو کبھی شیخ صاحب نے بھی استعمال نہیں کیے مگر وہ کبھی کبھی آپ جناب کا دامن چھوڑ دیتے تھے۔ خان صاحب کی بیوی بھی ان کی طرح پُر خلوص اور محلے والوں سے خوش اخلاقی سے ملتی تھیں ان کے گھر جاؤ تو پتھی جاتیں۔ دونوں بیٹیاں اس وقت چودہ اور پندرہ سال کی تھیں۔ وہ بھی شکل صورت کی اچھی اور تمیز والی لڑکیاں تھیں۔ اسکول میں پڑھتی تھیں۔ امی نے خان صاحب کی فیملی سے بہت جلد تعلق بنا لیا تھا اور ان کے آنا جانا شروع کر دیا تھا۔ خان صاحب کی بیگم آتی تھیں البتہ بیٹیاں بہت کم آتی تھیں کیونکہ ہمارے ہاں زیادہ تر لڑکے تھے۔

اگرچہ ہم سب بھائی ان بہنوں سے چھوٹے یا ان کے آس پاس کے تھے اس کے باوجود اس زمانے میں ان باتوں کا بہت خیال رکھا جاتا تھا۔ امی بھی اس بات کا خیال رکھتی تھیں کہ اگر کچھ کہنا، منگوانا یا بھیجنا ہو تو مجھ سے بڑی نورین باجی کو بھیجی نہیں۔ مجبوری میں مجھے بھیج دیا کرتی تھیں مگر مجھ سے بڑے بھائیوں کو کبھی ان کے دروازے پر نہیں بھیجا تھا۔ خان صاحب بیوی اور بیٹیوں کے معاملے میں بہت غیرت مند تھے۔ ان کی بیٹیاں بارہ سال کی عمر میں پردہ کرنے لگی تھیں۔ اس لیے امی بھی اس چیز کا خیال رکھتی تھیں۔ چند دن میں ہی امی اس گھرانے کے گن گانے لگیں اور شیخ صاحب ان کے نزدیک ولن بن گئے جو نہ صرف خان صاحب کی زمین کھا کر بیٹھ گئے تھے بلکہ ان سے دشمنی بھی پال لی تھی۔

دوسری طرف شیخ صاحب کا گھرانہ تھا۔ دونوں میاں بیوی کے علاوہ تین بیٹے تھے۔ سب سے بڑا اٹھارہ سال کا تھا اس سے چھوٹا سولہ سال کا اور سب سے چھوٹا بھی پندرہ سال کا تھا۔ دونوں بڑے بیٹے بالترتیب انٹر اور میٹرک کر کے باپ کے ساتھ کاروبار میں لگ گئے تھے۔ سب سے چھوٹا میٹرک کر رہا تھا مگر وہ بھی شام کے وقت دکان اور گودام پر جاتا تھا۔ چاروں باپ بیٹے بلا کے مٹنتی تھے۔ صبح گھر سے نکلے تو دن کی روشنی میں انہیں کسی نے گھر میں آتے نہیں دیکھا تھا۔ اکثر ان کی واپسی سات آٹھ بجے تک ہوتی تھی۔ اس

نہیں دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ غلطی پہلے شیخ صاحب نے کی اور خان صاحب نے جب اپنے مکان کی بنیاد رکھی اور پھر پلنتھ کے ساتھ ستون بھی اٹھوا دیئے تو اتنے عرصے بعد ان کو خیال آیا کہ ناپ کر دیکھ لیا جائے۔ اگر وہ شروع میں دیکھ لیتے جب تعمیر زیادہ نہیں ہوتی تھی تو مسئلہ آسانی سے حل ہو سکتا تھا۔

Downloaded from paksociety.com

مگر اب بات اتنی بڑھ گئی تھی کہ دونوں ہی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھے۔ محلے میں کئی بار جھگڑے کا ماحول بنا مگر نوبت زبانی کلامی رہی۔ شیخ صاحب کاروباری آدمی تھے۔ وہ گروسری ہول سلر تھے اور خاصا بڑا کاروبار تھا۔ جب انہوں نے یہ مکان بنانا شروع کیا تو ان کے تین بیٹے بھی کاروبار میں شریک ہو گئے تھے۔ کام ایسا تھا کہ ملازموں پر چھوڑا نہیں جاسکتا تھا بیٹوں کی وجہ سے شیخ صاحب کو بہت آسانی ہوئی تھی۔ کاروبار تھا اس لیے پیسا کھلا تھا۔ دوسری طرف خان صاحب ملازمت پیشہ آدمی تھے۔ ایک بیک میں ملازم تھے۔ تنخواہ سے جوڑ جوڑ کر انہوں نے پہلے پلاٹ لیا تھا۔ پھر آفیسر کریڈ میں آئے تو بیک سے قرض لے کر اب مکان بنوا رہے تھے۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں جو پڑھ رہی تھیں۔ پہلے دونوں کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ پہلی بار اپنا مکان بنوا رہے تھے۔

دونوں مکانوں کی تعمیر اور اس کے ساتھ ساتھ خان صاحب اور شیخ صاحب کی صحیح صحیح چلتی رہی۔ مزے کی بات تھی کہ تعمیر کرتے ہوئے دونوں ہی جانتے تھے کہ اب مکان تڑوانا مسئلے کا حل نہیں رہے گا ورنہ اس میں دونوں فریقوں کو بہت نقصان ہوگا۔ زمین لیز تھی اور کے ڈی اے کی طرف سے منظور شدہ تھی اسی طرح نقشے بھی منظور شدہ تھے۔ اگر خان صاحب کے ڈی اے چلے جاتے تو شیخ صاحب مشکل میں پڑ سکتے تھے۔ مگر کے ڈی اے کی طرف سے توڑ پھوڑ ہوتی تو خان صاحب کا مکان بھی محفوظ نہیں رہتا۔ شاید اسی وجہ سے انہوں نے قانونی کارروائی سے گریز کیا۔ یوں ہی لڑائی جھگڑا چلتا رہا اور دونوں کے مکان مکمل ہو گئے۔ اس زمانے میں ایک منزلہ مکان کاروبار تھا اور پھر بڑے پلاٹ تھے اس لیے ایک منزل بھی کافی ہوتی تھی۔ اب دونوں پڑوسی بن گئے تھے مگر ان کے تعلقات سخت کشیدہ تھے۔ باقی سارے محلے سے بہت اخلاق اور خلوص سے ملتے تھے مگر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کے روا

نہیں کیا۔ جب پہلی بار انہیں پتا چلا تو انہوں نے یہاں زمین کی قیمت کے حساب سے خان صاحب کو ادا کیگی کرنے کو کہا مگر وہ نہیں مانے۔

”یہ تو ہمیں معلوم ہے۔“

”پھر بھی لوگ ہمیں خائن سمجھتے اور کہتے ہیں۔“ شیخ صاحب کی بیگم نے شکوہ کیا۔ ”یہی نہیں شیخ صاحب نے خان صاحب کو منانے اور تلافی کی ہر ممکن کوشش کی۔ وہ رقم بھی بڑھاتے رہے اور اب زمین کی موجودہ قیمت سے دوگنی رقم دینے کو تیار ہیں۔ مگر خان صاحب کلف لگے لٹھے کی طرح اکڑ گئے ہیں کسی صورت مان کر نہیں دے رہے۔ ان کی ایک ہی ضد ہے کہ مکان کا اتنا حصہ توڑ کر زمین ان کو دے دی جائے۔ آپ خود سوچیں کہ اگر ہم ایک فٹ کا حصہ مکان توڑ دیں تو ہمارا تو پورا مکان ہی برباد ہو جائے گا۔ کتنا خرچا آئے گا پھر سے بنوانے اور ٹھیک کرنے میں۔ بعض جگہیں تو بیکار ہو جائیں گی۔ پھر نیچے بنیاد سے لے کر اوپر تک سب کچھ بنوانا پڑے گا۔“

”کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں۔“ امی نے دبے لہجوں میں کہا۔ ”مگر زمین بہر حال آپ کے پاس ہے اور خان صاحب کو تلافی کرنا آپ کا کام ہے۔“

شیخ صاحب کی بیگم نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”سچ پوچھیں تو میں بھی روز روز کی سچ سچ سے تنگ آگئی ہوں۔ میں نے شیخ صاحب سے کہا کہ آپ اتنا حصہ توڑ کر زمین خان صاحب کو دے دیں مگر ان کا ہاتھ آج کل تنگ ہے۔ پچھلے دنوں کچھ پارٹیوں نے دھوکا کیا۔ سامان لے گئے اور رقم نہیں دی ہے اس سے بہت نقصان ہوا ہے۔ شیخ صاحب کہہ رہے ہیں کہ کچھ رقم ہاتھ آجائے تو ایسا ہی کرتے ہیں۔ مگر خان صاحب اس ایک فٹ کے ٹکڑے کو لے کر کیا کریں گے۔ کیا اپنا مکان بڑھانے کے لیے وہ بھی توڑ پھوڑ کریں گے۔“

امی جانتی تھیں کہ خان صاحب کی پوزیشن بالکل بھی ایسی نہیں ہے کہ وہ مکان کا یہ حصہ توڑ کر دوبارہ بنوا سکیں اور مسئلہ وہی تھا کہ نیچے بنیاد سے لے کر اوپر تک سب نئے سرے سے بنوانا پڑتا تھا اور یہی کام بہ قول شیخ صاحب کی بیگم ان کو بھی کرنا پڑتا۔ حالات ان کے بھی سخت تھے۔ پاکستان بنے پندرہ سال ہوئے تھے اور ابھی ملک کے حالات سنہلے نہیں تھے۔ اچھے اور مستحکم کاروباریوں کو کمانے کے لیے بہت محنت کرنا پڑتی تھی۔ دو نمبری کاروبار بہت کم

محت کا صلہ پیسے کی صورت میں ملا ہوا تھا۔ خان صاحب اور شیخ صاحب دونوں کے مکانات برابر میں تھے۔ خان صاحب نے بھی اچھے انداز میں بنوایا تھا اگرچہ چھوٹا تھا۔ انہوں نے سامنے کی طرف خوب صورت لان بھی بنوایا تھا۔ مگر شیخ صاحب کا مکان دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس وقت انہوں نے مکان میں وہ چیزیں لگوائی تھیں جن کا متوسط طبقے میں بھی رواج نہیں تھا۔ انہوں نے پورے گھر میں ماربل کا فلور کرایا تھا۔ جدید طرز کا کچن اور ہاتھ رومز بنوائے تھے۔ ان کے پاس کار بھی تھی جس کے لیے سامنے جدید طرز کا پورچ بنایا تھا۔

شیخ صاحب لوگ پہلے آئے تھے مگر ان کی بیگم سے امی کی باقاعدہ ملاقات محلے کی ایک شادی میں کئی مہینے بعد ہوئی تھی اور تب امی کو پہلی بار پتا چلا کہ شیخ صاحب اور ان کی فیملی بھی بہت اچھی ہے۔ امی اور محلے والے ان کے بارے میں جو تاثر رکھے ہوئے تھے وہ درست نہیں تھا کیونکہ خان صاحب گھٹنے پٹنے والے آدمی تھے۔ سب محلے والوں سے ان کی سلام دعا ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ شیخ صاحب کے بارے میں جو بتاتے لوگ اسی پر یقین کرتے تھے۔ شیخ صاحب سے لوگوں کی صرف جمعے کی نماز میں محلے کی مسجد میں یا پھر رات گھر آتے ہوئے سلام دعا ہوتی تھی اور اس میں آدمی زیادہ بات نہیں کر سکتا ہے۔ اس لیے شیخ صاحب تردید نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہی اپنا نقطہ نظر بیان کر سکتے تھے۔ درحقیقت شیخ صاحب اور ان کی بیگم کو علم ہی نہیں تھا کہ محلے میں ان کے بارے میں کیا باتیں پھیل رہی ہیں اور لوگ ان کے بارے میں کیا تاثر رکھتے ہیں۔

شیخ صاحب کی بیگم نے خود امی سے بات شروع کی اور پھر۔۔۔ کچھ ہی دیر میں امی ان سے کھل مل گئیں۔ دونوں خواتین نے ایک دوسرے کو گھر آنے کی دعوت دی۔ پہلے شیخ صاحب کی بیگم آئیں۔ امی نے پہلی بار ان سے کھل کر بات کی۔ شادی کی محفل میں کھل کر بات کرنا ممکن نہیں تھا اور شیخ صاحب کی بیگم حیران رہ گئیں جب انہیں پتا چلا کہ محلے والے انہیں اور ان کے شوہر کو بددماغ اور برا سمجھتے تھے۔ کیونکہ انہوں نے خان صاحب کے پلاٹ کے کچھ حصے پر قبضہ کر لیا تھا۔ شیخ صاحب کی بیگم نے امی کو حلفیہ کہا۔ ”خدا جانتا ہے ہم نے کبھی نہیں کہا کہ ہم نے ٹھیک کیا ہے۔ ہمیشہ مانا کہ خان صاحب کی زمین کا ایک فٹ ہمارے پلاٹ میں شامل ہو گیا ہے۔ شیخ صاحب نے کبھی اس کی تلافی سے انکار

تھا اور زیادہ تر لوگ محنت اور رزق حلال پر یقین رکھتے تھے۔ جو ہزار پتی تھا وہ بھی محنت سے کماتا اور جو لکھ پتی تھا وہ بھی محنت سے کماتا تھا۔ اس سے اوپر کمانے والے اس زمانے میں جیسے آسمان کی مخلوق سمجھے جاتے تھے۔ اس پہلی ملاقات میں امی نے زیادہ تر شیخ صاحب کی بیگم کی بات سنی۔

لیکن اس کے بعد ان کی جب ان سے ملاقات ہوتی وہ کہیں کہ اس مسئلے کا حل نکالا جائے تاکہ دو پڑوسیوں میں جھگڑے کی بنیاد ختم ہو اور وہ معمول کے مطابق رہ سکیں۔ ابھی تو یہ حال تھا کہ اوپری منزل کی سب سے اونچی دیوار محلے میں ان دو گھروں کے درمیان تھی۔ تاکہ اگر چھت پر بیک وقت جائیں تو ایک دوسرے کا آنا سامنا نہ ہو۔ محلے کے دوسرے لوگوں نے کئی بار کوشش کی کہ ان کی آپس میں صلح کرادی جائے۔ مگر مسئلہ اس ایک فٹ دیوار کا تھا جو مرے کتے کی طرح کنویں میں پڑی تھی جب تک یہ کتا نہیں نکالا جاتا کتے ہی ڈول پانی کیوں نہ نکال دیا جائے پانی سے بدبو نہیں جاتی۔ یہ مسئلہ محلے والے حل نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ دونوں ہی اپنے موقف سے ایک انچ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھے۔ خان صاحب اڑے تھے کہ شیخ صاحب کا مکان ٹوٹے گا اور شیخ صاحب اڑے ہوئے تھے کہ بے شک وہ ان سے دو گنا معاوضہ لے لیں مگر وہ اپنا اتنی محنت اور سرمائے سے بنایا ہوا مکان نہیں توڑیں گے۔

خاص بات یہ تھی کہ شیخ صاحب بے شک دو گنا معاوضہ دے دیتے یا دس گنا کاغذات میں یہ زمین خان صاحب کی ہی شمار ہوتی۔ محلے کے کچھ سیانوں نے شیخ صاحب کو سمجھایا کہ یہ مسئلہ ہمیشہ رہے گا۔ اس کا سب سے اچھا حل ہے کہ وہ خان صاحب سے مکان ہی خرید لیں۔ جن دنوں امی نے شیخ صاحب کی بیگم سے ملنا جلنا شروع کیا تھا ان دنوں شیخ صاحب کے اپنے حالات اچھے نہیں تھے۔ اس لیے وہ پورا مکان خریدنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ اگر وہ کاروبار سے اتنی بڑی رقم نکال لیتے تو کاروبار کہاں سے کرتے ان کا تو بزنس ہی زیادہ تر ادھار پر چلتا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ حالات بہتر ہو جائیں تو وہ اس کے لیے بھی تیار تھے۔ دوسری طرف خان صاحب کا صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جا رہا تھا۔ مکان کی تعمیر کے تیسرے سال انہوں نے کے ڈی اے میں درخواست دی کہ شیخ صاحب نے ان کی زمین پر تصرف کیا ہے اور وہ ان سے حاصل کر کے انہیں دے جائے خان صاحب نے بلڈنگ کنٹرول

اتھارٹی کو درخواست دی تھی جو تعمیرات کے بارے میں مجاز اتھارٹی تھی اگر وہ دیکھتی اور سمجھتی کہ تعمیر غلط ہوئی ہے تو وہ اسے توڑنے کی مجاز بھی تھی۔

چند دن بعد شیخ صاحب کو نوٹس آ گیا اور وہ جواب دینے کے لیے مجاز دفتر پہنچ گئے۔ وہاں خان صاحب اور شیخ صاحب نے کئی پیشیاں بھگتائیں اور پھر فیصلہ خان صاحب کے حق میں ہو گیا۔ اس دن خان صاحب اتنے خوش تھے کہ آتے ہوئے میٹھائی کا پورا ٹوکرا لائے اور سارے محلے میں میٹھائی بانٹی۔ حالانکہ ابھی صرف ان کے حق میں فیصلہ ہوا تھا۔ ابھی مجاز اتھارٹی شیخ صاحب کو نوٹس دیتی کہ وہ از خود یہ بڑھا ہوا حصہ سمار کر دیں۔ ایک کے بعد دوسرا نوٹس جاری ہوتا اور اس کے بعد کے ڈی اے کا عملہ خود کارروائی کرنے آجاتا۔ اس سارے عمل میں مہجوں لگ سکتے تھے۔ شیخ صاحب اور ان کی بیگم اس بارے میں خاموش تھے جب امی نے ان کی بیگم سے پوچھا کہ اب کیا ہوگا؟ تو انہوں نے ایک ہی جواب دیا۔ ”جو ہوگا وہ سارا محلہ دیکھے گا۔“

ایک مہینے بعد شیخ صاحب کو پہلا نوٹس ملا اور خان صاحب نے اس روز بھی شیرینی بوائی تھی۔ حسب معمول شیخ صاحب کے گھر کی طرف سے کوئی رد عمل نہیں ہوا ورنہ لوگوں کو توقع تھی کہ دونوں میں پھر لڑائی ہوگی۔ جس دن دوسرا نوٹس آیا اس دن سب کو یقین ہو گیا کہ اب شیخ صاحب کا مکان ٹوٹا ہی ٹوٹا۔ مگر کوئی ڈھائی مہینے بعد جب کے ڈی اے کا عملہ آیا تو شیخ صاحب نے انہیں عدالت کا حکم اتنا ہی دکھا دیا۔ انہوں نے خاموشی سے عدالت سے استثناء لے لیا تھا۔ اب سب کی سمجھ میں آیا کہ شیخ صاحب اتنے خاموش کیوں بیٹھے تھے اور انہیں خان صاحب کی پرواہ کیوں نہیں تھی۔ وہ پہلے ہی حفاظتی اقدام کر چکے تھے۔ جب کے ڈی اے کا عملہ واپس جانے لگا تو خان صاحب نے انہیں روکنے کی کوشش کی مگر انہوں نے عذر پیش کیا کہ وہ عدالتی حکم کے سامنے کچھ نہیں کر سکتے۔ اب خان صاحب پہلے عدالت جائیں اور وہاں سے اس حکم اتنا ہی ختم کرائیں اس کے بعد ہی وہ کچھ کر سکتے تھے۔ یہ کہہ کر عملہ چلتا بنا۔

بہت عرصے بعد اس دن شیخ صاحب اور خان صاحب میں لڑائی ہوئی اور یہ ایسی لڑائی تھی کہ اگر محلے والے درمیان میں نہ پڑتے تو وہ آپس میں ہاتھ پائی پر اتر آتے۔ مگر زبانی دونوں نے ایک دوسرے کو دل کھول کر سنائیں اور پہلے اگر کوئی حد رہتی تھی تو اس دن وہ حد بھی ختم ہو

گئی۔ یہ مشکل لوگ ان کو ان کے گھروں میں بھیجنے میں کامیاب رہے اور کچھ افراد رات تک پہرہ بھی دیتے رہے کہ وہ لڑنے کے لیے پھر باہر نہ نکل آئیں۔ اس زمانے میں آتشیں ہتھیار کم ہوتے تھے مگر چاقو چھری اور ڈنڈے وغیرہ تو ہر گھر میں پائے جاتے تھے۔ خانگی لڑائیوں میں یہی ہتھیار استعمال ہوتے تھے۔ مرنے مارنے کی نوبت تو کم آتی تھی مگر زخمی بہت ہوتے تھے۔ لوگوں کو یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ وہ کہیں لڑائی میں کوئی ہتھیار نہ استعمال کریں۔ شیخ صاحب ٹھنڈے دماغ کے آدمی تھے مگر ان کے بیٹے تو جوان اور گرم مزاج تھے۔

بہر حال یہ رات سکون سے گزر گئی۔ آنے والے اتوار کو محلے کے بڑے ہمارے ہاں جمع ہوئے۔ خان صاحب اور شیخ صاحب کو بھی بلایا گیا۔ پہلے تو وہ ایک دوسرے کا سن کر آنے کو تیار نہیں تھے مگر کسی نہ کسی طرح انہیں منا لیا گیا۔ جب وہ آئے تو ان کے چہروں پر بہت زیادہ کشیدگی تھی۔ محلے میں ایک وکیل صاحب بھی رہتے تھے۔ سب سے پہلے تو انہوں نے عدالتی کارروائیوں کے بارے میں تفصیل سے بتایا کہ اس میں کتنے مشکل مراحل ہوتے ہیں اور معمولی مقدمات بھی سالوں تک چلتے رہتے ہیں۔ کسی بھی مسئلے کو حل کرنے کا سب سے سیدھا اور مشکل راستہ عدالت کا ہے۔ دونوں فریقوں کو اس صورت میں بہت سی مشکل پیش آئیں گی۔ ان کا بہت وقت اور پیسا اس کام میں صرف ہوگا اور عین ممکن ہے کہ عدالت سے باہر اس کا حل بہت کم پیسوں اور وقت میں ہو جائے اس لیے ان کی گزارش ہے کہ عدالتی حل سے اجتناب کیا جائے۔ میں اس ساری کارروائی کا عینی گواہ ہوں کیونکہ والد صاحب نے مجھے امور مہمانداری پر مقرر کیا ہوا تھا اور میں وہیں موجود تھا۔ وکیل صاحب کی تقریر کے بعد والد صاحب نے خان صاحب سے کہا۔

”اب آپ اپنی بات کیجئے لیکن خدا کے واسطے بات ایسی ہو جس میں کوئی راستہ نکل رہا ہو۔ ہم اسی مقصد کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں کہ کوئی ایسا راستہ نکل آئے جس پر آپ دونوں راضی ہوں۔ مجھے امید ہے آپ دونوں اپنے موقف میں نرمی لائیں گے۔“

خان صاحب نے کہا۔ ”میرا موقف بہت سیدھا اور صاف ہے کہ مجھے میری زمین دی جائے۔ میں مانتا ہوں کہ شیخ صاحب نے جان بوجھ کر یہ زمین نہیں لی ہے۔ مگر غلطی ان کی ہے۔ اب اس کی تلافی بھی ان کی ذمے داری

خان صاحب نے کہا۔ ”میرا موقف بہت سیدھا اور صاف ہے کہ مجھے میری زمین دی جائے۔ میں مانتا ہوں کہ شیخ صاحب نے جان بوجھ کر یہ زمین نہیں لی ہے۔ مگر غلطی ان کی ہے۔ اب اس کی تلافی بھی ان کی ذمے داری

ہاں نام سرگزشت

اس زمین کو اپنی زمین سمجھا۔ اگر میں تین سال سے اسے استعمال کر رہا ہوں تو میں اب تک اس کا جو کرایہ بنتا ہے وہ بھی دینے کو تیار ہوں۔ میں خان صاحب کو زمین کی مارکیٹ سے دو گنے ریٹ دینے کو تیار ہوں۔ اگر خان صاحب اس پر راضی نہیں ہیں تو وہ جو کہیں میں وہ دینے کو تیار ہوں۔“

”مجھے صرف زمین چاہیے۔“ خان صاحب نے حتیٰ لہجے میں کہا۔

”اس طرح تو بات نہیں بنے گی۔“ شیخ صاحب بولے۔

”بات اسی طرح بنے گی۔“ خان صاحب کا لہجہ پھر بگڑ گیا۔

”پاپیڑ خان صاحب۔“ والد صاحب نے کہا۔ ”ہم یہاں مسئلے کا حل نکالنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ اگر آپ اپنی بات پر جیسے رہے تو حل کس طرح نکلے گا۔“

”جس طرح بھی نکلے مجھے اپنی زمین چاہیے۔“ خان صاحب بولے۔ ”اگر یہ عدالت تک جاسکتے ہیں تو میں بھی جاسکتا ہوں۔“

”عدالت جانا آپ کے اور میرے لیے نقصان دہ... ہو گا۔“ شیخ صاحب بدستور محل سے بول رہے تھے۔ ”میرے پاس ایک تجویز اور ہے۔“

”کیسی تجویز شیخ صاحب؟“ والد صاحب نے پوچھا۔

”میں خان صاحب کا پورا مکان خرید لیتا ہوں اور خان صاحب مجھ سے رقم لے کر اسی علاقے میں اپنا دوسرا مکان تیار کر لیں اور اس دوران میں اسی مکان میں رہیں۔ یہاں بنے بنائے مکان کی قیمت پچیس ہزار ہے اور پلاٹ دس ہزار میں مل جاتا ہے۔ لیکن میں خان صاحب کو تیس ہزار کی آفر کرتا ہوں۔“

شیخ صاحب کی اس فراغ دلانہ تجویز نے سب کو چونکا دیا تھا۔ وکیل صاحب بولے۔ ”یہ تو بہت اچھی تجویز ہے۔“

والد صاحب اور دوسروں نے بھی اس کی تائید کی تو خان صاحب پھر بگڑ گئے۔ ”خاک اچھی تجویز ہے آپ لوگوں کے دماغ میں یہ بات نہیں آرہی کہ میں اپنا پلاٹ کسی صورت نہیں چھوڑنا چاہتا۔ میری اس سے جذباتی وابستگی ہے۔“

”ٹھیک ہے اس سے آپ کی جذباتی وابستگی ہے مگر مسئلے کا حل تو کل رہا ہے۔“ والد صاحب نے کہا۔

”مجھے یہ حل منظور نہیں ہے۔“ خان صاحب بولے تو رائے عامہ جو ان کی بات سن کر ان کی حامی ہو گئی تھی۔ اب ان کے سخت رویے کے باعث کبیدہ دکھائی دینے لگی۔ وکیل صاحب نے کہا۔

”خان صاحب آپ کا رویہ بے لچک ہے اور اس سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔“

”نہ ہو۔“

”معاملہ عدالت میں ہے۔“ وکیل صاحب نے انہیں یاد دلایا۔

”بے شک ہو میں وہاں بھی دیکھ لوں گا۔“ خان صاحب نے کہا اور کھڑے ہو گئے۔ وہ دوسروں کے روکنے کے باوجود وہاں سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد لوگ ان کے رویے پر تبصرہ کرنے لگے اور اکثر کا تبصرہ منہنی تھا۔

خان صاحب نے تقریباً سب کو اپنا مخالف کر لیا تھا اور جو مخالف نہیں تھے وہ اب ان کے حامی بھی نہیں رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ محلے کی حد تک خان صاحب نے اپنا کیس خراب کر لیا تھا۔ وکیل صاحب نے کہا کہ وہ عدالت میں بھی

مقابلہ نہیں کر سکیں گے کیونکہ جب شیخ صاحب نے سب پیشکشیں وہاں رکھیں گے تو عدالت بھی ان کو قبول کرنے کو کہے گی اور اس کا امکان بہت کم ہے کہ خان صاحب کے حق میں فیصلہ آجائے۔ بلکہ سماعت بھی اس وقت ہوگی جب شیخ

صاحب چاہیں گے۔ ورنہ ان کا وکیل تاریخ لیتا رہے گا اور خان صاحب اس میدان میں زیادہ دیر مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ خود خان صاحب جسے وکیل کریں گے وہ بھی یہی

چاہے گا کہ مقدمہ طول کھینچتا رہے تاکہ اس کی روزی بندی رہے۔

پھر ایسا ہی ہوا تھا۔ خان صاحب نے بھی ایک وکیل کیا اور حکم امتناعی کے خلاف عدالت میں چلے گئے۔ مگر شیخ صاحب کا وکیل زیادہ قابل اور ہوشیار تھا اس نے مقدمے کو طول دینے کے لیے تاریخیں لینا شروع کر دیں۔ متعدد بار تاریخ لینے کے بعد کوئی ایک سال کے بعد جا کر پہلی پیشی ہوئی جس میں خان صاحب کے وکیل نے جج کے سامنے ان کا کیس پیش کیا۔ اس پہلی پیشی تک خان صاحب وکیل اور کیس پر خاصی رقم خرچ کر چکے تھے اور امی کو ان کی بیگم سے پتا چلا تھا کہ ان کے مالی حالات ٹھک رہے۔ امی نے بھی انہیں یہی مشورہ دیا کہ وہ شیخ صاحب کی پیشکش قبول کر لیں۔

مالی لحاظ سے وہ شیخ صاحب کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ خان

صاحب کا وکیل زیادہ قابل اور ہوشیار تھا اس نے مقدمے کو

طول دینے کے لیے تاریخیں لینا شروع کر دیں۔ متعدد بار

تاریخ لینے کے بعد کوئی ایک سال کے بعد جا کر پہلی پیشی

ہوئی جس میں خان صاحب کے وکیل نے جج کے سامنے ان

کا کیس پیش کیا۔ اس پہلی پیشی تک خان صاحب وکیل اور

کیس پر خاصی رقم خرچ کر چکے تھے اور امی کو ان کی بیگم سے

پتا چلا تھا کہ ان کے مالی حالات ٹھک رہے۔ امی نے بھی

انہیں یہی مشورہ دیا کہ وہ شیخ صاحب کی پیشکش قبول کر لیں۔

مالی لحاظ سے وہ شیخ صاحب کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ خان

صاحب کی بیگم نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”میں نے بھی خان صاحب سے یہی کہا مگر وہ اتنے بگڑے کہ مجھے طلاق دینے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ وہ تو میں نے رو دھو کر اور بچیوں کے واسطے دے کر انہیں روک لیا ورنہ میں خود در بدر ہو چکی ہوتی۔“

”آخر خان صاحب اس معاملے میں اتنے جذباتی کیوں ہو رہے ہیں اور شیخ صاحب سے تو ان کی پرانی دوستی ہے۔“

”پتا نہیں کیا بات ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ بس خان صاحب کی انا ہے جو ان کو اجازت نہیں دے رہی۔ ورنہ وہ تو ایسے ہیں کہ کوئی مدد مانگے تو اپنی جان نکال کر اس کے سامنے رکھ دیں۔“

خان صاحب کی بیگم ٹھیک کہہ رہی تھیں محلے کے ہر مسئلے اور مشکل کام میں خان صاحب آگے آگے رہا کرتے تھے۔ کوئی ان سے مدد لینے آئے کبھی انکار نہیں کرتے تھے۔ اس زمانے میں بینک سے قرض لینا جان جو کھم کا کام تھا۔ مگر خان صاحب نے کتنے ہی لوگوں کو قرض دلوائے تھے اور بعض کے تو ضمانتی بھی بنے تھے۔ مالی لحاظ سے کمزور تھے مگر دینے دلانے میں ہمیشہ آگے رہتے تھے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی موقع ہو اور خان صاحب نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر نہ کیا ہو۔ ان کی بیگم امی کو بتا رہی تھیں کہ ہاتھ اتنا تنگ ہو گیا ہے کہ پہلے وہ بیٹیوں کے بھرنے کے لیے کچھ نہ کچھ جوڑنی رہتی تھیں۔ مگر اب ایک سال سے گھر کا گزارا ہی مشکل سے ہو رہا ہے۔ بیٹیوں کے لیے کہاں سے جمع کریں۔ اگر گھر میں کوئی مہمان آجاتا تو اس کی خاطر داری بھی مشکل سے ہوتی تھی۔ بیگم کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ خود بھی خان صاحب کی ہٹ دھرمی سے تنگ آئی ہوئی تھیں۔ امی نے آکر والد صاحب کو بتایا تو وہ بولے۔

”خان صاحب ویسے تو معقول انسان ہیں مگر اس معاملے میں ان کا رویہ بچکانہ ہے۔ انہیں اپنے اور اپنے گھر کے حالات دیکھ کر قدم اٹھانا چاہیے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ شیخ صاحب نے بہت زیادہ شرافت دکھائی ہے۔ وہ پورا گھر لینے کو تیار ہو گئے ہیں اس کے تمس ہزار دے رہے ہیں حالانکہ اس علاقے میں ایسا بتا ہوا مکان کچھس سے بھی کم میں مل جاتا ہے۔ پھر ابھی ان کے کاروباری حالات اتنے اچھے نہیں ہوئے ہیں مگر صرف مسئلہ حل کرنے کے لیے اتنا بڑا قدم اٹھانے کو تیار ہیں۔“

”خان صاحب کے گھر کے حالات خراب ہیں۔ بھابی اور بچیوں کے منہ اترے ہوئے ہیں۔ سال بھر سے پرانے کپڑے اب تک چلا رہی ہیں۔ چھوٹی کو تو اب کپڑے بھی چھوٹے پڑ گئے ہیں۔ مگر خان صاحب ہیں کہ ان کو بیوی بچوں کی پرواہ نہیں ہے۔ بیوی نے صلح کا کہا تو اسے طلاق دینے پر آمادہ ہو گئے۔“

”بس اللہ ہی ان کو عقل دے، ورنہ سب نے پوری کوشش کر لی ہے۔“ والد صاحب نے گہری سانس لے کر کہا۔

میں نے بتایا کہ والد صاحب سرکاری ملازم تھے اور ساٹھ کی دہائی کے آخر میں انہیں دارالحکومت کراچی سے اسلام آباد منتقل کر دیا گیا تھا۔ مگر بیشتر سرکاری دفاتر اور ملازمین ابھی کراچی میں کام کر رہے تھے جیسے جیسے ان کے لیے اسلام آباد میں بندوبست ہو رہا تھا وہاں جا رہے تھے۔ والد صاحب کو بھی ایسے اشارے ملے تھے کہ ان کا دفتر بھی منتقل اسلام آباد جانے والا ہے اور ظاہر ہے انہیں بھی وہاں جانا ہوگا۔ اس لیے والد صاحب نے ابھی سے تیاری شروع کر دی۔ میرے سب سے بڑے بھائی ذوالفقار قاضی گریجویٹ کر کے بی آئی اے میں ملازم ہو گئے تھے۔ ان سے چھوٹے عمار قاضی ان دنوں گریجویٹ کر رہے تھے۔ نورین باجی بھی کالج میں ایف اے کے دوسرے سال میں تھیں اور میں حسنی البصار احمد قاضی میٹرک میں تھا۔ ابو نے فیصلہ کیا کہ اگر ان کا تبادلہ ہوا تو وہ پہلے اکیلے اسلام آباد جائیں گے۔ مکان اور ضروریات کا بندوبست ہونے کے بعد وہ امی کو بلوالیس گے۔

ہم سب بہن بھائیوں کے لیے فیصلہ ہوا کہ ہم یہیں رہیں گے۔ جب نورین باجی بی آئی اے کر لیں گی تو وہ والدین کے پاس چلی جائیں گی۔ اس کے بعد نورین باجی اور ذوالفقار بھائی کی شادی۔۔۔ کی جائے گی۔ دونوں کے رشتے ملے تھے اور خاندان میں ہی ہوئے تھے۔ بھابی کے آجانے سے گھر دیکھنے کے لیے ایک عورت آجاتی۔ والد صاحب کا ارادہ مستقل اسلام آباد میں رہنے کا نہیں تھا۔ وہ ریٹائرمنٹ کے بعد واپس کراچی آجاتے۔ یہ مستقبل کے منصوبے تھے۔ نئے سال کے آغاز میں ہی والد صاحب کا دفتر اسلام آباد چلا گیا اور انہوں نے اسلام آباد جا کر پہلے رہائش کے لیے ایک چھوٹا مکان لیا اور پھر دو مہینے بعد امی کو بلالیا۔ ان کے جانے سے ہم بہن بھائی اداس ضرور ہوئے

زبردست جھگڑا ہوا ہے دونوں میں ہاتھ پائی ہوئی ہے اور شیخ صاحب کو اچھی خاصی چوٹیں آئی ہیں۔“

تفصیل کچھ یوں تھی کہ خان صاحب غصے میں بھرے ہوئے شیخ صاحب کے گھر پہنچے اور انہیں باہر بلایا۔ طبیعت خرابی کی وجہ سے شیخ صاحب دکان پر نہیں گئے تھے اور گھر میں تھے۔ ان کے بیٹے دکان پر تھے۔ شیخ صاحب باہر آئے اور خان صاحب ان پر گرجنے برسے لگے کہ بہت ہو گیا اب اگر انہوں نے ان کی زمین واپس نہ کی تو وہ انہیں دیکھ لیں گے۔ طبیعت خرابی کی وجہ سے شیخ صاحب کا ضبط بھی جواب دے گیا اور انہوں نے خان صاحب کو ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ خان صاحب نے انہیں پھٹ مارا اور اس کے بعد دونوں ہی گتھم گتھا ہو گئے۔ جب تک محلے والوں نے بیچ بچاؤ کرایا دونوں کو خاصی چوٹیں آگئی تھیں۔ خاص طور سے شیخ صاحب کا سر پھٹ گیا تھا۔ دھکا دینے پر وہ دیوار سے جا ٹکرائے تھے۔ انہیں مقامی ڈاکٹر کے پاس لے جانا پڑا تھا۔ ان کے بیٹوں کو خبر ہوئی تو وہ جبر کر آئے تھے مگر اس وقت تک شیخ صاحب واپس آچکے تھے انہوں نے انہیں قابو کر لیا۔

در اصل مقدمے بازی نے خان صاحب کو پریشان کر دیا تھا۔ ان کی آمدنی اتنی نہیں تھی اور پھر پیشی کے چکر میں وہ چھٹی لے کر عدالت پہنچے تو وہاں شیخ صاحب کا وکیل پہلے ہی تاریخ لے چکا ہوا تھا۔ اس طرح ان کی چھٹی بھی ضائع ہو جاتی۔ اس چھٹی کی تنخواہ بھی کٹ جاتی تھی۔ ان سب عوامل نے مل کر خان صاحب کا غصہ اس حد تک پہنچا دیا کہ وہ مرنے مارنے پر اتر آئے تھے۔ مگر کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ شیخ صاحب کا بہتا خون دیکھ کر خان صاحب کا غصہ سرد پڑ گیا تھا اور پھر وہ جھگڑا چھوڑ کر اپنے گھر چلے گئے تھے۔ نورین باجی اور مجھ سے بڑے عمار بھائی گرمیوں کی چھٹیوں میں امی ابو کے پاس اسلام آباد چلے گئے۔ اب گھر میں میں اور ذوالفقار بھائی تھے۔ یہ جھگڑا ان ہی دنوں میں پیش آیا تھا۔ ذوالفقار بھائی نے فون کر کے ابو کو بھی بتایا۔ اس زمانے میں کال بک کرائی جاتی تھی۔ وہ دفتر سے والد صاحب کے دفتر بات کر لیتے اور خیر خیریت مل جاتی تھی۔ بھائی محلے کے حالات بھی بتا دیتے تھے۔ یہ خاص اطلاع تھی اس لیے بھائی نے فوراً والد صاحب تک پہنچائی تھی۔

چھٹیاں ختم ہوئیں تو باجی اور بھائی واپس آ گئے۔ مگر وہ کچھ پریشان تھے۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ ابو اور دوسرے لوگ کہہ رہے ہیں کہ حالات ٹھیک نہیں ہیں اور سرحدوں پر

تھے مگر اور کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ہم سب بہن بھائیوں کی ایسی پرورش ہوئی تھی کہ ہم گھر کے سارے کام خود کر لیتے تھے اور کسی کو کوئی کام کرتے ہوئے مسئلہ نہیں ہوتا تھا۔

نورین باجی نے کچن سنبھال لیا تھا مگر میں ان کا یہاں ہاتھ بٹاتا تھا۔ صبح کا ناشتا ریڈی میڈ ہوتا تھا۔ ڈبل روٹی، انڈے اور مکھن چائے سے ناشتا ہوتا تھا۔ دوپہر کا سالن یا دال نورین باجی رات میں ہی پکا لیتی تھیں اور پھر کالج سے آ کر چاول بنا لیتیں۔ اس سے ہم سالن یا دال کھاتے تھے۔ رات کا سالن اور دال الگ بنتی تھی۔ میں گھر کی صفائی ستھرائی کے ساتھ نورین باجی کا کچن میں ہاتھ بٹاتا تھا۔ چھٹی والے دن سب مل کر سارا گھر صاف کرتے۔ ہفتے بھر کے کپڑے دھوتے تھے۔ اس دن ناشتا اور دوپہر کا کھانا باہر سے آتا تھا۔ کبھی حلوا پوری اور کبھی پائے اور کھجے آتے تھے۔ دوپہر کے لیے نہاری یا حلیم کے ساتھ روٹی آتی تھی اور کبھی بریانی لے آتے۔ شام کو نورین باجی اہتمام سے کچھ بناتی تھیں۔ یوں والدین کے جانے سے ہمیں اس لحاظ سے کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ مگر ان کی یاد بہت آتی تھی۔ خاص طور سے مجھے کیونکہ میں سب سے چھوٹا تھا۔

گرمیوں کے آغاز تک میں نے میٹرک کے پیرزدے دیئے تھے اور فارغ تھا۔ اس لیے ذوالفقار بھائی نے مجھے پی آئی اے کے انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ میں ایک کورس پر لگا دیا۔ یہ اپریل شب تھی جو ایک سال کی تھی اگر میں کامیابی سے مکمل کر لیتا تو مجھے بھی پی آئی اے میں جاب مل جانی۔ ذوالفقار بھائی ایڈمنسٹریشن میں تھے اس لیے ان کی ٹائن ٹو فائیو والی جاب تھی۔ میں ان کے ساتھ جاتا اور واپس آتا تھا۔ تنخواہ نہیں تھی مگر کچھ الاؤنس مل جاتا جس سے چھوٹے موٹے خرچ پورے ہو جاتے تھے۔ والد صاحب اور امی کے جانے کے بعد ہمارا محلے والوں سے واسطہ زیادہ تر سلام دعا تک محدود رہ گیا تھا۔ اتفاق سے ہم تینوں بھائی ہی دوستی کے زیادہ قائل نہیں تھے۔ اس لیے محلے میں ہماری جان پہچان محدود تھی اور جو دوست تھے وہ بھی اسکول اور کالج کے تھے۔ اس لیے ہمیں زیادہ اطلاعات نہیں ملتی تھیں۔ خاص طور سے خان صاحب اور شیخ صاحب کے تنازعے کے بارے میں اب بہت کم سننے میں آتا تھا۔ ایک رات ذوالفقار بھائی کچھ سامان لینے باہر گئے اور واپس آئے تو یہ سنسنی خیز اطلاع ساتھ لائے۔

”کل محلے میں خان صاحب اور شیخ صاحب کا

کشیڈگی ہے۔ اس وقت میڈیا کا دور نہیں تھا۔ ٹی وی اور ریڈیو سرکاری کنٹرول میں تھے اور ان پر ایسی کوئی خبر نہیں تھی۔ اخبارات میں بھی زیادہ نہیں آتا تھا۔ ذوالفقار اور عمار بھائی سول ڈیفنس کی تربیت لے چکے تھے۔ اگست کے وسط میں اچانک ہی سول ڈیفنس کی مشقیں شروع ہو گئیں۔ ذوالفقار بھائی تو اب ملازم تھے مگر عمار بھائی اور ان کے ساتھ میں بھی ان مشقوں میں شامل ہو گیا۔ ان مشقوں سے ہمیں اندازہ ہوا کہ جنگ کا خطرہ ہے۔ ستمبر کے آغاز میں بھارتی جارحیت میں شدت آگئی اور اس کے طیارے مسلسل ہماری فضائی حدود کی خلاف ورزی کرنے لگے۔ پھر ایک دن پاکستان نے سخت جواب دیا اور انڈیا کے چار طیارے بیک وقت مار گرائے۔ یہ ایک طرح سے اشارہ تھا کہ پاکستان کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔

اس واقعے کے بعد حالات زیادہ کشیدہ ہو گئے تھے۔ والد صاحب بھائی کو کال کر کے حفاظتی تدابیر کرنے کو کہہ رہے تھے۔ دوسری طرف ہم ذرا بے پروا تھے کہ شاید جنگ نہ ہو۔ اس لیے کوئی خاص احتیاطی تدبیر بھی نہیں کی۔ ہم نے کیا کسی نے نہیں کی تھی مگر جب چھ ستمبر کا دن طلوع ہوا اور جنگ کے سائرن بجتے لگے۔ صدر ایوب خان نے اعلان جنگ کیا اور قوم سے جنگ کے لیے تیار رہنے کو کہا تو ہم سب یوں حرکت میں آ گئے جیسے ہمیشہ سے جنگ کے لیے تیار رہے ہوں۔ سب سے پہلے ہم نے اپنے کپے زمین کھود کر بمباری سے محفوظ رہنے کے لیے خندق تیار کی۔ ان پر لکڑی کے تنخے رکھے۔ تاکہ جیسے ہی ہوائی حملے کا سائرن گونجے ہم اس میں چلے جائیں۔ اس کے بعد میں نے اور عمار بھائی نے محلے والوں کے ساتھ مل کر ان کھنڈیوں کو کھودیں۔

محلہ سول ڈیفنس کمیٹی بنی جس میں سب سے آگے آگے خان صاحب تھے اور ڈیوٹیاں لگائیں کہ کون کون کب پہرہ دے گا۔ رات کو بلیک آؤٹ پر سختی سے عمل کیا جائے گا۔ خان صاحب کے ساتھ ساتھ شیخ صاحب بھی میدان میں آ گئے تھے۔ انہوں نے اعلان کر دیا تھا کہ جو چیز محلے کا دکاندار زیادہ قیمت پر دے وہ ان سے کہیں وہ محلے والوں کو بنا کسی نفع کے لا کر دیں گے۔ مگر ایسا ہونے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ محلے کے دکانداروں نے خود قیمتیں کم کر دیں اور دوسری طرف لوگوں کا یہ حال تھا کہ جو آدھا کلو دودھ لیتا تھا اس نے ایک پاؤ کر دیا کہ جنگ کے دن ہیں اور ان چیزوں کی قلت ہوگی اس لیے کم استعمال کی جائے۔ لوگ زیادہ

سے زیادہ بچت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تاکہ بچت کو جنگی فنڈ میں دے سکیں۔

جنگ ہم تک نہیں آئی تھی اس کے باوجود ہم پوری طرح اس جنگ میں شریک تھے۔ محلے کے خالی پلاٹ میں ٹینٹ لگا کر وہاں ایک بڑا ریڈیو رکھا گیا تھا جو چوبیس گھنٹے چلتا تھا اور محلے والوں کو جنگ کی تازہ خبریں ملتی رہتی تھیں۔ یہاں ہمہ وقت خبریں سننے اور پھر اس پر تبصرے کرنے والوں کا ہجوم رہتا تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لوگ کام چھوڑ کر بیٹھے رہتے تھے۔ میں نے تو ان دنوں ان لوگوں کو بھی پورے شوق سے کام پر جاتے دیکھا جن کے لیے کام کرنا موت کے مترادف ہوتا تھا۔ لوگ ایک دوسرے کا خیال رکھنے لگے تھے۔ بڑوسوں سے پوچھا جاتا کہ آج انہوں نے کیا پکایا ہے۔ اگر کسی کے گھر کچھ نہ پکا ہوتا تو اس کے گھر کئی گھروں سے کھانا آ جاتا تھا۔ وہ لوگ جو پہلے کچرہ باہر پھینکتے تھے اب وہ صفائی کا خیال رکھنے لگے تھے۔ شر پسندوں اور خراب کاروں سے بچنے کی تدابیر کی جاتی تھیں۔ علاقے میں پھیلی جھاڑیوں کا صفایا کیا گیا تاکہ کوئی ان میں سے چھپ کر کچھ نہ کر سکے۔ میں لفظوں میں نہیں بتا سکتا کہ اس وقت لوگوں کا جذبہ کیا تھا اور ہم کیسے وطن کی حفاظت کے جذبے سے سرشار تھے۔ اس وقت سب اپنی حیثیت اور مفاد بھول گئے تھے صرف ایک خیال تھا کہ ہماری سر زمین پر حملہ کرنے والے دشمن کو شکست دینی ہے۔ اس کے لیے لوگ جان اور مال سب قربان کرنے کو تیار تھے۔

جنگ شروع ہوئے چند دن ہوئے تھے کہ حکومت کی جانب سے ہمارے علاقے میں کمپ لگا اور لوگوں سے اپیل کی گئی کہ وار فنڈ میں چندہ دیں کیونکہ اس وقت ہمیں ملک کے دفاع کے لیے ایک ایک روپے کی اشد ضرورت ہے۔ اپیل کی دیر تھی کہ لوگ اپنی جمع پونجیاں لے کر حاضر ہونے لگے۔ بڑے سینکڑوں اور ہزاروں دے رہے تھے تو چھوٹے بچے اور بچیاں اپنے گلک اٹھائے لا رہے تھے جن میں وہ سکے سکے کر کے جمع کرتے تھے۔ لڑکیوں نے سونے کی بالیاں وار فنڈ میں دیں تو جو سہاگنیں تھیں انہوں نے اپنا زیور نذر کر دیا۔ خان صاحب کی بیوی اپنی بچیوں کے لیے بنایا ہوا زیور لے کر وار فنڈ میں دینے آئی تھیں۔ کسی نے کہا۔ ”آپ نے بچیوں کے لیے بنایا تھا۔“

انہوں نے جواب دیا۔ ”یہ ملک رہے گا تو ایسے بہت سے زیور بن جائیں گے۔ اس ملک سے بڑھ کر ہمارے

لیے کچھ بھی نہیں ہے۔“

حالانکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ انڈیا ہر محاذ پر منہ کی کھا رہا تھا۔ صرف ریڈیو پاکستان جو جنگ کی درست خبریں پیش کر رہا تھا۔ پہلے لوگ بی بی سی یا وائس آف امریکا سنتے تھے مگر ان کی ایک طرفہ رپورٹنگ کی وجہ سے ہم نے انہیں سنتا چھوڑ دیا تھا۔ اگرچہ ساکھ تو ریڈیو پاکستان کی بھی اچھی نہیں تھی مگر اس جنگ کی حد تک لوگ اس پر اعتبار کر رہے تھے۔ جنگ کے دوسرے دن پاک فضائیہ کے شاہینوں نے اپنی حدود میں مکمل برتری حاصل کر لی اور شہروں پر انڈیا کے حملے کے خطرے کو تقریباً ختم کر دیا تھا۔ اسی لیے اس پوری جنگ کے دوران کراچی پر کوئی بھی کامیاب حملہ نہیں ہوا۔ لاہور اور پنجاب کے دوسرے شہروں پر حملے ہوئے مگر وہ زیادہ تر ناکام رہے۔ اسلام آباد بھی بہت کم نشانہ بنا۔ وہاں امی اور والد صاحب تھے ہمیں سب سے زیادہ فکر ان کی تھی۔

جنگ کی وجہ سے فون لائنیں بہت مصروف تھیں اور رابطہ نہیں ہو پارہا تھا۔ ان کی طرف سے دل پریشان تھا اور ہمہ وقت یہی دعا کرتے تھے کہ اللہ ہمارے والدین کو اپنے حفظ و امان میں رکھے گا۔ جنگ کے دسویں دن ذوالفقار بھائی نے بڑی مشکل سے ایک منٹ کے لیے والد صاحب سے بات کی اور بس ایک دوسرے کی خیریت ہی پوچھ سکے تھے۔ مگر اس مختصر سی بات سے دونوں گھروں کو ایک گونہ سکون مل گیا تھا۔ جنگ کے شروع دنوں میں شہر کی رونقیں ماند پڑ گئی تھیں مگر جب جنگ میں ہمارا پلہ بھاری ہوا اور کراچی پر سے فضائی حملے کا خطرہ ٹل گیا تو شہر کی رونقیں پھر بحال ہونے لگیں۔ لوگ کھلی جگہوں اور تفریح گاہوں میں نظر آنے لگے۔ البتہ شام ڈھلنے کے بعد بلیک آؤٹ ہو جاتا اور پھر سب اپنے گھروں میں رہتے تھے۔ بلیک آؤٹ پر اتنی سختی سے عمل کیا جاتا کہ رات کے وقت لوگ بلب کے بجائے موم بتی یا لائٹس جلا کر اس سے کام چلاتے تھے۔ تمام کھڑکیوں پر کالا کاغذ چسکایا ہوا تھا۔

ہمارا ملک غریب تھا جو بھرپور جنگ کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے حکومت کی طرف سے مسلسل عوام سے مدد کی اپیل کی جا رہی تھی۔ لوگ بھی مسلسل دے رہے تھے مگر ضرورت پوری نہیں ہو رہی تھی۔ رات کے وقت ڈیوٹی دینے والے لڑکوں میں میرا نام بھی تھا اور میں رات آٹھ سے صبح چھ بجے تک پہرہ دیتا تھا۔ اس رات بھی میں گلی کے سرے پر تھا۔ اچانک مجھے شیخ صاحب کے مکان کے پاس ایک سایہ

ان دنوں سارا محلہ ایک ہو گیا تھا سوائے خان صاحب اور شیخ صاحب کے۔ وہ ہر معاملے میں آگے آگے ہوتے تھے مگر ایک دوسرے سے بات کرنا تو ایک طرف رہا ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کے روادار بھی نہیں تھے۔ اگر مجبوری میں کوئی بات کرنی پڑ جائے تو کسی دوسرے کے توسط سے کرتے تھے۔ دونوں ہی محلے کی سول ڈیفنس کمیٹی میں تھے۔ اس لیے کبھی بات کرنے کی ضرورت پڑ ہی جاتی تھی۔ شیخ صاحب نے ان دنوں ہول سیل کا کام چھوڑ کر اپنا سامان بنا کسی نفع کے ان غریب آبادیوں میں فروخت کرنا شروع کر دیا تھا جہاں بسنے والے ایک وقت کا کھاتے تھے تو ان کو دوسرے وقت کا علم نہیں ہوتا تھا۔ بہت سے کاروباری یہی کر رہے تھے اور اپنا نفع وارنڈ میں دے رہے تھے یا پھر غریبوں میں تقسیم کر رہے تھے۔ ہمارے علاقے میں ایک بہت اچھا مردانی سیلون کھلا تھا۔ جہاں مردوں کے بال کٹوانے سے لے کر بہت سے کام ہوتے تھے اور یہ خاصا مہنگا تھا۔ جب تک جنگ ہوئی رہی اس کا مالک اگلی صبح سیلون کھولنے سے پہلے پچھلے دن کی پوری آمدنی وارنڈ میں دے جاتا تھا۔ ان سترہ دنوں میں اس نے ایک پیسہ بھی پاس نہیں رکھا۔

جنگ کے شروع کے دن بہت کڑے تھے۔ خاص طور سے جب انڈیا لاہور پر قبضے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ لاہور پر قبضہ کر کے پاکستان کو دو حصوں میں تقسیم کر دے مگر ہماری فوج نے عوام کی پشت پناہی سے اس کا یہ ناپاک منصوبہ ناکام بنایا تو اس نے کئی محاذ اور کھول دیئے۔ ہماری فوج، فضائیہ اور بحریہ کامیابی حاصل کر رہی تھیں مگر اتنی بڑی جنگی قوت سے مقابلہ کرنا آسان نہیں تھا۔ ہمارے پاس جنگی سامان کم تھا اور اس کمی کو ہمارے جوان اپنی جانوں سے پورا کر رہے تھے۔ عوام با حوصلہ تھے مگر اس کے باوجود خطرہ تھا کہ کہیں انڈیا اپنے ناپاک منصوبوں میں کامیاب نہ ہو جائے۔ پورا مغربی میڈیا بھارت کے ساتھ تھا اور جنگ سے متعلق دی جانے والی خبریں بھارت کی طرف سے آتی تھیں اس لیے ان میں بھارت کا رنگ ہی نمایاں ہوتا تھا۔ ہماری کامیابیاں پس پشت ڈال دی جاتی تھیں اور اس سے دنیا میں یہ تاثر بن رہا تھا کہ انڈیا جنگ جیت رہا ہے۔ جب بی بی سی یا وائس آف امریکا سنتے تو ہمارے دل ڈوبنے لگتے تھے۔

سر دار محمد ابراہیم خان

وہ 23 اگست 2001ء تک آزاد جموں و کشمیر حکومت کے صدر رہے۔ انہوں نے دو کتابیں Kashmir Saga اور "متاع زندگی" لکھیں۔ انہیں یہ اعزاز بھی حاصل رہا کہ وہ چار مرتبہ آزاد کشمیر کے صدر رہے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ وہ 32 سال کی عمر میں آزاد کشمیر کے نوجوان ترین اور 86 سال کی عمر میں معمر ترین صدر تھے۔ انہوں نے 2003ء میں انتقال کیا۔ وہ غازی ملت کے لقب سے بھی جانے جاتے تھے۔
مرسلہ: اکبر ذیشان۔ میرپور (آزاد کشمیر)

ابو سیاف گروپ

ایک مسلح گروپ جو فلپائن کے علاقے سولو آئی لینڈ میں فلپائن کی فوج سے برسر پیکار ہے۔ اسے 1991ء میں عبدالرزاق بھنگلانی نے قائم کیا۔ اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لیے اسامہ بن لادن کے قریبی رشتے داروں نے اسے رقم فراہم کیں۔ اسی گروپ کے ایک رکن کو 1993ء میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر میں دھماکا کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ بعد ازاں یہ گروپ تین حصوں میں تقسیم ہو گیا اور اسلامی ریاست کے قیام کی جدوجہد کرنے کی بجائے لوٹ مار اور اغوا برائے تادان کی دانتوں میں مصروف ہو گیا۔ ابتداء میں اس کی سرگرمیاں خفیہ تھیں لیکن اگست 2000ء میں اس نے اعلیٰ تخریبی سرگرمیاں شروع کر دیں جو 2001ء اور 2002ء میں بھی جاری رہیں۔ اس ضمن میں سب سے بڑی کارروائی 22 اگست 2002ء کو اس وقت کی گئی جب اغوا شدہ مسیحیوں میں سے دو کے سر قلم کر دیے گئے۔

مرسلہ: اکبر ذیشان۔ میرپور (آزاد کشمیر)

آشا بھوسلے

3 ستمبر 1933ء کو پیدا ہونے والی نامور بھارتی گلوکارہ اور ممتاز گلوکارہ تھیں۔ بھارتی گلوکاری کی ابتداء 1948ء میں فلم "چڑیا" سے کی۔ ان کے گلے میں بلا کا سوز پایا جاتا ہے اور ان کے گانے میں ایک تھکے ماندے آدمی کو حیات نو کا پیغام ملتا ہے۔ انہوں نے بھارت کی تمام اہم زبانوں میں نغمے گائے جن کی تعداد 14 کے لگ بھگ ہے جب کہ گائے جانے والے نغموں کی تعداد 20 ہزار سے زائد ہے۔

مرسلہ: کنیز۔ میرپور اے کے

ساحرت کرتا نظر آیا۔ تاروں کی معمولی سی روشنی تھی اور وہ آدمی واضح نہیں تھا۔ پہلے میں نے لٹکارنے کو سوچا مگر پھر خود دبے قدموں اس کی طرف بڑھا۔ وہ شیخ صاحب کے گیٹ کے پاس تھا۔ میں دیوار سے لگا ہوا اس کے نزدیک پہنچا تو... مجھے احساس ہوا کہ وہ گیٹ بہت آہستہ سے کھٹکھٹا رہا تھا۔ اس سے پہلے میں مداخلت کرتا گیٹ کھل گیا اور میں نے شیخ صاحب کی حیرت زدہ آواز سنی۔

"خان تم.....؟"

"جی شیخ صاحب یہ میں ہوں۔"

شیخ صاحب با مروت آدمی تھے انہوں نے نرمی سے پوچھا۔ "کہو کس لیے آئے ہو؟"

میں حیران تھا کہ خان صاحب اور شیخ صاحب کے دروازے پر۔ پھر مجھے خیال آیا کہ خان صاحب کی مالی حالت خراب ہو رہی تھی اور وہ شیخ صاحب سے مدد مانگنے آئے تھے۔ کیونکہ دار فنڈ میں انہوں نے بیٹیوں کے زیور کے علاوہ بہت کچھ نقد اور دوسرا سامان بھی دیا تھا۔ شاید یہی شیخ صاحب کے ذہن میں تھا۔ جب خان صاحب کچھ دیر کے لیے خاموش رہے تو انہوں نے پھر کہا۔ "خان صاحب بلا جھجک نہیں، اس وقت ہم پڑوسی ہیں۔"

"یہی سوچ کر میں آیا ہوں۔" خان صاحب نے کہا۔ "شیخ صاحب آپ میرا مکان خریدنا چاہتے تھے۔ میں اپنا مکان بیچنے آیا ہوں۔"

میرے ساتھ شیخ صاحب بھی حیران رہ گئے۔ "خان صاحب، اس وقت....."

"ہاں کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ اس کا علم کسی اور کو نہ ہو، بات بس میرے اور آپ کے درمیان میں رہے۔"

شیخ صاحب کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئے پھر انہوں نے کہا۔ "خان صاحب اگر آپ کو فوری کسی مدد کی ضرورت ہو تو....."

"نہیں..... نہیں، اللہ کا کرم ہے میرے گھر میں کئی دن کاراشن ہے۔ کوئی اور ضرورت بھی نہیں ہے۔"

"تب آپ مکان اس طرح کیوں فروخت کر رہے ہیں؟"

"بس یہ مدت پوچھیں شیخ صاحب۔" خان صاحب نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ "ساتھ ہی میں آپ سے ان تمام بدتمیزیوں اور بے ہودگیوں کی معافی چاہتا ہوں جو آپ کے ساتھ مجھ سے سرزد ہوئیں۔"

پابنا مسرگزشت

شیخ صاحب بھی باہر نکل آئے۔ ”ایسا مت کہیں خان صاحب، قصور ہم دونوں کا برابر کا تھا۔ شاید میرا زیادہ تھا کیونکہ زیادتی کا آغاز مجھ سے ہوا تھا اور میں نے پڑوسی کے بجائے اپنا مکان دیکھا۔ میں بھی آپ سے شرمندہ ہوں اور معافی چاہتا ہوں۔“

”شیخ صاحب میں چاہتا ہوں کہ آپ کل ہی ابتدائی لکھا پڑھی کر کے قیمت مجھے دے دیں اور اگر ہو سکے تو اس وقت رہنے کی مہلت بھی دیں جب تک میں کسی دوسری جگہ کا بندوبست نہیں کر لیتا۔“

”خان صاحب میں اپنے الفاظ پر قائم ہوں اور با خدا آپ جب تک چاہیں اس مکان میں رہیں ساری عمر رہیں میری طرف سے بھی تقاضہ نہیں ہوگا۔ خدا گواہ ہے میں نے مکان صرف جھگڑا ختم کرنے کی نیت سے خریدنے کی بات کی تھی ورنہ میری اس پر نظر کبھی نہیں رہی اور نہ ہی مجھے اس کی ضرورت ہے۔“

”میں جانتا ہوں شیخ صاحب آپ کو، پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔“ خان صاحب نے کہا۔ ”امید ہے یہ بات آپ کے اور میرے گھر کے درمیان رہے گی۔“

”بالکل اور کیونکہ آپ کو جلدی ہے اس لیے آپ زحمت کیجئے گا اور میری دکان پر آجائے گا۔ وہاں ہم سکون سے بیٹھ کر بات کر لیں گے اور میں اپنی رقم ہو سکی اس کا انتظام کر کے آپ کے حوالے کر دوں گا۔ باقی کے لیے پوری کوشش ہوگی کہ جلد از جلد ہو جائے۔ آپ جانتے ہیں آج کل کاروبار نہیں کر رہا ہوں۔“

”جی میں جانتا ہوں اور کل حاضر ہو جاؤں گا۔“ خان صاحب نے کہا اور ہاتھ ملانے کے لیے دونوں ہاتھ آگے بڑھائے تو شیخ صاحب نے ان کے ہاتھ کھینچ کر انہیں سینے سے لگا لیا۔ مجھے کچھ دیر بعد احساس ہوا کہ دونوں رورہے تھے۔ پھر وہ ایک دوسرے سے الگ ہوئے اور اپنے اپنے گروں میں چلے گئے۔ میں ایک آڑ میں کھڑا ہوا تھا اس لیے ان میں سے کوئی مجھے دیکھ نہیں سکا تھا اور میں نے سب دیکھ اور سن لیا تھا۔ میں اس حیرت انگیز واقعے کا عینی گواہ تھا اور میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ جلد از جلد گھر جا کر پہلے گھر والوں کو بتاؤں۔ اس کے لیے مجھے صبح چھ بجے تک انتظار کرنا پڑا تھا۔ میں چھ بجتے ہی گھر پہنچا تو سب بیدار ہو چکے تھے اور جب میں نے انہیں بتایا تو سب ہی اچھل پڑے تھے۔ نورین باجی نے کہا۔

”یہ تو معجزہ ہو گیا ہے۔“

”خان صاحب اور شیخ صاحب کا آپس میں ملنا اور گلے لگنا اس سال کی سب سے بڑی خبر ہے۔“ عمار بھائی بولے۔

”سب سے بڑی خبر یہ ہے جو اس وقت ہمارے ملک پر گزر رہی ہے۔“ ذوالفقار بھائی نے انہیں گھورا۔

”اب تو اس کے عادی ہو گئے ہیں۔“ عمار بھائی بولے۔ ”یہ سب سے بڑی خبر ہے۔“

وہ مجھ سے کرید کرید کر سوال کرنے لگے کہ اور کیا بات ہوئی اور پھر تبصرے شروع ہو گئے۔ نورین باجی اور عمار بھائی کا خیال تھا کہ خان صاحب کی انا بالآخر شکست کھا گئی کیونکہ ان کی مالی حالت انتہائی خراب ہو گئی ہے مگر ذوالفقار بھائی کا خیال تھا کہ ایسی بات نہیں ہے، خان صاحب ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو اس بات پر کسی کے سامنے جھک جائیں اور کسی کے سامنے مدد مانگنے جائیں اور وہ بھی اس شخص سے جس سے ان کا شدید اختلاف ہو۔ ان کے خیال میں یہ معاملہ کچھ اور تھا۔

میں ان سے متفق تھا مگر میں ذوالفقار بھائی بھی سمجھنے سے قاصر تھے کہ خان صاحب نے اتنا بڑا قدم کسے اٹھایا جب کہ ان سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ مگر ذوالفقار بھائی نے مجھے اور دوسرے گھروالوں کو سختی سے منع کر دیا کہ اس بارے میں کسی سے ایک لفظ نہیں کہنا ہے۔ خان صاحب اور شیخ صاحب اس بات کو راز رکھنا چاہتے ہیں اس لیے اسے راز ہی رہنا چاہیے۔ ہم نے بھائی سے وعدہ کیا کہ کسی کو نہیں بتائیں گے۔

محلے میں کسی کو پتا نہیں چلا کہ رات میں کتنی بڑی تبدیلی آئی تھی۔ رات میں صرف میں نے ان دونوں کو ملتے اور بات کرتے دیکھا اور سنا تھا۔ اگلے دن خان صاحب شیخ صاحب کی دکان پر گئے ہوں گے اور وہاں انہوں نے شیخ صاحب سے مکان کی فروخت کا معاہدہ کر لیا ہوگا۔ مجھے خیال آیا کہ شاید خان صاحب کو کوئی اچھا موقع مل رہا ہو اور وہ اس سے فائدہ اٹھا رہے ہوں۔ کوئی جگہ اچھی اور سستی مل رہی ہو۔ شیخ صاحب انہیں تیس ہزار کی پیشکش کر چکے تھے۔ ان کو سمجھ آ گیا تھا کہ بلاوجہ کی ضد اور جذبات سے صرف ان کا نقصان ہوگا اور بالآخر انہوں نے عقل کا راستہ اختیار کیا۔ کیونکہ خان صاحب بدستور اسی مکان میں رہ رہے تھے اس لیے کسی کو علم نہیں ہوا کہ

گیا۔ امی کو دکھانے کے بعد میں دوائیں اور دوسرے کاموں کے لیے فارمیسی گیا تھا وہاں سے آیا تو امی ایک نقاب پوش خاتون سے بات کر رہی تھیں۔ امی نے ان سے میرا تعارف کرایا تو وہ خوش ہو گئیں۔

”ماشا اللہ کتنا بڑا ہو گیا۔“

”میں سوچ رہی ہوں اس کی بھی شادی کر دوں۔“
 ”ضرور کریں۔ بچوں کو جتنی جلدی نمٹا دیا جائے اچھا ہے۔“

”آپ نے دونوں بیٹیوں کی شادی کی؟“

اس سوال پر وہ خاتون مرجھا گئی تھیں۔ ”کہاں یا جی،

انہوں نے مکان فروخت کر دیا ہے۔ چند دن اور گزرے جنگ ختم ہو گئی۔ انڈیا اپنے مذموم عزائم میں ناکام رہا۔ اس جنگ نے سترہ دن کے لیے پاکستان اور اس میں بسنے والوں کو ایک کر دیا تھا۔

ان دنوں ہر فرد پاکستانی تھا اور پورے دل سے پاکستانی تھا، وہ صرف پاکستان کا مفاد سوچ رہا تھا۔ یہ سترہ دن کسی خواب کی طرح گزرے اور مجھے اور مجھ جیسے بہت سے دیکھنے والوں کو آج بھی خواب ہی لگتے ہوں گے۔ جنگ ختم ہوئی اور سب معمول پر آ گیا۔ ہم پاکستانی نہیں رہے پھر سے بنگالی، پنجابی، سندھی، مہاجر، پٹھان اور بلوچ بن گئے۔ ایک بڑی کامیابی کے بعد آنے والا انتشار بہت بڑا تھا جس نے چند سال بعد مشرقی پاکستان کے لیے کو جنم دیا۔ اس میں اغیار کی سازشیں نمایاں تھیں لیکن انہوں کی غلطیاں بھی کم نہیں تھیں۔ بہر حال اس سچ بیانی کا موضوع خان صاحب اور شیخ صاحب ہیں۔ خان صاحب پہلی اکتوبر کو مکان چھوڑ کر گئے تب محلے والوں کو پتا چلا کہ انہوں نے مکان شیخ صاحب کو بیچ دیا ہے۔ وہ کہاں گئے تھے یہ کسی کو علم نہیں تھا۔ حد یہ کہ شیخ صاحب بھی نہیں جانتے تھے کہ خان صاحب نے کہاں مکان لیا تھا۔ وہ کسی کو بتا کر بھی نہیں گئے تھے۔ آج کل کا دور نہیں تھا کہ آدمی کو سوبائٹ اور فیس بک کی مدد سے تلاش کر لیا جائے اس زمانے میں تو لائن کا فون بھی بڑی مشکل سے ملتا تھا۔

محلے والے کچھ دن تو حیران رہے۔ شیخ صاحب نے بتایا کہ انہوں نے پورے تیس ہزار روپے کران سے مکان خرید لیا تھا اور پھر اپنے نام پر لیز بھی کر لیا تھا۔ رفتہ رفتہ بات پرانی ہوتی گئی اور محلے والے خان صاحب کو بھولتے چلے گئے۔ اس بات کو کئی سال گزر گئے تھے۔ والد صاحب نے ہماری وجہ سے قبل از وقت بیٹا منٹ لے لی اور واپس کراچی آ گئے۔ یہاں آ کر انہوں نے ایک اسٹیٹ ایجنسی کھول لی۔ کچھ عرصے بعد یہ چل نکلی۔ اگرچہ ہم سب ہی بھائی کمانے لگے تھے۔ مجھ سے بڑے تینوں کی شادی ہو گئی اور میں باقی رہ گیا تھا۔ مگر میری عمر اتنی نہیں تھی کہ ماں باپ شادی کے لیے زیادہ فکر کرتے دوسرے میں نے ملازمت کے دوران ہی ڈیپونہ کر لیا اور بی ٹیک کی کوشش کر رہا تھا۔ اس لیے مجھے وقت کم ملتا تھا۔ ان ہی دنوں امی کو دل کی ہلکی سی تکلیف ہوئی اور میں انہیں ڈاکٹر کو دکھانے جناح اسپتال لے

قارئین متوجہ ہوں

پچھلے نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پچھلے نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچہ دستیاب ہو۔

☆ شہر اور ضلع کے نام۔

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل فون نمبر

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

نور عباس

03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سینس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگشت

C-63 نیر 11 - سیشن ڈینس ہاؤسنگ اتھارٹی میں کورنگی روڈ، کراچی

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

آپ جان گئی ہوں گی کہ ہم وہاں سے بے سرو سامان نکلے تھے اور بہت عرصے تک تو مالی لحاظ سے سنبھل نہ سکے۔ کرائے کے گھر میں رہ رہے ہیں۔ جو آتا وہ خرچ ہو جاتا۔ بچیوں کو اچھی تعلیم دلانی مگر اب لوگوں کو تعلیم یافتہ اور سنبھلی لڑکیوں کی نہیں جہیز کی ضرورت ہوتی ہے۔“

”خدا سب السباب ہے۔“ امی نے انہیں تسلی دی۔ ”مجھے تو پتا ہی نہیں تھا کہ خان صاحب اتنا بڑا ایثار کر کے گئے تھے۔“

”ہاں مگر صلہ کیا ملا؟“ خاتون کا لہجہ کسی قدر تلخ ہو گیا۔

”انہوں نے جو کیا اس کا صلہ اوپر والا ہی دے سکتا ہے۔“ امی نے کہا تو وہ شرمندہ ہو گئیں۔

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مگر کیا کروں کبھی کبھی لیوں پر ہلکوا آ جاتا ہے۔ اتنا بڑا گھر چھوڑ کر دو کمروں کے فلیٹ میں رہ رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں سب زمین کے لیے کیا۔“

میں سن کر بے یقین ہو گیا کہ وہ خان صاحب کی بیگم تھیں اور ان کی امی سے بات ہوئی تھی۔ خان صاحب نے محلے سے جاتے ہوئے کون سا ایثار کیا تھا؟ مگر میں ان کے سامنے نہیں پوچھ سکتا تھا۔ خان صاحب کی بیگم بیمار تھیں اور یہاں ڈاکٹر کو دکھانے آئی تھیں۔ امی نے یقیناً ان سے پتا لے لیا تھا اور ان سے چکر لگانے کو کہا۔ ہم باہر نکلے اور رکشے میں بیٹھے تو میں نے امی سے پوچھا۔ ”یہ کیا کہہ رہی تھیں خان صاحب نے کون سا ایثار کیا؟“

”ایثار سا ایثار۔“ امی نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے حد کر دی۔ اپنا مکان شیخ صاحب کو بیچ کر ساری رقم وارنڈ میں دے دی۔“

میں دنگ رہ گیا تھا۔ ”تیس ہزار انہوں نے وارنڈ

میں دے دیے؟“

”ایک روپیہ بھی نہیں رکھا۔ بیوی نے مخالفت کی تو بولے کہ یہ پلاٹ اسی وطن کے طفیل ہے۔ رقم کی تو کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس کے لیے تو جان بھی حاضر ہے۔ انہوں نے اپنی انا بھی قتل کر دی۔“

امی نے گھر جا کر سب کو بتایا تو کسی کو یقین نہیں آیا مگر ہم خود خان صاحب کی بیگم سے مل کر آرہے تھے۔ ہوتے ہوتے یہ خبر محلے میں پھیلی تو سب ہی دوڑے آئے تھے۔ سب سے پہلے شیخ صاحب کی بیگم آئی تھیں۔ جب امی نے انہیں خان صاحب کے ایثار اور ان کے گھر والوں کی حالت کا بتایا تو وہ رو دی تھیں۔ دوسری عورتیں آئیں اور فیصلہ ہوا کہ وہ اگلے دن خان صاحب کے گھر جائیں گی۔ پھر سارے محلے کی خواتین خان صاحب کے ہاں گئیں۔ جب واپس آئیں تو پتا چلا کہ امی نے ان کی بڑی بیٹی کو میرے لیے مانگ لیا تھا اور شیخ صاحب کی بیگم نے چھوٹی بیٹی کو اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کے لیے مانگ لیا تھا۔ یہ کہانی نہیں ختم نہیں ہوتی ہے۔ شیخ صاحب اور والد صاحب جا کر خان صاحب سے ملے تو شیخ صاحب نے خان صاحب سے کہا کہ وہ اپنا مکان واپس لے لیں۔ انہوں نے آج تک اس کی ایک اینٹ بھی نہیں بدلی تھی۔

خان صاحب راضی نہیں تھے مگر سب نے انہیں مجبور کر کے منالیا۔ وہ اس شرط پر مانے کہ مکان کی قیمت شیخ صاحب کو قسطوں میں ادا کر دیں گے۔ انہوں نے مرنے سے پہلے یہ وعدہ پورا کر دیا۔ جب تک ملازمت رہی تنخواہ سے قسط ادا کرتے رہے اور جب ریٹائر ہوئے تو فنڈ سے ملنے والی رقم سے باقی ادائیگی کی۔ شیخ صاحب مکان پہلے ہی واپس ان کے نام کر چکے تھے اور انہوں نے وہی تیس ہزار لیے جو خان صاحب کو دیئے تھے۔ اگرچہ اس وقت تک مکان کی قیمت دو گنی سے زیادہ ہو گئی تھی۔ یہ مکان آج بھی اسی طرح قائم ہے بلکہ اس کی دو منزلیں ہو گئی ہیں۔ ایک منزل میں اپنی بیوی اور بچوں سمیت رہتا ہوں دوسری منزل میں خان صاحب کی دوسری بیٹی اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ رہتی ہے۔ یہ مکان ان ہی دو بہنوں کی ملکیت ہے لیکن اس کا آج تک ہزارہ نہیں ہوا ہے۔

شمارہ ستمبر 2015ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہلاری پیش کش..... آپ کا انتخاب

☆ اول: عجب دستور..... سعدیہ

☆ دوم: تلافی..... امیرہ سلیم

☆ سوم: ذمے دار کون..... الف

پہلے دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ میں منتخب کیجئے

ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے